2013ء

پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

ناشر

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور - 54600

فون : 92-042-35838341-35864994-35865969 فیکس : 92-042-35883582

ای میل : hrcp@hrcp-web.org

ویب سائٹ: www.hrcp-web.org

طابع

یو بی پرنٹرز

مشن روڈ، لاہور

جون 2014

قیمت : = / 400 روپے

10 ڈالرز

5 پاؤنڈ

(علاوہ ڈاک خرچ)

ISBN - 978-969-8324-71-1

سرورق ڈیزائن: وژنریز ڈویژن، لاہور

متن کمپوزنگ: جمال احمد/سید رضا شاہ

فہرست مضامین

اختصارات ... i

تعارف ... 1

اہم نکات ... 3

1- قانون کی حکمرانی

قوانین اور قانون سازی ... 13

عدل وانصاف کا انتظام وانصرام ... 23

2- قانون کا نفاذ

امن وامان کی صورت حال ... 43

قید خانے، قیدی اور جبری گمشدگیاں ... 63

3- بنیادی آزادیاں

نقل وحرکت کی آزادی ... 83

فکر وضمیر اور مذہب کی آزادی ... 93

اظہار رائے کی آزادی ... 121

اجتماع کی آزادی ... 145

انجمن سازی کی آزادی ... 162

4- فروغ جمہوریت

سیاسی عمل میں شرکت ... 173

5- محروم طبقوں کے حقوق

خواتین ... 195

بچے ... 215

لیبر ... 234

6- سماجی اور معاشی حقوق

تعلیم ... 259

صحت ... 279

ہاؤسنگ ... 297

ماحولیات ... 309

مہاجرین ... 329

ضمیمے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سرگرمیاں ... 347

اہم مسائل پر کمیشن کا موقف ... 376

ذرائع معلومات

ذرائع، جہاں متن یا حاشیہ میں ان کا حوالہ نہیں دیا گیا، ایچ آر سی پی کے جائزے پر مبنی رپورٹس، نامہ نگاروں اور عام شہریوں کے ساتھ خط و کتابت، سرکاری گزٹ، اقتصادی اور قانونی دستاویزات اور دیگر سرکاری اطلاعات اور بیانات، قومی اور علاقائی پریس میں شائع ہونے والی رپورٹوں اور یو این ڈی پی، آئی ایل او، ڈبلیو ایچ او، یونیسف اور ورلڈ بنک جیسے عالمی اداروں کی مطبوعات پر مبنی ہیں۔ سرکاری رپورٹوں، پریس کے جائزوں اور این جی اوز کی نمونے کی سروے رپورٹوں کو ان کے محدود وسائل کے پیش نظر صورت حال کی مکمل یا حتمی تصویر نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ صرف سال کے دوران سامنے آنے والے رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں۔

اختصارات

اے ڈی بی	ایشین ڈویلپمنٹ بنک
اے جے کے	آزاد جموں وکشمیر
اے این پی	عوامی نیشنل پارٹی
اے پی پی	ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان
اے آر ڈی	الائنس فار دی رسٹوریشن آف ڈیموکریسی [یہ وسیع تر اتحاد برائے بحالی جمہوریت 2000 کے اواخر میں تشکیل پایا تھا، جس میں پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی دونوں شامل تھیں]
اے ایس آئی	اسسٹنٹ سب انسپکٹر [پولیس]
اے ایس جے	ایڈیشنل سیشن جج
اے ٹی اے	اینٹی ٹیررازم ایکٹ
اے ٹی سی	اینٹی ٹیررازم کورٹ
بی ایچ سی	بلوچستان ہائی کورٹ
بی ایچ یو	بنیادی ہیلتھ یونٹ
سی ڈی اے	کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی اسلام آباد، کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (KDA)، لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی - (LDA)
سی ای سی	چیف الیکشن کمشنر
سی ای ڈی اے ڈبلیو	[CEDAW] عورتوں کے خلاف ہر قسم کے امتیازی سلوک کے خاتمے کا کنونشن
سی آئی اے	کریمنل انویسٹی گیشن ایجنسی
سی آئی آئی	کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی [اسلامی نظریاتی کونسل]
سی سی آئی	کونسل برائے مشترکہ مفادات
سی جے	چیف جسٹس
سی این آئی سی	کمپیوٹرائزڈ نیشنل آئیڈنٹٹی کارڈ
سی او اے ایس	چیف آف آرمی سٹاف
سی او پی	کانسٹی ٹیوشن آف پاکستان
سی آر پی سی	کرمنل پروسیجر کوڈ
سی آر سی	کنونشن آف دی رائٹس آف دی چائلڈ [بچوں کے حقوق کا کنونشن]
ڈی سی او	ڈسٹرکٹ کوآرڈی نیشن آفیسر
ڈی پی او	ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر
ڈی آئی جی	ڈپٹی انسپکٹر جنرل [پولیس]
ڈی ایس جے	ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج
ڈی ایس پی	ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس
ای سی ایل	ایگزٹ کنٹرول لسٹ
ای آئی اے	انوائرنمنٹ امپیکٹ اسسمنٹ
ای پی اے	انوائرنمنٹ پروٹیکشن ایجنسی [ادارہ تحفظ ماحولیات]
ای پی آئی	ایکس پینڈڈ پروگرام آف امیونائزیشن
ایف اے ٹی اے (فاٹا)	فیڈرلی ایڈمنسٹرڈ ٹرائبل ایریاز [وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات]
ایف سی آر	فرنٹیر کرائمز ریگولیشنز
ایف آئی آر	فرسٹ انفارمیشن رپورٹ
ایچ ای سی	ہائر ایجوکیشن کمیشن
ایچ آر سی پی	ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان [پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق]
آئی ڈی ایم سی	انٹرنیشنل ڈس پلیسمنٹ (اندرون ملک بے گھر ہونے والے افراد کے بارے میں) مینجمنٹ سنٹر
آئی ای ای	انٹرنیشنل انوائرنمنٹ ایگزامینیشن
آئی جی	انسپکٹر جنرل [آف پولیس]
آئی ایچ سی	اسلام آباد ہائی کورٹ
آئی ایم ایف	انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ
آئی ایس آئی	انٹر سروسز انٹیلی جنس
آئی ایس پی آر	انٹر سروسز پبلک ریلیشنز
آئی یو سی این	انٹرنیشنل یونین فار دی کنزرویشن آف نیچر
جے آئی	جماعت اسلامی
جے یو آئی (ایف)	جمعیت علمائے اسلام (ف)
جے جے ایس او	جُووینائل جسٹس سسٹم
ایل ایچ سی	لاہور ہائی کورٹ
ایل ایچ وی	لیڈی ہیلتھ وزیٹر
ایم این اے	ممبر قومی اسمبلی

ایم پی اے	ممبر صوبائی اسمبلی
ایم کیو ایم	متحدہ (سابق مہاجر) قومی موومنٹ
ایم ایس ایف	مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن
این اے	نیشنل اسمبلی
این اے بی	نیشنل اکاؤنٹ ایبلیٹی بیورو
این سی ایس ڈبلیو	نیشنل کمیشن آن دی سٹیٹس آف ویمن
این ای کیو ایس	نیشنل انوائرنمنٹ کوالٹی سٹینڈرڈز
این جی او	نان گورنمنٹ آرگنائزیشن [غیر سرکاری تنظیم]
سی این آئی سی	کمپیوٹرائزڈ نیشنل آئیڈنٹی کارڈ
این آئی آر سی	نیشنل انڈسٹریل ریلیشنز کمیشن
این ایس سی	نیشنل سیکورٹی کونسل
پی اے ای سی	پاکستان اٹامک انرجی کمیشن
پی اے ٹی اے [پاٹا]	پروونشلی ایڈمنسٹرڈ ٹرائبل ایریاز [صوبے کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات]
پی ایف یو جے	پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس
پی ایچ اے	پاکستان ہاؤسنگ اتھارٹی
پی ایچ سی	پشاور ہائی کورٹ
پی ایم ایل [این]	پاکستان مسلم لیگ [نواز شریف گروپ]
پی او این ایم (پونم)	پاکستان اپریسڈ نیشنز موومنٹ [چھوٹے صوبوں کی قومیت پرست جماعتوں کا پلیٹ فارم، جس کا مقصد پنجاب کی بالادستی کے خلاف شکایات کے ازالے کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔]
پی پی سی	پاکستان پینل کوڈ
پی پی پی	پاکستان پیپلز پارٹی
پی پی پی پی	پاکستان پیپلز پارٹی۔ پارلیمنٹیرین
پی ایس	پولیس اسٹیشن
پی ٹی آئی	پاکستان تحریک انصاف
آر ایچ سی	رورل ہیلتھ سنٹر
ایس اے اے آر سی (سارک)	ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن فار ریجنل کوآپریشن
ایس سی	سپریم کورٹ
ایس سی اے آر پی [سکارپ]	سیلنٹی کنٹرول اینڈ ریکلیمیشن پروجیکٹ
ایس سی بی اے	سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن
ایس ایچ سی	سندھ ہائی کورٹ
ایس ایچ او	اسٹیشن ہاؤس آفیسر [تھانیدار]
ایس آئی	سب انسپکٹر [آف پولیس]
ایس آئی ٹی ای [سائیٹ]	سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ
ایس ایم پی	سپاہ محمد پاکستان
ایس پی	سپرنٹنڈنٹ آف پولیس
ایس ایس پی	سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس
ایس ٹی این	شالیمار ٹیلی ویژن نیٹ ورک
ٹی بی	ٹیوبرکلوسس
ٹی جے پی	تحریک جعفریہ پاکستان
ٹی این ایس ایم	تحریک نفاذ شریعت محمدی
ٹی ٹی پی	تحریک طالبان پاکستان
یو جی سی	یونیورسٹی گرانٹس کمیشن
یو این ڈی سی پی	یونائیٹڈ نیشنز ڈرگ کنٹرول پروگرام
یو این ڈی پی	یونائیٹڈ نیشنز ڈویلپمنٹ پروگرام
یو این ای ایس سی او [یونیسکو]	یونائی ٹیڈ نیشنز ایجوکیشنل، سائنٹیفک اینڈ کلچرل آرگنائی زیشن
یو ڈی ایچ آر	یونیورسل ڈکلریشن آف ہیومن رائٹس
یو این ایچ سی آر	یونائیٹڈ نیشنز ہائی کمیشن فار ریفوجیز [اقوام متحدہ ہائی کمیشن برائے مہاجرین]
یو این آئی سی ای ایف (یونیسف)	یونائیٹڈ نیشنز انٹرنیشنل چلڈرنز ایجوکیشن فنڈ
ڈبلیو اے پی ڈی اے	(واپڈا) واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی
ڈبلیو اے ایس اے	واٹر اینڈ سیوریج اتھارٹی (واسا)
ڈبلیو بی	ورلڈ بنک
ڈبلیو ایچ او	ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن
ڈبلیو ٹی او	ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن
ڈبلیو ڈبلیو ایف	ورلڈ وائیڈ فنڈ فار نیچر

تعارف

سالانہ رپورٹس گزرے سال پر نظر ڈالنے اور اس دوران ہونے والے واقعات کو یکجا کرنے کا نام ہے۔ یہ کام کئی وجوہات کے باعث ضروری ہوتا ہے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ 2013ء کے دوران پیش آنے والے واقعات کی یادیں صرف خوشگوار ہوں۔

اس برس چند مثبت پیش رفتیں ایسی بھی تھیں جنہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ عام انتخاب کا انعقاد ہوا اور لوگ جمہوری نظام کے تحت زندگی گزارنے کے فیصلے پر ڈٹے رہے حالانکہ متعدد متعصب عناصر نے عوام کو گمراہ کرنے کی بھرپور کوششیں کیں لیکن نوجوانوں کی پُرجوش شرکت اور خواتین ووٹرز کی ملک کی تاریخ میں سب سے زیادہ ووٹ ڈالنے کی شرح ایسے خوش کن واقعات تھے جن پر جس قدر خوشی کا اظہار کیا جائے کم ہے۔

صوبوں نے اٹھارہویں ترمیم کے بعد قانون سازی کے اپنے وسیع اختیار کو استعمال میں لانے کا فیصلہ کیا۔ یہ عوام کے فیصلے کا احترام ہی تھا کہ سیاسی جماعتوں کی طرف سے ہر قیمت پر صوبائی حکومتیں بنانے کی تحریص کو ان جماعتوں نے درخوراعتنا نہ سمجھا۔ یقینی طور پر یہ عمل انتہائی تعریف کا مستحق ہے۔

تاہم کسی اور ملک یا کسی اور وقت میں محض انتخابات کے انعقاد یا ''پہلے جمہوری انتقال اقتدار'' پر خوشیاں منائی جاتیں تو لوگ اپنے ضمیر اور ذہن سے یہ سوال ضرور کرتے کہ ہمارا معاشرتی معیار کس حد تک گر چکا ہے۔

بہرحال جب ملک میں یہ تاریخی واقعات وقوع پذیر ہورہے تھے تو اس کے ساتھ ساتھ ریاست کو درپیش مشکلات بھی بحران کی شکل اختیار کرچکی تھیں۔ غالباً سب سے بڑا چیلنج مذہبی اقلیتوں کے حوالے سے تھا

جن کے لیے پاکستان ایک انتہائی خطرناک ملک بن چکا ہے۔

حواس باختہ کردینے والی کیفیات میں سے ایک یہ تھی کہ چیلنجوں کا سامنا کس انداز سے کیا گیا۔تشدد انتہا پسندی اور عدم رواداری کے خطرات سے لے کر بڑھتے ہوئے جرائم ،خواتین کے خلاف تشدد، سزائے موت/سزائے موت کا تعطل/ پھانسی کا معمہ،تضحیک مذہب کے قوانین، معاشرے کو اسلحے سے پاک کرنے، ریاست کی رِٹ کو بحال کرنے، افراد کو جبری غائب کرنے کی قابل مذمت روش کا خاتمہ اور فرقہ وارانہ غارت گری کے معاملات جیسے بحرانوں پر قابو پانے کی جو نیم دلانہ حکمت عملی اختیار کی گئی، وہ مسائل کو حل کرنے کی بجائے انہیں التواء کا شکار کرنے کے مترادف ثابت ہوئی ہے۔

صرف موجودہ حکومت کو ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے والی حکومتوں کو بھی صورتحال کی سنگینی پر قابو پانے کے لیے سخت تگ ودود کرنی پڑی تھی۔اتنی زیادہ مشکلات میں لوگوں کے پاس وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے لئے ہمدردی کے جذبات رکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا تاہم حکومتوں کے لئے لوگوں کے حقوق اور ان کے مفادات کا تحفظ،اور سب سے بڑھ کر ان کی زندگیوں کا تحفظ سب سے پہلی ترجیح ہونی چاہئے۔

وارننگ لائٹس اس وقت بجھ جانی چاہئیں جب انسانی حقوق کی پامالیوں کے اثرات سے حکومتوں کے لئے ایسی مشکلات پیدا ہوں جن سے ملک کا منفی تشخص ابھر کر سامنے آئے۔

2013ء ایک ایسا سال تھا جس کے دوران تقریباً تمام عناصر میں اختلاف رائے اور بالخصوص بنیادی آزادیوں کے متعلق عدم رواداری میں کافی حدتک اضافہ ہوا۔صحافیوں،انسانی حقوق کے محافظین اور سیاسی کارکنوں کا پیچھا کیا گیا۔بعض فرار ہوگئے،بعض قتل کردیئے گئے جبکہ متعدد کو خوف زدہ کرکے خاموش کردیا گیا۔

مذہبی اور مسلکی اقلیتوں نے محفوظ مقامات پر منتقل ہونے کو بہتر سمجھا۔متعدد نے کسی بھی ذریعے سے یہاں سے بچ نکلنے کے لیے بڑے خطرات بھی مول لئے۔سازشی نظریہ گھڑنے والوں کے اس موقف میں کسی حدتک صداقت کا شائبہ نظر آیا کہ دنیا پاکستان سے کس قدر خوفزدہ ہے۔لیکن ملک میں پیدا ہونے والی ہر قسم کی افراتفری کے پیچھے ایسے ہی افواہ سازوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔بہرحال صرف ایک لمحے کے لیے اس بات پر غور کرنا ہمارے لئے نقصان دہ نہیں ہوگا کہ جس ملک میں ہم لوگوں کو محض اس وجہ سے قتل کردیتے ہیں کہ وہ کسی اور مذہب سے تعلق رکھنے والے والدین کے ہاں میں پیدا ہوئے یا اس وجہ سے کہ ان کے نام شیعہ ناموں سے مطابقت رکھتے ہیں تو کیا ہمیں خود کو تباہ کرنے کے لئے کسی دوسرے دشمن کی واقعی ضرورت ہے؟

نجم الدین

ایڈیٹر

اہم نکات

قوانین اور قانون سازی

☆ پارلیمنٹ نے دو درجن کے قریب قوانین بنائے۔ 8 صدارتی آرڈیننسوں کا نفاذ کیا گیا۔

☆ سکیورٹی سے متعلق متعدد قوانین کی منظوری دی گئی۔ صدر مملکت نے تحفظ پاکستان آرڈیننس کے نفاذ کا اعلان کیا۔

☆ صوبوں میں اہم قانون سازی کی گئی۔ سب سے زیادہ قوانین سندھ کی صوبائی اسمبلی نے بنائے۔

☆ چاروں صوبوں نے بلدیاتی اداروں کے لیے قوانین متعارف کروائے لیکن بلدیاتی انتخابات کا انعقاد صرف بلوچستان میں ہو سکا۔

☆ خیبر پختونخوا معلومات کے حق کا قانون وضع کرنے والا پہلا صوبہ بن گیا۔ بعد ازاں پنجاب نے بھی ایسا ہی کیا۔

انصاف کا انتظام وانصرام

☆ عدالتوں میں لاتعداد مقدمات التوا کا شکار تھے۔ سپریم کورٹ میں 20 ہزار مقدمات زیر التوا تھے۔

☆ سپریم کورٹ نے ازخود نوٹس کا استعمال جاری رکھا۔ قانونی ماہرین نے اس سلسلے میں رہنما اصولوں کے فقدان کی نشاندہی کی جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ عدالت نے ازخود نوٹس کے تحت کن مسائل کو ترجیح دی اور کیوں۔

☆ قومی عدالتی پالیسی سازی کمیٹی کے عدالتی افسران کی تعداد میں اضافے کے مطالبے کو بڑی حد تک نظر انداز کیا گیا۔

☆ سلامتی سے متعلقہ قوانین جن کا مقصد دہشت گردی کی روک تھام ہے، کے باعث انفرادی حقوق کے تحفظ کے لئے قانون کی عملداری کی نفی کا خدشہ پیدا ہوا۔

☆ مذہب سے متعلقہ فوجداری قانون کے تحت 68 شہریوں کو گرفتار کیا گیا۔

امن و عامہ کی صورتحال

☆ پولیس نے قتل کے 14,000 سے زائد مقدمات درج کئے۔ 45 خودکش حملوں میں 694 افراد جاں بحق ہوئے۔

☆ پولیس مقابلے کے 357 واقعات منظر عام آئے۔ پولیس مقابلوں میں 503 مشتبہ افراد ہلاک اور 45 زخمی ہوئے۔ 50 پولیس اہلکار جاں بحق اور 99 زخمی ہوئے۔

☆ 31 ڈرون حملوں میں 199 افراد جاں بحق ہوئے۔

☆ 2013 کے دوران پاکستان میں 91 امدادی کارکنان پر حملہ کیا گیا۔

☆ اغواء برائے تاوان کے سینکڑوں واقعات منظر عام پر آئے۔

☆ پنجاب میں زنا بالجبر کے 2,576 مقدمات درج کئے گئے۔

☆ کراچی میں تشدد کے واقعات میں 3,218 افراد جاں بحق ہوئے۔ یہ تعداد 2012 سے 14 فیصد زیادہ ہے۔

☆ 64,000 سے زائد مختلف قسم کا آتشیں اسلحہ، 561 دستی بم اور 27 لاکھ گولیاں ضبط کی گئیں۔ خیبر پختونخوا میں 7 کروڑ 20 لاکھ کلوگرام دھماکہ خیز مواد ضبط کیا گیا۔

جیلیں اور قیدی

☆ جبری گمشدگی کے 90 سے زائد واقعات کمیشن کے نوٹس میں لائے گئے۔ مبینہ گمشدگی کے متاثرین کی 129 مسخ شدہ لاشیں بھی برآمد ہوئیں۔

☆ مختلف جرائم کے تحت کم از کم 227 افراد کو موت کی سزا سنائی گئی۔ پھانسیوں پر پابندی برقرار رہی۔

☆ گنجائش سے زیادہ قیدیوں والی جیلوں میں موجود 64 فیصد قیدیوں کے مقدمات زیر سماعت تھے اور وہ بلا کسی عدالتی فیصلے کے جیل میں بند رہے۔

☆ سینکڑوں پاکستانی اور ہندوستانی ماہی گیر دونوں ممالک کی جیلوں میں قید رہے۔

نقل وحرکت کی آزادی

☆ محرم میں مذہبی جلوسوں کے تحفظ کے لیے خصوصی اقدامات کئے گئے جن میں نقل وحرکت پر پابندی اور چند شہروں میں چند علماء کے داخلے پر پابندی شامل تھی۔

☆ کراچی میں لسانی، فرقہ وارانہ اور سیاسی تشدد کی وجہ سے متعدد علاقے نو گو ایریاز بنے رہے۔

☆ زائرین کی بسیں حملوں کے خطرات کی وجہ سے بلوچستان کے راستے ایران جانے کے لیے صرف سکیورٹی فورسز کے زیر نگرانی قافلوں میں سفر کر سکیں۔

☆ بلوچستان میں اہم شہروں کو ملانے والی شاہراہیں غیر تعمیر شدہ رہیں۔

☆ زیرالتواء لاتعداد پاسپورٹوں کا مسئلہ بالآخر حل ہو گیا اور 2013 میں چار لاکھ پچاس ہزار سے زائد پاسپورٹ جاری کئے گئے۔

فکر وضمیر اور مذہب کی آزادی

☆ 2013 کے پہلے چند ہفتوں میں بلوچستان میں فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات میں 200 سے زائد ہزارہ شیعہ جاں بحق ہوئے۔

☆ 200 سے زائد فرقہ وارانہ حملوں میں 687 افراد جاں بحق ہوئے۔

☆ ٹارگٹڈ حملوں میں 7 احمدی اپنی زندگیوں سے محروم ہو گئے۔

☆ پشاور کے ایک چرچ میں پاکستان کی مسیحی برادری کے خلاف ہونے والے جان لیوا ترین حملے میں 100 سے زائد افراد جاں بحق ہوئے۔

☆ لاہور میں ایک مسیحی شخص پر توہین رسالت کا الزام عائد کیا گیا جس کے بعد مسلمانوں کے ایک گروہ نے مسیحی رہائشی علاقے کے 100 سے زائد گھروں کو نذر آتش کر دیا۔

☆ جن افراد پر مذہب سے متعلقہ جرائم کا الزام عائد کیا گیا ان میں 17 احمدی، 13 مسیحی اور 19 مسلمان شامل تھے۔

☆ بدین میں مشتعل افراد، جن کا دعویٰ تھا کہ مسلمانوں کے قبرستانوں میں غیر مسلموں کو دفن نہیں کیا جا سکتا ، انہوں نے دو ہندوؤں کی نعشوں کو قبروں سے باہر نکال دیا۔

اظہار رائے کی آزادی

- ☆ 2013 میں اپنی فرائض کے انجام دہی کے دوران 11 صحافی جاں بحق اور متعدد زخمی ہوئے۔
- ☆ صحافیوں پر حملوں کا ارتکاب کرنے والوں کو سزا سے استثنیٰ حاصل رہا۔
- ☆ شہری آزادیوں کے حامل ممالک کی عالمی فہرست میں پاکستان 179 ممالک میں سے 159 ویں نمبر پر تھا۔
- ☆ انٹرنیٹ پر پابندیوں میں اضافہ ہوا۔ یوٹیوب کو بحال نہ کیا گیا اور دیگر ویب سائٹس کو پیشگی اطلاع کے بغیر بند کیا گیا۔

اجتماع کی آزادی

- ☆ دہشت گرد حملے اجتماع کی آزادی کے لیے ایک بڑا خطرہ بنے رہے۔ ان حملوں میں نماز اور نماز جنازہ کے اجتماعات کو نشانہ بنایا گیا۔ بم دھماکوں کے نتیجے میں سینکڑوں عبادت گزار جاں بحق ہوئے۔
- ☆ عوامی اجتماعات پر دفعہ 144 جیسی پابندیاں عائد کی جاتی رہیں۔
- ☆ بجلی کی قلت کے خلاف ہونے والے مظاہروں سمیت بہت سے سیاسی، مذہبی، اجتماعات اور احتجاجی مظاہرے قابو سے باہر ہوگئے۔ ان واقعات میں کم از کم دو افراد جاں بحق اور متعدد زخمی ہوئے اور نجی اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچا۔
- ☆ پولیس نے لوگوں کے ہجوم پر قابو پانے سے متعلق اختراعی اصولوں پر خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ مظاہرین کی اشتعال انگیزی کے باعث پیدا ہونے والی بدامنی اور تشدد پر پولیس کا ردعمل ضرورت سے زیادہ اور سخت رہا۔

انجمن سازی کی آزادی

- ☆ انتخابی مہم کے دوران سیاسی قائدین، دفاتر اور اجتماعات پر حملے کئے گئے جن مں اے این پی، ایم کیو ایم اور پی پی پی کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔
- ☆ این جی اوز اور امدادی تنظیموں سے وابستہ کارکنان کو نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں متعدد کارکنان جاں بحق اور زخمی ہوئے جبکہ متعدد کارکنان کو اغواء بھی کیا گیا۔

سیاسی شراکت

- ☆ ایک منتخب حکومت نے اپنی معیاد پوری کی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ پاکستان نے ایک جمہوری عہد

حکومت کے حصول کے حوالے سے ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

☆ الیکشن کے دن سے پہلے تشدد کے کئی واقعات پیش آئے جس سے انتخابی عمل کو نقصان پہنچا۔ لوگوں نے دہشت گردوں کی جانب سے لاحق خطرات کے باوجود عام انتخابات میں شرکت کی۔ 55 فیصد سے کچھ زیادہ ووٹروں نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔

☆ انتخابی فہرست میں خامیاں پائی گئیں اور حکام کو عدلیہ کے احکامات کی بجا آوری اور عوام کے خدشات دور کرنے کے لیے معمول سے زیادہ کام کرنا پڑا۔

☆ ملک کی مجالس قانون ساز میں خواتین کی نشستوں کی شرح کم ہو کر 19.5 فیصد رہ گئی جو کہ 2008 میں 19.9 فیصد تھی۔ 2013 میں عام نشستوں کے لئے انتخاب لڑنے والی خواتین کی شرح 2008 کے مقابلے میں 218 فیصد (192 کے مقابلے میں 419) زیادہ تھی۔

خواتین

☆ 869 خواتین کو غیرت کے نام پر قتل کیا گیا۔

☆ 2013 میں 800 سے زائد خواتین نے خودکشی کی۔

☆ محض 18.3 فیصد خواتین کو ثانوی یا اعلیٰ تعلیم میسر تھی اور ایک عام اندازے کے مطابق ملازمت کرنے والی خواتین کی شرح 28 فیصد تھی۔

☆ کم از کم 56 خواتین کو محض بیٹی کو جنم دینے پر قتل کیا گیا۔

☆ خیبر پختونخوا کی ساٹھ ہزار اہلکاروں پر مشتمل پولیس فورس میں صرف 560 خواتین تھیں۔ پنجاب میں 146 ایس پی افسران میں خواتین کی تعداد 9 جبکہ 474 ڈی ایس پی افسران میں خواتین کی تعداد صرف 35 تھی۔

☆ 2013 کے انتخابات میں خواتین کی ووٹر کے طور پر شرکت میں اضافہ ہوا۔

بچے

☆ پرائمری سکول جانے کی عمر کے ہر 10 بچوں میں سے 3 سکول نہیں جاتے رہے۔

☆ ایک عشرے کے دوران پانچ سال سے کم عمر بچوں میں نشوونما میں رکاوٹ کی شرح 41.6 فیصد سے بڑھ کر 43.7 فیصد ہوگئی۔ پاکستان میں اوسطاً سالانہ آٹھ لاکھ بچے ہلاک ہوئے۔ ان میں سے 35 فیصد بچے ناقص غذائیت کے باعث ہلاک ہوئے۔

☆ 47,099 بچے پولیو ویکسین سے محروم رہے۔ خیبر پختونخوا میں والدین کی ایک بڑی تعداد (24,968) نے بچوں کو پولیو ویکسین پلوانے سے انکار کیا۔

☆ 2013 کے پہلے چھ ماہ کے دوران 1,204 بچے جسمانی تشدد کا نشانہ بنے۔ جن میں 68 فیصد لڑکیاں تھیں۔

☆ تقریباً 1,400 نابالغ جیلوں میں قید تھے۔

☆ ایک کروڑ دس لاکھ سے زائد بچے محنت مزدوری کرتے رہے، ان میں سے نصف بچوں کی عمر دس برس سے کم تھی۔

محنت

☆ پانچ کروڑ نوے لاکھ محنت کشوں میں سے صرف ایک کروڑ انسٹھ لاکھ کو سوشل سکیورٹی تک رسائی حاصل تھی۔

☆ بیروزگار افراد کی تعداد جو کہ 11-2010 میں 34 لاکھ تھی، 2013 میں بڑھ کر 37 لاکھ بیس ہزار ہوگئی۔

☆ بحری جہاز توڑنے کی صنعت میں صرف ایک ماہ کے دوران دس مزدور جاں بحق ہوئے۔

☆ ایک اندازے کے مطابق 20 لاکھ پاکستانی مختلف اقسام کی غلامی میں جکڑے رہے۔

تعلیم

☆ پاکستان نے تعلیم کے لیے جی ڈی پی کا دو فیصد سے کم حصہ مختص کیا۔

☆ پاکستان شرح خواندگی کے لحاظ سے دنیا کے 221 ممالک میں 180 ویں نمبر پر تھا۔ پاکستان شرح خواندگی کے لحاظ سے چین، انڈیا، ایران اور نیپال سے بھی پیچھے تھا۔ پاکستان میں تقریباً 55 لاکھ بچے سکول نہیں جاتے تھے، جس کے باعث پاکستان دنیا کے ان ممالک میں دوسرے نمبر پر تھا جہاں بچوں کی ایک بڑی تعداد سکول نہیں جاتی تھی جبکہ ان ممالک میں نائجیریا سرفہرست تھا۔ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں بھی تیسرے نمبر پر تھا جہاں بالغوں کی ایک بڑی تعداد ناخواندہ تھی۔

☆ پاکستان میں مکتبی تعلیم کے متوقع سالوں کی اوسط صرف 6.8 تھی۔

☆ ایک سروے کے مطابق ملک میں 2,088 فرضی سکول تھے، 1,008 سکولوں پر ناجائز طور پر قبضہ کیا گیا تھا اور 5,827 سکول غیر فعال تھے۔

صحت

☆ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان یقینی طور پر زچہ و بچہ کی صحت اور نومولود بچوں کی ہلاکتوں کے حوالے سے

ایک ہزار سالہ ترقیاتی اہداف کے حصول میں ناکام رہے گا۔

- ☆ 1,127 افراد کے لیے ایک ڈاکٹر، 14,406 افراد کے لیے ایک دندان ساز اور ہسپتالوں میں 1,786 افراد کے لیے ایک بستر تھا۔
- ☆ پاکستان بھر میں پولیو کے 85 تصدیق شدہ واقعات منظر عام پر آئے، ان میں سے 60 واقعات صرف فاٹا میں سامنے آئے۔ پاکستان پولیو سے متاثرہ وہ واحد ملک تھا جہاں 2012 کی نسبت 2013 میں پولیو کے زیادہ واقعات منظر عام پر آئے۔
- ☆ پولیو ٹیموں پر حملوں کے نتیجے میں 20 کارکنان جاں بحق ہوئے۔ ان کی حفاظت پر مامور 9 پولیس اہلکار بھی جاں بحق ہوئے۔
- ☆ خسرے کی وباء پھیلنے سے 300 سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔ سب سے زیادہ متاثر ہونے والا صوبہ پنجاب تھا جہاں خسرے کے 23,477 واقعات منظر عام پر آئے اور 192 اموات واقع ہوئیں۔
- ☆ ڈینگی کے باعث پاکستان بھر میں متعدد افراد ہلاک ہوئے۔ 16,000 افراد میں مرض کی تشخیص ہوئی۔ خیبر پختونخوا ڈینگی سے بری طرح متاثر ہوا جہاں 8,546 افراد میں مرض کی تصدیق ہوئی اور 33 افراد ہلاک ہوئے۔

اقامت کاری

- ☆ پاکستان میں 90 لاکھ گھروں کی کمی تھی۔ مسلح تنازعات اور قدرتی آفات کی وجہ سے بے گھر ہونے والے افراد کی تعداد کے باعث صورتحال مزید بدتر ہوگئی۔
- ☆ سیلاب کے باعث 20,312 گھر تباہ ہوئے۔
- ☆ 33 فیصد پاکستانی ایسے علاقوں میں رہتے تھے جہاں نکاسی آب کا نظام موجود نہیں تھا۔
- ☆ شہری علاقوں میں موجود کچی آبادیوں کے مکین شہری سہولیات کے بغیر رہتے تھے۔
- ☆ غیر معیاری میٹریل سے تعمیر کی گئی عمارات منہدم ہونے سے سینکڑوں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔

ماحولیات

- ☆ ماحولیات کو درپیش سنگین چیلنجوں کے باوجود سیاسی جماعتوں نے 11 مئی کے انتخابات سے پہلے اپنے منشور میں اس مسئلے کو نظرانداز کیا۔ ایک بین الاقوامی تحقیق کے مطابق پاکستان ان تین ممالک میں سے ایک تھا جو موسمی تبدیلیوں سے بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ ایک اور تحقیق کے مطابق پاکستان دنیا کے

ان ممالک میں سے ایک تھا جہاں پانی کی شدید قلت تھی۔ 14-2013 کے بجٹ میں ماحولیاتی تبدیلی کی ڈویژن کے لیے 13-2012 کے 13 کروڑ پچاس لاکھ کے مقابلے میں صرف پانچ کروڑ نوے لاکھ روپے مختص کیے گئے۔

☆ لاہور کوئٹہ اور پشاور دنیا کے دس آلودہ ترین شہروں میں سے شامل تھے۔

☆ ایندھن سے چلنے والے پاور پلانٹ، گاڑیوں کا دھواں اور صنعتوں سے دھوئیں کا اخراج ملک میں فضائی آلودگی کا سب سے بڑا سبب تھے۔ پاکستان میں گرد اور دھویں کی مقدار عالمی اوسط سے دوگنا زیادہ تھی۔

☆ پاکستان میں جنگلات پر محیط علاقہ مایوس کن حد تک کم تھا۔ مارچ میں حکومت کی جانب سے پالیسی میں کی جانے والی معمولی تبدیلی گلگت بلتستان سے لکڑی کی قانونی اور غیر قانونی ترسیل اور لاکھوں درختوں کی کٹائی کا باعث بنی۔

☆ ملک میں ہونے والی 40 فیصد اموات کا سبب پانی سے پیدا ہونے والی بیماریاں تھیں۔

مہاجرین

☆ ملک بھر میں جاری مسلح تنازعات اور قدرتی اور مصنوعی آفات کے باعث دس لاکھ سے زائد پاکستانی بے گھر ہوئے۔

☆ فاٹا، خضدار، ڈیرہ بگٹی، کوہلو، ہنزہ نگر اور کراچی کے علاقوں میں اندرونی نقل مکانی واقع ہوئی۔

☆ ڈھائی لاکھ سے زائد پاکستانی انتہائی نامساعد حالات میں بنگلہ دیش میں پھنسے رہے۔

☆ یو این ایچ سی آر رضاکارانہ وطن واپسی پروگرام کے تحت 31,800 اندراج شدہ افغان مہاجرین افغانستان چلے گئے۔ 16 لاکھ اندراج شدہ اور اتنے ہی غیر اندراج شدہ افغان مہاجرین اب بھی پاکستان میں موجود تھے۔

☆ خیبر پختونخوا میں 10 لاکھ کے قریب اندراج شدہ مہاجرین مقیم تھے۔ 2013 میں ان میں سے صرف 16,250 اپنے وطن واپس گئے۔ یہ گزشتہ چند سالوں میں سب سے کم تعداد ہے۔

1 - قانون کی حکمرانی

قوانین اور قانون سازی

بنیادی حقوق، بشمول رتبے، مواقع، قانون کی نظر میں برابری، سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف اور فکر، اظہار، عقیدہ، ایمان، عبادت اور اجتماع کی آزادیاں، قانون کے مطابق اور اخلاق عامہ کے مفاد میں عائد پابندیوں کے ساتھ مہیا کرنے کی ضمانت دی جائے گی۔ عدلیہ کی آزادی کو مکمل طور پر یقینی بنایا جائے گا۔

آئین پاکستان [تعارف]

قانونی تحفظ اور قانون کے مطابق سلوک، ہر شہری کا بنیادی اور ناقابل تنسیخ حق ہے، چاہے وہ جہاں کہیں بھی ہو، اور ہر اس شخص کا بھی جو عارضی طور پر پاکستان میں مقیم ہو۔

آئین پاکستان [آرٹیکل - 4]

کوئی قانون یا کوئی رسم یا رواج، جسے قانون کی حیثیت حاصل ہو اگر ان حقوق سے متصادم ہے جو اس باب [بنیادی حقوق] کے تحت شہریوں کو حاصل ہیں، تو وہ اس میں پائے جانے والے تضاد کی حد تک منسوخ تصور کیا جائے گا۔

آئین پاکستان [آرٹیکل- 8 (1)]

اگر انسان کو اس بات پر مجبور کرنا مقصود نہیں ہے کہ وہ آخری چارہ کار کے طور پر ظلم اور ناانصافی کے خلاف خود علم بغاوت بلند کرے، تو لازم ہے کہ قانون کی حکمرانی کے ذریعے انسانی حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [ابتدائیہ]

ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر یا آزادانہ طور پر منتخب نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل دفعہ - 21 (1)]

سال 2013 کے دوران پارلیمنٹ نے تقریباً دو درجن قوانین بنائے۔ وسیع تر دہشت گردی اور لاقانونیت کے گمبھیر چیلنجوں کا سامنا کرنے والے ملک کی سلامتی سے متعلق خصوصی قانون سازی شائد غیر متوقع نہیں۔ تاہم ان قوانین کی تیاری کے لئے ہونے والے بحث مباحثہ میں زیادہ تر زور قومی سلامتی کے مسئلے پر رہا۔ بہر حال آئین میں دیئے گئے انسانی حقوق کو مکمل طور پر فراموش نہیں کیا گیا۔ اس حوالے سے پارلیمنٹ کے وہ دو ایکٹ بے حد اہم تھے جن کے تحت دہشت گردی کے خلاف، اینٹی ٹیریرازم ایکٹ مجریہ 1997ء میں ترمیم کی گئی۔ یہ دونوں ایکٹ مارچ کے ایک ہی ہفتہ میں منظور کر لئے گئے۔ مارچ ہی میں اسمبلی نے نیشنل کاؤنٹر ٹیررازم اتھارٹی قائم کرنے کا ایکٹ بھی منظور کر لیا۔

صدر پاکستان نے کئی آرڈیننسوں کا اجرا کیا جن میں زیادہ تر قومی سلامتی اور عام انتخابات کے

انعقاد سے متعلق تھے۔ نومبر میں صدر نے تحفظ پاکستان آرڈیننس جاری کیا۔ اس آرڈیننس کے مندرجات پر سول سوسائٹی کی جانب سے شدید تنقید کی گئی کیوں کہ ان کا نفاز ملزمان کے بنیادی حقوق کی شقوں سے متصادم تھا۔ صدر نے 7 نومبر کو اینٹی ٹیررازم ایکٹ 1997 میں ترمیم کے لئے دو آرڈیننس جاری کئے۔ 2013 میں زیادہ تر بلوں کو وفاقی سطح پر قومی اسمبلی کے ذریعے منظور کرنے کے بعد ایوان بالا یعنی سینٹ میں بھیجا گیا جہاں انہیں منظور کر لیا گیا۔

قانون سازی کے عمل میں ارکان اسمبلی کی بھرپور توجہ کی بدولت معیار میں کافی بہتری ممکن تھی۔ بسا اوقات مسودات قانون پر بھرپور بحث نہ ہو سکی یا بلوں پر دوران بحث منظور کئے گئے نکات پر عمل درآمد کے لئے اتفاق رائے پیدا کرنے کیلئے مناسب کوششیں نہ کی گئیں۔ نئی منتخب حکومت کو بجٹ کی تیاری کا اہم کام بھی درپیش تھا جو بالآخر جولائی میں فنانس ایکٹ کی شکل میں اختتام پذیر ہوا۔ سال 2013ء میں یہ قوانین بنائے گئے:

پارلیمنٹ کے بنائے قوانین

- ☆ The Investigation for Fair Trial Act 2013. مجریہ 20 فروری تاکہ جدید تکنیک اور آلات کی مدد سے ثبوت مہیا کرنے اور قانون کی خلاف ورزی روکنے کیلئے قانون نافذ کرنے والے اداروں اور خفیہ ایجنسیوں کے اختیارات کو باضابطہ بنایا جائے۔
- ☆ The Trade Organization Act 2013. مجریہ 20 فروری تجارتی اداروں کی رجسٹریشن کرنا اور ان کو باقاعدہ بنانا تاکہ تمام تجارتی اداروں کی مناسب نمائندگی ہو سکے۔
- ☆ The Trade Development Authority Act 2013. مجریہ 22 فروری تاکہ مؤثر تجارتی پالیسی وضع کرنے کے لئے ٹریڈ ڈویلپمنٹ اتھارٹی آف پاکستان کا قیام عمل میں لایا جاسکے۔
- ☆ The Pakistan Academy of Letters Act 2013. مجریہ 22 فروری تاکہ پاکستان کی قومی زبانوں اور ان زبانوں کی نگارشات کو فروغ حاصل ہو اور اہل قلم کی فلاح یقینی بنائی جاسکے۔
- ☆ The Provincial Motor Vehicles Act 2013. (ترمیم شدہ) مجریہ 11 مارچ تاکہ بین الاقوامی طور پر مسلّمہ ہولناک اور پرخطر خلاف ورزیوں کو پہلے سے موجود ٹریفک قوانین کی فہرست میں شامل کیا جاسکے۔
- ☆ The Pakistan Coinage Act 2013. (ترمیم شدہ) مجریہ 11 مارچ تاکہ ایک روپے سے کم مالیت کے سکّوں کا استعمال ختم کیا جائے۔
- ☆ The Dar-ul-Madina International University Islamabad Act 2013.

مجریہ 14 مارچ کا مقصد ایک نئی یونیورسٹی کا قیام اور اعلیٰ تعلیم کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو دُور کرنا تھا۔

☆ The South Asian Strategic Stability Institute University Islamabad Act 2013. مجریہ 14 مارچ کا مقصد جنوبی ایشیاء کے تحفظ اور استحکام کے حوالے سے تدریس اور حکمت عملی پر مبنی تحقیقی مکالموں کو فروغ دینے کے لئے ایک نئی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لانا تھا۔

☆ The MY University Islamabad Act 2013. مجریہ 14 مارچ کا مقصد پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کی تدریس کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی کا قیام تھا جو، جدید تحقیقات اور تربیّت پر مبنی سماجی اور قدرتی سائنس کے شعبوں میں تعلیم کو فروغ دے سکے۔

☆ The Maritime Security Agency Act 2013. (ترمیم شدہ) مجریہ 14 مارچ کا مقصد بطور قانون نافذ کرنے والے ایک قومی ادارے کے طور پر پاکستان میری ٹائم سیکورٹی ایجنسی کا قیام تھا۔

☆ The Federal Ombudsmen Institutiional Reforms Act 2013. مجریہ 14 مارچ کا مقصد شکایات کا فی الفور ازالہ کرنا اور محتسب کے فیصلوں کے خلاف نمائندگی کے عمل کی درستگی کرنا تھا۔

☆ The Defence Housing Authority Islamabad Act 2013. مجریہ 16 مارچ تا کہ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی اسلام آباد کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔

☆ The Islamabad Capital Territory Private Educational Institutions (Registration and Regulaion) Act 2013. مجریہ 16 مارچ کا مقصد اسلام آباد دارالحکومت کے علاقہ میں قائم نجی تعلیمی اداروں کی رجسٹریشن اور انکے طریقہ کار کو ضابطہ قانون میں لانا تھا.

☆ The Anti-Terrorism Act 2013. مجریہ 14 مارچ کا مقصد بڑھتی ہوئی دہشتگردی کی روک تھام، مسلح افواج، سول مسلح اداروں، قانون نافذ کرنے والے اداروں، سول اور حکومتی افسران پر حملہ آور دہشت گردوں اور تنصیبات کو نقصان پہنچانے میں ملوث افراد کو سزا دلوانا اور دہشت گردی کے خلاف حصار قائم کرنا تھا۔

☆ The Anti-Terrorism Act 2013. (دوسری ترمیم) مجریہ 22 مارچ کا مقصد دہشت گردی سے متعلق ایکٹ کی بعض شقوں کو مضبوط کرنا، دہشت گردی کے لئے مالی کمک جیسے جرائم کی بیخ

کنی کے لئے قانون میں قوت فراہم کرنا تھا۔

☆ The Shaheed Zulfiqar Ali Bhutto Medical University(PIMS) Islamabad Act 2013. مجریہ 20 مارچ شہید ذوالفقار علی بھٹو میڈیکل یونیورسٹی اسلام آباد کا قیام اور میڈیکل کی معیاری تعلیم دینا مقصود ہے۔

☆ The Election Laws (Amendment) Act 2013. (ترمیم شدہ) مجریہ 20 مارچ کا مقصد یہ تھا کہ امیدوار کو اپنے تجویز کنندہ، توثیق کنندہ یا اپنے نامزد فرد کے ذریعے اپنے نامزدگی کے کاغذات جمع کرانے کی اجازت دینا تھا۔

☆ The National Counter Terrorism Authority Act 2013. مجریہ 22 مارچ مقصد نیشنل کونٹر ٹیررازم اتھارٹی کا قیام عمل میں لانا تھا۔

☆ The Securities and Exchange Commission of Pakistan Act 2013. (ترمیم شدہ) مجریہ 22 مارچ کا مقصد سیکورٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان کی راہ میں حائل مشکلات کا حل کرنا اور کمیشن کے طریقہ کار کو یقینی طور موثر بنانا اور دوام بخشنا تھا۔

☆ The Global Change Impact Studies Centre Act 2013. مجریہ 22 مارچ کا مقصد عالمی موسمی تبدیلیوں کے آب وہوا پر اثرات کے مطالعہ کیلئے ایک مرکز کا قیام تھا تاکہ موسمی تغیّرات کا سائنسی نقطہء نظر سے مطالعہ کیا جا سکے۔

☆ The Abolition of Discretionary Quotas in Housing Societies Act 2013. ایکٹ مجریہ 2 مئی کا مقصد پبلک سیکٹر ہاؤسنگ سکیموں میں صوابدیدی کوٹہ کا خاتمہ کرنا تھا تاکہ الاٹمنٹ کے معاملات منصفانہ، برابری کی سطح پر اور شفاف طریقے سے طے کئے جائیں۔

☆ The Finance Act 2013 مجریہ یکم جولائی کے ذریعے بجٹ تجاویز کی منظوری دینا۔

صدر مملکت کے جانب سے نافذ کئے گئے آرڈیننس

☆ The PMDC Ordinance 2013 مجریہ 14 فروری تاکہ وفاقی حکومت کو پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کونسل کا ایڈمنسٹریٹر تعینات کرنے کا اختیار حاصل ہو۔

☆ The Electoral Laws (Amendment) Ordinance 2013 مجریہ 9 مئی کا مقصد عوامی نمائندگی ایکٹ 1976 اور انتخابی فہرستوں کے ایکٹ 1974 میں ترمیم کرنا تھا۔

☆ The Electoral Laws (Amendment)Ordinance 2013 مجریہ 9 مئی

کے ذریعے انتخابی قوانین میں ترمیم کرکے بیرونی ممالک میں مقیم پاکستانیوں کو ووٹ ڈالنے کی سہولت فراہم کرنا مقصود تھا۔

☆ The Surveying and Mapping Ordinance 2013 مجریہ 20 مئی کا مقصد پاکستان میں نقشہ نویسی کو باضابطہ کرنے کے لئے سروے اور نقشہ نویسی کے معیار مقرر کرنا تھا تاکہ سروے آف پاکستان کو قومی نقشہ نویس ادارے (نیشنل میپنگ آرگنائزیشن) کی حیثیت حاصل ہو۔

☆ The Civil Servants (Amendment)Ordinance 2013 مجریہ 23 مئی کا مقصد مستقل سرکاری ملازمین کو تحلیل شدہ وزارتوں میں مستقل طور پر تعینات کرنا مقصود تھا جہاں وہ آرڈیننس کے اجراء کے وقت کام کر رہے تھے۔

☆ The protection of Pakistan Ordinance 2013 مجریہ 7 نومبر کا مقصد پاکستان کی سلامتی کو لاحق خطرات کا سدباب کرنا تھا۔

☆ The Anti-Terrorism (Amendment) Ordinance 2013 (No.7 of 2013) مجریہ 7 نومبر کا مقصد Anti-Terrorism Act 1997 میں ترمیم کرنا تھا۔

☆ The Anti-Terrorism (Amendment) Ordinance 2013 (No.8 of 2013) مجریہ 7 نومبر کا مقصد Anti-Terrorism Act 1997 میں ترمیم کرنا تھا۔

صوبائی قانون سازوں کے بنائے گئے قوانین:

سال 2013 کے دوران صوبوں میں بھی اہم قانون سازی کی گئی۔ سال رواں میں صوبائی ایکٹوں اور آرڈی نینسوں کی سب سے زیادہ تعداد صوبہ سندھ میں منظور کی گئی۔ صوبہ خیبر پختونخوا اطلاعات تک رسائی کے حق کا بل پاس کرکے سبقت لے گیا۔ صوبہ پنجاب نے بھی اس معاملے پر کچھ پیش رفت کی۔ تمام صوبوں نے مقامی حکومتوں کے قوانین بنائے جبکہ صرف صوبہ بلوچستان میں بلدیاتی انتخابات منعقد کرائے گئے۔

بلوچستان اسمبلی

☆ The Baluchistan Local Government (Amendment) Act 2013 مجریہ 30 اگست تاکہ مقامی حکومتوں کے قوانین کو بروئے کار لاتے ہوئے آئین پاکستان کے مطابق بلدیاتی انتخابات کا انعقاد کیا جا سکے۔

خیبر پختونخوا اسمبلی

☆ The Khyber Pakhtunkhwa Elimination of Custom of Ghag Act 2013 مجریہ 8 جنوری کا مقصد گھاگ کی رسم کا خاتمہ تھا۔ اس رسم کے ذریعے ایک مرد کسی خاتون پر شادی کے لئے زبردستی اپنا حق جتا سکتا یا دعویٰ کر سکتا تھا۔

☆ The Khyber Pakhtunkhwa Civil Servants (Amendment) Act 2013 مجریہ 8 جنوری تاکہ تمام ملازمین کو ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن اور گریچوئیٹی کا حق دیا جائے۔

☆ The Khyber Pakhtunkhwa Press, Newspapers, News Aganeices and Books Registration Act 2013 مجریہ 6 مارچ تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ چھاپہ خانوں، اخبارات اور نیوز ایجنسیوں کے مالکان اپنے ملازمین کو ویج بورڈ ایوارڈ کے مطابق تنخواہیں ادا کرنے کے پابند ہوں۔

☆ The Khyber Pakhtunkhwa Local Government Act 2013 مجریہ 31 اکتوبر تاکہ لوکل گورنمنٹ ادارے کا قیام خیبر پختونخوا میں عمل میں لا کر اس کو چلایا جائے۔

☆ The Khyber Pakhtunkhwa Right to Information Act 2013 مجریہ نومبر تاکہ صوبے میں اطلاعات تک رسائی کے عمل کو یقینی اور شفاف بنایا جائے۔

پنجاب اسمبلی

☆ The Punjab Animal Slaughter Control (Amendment) Act 2013 مجریہ 19 اگست پنجاب اینیمل سلاٹر کنٹرول ایکٹ 1963 میں مزید ترمیم کے لئے۔

☆ The Punjab Local Government Act 2013 مجریہ 21 اگست صوبے میں لوکل گورنمنٹ سسٹم کی درستگی اور تنظیم نو کے لئے۔

☆ The Punjab Police Order Amentment Act 2013 مجریہ 29 اگست سب انسپکٹر عہدے تک ترقی کے واسطے 25% محکمانہ افراد کا کوٹہ مقرر کرنے کے لئے۔

☆ The Punjab Transparency and Right to Information Act 2013 مجریہ 12 دسمبر معلومات تک رسائی اور شفافیت کے لئے۔

سندھ اسمبلی

☆ The Sindh Civil Servants (Amendment) Act 2013 مجریہ 7 فروری

تا کہ پولیس میں کی گئی بے ضابطہ ترقیوں کو تحفظ دیا جائے۔ اس بل کی مخالفت کرنے والوں کا خیال تھا کہ یہ بل سرکاری اہلکاروں کو بے ضابطہ ترقیاں دینے کے لئے لایا گیا تھا۔ اس بل کی حمایت کرنے والے ممبران کے مطابق یہ بل امن وامان برقرار رکھنے کی خاطر گرانقدر خدمات سرانجام دینے والے پولیس افسران کی ترقیوں کے لئے پیش کیا گیا۔

☆ The Sindh Right of Children to Free and Compulsary Education Act 2013 مجریہ 13 فروری تا کہ پانچ سال سے سولہ سال کی عمر تک کے بچوں کو لازمی اور مفت تعلیم دی جا سکے۔

☆ The Sindh Protection of Breast Feeding and Child Nutrition Act 2013 مجریہ 14 فروری تا کہ دودھ بنانے والوں اور تقسیم کاروں کو ماں کا دودھ پلانے کے خلاف پبلسٹی سے روکا جائے اور بوتل کے دودھ کی ترغیب دینے والی اشتہار بازی کرنے سے منع کیا جائے۔

☆ The Sindh Education City Act 2013 مجریہ 14 فروری تا کہ جدید تعلیمی اور صحت کی سہولیات سے مزّین ایجوکیشن سٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔

☆ The Sindh Arms and Ammunition Act 2013 مجریہ 21 فروری کا مقصد تھا کہ غیر قانونی اسلحہ رکھنے کو نا قابل ضمانت جرم قرار دیا جائے اور قید کی مدت بڑھا کر چودہ سال کر دی جائے۔

☆ The Sindh Higher Education Act 2013 مجریہ 21 فروری کا مقصد صوبائی ہائر ایجوکیشن کمیشن کا قیام تھا۔

☆ The Sindh Transplantation of Human Organs and Tissues Act 2013 مجریہ 27 فروری کا اجراء انسانی اعضاء اور ریشوں کو اتارنے، ان کو محفوظ کرنے اور علاج کی خاطر پیوندکاری کرنے سے متعلق قانون سازی کرنا مقصود تھا۔

☆ The Domestic Violance(Prevention & Protection) Act 2013 مجریہ 8 مارچ کے اجرا کا مقصد گھریلو تشدد سے بچاؤ اور تحفظ کے اقدامات کو ادارہ کی شکل دے کر عورتوں، بچوں اور ان حملوں کا ممکنہ شکار ہونے والوں کو گھریلو تشدد سے نجات دلانا تھا۔

☆ The Sindh Witness Protection Act 2013 مجریہ 18 ستمبر تاکہ گواہی دینے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، گواہوں اوران کے اہل خانہ کا تحفظ کیا جائے۔

☆ The Sindh Mental Health Act 2013 مجریہ 19 ستمبر۔

☆ The Sindh Preventioin and Control of Thalassaemia Act 2013 مجریہ 19 ستمبر کا مقصد تھیلیسیمیا کے پھیلاؤ کی روک تھام کرنا تھا۔

☆ The Sindh HIV and AIDS Treatment and Protection Act 2013 مجریہ 20 ستمبر کا مقصد ایڈز سے بچاؤ، علاج، اس سے تحفظ اور اس پر قابو پانے کے لئے کمیشن کا قیام اور ایڈز زدہ افراد کی علاج معالجہ میں مدد کرنا تھا۔

☆ The Sindh Newborn screening Act 2013 مجریہ 23 ستمبر کا مقصد نومولود بچوں کے معائنے کا مستقل نظام وضع کرنا تھا تاکہ ان میں ثقل سماعت جیسے عوارض کا پتہ لگایا جاسکے۔

☆ The Sindh Local Government (Amendment) Act 2013 مجریہ 20 دسمبر۔

صوبائی گورنروں کی جانب سے جاری کردہ آرڈیننس

بلوچستان

☆ The Balochistan Free and Compulsary Education Ordinance 2013 مجریہ 12 مارچ تاکہ سکولوں میں پرائمری اور ثانوی تعلیم کو لازمی اور مفت قرار دیا جائے۔

☆ The Balochistan Service Tribunals (Amendment) Ordinance 2013 مجریہ 3 مئی تاکہ بلوچستان سروس ٹربیونلز ایکٹ 1974 میں ترمیم ہوسکے۔

خیبر پختونخوا

☆ The Khyber Pakhtunkhwa Right to Information Ordinance(RTIO) 2013 مجریہ 13 اگست تاکہ ایک آزاد انفارمیشن کمیشن قائم کیا جائے اور اطلاعات تک رسائی میں رکاوٹ بننے والوں کو دو سال قید کی سزا دی جاسکے۔

☆ The Khyber Pakhtunkhwa Promotion, Protection and Enforcement of Human Rights Ordinance 2013 مجریہ 13 دسمبر تاکہ صوبائی انسانی حقوق کی نظامت کو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی تحقیقات کا اختیار حاصل ہو اور وہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے شکار افراد کی مدد کر سکے۔

☆ The Khyber Pakhtunkhwa Deserving Widows and Special Persons Welfare Foundation Ordinance 2013 مجریہ 17 دسمبر کا مقصد مستحق بیواؤں اور معذور افراد کی مدد کے لئے ایک فلاحی کمیشن قائم کرنا تھا۔

پنجاب

☆ The Punjab Local Government(Amendment) Ordinance 2013 مجریہ 5 نومبر پنجاب لوکل گورنمنٹ ایکٹ 2013 میں ترمیم کرنے کے لئے جاری کیا گیا۔

☆ The Punjab Transparency and Right to Information Ordinance 2013 مجریہ 4 اکتوبر ایک کمیشن قائم کر کے متعلقہ افسران اطلاعات کو مطلوبہ اطلاعات تک خواہشمند افراد کو اطلاعات تک رسائی دینے کا پابند کرنا۔

سندھ

☆ The Sindh HIV/AIDS Control, Treatment and Protection Ordinance 2013 مجریہ 22 مئی کا اجراء صوبے میں ایڈز کے مرض پر قابو پانے اور اس کے علاج معالجے کے لئے کیا گیا۔

☆ The Sindh Mental Health Ordinance 2013 مجریہ 8 مئی کا مقصد سندھ مینٹل ہیلتھ اتھارٹی میں ایک ماہر نفسیات اور ایک خاتون نمائندہ کا اضافہ کر کے اس اتھارٹی میں نوکر شاہی کی بھرمار کا ازالہ کرنا تھا۔

سفارشات

1۔ قوانین کے نفاذ اور عمل درآمد کے لئے حکومت کو چاہیئے کہ فوری اور مؤثر نظام وضع کرے۔

2۔ صوبوں کو چاہیئے کہ قانون سازی کے اختیارات کا بہتر استعمال کریں کیوں کہ آئین میں اٹھارہویں

ترمیم کے بعد صوبوں کو بہت سی وزارتوں کی منتقلی ہو چکی ہے۔

3۔ عوام اور پارلیمان میں رابطے بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔ کم از کم وفاقی اور صوبائی ممبران کی ویب سائٹس پر تفصیلی فہرست کے تازہ ترین مندرجات کی بدولت مکمل ہونے والی قانون سازی اور زیرِ غور مسوّدوں کا پتہ چلنا چاہیئے۔

4۔ ممبران کے پیش کئے گئے پرائیویٹ بلوں خصوصاً خواتین اور مذہبی اقلیتی ارکان کی طرف سے پیش کئے گئے بلوں کو مناسب پذیرائی ملنی چاہیئے۔

عدل وانصاف کا انتظام وانصرام

قانون کا تحفظ اور قانون کے مطابق سلوک، ہر شہری کا چاہے وہ جہاں بھی ہو، ناقابل تنسیخ حق ہے اور ہر اس شخص کا بھی جو فی الوقت پاکستان میں موجود ہے۔ خاص طور پر (الف) کسی شخص کی زندگی، آزادی، جسم، وقار یا جائیداد کے خلاف کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جائے گا جو نقصان دہ ہو۔ سوائے ایسے قدم کے جو قانون کے عین مطابق ہو (ب) کسی شخص کو ایسا کوئی کام سرانجام دینے سے نہیں روکا جائے گا جس کی قانون ممانعت نہیں کرتا اور (ج) کسی شخص کو ایسا کوئی کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، جس کی قانون اجازت نہیں دیتا۔

آئین پاکستان[آرٹیکل- 4 (1)اور(2)]

کسی شخص کو اس کی زندگی یا آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ سوائے قانون کی مطابقت میں۔

آئین پاکستان[آرٹیکل - 9]

تمام افراد قانون کے سامنے مساویانہ حیثیت کے مالک ہیں اور مساویانہ قانونی تحفظ کے حق دار ہیں۔ آئین پاکستان [آرٹیکل 25(1)]

محض جنس کی بنا پر کسی کے خلاف کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ آئین پاکستان[آرٹیکل - 25 (2)]

ریاست سستے اور فوری انصاف کے حصول کو یقینی بنائے گی۔ آئین پاکستان [آرٹیکل 37(اے)]

کسی جائیداد کو جبراً حاصل یا اس پر قبضہ نہیں کیا جائے گا ماسوائے قومی سطح پر کسی مقصد کے لیے اور ماسوائے قانون کی اجازت سے۔ آئین پاکستان[آرٹیکل- (2)24]

تمام انسانوں کے وقار اور ان کے مساویانہ اور ناقابل تنسیخ حقوق کو تسلیم کرنا، دنیا میں امن اور انصاف اور آزادی کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[تعارف]

ہر شخص کو قانون کے روبرو بطور انسان تسلیم کروانے کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل(6)]

ہر شخص قانون کے روبرو مساویانہ حیثیت رکھتا ہے اور بغیر کسی تمیز کے مساویانہ قانونی تحفظ کا حق رکھتا ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل- (3)]

قانون یا آئین کی طرف سے عطا کردہ حقوق کی خلاف ورزی کے خلاف ہر شخص کو بااختیار قومی ٹریبونلز کے ذریعے موثر دادرسی کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل نمبر - 8]

ہر شخص کو اپنے حقوق اور ذمہ داریوں یا اپنے خلاف عائد کیے گئے کسی بھی فوجداری الزام کے تعین کے لیے، ایک خود مختار اور غیر جانبدار ٹربیونل کے ذریعے مکمل مساویانہ حیثیت میں منصفانہ اور کھلی سماعت کا حق حاصل ہے۔
انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 10]

کسی شخص کو یکطرفہ طور پر اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 17 - (2)]

موجودہ اختیاری پروٹوکول [سزائے موت کے خاتمے کے لیے] کی فریق کوئی ریاست اپنی حدود میں کسی شخص کو سزائے موت نہیں دے گی۔
ہر فریق ریاست اپنی حدود اختیار میں موت کی سزا کے خاتمے کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔
دوسرا اختیاری پروٹوکول ICCPR۔[آرٹیکل - 1]

عدالتی نظام کی ہر سطح پر زیر سماعت مقدمات کے انبار انصاف کی فوری فراہمی میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے رہے۔ عدالتی افسروں کی تقرری میں تاخیر بھی عدالتوں کی استعداد کار کو متاثر کرتی رہی۔ ضلع سطح پر عدالتی کارندوں کے عام لوگوں کے ساتھ میل جول سے مقدمات کے فیصلوں میں ہونے والی تاخیر کے دوررس نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

عدالت عظمیٰ کے لئے 2013ء کا سال بھی بہت مصروف رہا۔ جس انداز سے عدلیہ نے زیر سماعت مقدموں کو ترجیح دی اس پر سبھی لوگوں کو اتفاق نہیں تھا۔ سابق چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری دسمبر میں اپنی ریٹائرمنٹ تک میڈیا کی شہ سرخیوں کی زینت بنے رہے۔ وہ اپنی عدالتی مہم جوئی کی وجہ سے شدید تنقید کا نشانہ بھی بنے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ریاست کے دوسرے ستونوں کے معاملات میں دخل انداز ہوتے رہے ہیں۔ 2013ء میں انہوں نے اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کی خبروں پر ازنوٹس لینا جاری رکھا۔ ارکان پارلیمنٹ کو آئین میں دی گئی پارسائی کی متنازعہ حدود پر پورا نہ اترنے پر نا اہل قرار دیا گیا۔ ایک وزیر اعظم کو توہین عدالت کے جرم میں برطرف کرنے کے بعد 2013ء میں اس فیصلے پر تنقید کرنے والوں کو جارحانہ طریقے سے توہین عدالت کے نوٹس تھمائے گئے۔ عدالتوں نے قومی احتساب بیورو (NAB) اور پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی سمیت قومی اداروں میں بہت سی غیر قانونی بھرتیوں کے معاملات نپٹائے۔ عدالت نے سابق وزیر اعظم کے داماد کی ورلڈ بینک میں بطور ایگزیکٹوڈائریکٹر تعیناتی کا معاملہ بھی اٹھایا۔ اسی طرح عدالت نے پیٹرولیم مصنوعات کی گرانی اور ملک بھر میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ کا بھی ازخود نوٹس لیا۔ سپریم کورٹ نے نیشنل پولیس فاؤنڈیشن (NPF) اور ایمپلائیز اولڈ ایج بینیفٹس انسٹیٹیوشن (EOBI) اور نیشنل انشورنس کارپوریشن (NIC) میں ہونے والے گھپلوں کے معاملات بھی نپٹائے۔

جب ایک ہجوم لاہور کی جوزف کالونی کے رہائشی کے توہین رسالت کے مبینہ ارتکاب پر اس مسیحی بستی پر چڑھ دوڑا اور اسے جلا کر خاکستر کر دیا تو سپریم کورٹ نے اس واقعے کا ازخود نوٹس لیا۔ پولیس جو اس

خدشہ سے پیشگی آگاہ تھی دو سو گھروں کی اس بستی پر حملے کو روکنے اور اسے جلنے سے بچانے میں ناکام ہو گئی۔

عدالت عظمیٰ نے یہ فیصلہ بھی دیا کہ اعلیٰ عدالتوں میں پانچ برس تک فرائض انجام دینے والے جج صاحبان اسی پنشن کی مراعات سے مستفید ہوں گے۔

حکومت نے سابق فوجی سربراہ ریٹائرڈ جنرل پرویز مشرف پر آئین کے آرٹیکل 6 کے تحت بغاوت کا مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان میں ایک سابق فوجی حاکم پر غداری کے پہلے مقدمہ کے لئے ایک خصوصی عدالت قائم کی گئی۔

سپریم کورٹ کے مقدمات

اخباری اطلاعات کے مطابق اکتوبر تک 20,000 مقدمات عدالت عظمیٰ میں زیر التوا تھے۔ یکم ستمبر 2012ء سے 7 ستمبر 2013ء تک سپریم کورٹ کے انسانی حقوق کے سیل میں 45,040 شکایات درج کرائی گئیں۔ بعض قانونی ماہرین کی رائے کے مطابق سپریم کورٹ کے ازخود نوٹس، اس زیر التوا مقدمات کے انبار میں اضافہ کا باعث بنے۔ ریٹائرڈ جسٹس طارق محمود نے تجویز دی کہ مقدمات کے اس انبار کو نپٹانے کے لئے یہ مقدمات سپریم کورٹ کے تمام بنچوں میں برابر تقسیم کر دیئے جائیں۔ سپریم کورٹ کی اسلام آباد رجسٹری میں 8,282 نئے مقدمات درج کئے گئے جبکہ 7,832 مقدمات کے فیصلے کئے گئے۔ لاہور رجسٹری میں 6,946 نئے مقدمات کا اندراج ہوا اور 8,348 مقدمات پر فیصلے کئے گئے۔ کراچی رجسٹری میں 1,132 نئے مقدمات درج ہوئے جبکہ 972 مقدمات پر فیصلے سنائے گئے۔ پشاور رجسٹری میں 1,299 نئے مقدمات کا اندراج ہوا جبکہ 1,314 مقدمات فیصلوں پر منتج ہوئے۔ بلوچستان رجسٹری میں 438 نئے مقدمات درج ہوئے جبکہ 470 مقدمات میں فیصلے دیئے گئے۔

قومی جوڈیشل کمیٹی (پالیسی ساز) نے حکومت سے باقاعدہ درخواست کی کہ عدالتی ڈھانچے کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لئے عدالتی افسروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ صرف حکومت پنجاب نے لاہور ہائی کورٹ کے مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے 317 ایڈیشنل ڈسٹرکٹ ججوں اور 696 سول ججوں کی تعیناتی کی اور ان تعیناتیوں پر اٹھنے والے اضافی اخراجات کے لئے ایک ارب روپے کی رقم مختص کی۔

شیخ زید ہسپتال اور افروز کیمیکلز کا مقدمہ

جب سپریم کورٹ نے شیخ زید ہسپتال کے مقدمہ کی سماعت شروع کی تو پنجاب حکومت کے قائمقام سیکرٹری صحت بابر حیات تارڑ نے عدالت کو یقین دلایا کہ ہسپتال کی خود مختار حیثیت برقرار رکھی جائے گی۔

انہوں نے اس بات کا اعادہ کیا کہ شیخ زید بن سلطان النہیان ٹرسٹ کے ممبروں کے بورڈ کی دوبارہ تشکیل کیلئے صوبائی حکومت نے وفاقی حکومت کو ریفرنس ارسال کیا ہے۔ محکمہ صحت کے عہدے دار کی طرف سے معاملہ کو جلد حل کرنے کی یقین دہانی پر عدالت نے ادارے کے معاملات کی دیکھ بھال کے لئے عبوری کمیٹی تشکیل نہ کی۔

پنجاب انسٹیٹیوٹ آف کارڈیالوجی (PIC) میں غیر معیاری ادویات کے استعمال سے ہونے والی 90 سے زائد ہلاکتوں کے مقدمہ میں دواساز ادارے کے وکیل نے ادارے کے خلاف کریمنل چارجز واپس لینے کی شرط پر متوفی کے لواحقین کو چار لاکھ روپے کے حساب سے معاوضہ ادا کرنے کی پیشکش کی۔ عدالت نے وکیل کو اپنے موکلان سے مشورہ کر کے جلد از جلد معاوضہ دینے کا طریقہ کار وضع کرنے کے لئے تین دن کی مہلت دی اور مقدمہ اگلی سماعت تک ملتوی کر دیا۔

قومی پولیس فاؤنڈیشن کی اراضی کا مقدمہ

سپریم کورٹ نے 2011ء کی ایک اخباری رپورٹ پر از خود نوٹس لیا جس میں نیشنل پولیس فاؤنڈیشن (NPF) کے چھ ارب روپے کے گھپلے میں قومی اسمبلی کا ایک رکن ملوث تھا۔ میڈیا میں سیکرٹری داخلہ کو بھیجی گئی نیشنل پولیس فاؤنڈیشن کی رپورٹ کا تذکرہ کیا گیا جس میں الزام تھا کہ ایم۔ این۔ اے انجم عقیل خان نے نیشنل پولیس فاؤنڈیشن کے افسران کی ملی بھگت سے اسلام آباد میں نیشنل پولیس فاؤنڈیشن کیلئے اراضی کے حصول میں چھ ارب روپے کا گھپلا کیا تھا۔

سپریم کورٹ نے پلاٹوں کی الاٹمنٹ میں سنگین بے قاعدگیوں اور نیشنل پولیس فاؤنڈیشن کی بدانتظامی کا سراغ لگایا۔ عدالت نے نیشنل پولیس فاؤنڈیشن کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی انجم عقیل خان کے ساتھ ملی بھگت سے خریدی گئی اراضی میں بے ضابطگیوں اور غیر قانونی اقدامات کو رشوت ستانی اور کرپشن کی بد ترین مثال قرار دیا۔ اکتوبر کے اواخر میں عدالت عظمٰی نے نیب چیئرمین کو انجم عقیل خان اور دیگر ملزمان کے خلاف کارروائی شروع کرنے اور نوے دن کے اندر رپورٹ پیش کرنے کا حکم دیا۔

عمران خان کا توہین عدالت کا مقدمہ

سپریم کورٹ آف پاکستان نے پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان کو عدالت کا تمسخر اڑانے اور اسے رسوا کرنے کے الزام میں توہین عدالت کا نوٹس جاری کیا۔ عمران خان نے عدلیہ کے اقدامات کو شرمناک قرار دیا تھا۔ اپنے بیس صفحات پر مبنی بیان میں عمران خان نے عدالت کو بتایا کہ انہیں عدلیہ کی آزادی اور اس کے وقار کا بے حد احترام ہے۔ عدالت نے پی ایل ڈی 2013 ایس سی 413 (ڈاکٹر طاہر

القادری بنام فیڈریشن آف پاکستان) سمیت فیصلوں کا حوالہ دیتے ہوئے آر بنام میٹروپولیٹن پولیس کمشنر 1968 میں لارڈ ڈیننگ کے دلائل کا حوالہ دیا جن میں انہوں نے کہا تھا: 'ہم توہین عدالت کے معاملے کو اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے استعمال نہیں کریں گے۔ عدالتی وقار یقیناً اپنی بنیاد پر قائم رہے گا۔ ہم اسے ان لوگوں کو دبانے کے لئے استعمال نہیں کریں گے جو ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ نہ ہم تنقید سے ڈرتے ہیں نہ اس کا برا مناتے ہیں۔ آزادئ اظہار کے علاوہ بھی بہت سے امور خطرات کی زد پر ہیں''۔

معافی تلافی کے اصولوں کی روشنی میں عدالت نے یہ مقدمہ خارج کر دیا اور توہین عدالت کے مرتکب کو معافی بھی نہیں مانگنی پڑی۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اگر مقدمہ کی تشہیر اور وقت کا ضیاع مقصود تھا تو یہ نوٹس جاری ہی کیوں کیا گیا۔

جعلی ڈگری کے مزید مقدمات

2013ء میں سپریم کورٹ نے جعلی تعلیمی اسناد رکھنے والے ارکان پارلیمنٹ کے خلاف یلغار جاری رکھی۔ اگرچہ ارکان پارلیمنٹ کے گریجویٹ ہونے کی شرط ختم ہو چکی تھی، پھر بھی جنہوں نے جعلی ڈگریوں کے ساتھ گزشتہ انتخابات لڑے وہ آئین کی شق 62 اور 63 میں دیئے گئے صادق اور امین کے مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اترتے تھے۔ یہ شقیں امیدوار کی ذاتی اخلاقیات کا اندازہ لگانے کے ساتھ ساتھ اسلام کے بارے ان کے واجبی علم کی جانب بھی توجہ مبذول کراتی ہیں۔

ثمینہ خاور حیات 2008ء کے منعقدہ الیکشن کے نتیجہ میں خواتین کی مخصوص نشست پر صوبائی اسمبلی کی رکن بنیں۔ 3 اپریل 2013ء کو ان کی ڈگری کے جعلی ہونے کی تصدیق کے بعد سپریم کورٹ نے انہیں نااہل قرار دے دیا۔ ثمینہ نے ڈگری کے جعلی ہونے سے انکار تو نہ کیا مگر یہ گلہ ضرور کیا کہ کسی نے جعلی ڈگری کی نقل شرارتاً میرے کاغذات نامزدگی کے ساتھ نتھی کر دی تھی۔ ثمینہ حیات 2013ء کے الیکشن میں خواتین کی سیٹ پر دوبارہ منتخب ہوئیں۔ سپریم کورٹ نے 4 جون 2013 کو یہ معاملہ اٹھایا اور رولنگ دی کہ ثمینہ اہلیت کے معیار پر پورا نہیں اترتیں۔ عدالت نے اپنے سابقہ فیصلے میں اللہ ڈینو بھائیو بنام الیکشن کمیشن آف پاکستان کا حوالہ دیتے ہوئے قرار دیا کہ جو آئین کی دفعہ 62-1- کے تحت ایک دفعہ نااہل ہو گیا، وہ نااہلی آسیب کی طرح ہمیشہ اس کے تعاقب میں رہے گی۔ ثمینہ کی نااہلی کا نوٹس جاری ہو گیا اور عدالت نے خواتین نشست پر ان کے انتخاب کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

راجہ عظیم کا مقدمہ

سپریم کورٹ نے وزیر اعظم راجہ پرویز اشرف کے داماد راجہ عظیم الحق کی ورلڈ بینک میں بطور ایگزیکٹو ڈائریکٹر تقرری کا ازخود نوٹس لیا۔ راجہ پرویز اشرف کے بارے میں کہا گیا تھا کہ انہوں نے اس تقرری کیلئے اپنے صوابدیدی اختیارات کا استعمال کیا تھا۔ مارچ 2013ء میں قومی اسمبلی کی مدت ختم ہونے پر راجہ پرویز اشرف کی وزارت عظمیٰ کا عہد ختم ہو گیا۔ راجہ عظیم الحق نے 6 جون 2013ء کو عدالت میں پیش ہو کر اپنا بیان جمع کرایا جس میں انہوں نے بتایا کہ اپنی جواں عمری اور اپنے کیریئر کے مستقبل کے پیش نظر وہ کسی تنازع میں الجھنا نہیں چاہتے اور نہ ہی پاکستان کے لئے کوئی مشکل پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اپنا استعفیٰ ورلڈ بینک کو بھجوا دیا ہے۔ عدالت نے راجہ عظیم کو استعفے کی نقل جمع کرانے کی ہدایت کرتے ہوئے مقدمے کی سماعت ملتوی کر دی۔

ججوں کیلئے پنشن کی مراعات

سپریم کورٹ نے اعلیٰ عدالتوں کے ریٹائر ہونے والے ججوں کی پنشن کی مراعات کا مقدمہ بھی نپٹایا۔ پانچ رکنی بینچ نے متفقہ فیصلہ دیا کہ پانچ سال سے زائد عرصہ خدمات انجام دینے والے جج پنشن کی مراعات کے اہل ہوں گے۔ بینچ نے دو کے مقابلے میں تین ججوں کی رائے سے فیصلہ دیا کہ اس فیصلے کا اطلاق آئندہ سے ہو گا تاہم جو ریٹائرڈ جج ان مراعات سے پہلے سے ہی مستفید ہو رہے ہیں ان سے یہ مراعات واپس نہیں لی جائیں گی۔

نیب چیئرمین کی تعیناتی

حزب اختلاف کے لیڈر چوہدری نثار علی خان نے سپریم کورٹ میں درخواست کے ذریعے قومی احتساب بیورو (NAB) کے چیئرمین کی تعیناتی کو چیلنج کیا۔ عدالت نے شاہد اورکزئی اور دوسرے بنام حکومت بذریعہ سیکرٹری وزارت قانون اور (PLD2011SC365) میں اپنے فیصلے کا حوالہ دیتے ہوئے قرار دیا کہ مشاورت موثر، بامعنی اور بامقصد ہونی چاہئے تاکہ من مانی اور بے ایمانی کا امکان باقی نہ رہے۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ مشاورت کی پہلی ترجیح اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ کورٹ نے فیصلہ دیا کہ چیئرمین نیب کی تقرری کے بارے میں مشاورت قومی احتساب آرڈیننس 1999 کی شق 6 اور سپریم کورٹ کے وضع کئے گئے اصولوں کے مطابق نہیں تھی اس لئے عدالت عظمیٰ نے چیئرمین نیب کی تقرری کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے فی الفور منسوخ کر دیا۔

جوزف کالونی میں تشدد

لاہور میں بادامی باغ کے نواح میں جوزف کالونی کے نام سے مسیحیوں کی آبادی کے ایک شخص پر توہین رسالتؐ کے ارتکاب کا الزام لگنے پر ایک مشتعل ہجوم نے اس مسیحی بستی پر حملہ کر دیا۔ مکانوں کو آگ لگا کر گھریلو اشیا لوٹ لی گئیں۔ پولیس نے عدالت میں اپنے بیان میں کہا کہ وہ معاملے کی نزاکت کا اندازہ نہ لگا سکی، تاہم احتیاطی تدبیر کے طور پر بستی کو خالی کرالیا گیا تھا۔ جب تشدد پر آمادہ ہجوم پولیس پر جھپٹا تو پولیس والوں کو جانیں بچانے کیلئے قریبی گوداموں میں پناہ لینی پڑی۔ جان بچانے میں مصروف پولیس کے فرار کے بعد مشتعل ہجوم کو تباہی پھیلانے کا موقع مل گیا۔ عدالت نے اپنے ریمارکس میں اس حملہ کو آئین کے آرٹیکل 9 اور 14 کے تحت دیئے گئے انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیا۔

لاپتہ افراد کا مقدمہ

سپریم کورٹ نے مئی میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی طرف سے 2007ء میں جبری گمشدگی کے شکار متعدد افراد کی بازیابی کے حوالے سے دائر کرائے گئے مقدمہ کو نمٹایا۔ سات سال کے دوران عدالتی سماعتوں اور پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی مرتب شدہ فہرست میں سے چند افراد کی سرکاری ایجنسیوں کی طرف سے غیر تسلیم شدہ حراست سے بازیابی اور مقدمہ کے نتیجہ خیز ہونے کے باوجود مجرموں کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی گئی۔ 18 مئی کو پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی آئینی درخواست نپٹاتے ہوئے سپریم کورٹ نے اپنے مختصر حکم کے ذریعے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کو ہدایت کی کہ وہ لاپتہ افراد کی بازیابی کے لئے حکومت کی جانب سے قائم کئے گئے کمیشن سے رابطہ کرے۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کو گلہ ہے کہ عدالت کے مختصر حکمنامہ میں اس کی درخواست میں درج مشکلات کا ازالہ نہیں کیا گیا اس لئے اس نے عدالت میں فیصلے پر نظر ثانی کی درخوات دائر کر دی جس میں استدعا کی گئی کہ آئین کے آرٹیکل 184(3) کے تحت عدالت کو تفویض کردہ آئینی اختیارات کا استعمال کوئی ایسا کمیشن نہیں کر سکتا جو غیر عدالتی افراد پر مشتمل ہو۔ خاص طور پر جب معاملہ عوامی اہمیت اختیار کر چکا ہو اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہوں تو وہ معاملہ عدالت عظمیٰ کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے زور دیا کہ سپریم کورٹ کو فراہم کی گئی فہرست میں سے 47 افراد ابھی تک لاپتہ ہیں اور ان کے اہل خانہ کو حکومت کے قائم کئے گئے کمیشن تک رسائی نہیں دی گئی۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے یہ بھی بتایا کہ سپریم کورٹ میں گذشتہ چھ سال میں سماعتوں

کے دوران کمیشن کی جانب سے لاپتہ افراد کی فہرست میں سے کئی لوگ عدالت میں پیش ہوئے۔انہوں نے اپنی جبری گمشدگی اور حراست کا سرکاری خفیہ ایجنسیوں پر الزام لگایا۔کمشن نے مزید بتایا کہ بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں کے اہم معاملے پر سپریم کورٹ کا تفصیلی فیصلہ ابھی جاری نہیں ہوا۔ یہ معاملہ چھ سال عدالت میں زیر سماعت رہا اور اس دوران کئی بیانات قلمبند ہوئے جن میں جبری گمشدگیوں کے مرتکب افراد کی نشاندہی کی گئی۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے اپنی درخواست میں جبری گمشدگی کے بعد بازیاب ہونے والوں کو معاوضہ دینے کی استدعا کی تھی مگر عدالت کے جاری کئے گئے فیصلے میں بازیاب ہونے والے افراد کو معاوضہ دینے کا کوئی ذکر نہ تھا۔

حراست اور گمشدگی

عدالت میں 150 سے زائد افراد کی حبس بیجا کی درخواستوں کی سماعت کے دوران ستمبر میں پشاور ہائی کورٹ نے سیکورٹی اداروں کو ہدیت کی کہ غیر قانونی طور پر گرفتار افراد کو یا تو قانونی حراستی مراکز میں رکھا جائے یا انہیں آزاد کیا جائے۔ ہائی کورٹ نے اظہار خیال کیا کہ آرمی ایکٹ کے تحت غیر قانونی حراست ایک جرم ہے اور ایسے مقدمات سول عدالتوں میں چلائے جا سکتے ہیں۔جج 150 سے زائد افراد کی جبری گمشدگی کے خلاف دی گئی حبس بے جا کی درخواستوں کی سماعت کر رہے تھے۔

مقدمے کی سماعت کرنے والے بینچ میں صوبائی چیف جسٹس بھی شامل تھے بنچ نے گمشدہ افراد کے بارے میں وہ رپورٹ مسترد کر دی جس میں وزارت نے موقف اختیار کیا تھا کہ لاپتہ افراد کے بارے میں اسے کچھ علم نہیں۔اس سے ایک روز قبل بنچ نے تقریباً ڈھائی سو گمشدہ افراد کے مقدمات میں اسی قسم کی ایک رپورٹ مسترد کر دی تھی۔

عدالت کا مشاہدہ تھا کہ یہ دلیل ناقابل قبول ہے کیونکہ ایک شخص نے، جسے غیر قانونی تحویل میں رکھنے کے بعد رہا کیا گیا تھا بیان دیا کہ ایک دن قبل اسے اٹھا کر خفیہ والوں کی غیر قانونی حراست میں رکھا گیا۔عدالت نے نشاندہی کی کہ آئین کے آرٹیکل 10 کے مطابق گرفتاری کے چوبیس گھنٹوں کے اندر ملزم کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جانا چاہئے ورنہ یہ گرفتاری غیر قانونی حراست تصور کی جائے گی۔

مذہب سے تعلق رکھنے والے جرائم

تعزیرات پاکستان کے باب 15 کے تحت 68 ملزمان کے خلاف مذہب سے متعلق جرائم کے مقدمات درج کئے گئے۔ان میں سے 14 ملزمان کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295-C کے تحت

مقدمات درج ہوئے۔اس دفعہ کے تحت جرم ثابت ہونے پر موت کی سزا ہو سکتی ہے۔تعزیرات پاکستان کے باب 15 کے تحت جرائم کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

نمبر شمار	دفعہ	جرم	زیادہ سے زیادہ سزا
1	295	عبادت گاہوں کی بے حرمتی	دو سال قید یا جرمانہ یا دونوں
2	A-295	مذہبی احساسات کو مجروح کرنے والی بدنیتی پر مبنی کارروائیاں	دو سال قید یا جرمانہ یا دونوں
3	B-295	قرآنی اوراق کی بے حرمتی	صرف ایک سزا یعنی عمر قید
4	C-295	نبی کریمؐ کی ذات کے بارے میں توہین آمیز کلمات کی ادائیگی	لازمی سزائے موت
5	296	مذہبی اجتماع میں ہنگامہ آرائی کرنا	ایک سال قید یا جرمانہ یا دونوں
6	297	قبرستانوں میں مداخلت بے جا	ایک سال قید یا جرمانہ یا دونوں
7	298	لفظوں یا اشاروں کے ذریعے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا	ایک سال قید یا جرمانہ یا دونوں
8	A-298	مذہبی شخصیات کے بارے میں توہین آمیز کلمات ادا کرنا	تین سال قید یا جرمانہ یا دونوں
9	B-298	مذہبی شخصیات اور مقامات کے لئے مخصوص القابات کا غلط استعمال کرنا	تین سال قید اور جرمانہ
10	C-298	احمدیوں کی طرف سے اپنے عقیدے کی اشاعت اور تبلیغ	تین سال قید اور جرمانہ

مسلمان

2013ء کے دوران مذہب سے متعلق 19 واقعات سامنے آئے جن میں 24 مسلمان ملوث تھے۔ پانچ افراد پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295 سی کے تحت توہین رسالت کے مقدمات درج کئے گئے۔ان میں سے دو افراد کی ذہنی حالت درست نہیں تھی۔ایک پرائیویٹ سکول کی خاتون پرنسپل کے خلاف 295C کے تحت مقدمہ درج ہوا۔ایک ملزم دفعہ 295C سے تو بری ہو گیا مگر دفعہ 295A کے تحت اسے دس سال قید اور دو لاکھ روپے جرمانے کی سزائیں دی گئیں۔ایک اور ملزم پر دفعہ 295A اور 295B کے تحت مقدمات درج ہوئے۔ان مقدمات میں اسے عمر قید کی سزا دی گئی۔

فروری میں جنوبی پنجاب کے ضلع ملتان میں اس وقت امریکہ میں پاکستان کی سابقہ سفیر شیری رحمان کے خلاف توہین رسالت کا ارتکاب کرنے کا مقدمہ درج ہوا۔ ملتان کے ایک شہری نے الزام لگایا کہ نومبر 2010ء میں توہین رسالت کے قانون پر ایک ٹیلیویژن پروگرام میں بات کرتے ہوئے شیری رحمان نے توہین رسالت کا ارتکاب کیا۔ جب پولیس نے یہ مقدمہ درج نہ کیا تو درخواست گزار پہلے نچلی عدالت

گیا۔ وہاں سے منفی جواب پر اس نے لاہور ہائی کورٹ سے رجوع کیا۔ لیکن ہائی کورٹ نے بھی پولیس کو مقدمہ درج کرنے کی ہدایت نہ کی۔ جس پر وہ سپریم کورٹ گیا۔ جنوری میں سپریم کورٹ کے بینچ نے ملتان پولیس کو ہدایت کی کہ قانون کے مطابق کارروائی کی جائے۔

دسمبر کے اواخر میں PIA کے ایک سینئر پائلٹ نے خود کو انتہا پسند عناصر سے بچنے کے لئے اس وقت چھٹی پر جانے میں عافیت جانی جب اس پر کلمہ طیبہ، کلمہ شہادت اور پیغمبر اسلام کے بارے میں نازیبا کلمات ادا کرنے کا الزام لگایا گیا۔ (دیکھئے آزادئ اظہار، ضمیر اور مذہب کا باب)

نمبرشمار	نام	ضلع یا شہر	تعزیرات کی دفعہ	الزام	کیفیت
1	چار افراد جن کے نام میڈیا رپورٹ میں نہیں دیئے گئے	واربرٹن	B-295	مبیّنہ طور پر قرآن مجید کا نسخہ جلایا گیا	گرفتار ہونے والوں میں ایک شخص مدرسہ کا استاد تھا 8-1-2013ء
2	نسیم	بھکر	C-295	ایک مذہبی اجتماع میں تقریر کے دوران توہین رسالت کا الزام	گرفتاری کی تاریخ 27-1-2013ء
3	میڈیا رپورٹ میں درج ایک شخص جس کا نام نہیں دیا گیا	دادو	B-295	قرآن پاک کا نسخہ جلانے کا الزام	
4	عمر فاروق	جوہرآباد	B-295	قرآن پاک کا نسخہ جلانے کا الزام	10-3-2013ء کو گرفتار کیا گیا
5	پروفیسر جنید حفیظ	ملتان	C-295		گرفتار کیا گیا
6	غلام حسین	لاہور	B-295	قرآن کے اوراق جلانے کا الزام	مارچ 2013ء میں گرفتار کیا گیا، ذہنی حالت درست نہ ہونے کی اطلاع
7	سعد حماد	سیالکوٹ	B-295	قرآن پاک کا نسخہ جلانے کا الزام	مارچ 2013ء میں گرفتار کیا گیا، ذہنی حالت درست نہ ہونے کی اطلاع
8	یٰسین	لاہور	B-295	قرآن پاک کی بے حرمتی	اپریل 2013ء میں گرفتار کیا گیا
9	میڈیا رپورٹ میں شناخت نہ ہونے والے تین اشخاص	سکھیکی/ننکانہ صاحب	B-295	قرآن پاک کا نسخہ جلانے کا الزام	گرفتار کرلیا گیا
10	افضل بٹ	شیخوپورہ	B-295	قرآنی اوراق پر انسانی خاکے بنانے کا الزام	جولائی 2013ء میں گرفتار کیا گیا

11	ملک شفیق	پاکپتن	C-295		گرفتار کرلیا گیا۔ ملزم ایک پیش امام تھا
12	سلمیٰ فاطمہ تنویر	لاہور	C-295	نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور نبی کریمؐ کے بارے میں توہین آمیز مواد تقسیم کیا	2-9-2013 ء کو گرفتار کی گئی. ملزمہ ایک نجی سکول کی پرنسپل تھی
13	نامعلوم	اوکاڑہ	B-295		2-9-2013ءکوگرفتارکیاگیا۔ ذہنی حالت درست نہیں
14	نامعلوم	اسلام آباد	B-295	قرآن پاک کے اوراق جلانے کا الزام	24-9-2013ءکوگرفتارکیا گیا
15	شیری رحمان	کراچی		نومبر 2010 ء میں توہین رسالت کے قانون کے موضوع پر ایک ٹی وی شو کے دوران توہین رسالتؐ کے ارتکاب کا الزام	17-1-2013ء
16	ثاقب	گوجرانوالہ		مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر توہین آمیز کلمات ادا کرنے کا الزام	20-11-2013ءکوگرفتار کیا گیا
17	غلام حیدر	بہاولپور		قرآنی آیات والا پوسٹر پھاڑنے کا الزام	8-6-2013ءکوگرفتارکیا گیا
18	رضا کھرل	ٹوبہ ٹیک سنگھ	295-A 298-A	فیس بک پر توہین آمیز مواد ڈالنے کا الزام	19-11-2013ءکوگرفتار کیا گیا
19	اریج سجاد	لاہور	295-C	توہین رسالتؐ کے ارتکاب کا الزام	14-12-2013ءکو مقدمہ درج ہوا

سزائیں اور بریّت

نمبر شمار	نام	ضلع یا شہر	تعزیرات کی دفعہ	الزام	کیفیت
1	غلام علی اصغر	چکوال/تلہ گنگ	295-A 295-C	پنجابی زبان میں ایک حدیث کو غلط طور پر بیان کرنا	دفعہ C-295 کے الزام سے بریت، دفعہ A-295 کے تحت دس سال قید اور دو لاکھ روپے جرمانہ
2	جلال چانڈیو	حیدرآباد	295-A 295-B	قرآن پاک کا نسخہ جلانا	ارتکاب جرم کے 12 سال بعد فرد جرم لگنے پر عمر قید کی سزا

2013ء کے دوران پاکستان میں احمدی فرقہ کو مذہبی بنیادوں پر نو مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مقدمات 30 احمدیوں کے خلاف قائم کئے گئے۔ ان میں سے 23 افراد کو گرفتار کیا گیا۔ ان میں سے ایک کے

خلاف پی پی سی کی دفعہ 295 سی کے تحت مقدمہ درج کیا گیا۔ایک آدمی کے خلاف دو علیحدہ علیحدہ مقدمات قائم کئے گئے۔

نمبر شمار	نام	ضلع یا شہر	تعزیرات کی دفعہ	الزام	کیفیت
1	معید اعجاز، عصمت اللہ، رضا اللہ، غلام اللہ	لاہور	298C 295B,	مبیّنہ طور پر توہین رسالت کا مواد چھاپا	7-1-2013ء کو گرفتار کئے گئے
2	عاطف احمد	لاہور	298B	احمدیت سے متعلق مواد تقسیم کرنے کا الزام	16 جنوری 2013ء کو گرفتار کیا گیا
3	عصمت اللہ، الطاف شاہ	لاہور	298C295B,	جلد ساز الطاف شاہ احمدی نہیں مگر اس کو عصمت اللہ کی احمدیت سے متعلق مطبوعات کی جلد بندی کرنے پر گرفتار کیا گیا	24-2-2013ء کو گرفتار کئے گئے
4	خالد اسحاق، طاہر احمد، فیصل احمد، اظہر شریف، عبدالسمیع، طاہر مہدی	لاہور	298C295B,	قرآن پاک کی حکم عدولی اور توہین آمیز مواد کی تقسیم	ان میں سے دو افراد گرفتار کئے گئے
5	خواجہ ارشاد، نصیر قریشی، نعیم احمد خان، عبدالرحیم، عطا محمد، احمد محمود، ثاقب محمود، نعمان ورک	لاہور	295B		گرفتار کر لئے گئے
6	میاں محمد شاہ، یاسر زیروی، یاسر منصور اور دو دیگر افراد	لاہور	298C	خود کو مسلمان قرار دینے اور احمدی عقائد کی تبلیغ کا الزام	15 جون 2013ء کو گرفتار کئے گئے
7	سلیم احمد	عمرکوٹ/کنری	298C	مبیّنہ طور پر احمدی عقائد کی تبلیغ	گرفتار کر لیا گیا
8	ڈاکٹر مسعود احمد	لاہور	295C298C,	مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے کا الزام	25 نومبر 2013ء کو گرفتار کر لیا گیا
9	شریف احمد، ناصر احمد قمر، لئیق احمد	راجن پور	298-C	کھلم کھلا احمدی عقائد کی تبلیغ کرنے اور پمفلٹ تقسیم کرنے کا الزام	شریف احمد کو 19 دسمبر 2013ء کو گرفتار کیا گیا

مسیحی ملزمان

2013ء میں 14 مسیحی شہریوں پر 9 مقدمے درج کئے گئے۔9 مسیحوں کو ان کیسوں میں گرفتار کر لیا گیا۔دو خواتین سمیت چار مسیحیوں کو توہین رسالت کے پیغامات ارسال کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔دوران سماعت دو مسیحی بری کر دیئے گئے جبکہ ایک کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔تین مسیحیوں کو دو مقدمات میں فرد جرم عائد ہونے پر موت کی سزا سنائی گئی۔

لاہور میں ساون نامی ایک مسیحی پر توہین رسالت کا الزام لگنے کے بعد پوری مسیحی بستی جوزف کالونی کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔خبروں کے مطابق ہجوم کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے پولیس نے ساون

کے خلاف توہین رسالت کا مقدمہ درج کیا۔

کراچی میں ایک مسلمان نے مارچ میں ایک مسیحی کو گلا کاٹ کر قتل کر دیا۔ گلا کاٹتے وقت قاتل شور مچا رہا تھا کہ وہ ایک کافر کو قتل کر رہا ہے جس نے توہین رسالت کا ارتکاب کیا ہے۔ پاکستان کے دوسرے بڑے شہر لاہور میں لاہور ہائی کورٹ نے یونس نامی ایک مسیحی کو بری کر دیا جسے چھ سال قبل توہین رسالت کے جرم میں سزائے موت کا حکم سنایا گیا تھا۔

نمبر شمار	نام	ضلع یا شہر	تعزیرات کی دفعہ	الزام	کیفیت
1	ظفر بھٹی، مس غزالہ خان	راولپنڈی	295C	مبیّنہ طور پر توہین آمیز ایس ایم ایس کے ذریعے پیغامات کا تبادلہ	گرفتار کر لئے گئے
2	ساون مسیح	بادامی باغ لاہور	295C	نبی کریمؐ کے خلاف توہین آمیز کلمات ادا کئے	8-3-2013ء کو گرفتار کیا گیا۔ کوٹ لکھپت جیل میں سماعت ہو رہی ہے
3	شفقت مسیح اور اس کی بیوی شگفتہ بی بی	گوجرہ	295C	ایس ایم ایس کے ذریعے بے ہودہ پیغامات بھیجنے کا الزام	21-7-2013ء کو گرفتار کئے گئے
4	ستار مسیح (پادری)	لاہور کا نواحی گاؤں		نبی کریمؐ کے بارے میں مبیّنہ طور پر توہین آمیز کلمات ادا کئے	گرفتار نہیں ہوا
5	بابر الیاس، رابرٹ	کراچی	298	پشاور کے چرچ میں خونی دھماکے کے بعد مسجد میں کندہ خلفائے راشدین کے ناموں کو پتھروں اور ڈنڈوں سے پیٹنے کا الزام	گرفتاری کے بعد 27 ستمبر 2013ء کو ضمانت پر رہائی
6	آصف پرویز	لاہور	295A,B,C	توہین آمیز ایس ایم ایس کے ذریعے پیغامات بھیجنے کا الزام	12-10-2013ء کو گرفتار کیا گیا
7	عدنان مسیح (پادری)	لاہور	295A,B,C	ایک اسلامی کتاب پر توہین آمیز کلمات لکھے	28 مارچ 2013ء کو گرفتار کیا گیا
8	صائم صنوبر (پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (PIMS) اسلام میں استاد	اسلام آباد		امتحانی پرچہ میں توہین آمیز سوال پوچھنے کا الزام	28-3-2013ء کو معاملہ طے ہو گیا
9	عارف اور طارق (بھائی)	وزیرآباد ضلع گوجرانوالہ	295B	مبیّنہ طور پر قرآنی آیات پر مشتمل اوراق کو آتش بازی کے کریکر بنانے میں استعمال کرنا	29-10-2013ء کو طارق کو گرفتار کیا گیا

سزائیں اور بریت

نمبر شمار	نام	ضلع یا شہر	تعزیرات کی دفعہ	الزام	کیفیت
1	برکت مسیح	خیر پور	295C	توہین رسالت کے ارتکاب کا الزام	28-1-2013ء کو بری کر دیا گیا
2	یونس مسیح	لاہور		صوفیانہ موسیقی کی محفل میں دخل اندازی اور بے ہودہ کلمات کا استعمال	ستمبر 2005ء کو توہین رسالت کا الزام لگا، اپریل 2013ء کو لاہور ہائیکوٹ نے بری کر دیا
3	سجاد مسیح	گوجرہ/ٹوبہ ٹیک سنگھ		توہین آمیز پیغام بھیجنے کا الزام	ٹرائل کورٹ نے 13 جولائی 2013ء کو عمر قید کی سزا سنادی

عدلیہ پر تبصرے

2013ء میں انتظامیہ کو نکیل ڈالنے پر جہاں سپریم کورٹ پر داد کے ڈونگرے برسائے گئے وہیں اسے تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ عدالت عظمیٰ کے ججوں کی بحالی کے سبب چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری عدلیہ کی آزادی کی علامت بن کر اُبھرے۔ انہیں جہاں عدالتی مہم جوئی اور اپنے بیٹے ڈاکٹر ارسلان افتخار پر لگنے والے مبینہ کرپشن کے الزامات کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بننا پڑا وہیں انہوں نے عدلیہ کے وقار میں بھی اضافہ کیا۔ جسٹس دراب پٹیل نے کہا تھا کہ ''آزاد عدلیہ کا مطلب محض ایسی عدلیہ نہیں جو نہ صرف حکومتی دباؤ کا مقابلہ کرتی ہے بلکہ وہ عوامی رائے کے دباؤ کا بھی سامنا کرتی ہے۔'' جسٹس چوہدری کے ناقدین کا کہنا ہے کہ جسٹس چودھری اس حوالے سے ناکام رہے اور شہرت حاصل کرنے کے خبط میں اُنہوں نے صرف ٹیلی ویژن پر چلنے والی پٹیوں اور اخبارات کی شہ سرخیوں کو قابل توجہ جانا۔ اُنہوں نے جس انداز سے سابقہ جمہوری طریقے سے منتخب وزیراعظم کو گھر بھجوایا اس پر سخت تنقید کی گئی۔ انہوں نے جس طرح سابقہ حکومت اور منتخب سابقہ صدر کو آڑے ہاتھوں لیا اس کو ان کے بعض ناقدین نے قانونی لڑائی کی بجائے ذاتی جنگ سے تعبیر کیا۔

جنیوا میں قائم انٹرنیشنل جیورسٹ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ چیف جسٹس پاکستان افتخار محمد چوہدری نے انسانی حقوق کو اگرچہ مضبوط کیا لیکن مقدمات کے غیر مناسب چناؤ کے باعث ان کے اقدامات کو متعصّبانہ مداخلت بھی کہا گیا جس کی وجہ سے سپریم کورٹ تنقید کا نشانہ بنی۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ حکومت کے احتساب پر زور دینے پر عدالت عظمیٰ کو عوامی طور پر سراہا گیا۔ لیکن قومی اور بین الاقوامی سطح پر وسیع تنقید کی وجہ وہ طریقہ کار بنا جس کی وجہ سے اپنے دائرہ عمل میں بعض مقدمات کو ترجیح دے کر ان کی سماعت کی

گئی۔ بسا اوقات سپریم کورٹ نے اپنے اختیار کا استعمال میڈیا رپورٹوں کی بنیاد پر کیا اور بعض اوقات سیاسی جماعتوں کی دائر کردہ تعصب پر مبنی درخواستوں پر عدلیہ حرکت میں آئی۔ سپریم کورٹ میں سماعت کے لیے مقدمات کے چناؤ کے شفاف طریقہ کار کی عدم موجودگی اور انسانی حقوق کے مقدمات کو ترجیحی بنیاد پر سننے سے عدالت کے من مانے رویے کا شائبہ رہا۔ ''اختیار کے بغیر احتساب: پاکستان میں انصاف کی تلاش'' کے عنوان سے 99 صفحات پر مشتمل جسٹس آف پاکستان کے عدالتی معاملات کو چلانے کے انداز کو پھوہڑ پن سے تعبیر کیا گیا۔ انٹرنیشنل جیورسٹ کمیشن کے ڈائریکٹر برائے ایشیا سام ظریفی کے مطابق چیف جسٹس آف پاکستان کی جانب سے عدلیہ کو آزاد ادارہ بنانے اور فوجی مداخلت کا راستہ روکنے کے لیے عدلیہ کو جس طرح مضبوط کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ انہوں نے کہا '' تاہم عدم شفافیت کے باعث عدالت کی عظیم کامیابیاں نہ صرف گہنا گئی ہیں بلکہ قانون کی حکمرانی کے اصولوں پر بھی زد پڑی ہے۔'' تحقیق میں مزید بتایا گیا کہ آئین کے آرٹیکل 184(3) کے بے محابہ استعمال سے قانون کی حکمرانی کی جدوجہد کمزور پڑ گئی۔ رپورٹ میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ بین الاقوامی معیار کے مطابق عدلیہ کو نہ صرف آزاد اور غیر جانبدار ہونا چاہیے بلکہ حقیقتاً آزاد اور غیر جانبدار نظر بھی آنا چاہیے۔

تحفظ پاکستان آرڈیننس

2013ء کے دوران حکومت نے دہشت گردی کے خطرے سے نپٹنے کے لیے قوانین نافذ کرنے کا عمل جاری رکھا۔ فیئر ٹرائل ایکٹ اور اینٹی ٹیررازم (ترمیم شدہ) ایکٹ کے بعد تحفظ پاکستان آرڈیننس (Proteciton of Pakistan Ordinance) لایا گیا۔ 20 اکتوبر کو صدر پاکستان نے پی پی او کی منظوری دے دی۔ اس آرڈیننس کو دستوری حکمنامے (SRO) کے ذریعے 5 دسمبر 2013ء سے نافذ کر دیا گیا۔ اس آرڈیننس کا بظاہر مقصد دہشت گردوں کے خلاف مقدمہ چلانے کے عمل کو زیادہ مؤثر بنانا تھا لیکن اس سے بنیادی حقوق متاثر ہونے کا یقینی خطرہ ہے۔ تحفظ پاکستان آرڈیننس کے دیباچہ کے مطابق یہ آرڈی ننس پاکستان کے خلاف جنگ کرنے والوں اور پاکستان کی سلامتی کو درپیش خطرات سے تحفظ مہیا کرتا ہے۔ اس آرڈی ننس میں ان محرکات کی تفہیم صحیح طور پر نہیں کی گئی جن سے پاکستان کی سلامتی کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ انسانی حقوق کے سرگرم کارکنوں کو خدشہ ہے کہ ملک میں انسانی حقوق سلب کرنے کے لیے اس آرڈی ننس کو بطور ہتھیار استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مسلح افواج اور خفیہ اداروں کو پولیس کے اختیارات دیئے گئے ہیں۔ سکیورٹی

تحفظ پاکستان آرڈی ننس کو شدید عوامی تنقید کا سامنا کرنا پڑا

افسران کو ایسے آمرانہ اختیارات دے دیئے گئے ہیں جن کے تحت وہ موقع پر ہی جج کے اختیارات استعمال کر سکیں گے۔ یہ خطرے کا الارم تھا اس لیے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے تو اپنے اختیارات سے کہیں زیادہ تجاوز کرنے کی شہرت رکھتے ہیں۔

پی پی او کے تحت کسی شخص کا 90 دن کا ریمانڈ دیا جا سکے گا۔ جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ زیر حراست فرد سے اعترافات کرانے کے لیے مزید وقت اور مواقع مل جائیں گے۔ حفاظتی نظر بندی کی شق حکومت کو یہ اجازت بھی دیتی ہے کہ وہ کسی بھی شخص کو نوے روز تک حراست میں رکھ سکتی ہے۔ یہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے میثاق کی خلاف ورزی ہے۔ اس سے آئین کے آرٹیکل 9 اور 10 کی بھی خلاف ورزی ہو گی۔ اس کے تحت قانون نافذ کرنے والے افراد کو جدولی جرم کے خدشہ پر گولی مارنے اور معقول شک کی بنیاد پر بغیر وارنٹ گرفتار کرنے کی اجازت ہوگی۔ پی پی او پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بظاہر تو یہ آرڈی ننس غیر ملکی دشمنوں کے خلاف استعمال ہوگا مگر جو بھی شہری موقع پر اپنی شناخت نہ کرا سکے گا، اس پر اس قانون کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔

اس آرڈی ننس نے بے گناہی ثابت کرنے کا بوجھ ملزم پر ڈال دیا ہے۔ موجودہ ملکی قوانین کے مطابق ملزم کو اس وقت تک مجرم سمجھا جائے گا جب تک وہ اپنی بے گناہی ثابت نہ کر دے۔ یہ فطری انصاف کے اُن بنیادی اصولوں کی صریح خلاف ورزی ہے جن کے مطابق کوئی بھی شخص اس وقت تک بے گناہ سمجھا جائے گا جب تک اس کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے۔ اس بنیاد پر ان خدشات کا اظہار کیا گیا کہ پی پی او کا

غلط استعمال کیا جائے گا۔ اسی وجہ سے سول سوسائٹی کی تنظیموں اور حزب اختلاف کی سیاسی جماعتوں نے اسے یکسر مسترد کر دیا۔

سزائے موت پر عارضی پابندی

حکومت سزائے موت پر عارضی پابندی کے مؤقف پر ڈٹی ہوئی ہے۔ 2009ء سے اب تک حکام نے صرف ایک مجرم کو پھانسی لگائی۔ ملک بھر کی جیلوں میں آٹھ ہزار سزائے موت کے قیدی بند ہیں جو پھانسی کے منتظر ہیں۔ اگست میں یورپی یونین نے پاکستان کو تنبیہہ کی کہ اگر اس نے سزائے موت پر موجود پابندی کو ختم کیا تو یورپ کے 28 ممالک کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا جس کے نتیجے میں یورپ کے ڈیوٹی فری اقتصادی بلاک کی مارکیٹ میں پاکستانی مصنوعات کا داخلہ خطرے میں پڑ جائے گا۔

اگر چہ نئی حکومت نے دسمبر تک کسی کو سزائے موت پر پھانسی نہیں دی تاہم یہ عندیہ ضرور دیا کہ وہ سزائے موت کو ختم نہیں کر سکتی۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی طرف سے سزائے موت کو روکنے کی درخواست کے جواب میں وزارت قانون وانصاف اور انسانی حقوق نے کمیشن کی درخواست پر جواب دیتے ہوئے کہا کہ حکومت سزائے موت پر پابندی پر کاربند تو ہے لیکن وزارت امن و انصاف کی موجودہ صورت حال اور بڑھتی ہوئی دہشت گردی کے پیش نظر سزائے موت پر مکمل پابندی کے حق میں نہیں۔ آئین کے آرٹیکل 2اے بمع آرٹیکل 227 کے پیش نظر حدود قوانین کے تحت دی گئی موت کی سزاؤں کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ بنیادی طور پر

سزائے موت کے قیدی جو شاید کچھ عرصہ کے لیے پھانسی گھاٹ تک کے سفر سے محفوظ ہو گئے

سزائے موت کا معاملہ وزارت داخلہ و نارکوٹکس کنٹرول اور صوبائی حکومتوں سے متعلق ہے۔ وزارت ان کی آرا کی منتظر ہے اور ان کی طرف سے ملنے والے حتمی جواب کے بعد ہی خط کا جواب دیا جا سکے گا۔'' وزارت قانون نے 5 دسمبر 2013 کو کمیشن کو حتمی جواب ارسال کرنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ اس رپورٹ کی تیاری تک موصول نہیں ہوا۔

عوامی مباحثہ

10 اکتوبر 2013ء کو سزائے موت کے خاتمے کا دن منانے کے سلسلے میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی طرف سے منعقدہ سیمینار میں اس موضوع پر سزائے موت کے خاتمے کی عالمی سطح پر مہم چلانے والے پروفیسر راجر ہڈ نے اس حوالے سے جو لیکچر دیا، اسے شرکاء میں بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس لیکچر میں پروفیسر راجر ہڈ نے ان اقدامات کا ذکر کیا جو چین اور مسلم ملکوں نے اپنے ہاں سزائے موت کو برقرار رکھنے کی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنے کے لیے اٹھائے۔

سفارشات

1- ازخود نوٹس لینے کے اختیارات کو استعمال کرنے کے لیے اصولوں اور ترجیحات وضع کرنے کی فوری ضرورت ہے۔ ازخود نوٹس والے مقدمات کو چلانے یا انتظامیہ کے خلاف مقدمات کی سماعت ان مقدمات کی قیمت پر نہیں ہونی چاہیے جو پہلے سے زیر سماعت ہیں۔

2- توہین عدالت کے قانون کا استعمال احتیاط سے کیا جانا چاہیے۔

3- اس اصول پر کاربند رہنا ضروری ہے کہ جج صرف اپنے فیصلوں کے ذریعے بولتے ہیں۔

4- عدالتی ڈھانچے کو مضبوط کرنے کے لیے جوڈیشل افسروں کی تعداد میں بلا تاخیر اضافہ کیا جائے اور عدالتی ڈھانچے کو مضبوط بنایا جائے تاکہ زیر سماعت مقدمات میں ہونے والی بہت زیادہ تاخیر کا سدباب ہو سکے۔ جمع شدہ مقدمات کو نپٹانے کے لیے بار کی مدد بھی لینی چاہیے۔

5- انصاف کی فراہمی کو تیز تر، کم خرچ اور لوگوں کی دسترس میں رکھنے کے لیے مقدمات کے فریقین کی سہولت کے لئے اقدامات کیے جائیں۔

2 - قانون کا نفاذ

امن وامان کی صورت حال

کسی شخص کو وجہ بتائے بغیر حراست میں نہیں لیا جائے گا۔ نہ ہی اسے اس کی مرضی کے وکیل سے مشورہ حاصل کرنے یا اس کے ذریعے اپنے دفاع کے حق سے محروم کیا جائے گا۔ آئین پاکستان [آرٹیکل-10(1) اور (2)]

انسانی وقار، گھر اور چار دیواری کی حرمت کی، قانون کے مطابق، ہر قیمت پر حفاظت کی جائے گی۔ کوئی شہادت یا ثبوت حاصل کرنے کے لیے کسی شخص کو تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ آئین پاکستان [آرٹیکل 14(1) اور (2)]

ہر شخص کو زندہ رہنے، آزادی اور جان و مال کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل -3]

کسی شخص کو اذیت نہیں پہنچائی جائے گی۔ اور نہ ہی اس کے ساتھ ظالمانہ، غیر انسانی یا توہین آمیز سلوک کیا جائے گا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-5]

ہر اس شخص کو جس پر کوئی قابل سزا الزام عائد کیا جائے، یہ حق حاصل ہے کہ جب تک قانون کے تحت اس کو ایک کھلی عدالت میں، جہاں اسے اپنے دفاع کی تمام سہولتیں حاصل ہوں، مجرم ثابت نہیں کیا جاتا، اسے بے قصور تصور کیا جائے گا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 11-(1)]

کسی شخص کی خلوت یا تنہائی، خاندانی زندگی، گھر یا اس کی خط و کتابت میں، من مانے طور پر مداخلت نہیں کی جائے گی۔ نہ ہی اس کے وقار اور اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ ہر شخص کو اس قسم کی مداخلت اور کوششوں کے خلاف قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-2]

2013 کے دوران جرائم اور دہشت گردی کی کارروائیوں، سیاسی سرپرستی میں کام کرنے والے جرائم پیشہ گروہوں کے درمیان ہونے والے تصادم، فرقہ وارانہ تشدد اور لوگوں کے تحفظ کے حوالے سے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نااہلی اور عدم توجہی کے باعث عوام کی زندگیوں اور املاک کو شدید خطرات لاحق ہے۔

باوجود اس کے کہ حکومت نے دہشت گردی کو روکنے اور دہشت گردوں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ سخت قوانین متعارف کروائے، تحقیقات اور قانونی کارروائی کا فریضہ ادا کرنے والے اداروں کی اہلیت سوالیہ نشان ہی بنی رہی۔ اقبال جرم کروانے کے لیے پولیس کی حراست میں تشدد سے متعلق مسلسل شکایات موصول ہوتی رہیں۔

ملک کے بہت سے علاقوں میں جرائم اور لاقانونیت اس حد تک بڑھ گئے کہ لوگوں نے غروب آفتاب کے بعد گھروں کے اندر رہنے کو ترجیح دی۔ فاٹا اور بلوچستان کے علاقوں میں دن کے وقت سفر کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ شہریوں کو قانون نافذ کرنے والے اداروں کی طرف سے ماورائے عدالت ہلاکتوں کا خطرہ لاحق تھا حالانکہ ان اداروں کا مقصد لوگوں کو تحفظ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اسلحے کی آزادانہ نقل وحمل نے مشکل صورت حال کو سنگین تر بنا دیا۔ تحفظ کی فراہمی میں حکومتی ناکامی کے باعث امیر لوگوں نے مجبوراً نجی سکیورٹی گارڈز کی خدمات حاصل کر لیں؛ دیگر لوگوں نے اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ رکھ لیا جبکہ غریب لوگوں کو مجرموں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا۔

سکیورٹی فورسز کی جانب سے آپریشن کے باوجود کراچی میں تشدد کی وارداتوں پر قابو نہ پایا جا سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان کے سب سے بڑے شہر میں ٹارگٹ کلنگ کی لہر کو کسی طرح سے بھی نہیں روکا جا سکتا۔ انتہا پسند دہشت گردوں کی جانب سے تشدد اور زیادتیوں نے پشاور کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا۔ کوئٹہ میں اس سال بھی امن قائم نہ ہو سکا۔ فاٹا کی صورت حال انتہائی خوفناک رہی۔ یہاں تک کہ وہ علاقے بھی محفوظ نہ رہ سکے جہاں لوگ اندرونی یا کسی اور سبب سے بے دخلی کا سامنا کر رہے تھے۔ سال کے اوائل میں انتخابات سے پہلے تشدد کی شرح پاکستان کے معیار کے حوالے سے بہت زیادہ تھی۔

فرقوں اور مذہبی اقلیتوں کے خلاف تشدد کے واقعات نے انہیں دیگر گروہوں سے زیادہ غیر محفوظ بنا دیا۔ پولیس اہلکاروں کی ایک بڑی تعداد بے جا طور پر لا تعداد اہم حکومتی شخصیات اور سرکاری ملازمین کی حفاظت پر مامور تھی، جس کے باعث لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے میں پولیس کی اہلیت مزید کم ہو گئی۔

امن وامان کی صورت حال

مختلف وجوہات کی بنا پر بہت سے جرائم کی اطلاع پولیس کو نہیں دی جاتی۔ ان میں اغوا برائے تاوان کے واقعات، جنسی تشدد اور بھتے کے مطالبات جیسے جرائم شامل ہیں۔ اس کے باوجود تھانوں میں درج کرائے جانے والے مقدمات جرائم کی صورت حال کی کسی حد تک نشاندہی کرتے ہیں۔ ایچ آر سی پی کو صوبائی پولیس کی جانب سے فراہم کردہ اور دیگر اداروں کی ویب سائٹوں سے حاصل کردہ اعداد وشمار مایوس کن تصویر

پیش کرتے ہیں۔

سب سے زیادہ آبادی والے صوبہ پنجاب میں پولیس نے مختلف جرائم کے 390,932 مقدمات درج کیے۔ان میں قتل کے 6,095اقدام قتل کے 6,874،اغوابرائے تاوان کے 132،جنسی زیادتی کے 2,576،ڈکیتی کے 2,768،گاڑیوں کی چوری کے 20,677اور گاڑیاں چھیننے کے 6,441 مقدمات شامل ہیں۔ پولیس کے اعداد وشمار سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ تضحیک مذہب کے 275 مقدمات درج کیے گئے۔ 2013ء کے دوران ملک بھر میں تضحیک مذہب کے منظر عام پر آنے والے واقعات کی تعداد اور پولیس کی جانب سے پیش کیے گئے اعداد وشمار میں تھوڑا بہت فرق تھا۔ایسا ممکن تھا کہ ان 275 مقدمات میں سے بہت سے مقدمات کا تضحیک مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بلکہ یہ وہ مقدمات تھے جو تعزیرات پاکستان کے باب نمبر 15 کی مختلف دفعات کے تحت درج کیے گئے تھے۔جن کا تعلق مذہب سے متعلق مختلف جرائم سے تھا۔

سندھ میں قتل کے 4,074 واقعات ریکارڈ کیے گئے۔ان میں سے 153 افراد ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ ہے جبکہ 146 افراد ڈکیتیوں کے دوران قتل ہوئے۔صرف ہائی وے پر ہونے والی ڈکیتیوں کی تعداد 136 تھی جبکہ بینک ڈکیتی کے واقعات کی تعداد 36 تھی۔خودکش بم دھماکوں یا بم دھماکوں کے 54 مقدمات درج کیے گئے۔

خیبر پختونخوا میں 2013ء کے دوران پولیس نے قتل کے 3,240 مقدمات درج کیے جن میں نام نہاد غیرت کے نام پر قتل کے 45 مقدمات شامل تھے۔ پولیس نے اقدام قتل کے 3,152 جنسی زیادتی کے 127 اور اجتماعی زیادتی کے تین واقعات بھی درج کیے۔اغوابرائے تاوان کے 91 واقعات کی پولیس

جرائم سے تحفظ دینے میں پولیس کی ناکامی پر عوام کا شدید احتجاج

میں رپورٹ درج کرائی گئی جبکہ 630 گاڑیاں چوری ہوئیں اور 247 گاڑیاں چھینی گئیں۔ تضحیک مذہب کے چودہ مقدمات درج کیے گئے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاید مذہب سے متعلق تمام جرائم کو تضحیک مذہب کے لیبل کے تحت یکجا کیا جارہا تھا۔

بلوچستان میں قتل کے 645 اوراقدام قتل کے 480 مقدمات درج کیے گئے۔ سرکاری ملازمین پر 209 حملے ہوئے اوراغوا کے 248 اوراغوابرائے تاوان کے 56 واقعات پیش آئے۔ کہا جاتا تھا کہ غیرت کے نام پر 33 افراد کو قتل کیا گیا۔ صوبے میں دہشت گردی عروج پر تھی اور پولیس نے 255 بم دھماکوں اور راکٹ فائرنگ کے 58 واقعات کے مقدمات درج کیے۔ پولیس نے تضحیک مذہب کے بھی دومقدمات درج کیے۔ یہ دونوں مقدمات کوئٹہ میں درج کیے گئے۔

اسلحے کی فراوانی

2013ء کے دوران ملک بھر میں مہلک ہتھیاروں کی بہتات باعث حیرت تھی۔ وہ دن گئے جب مجرموں سے برآمد ہونے والے ہتھیاروں میں چھریاں اورخنجر شامل ہوتے تھے۔ اب جرائم میں ملوث افراد پولیس کے اسلحہ سے کہیں زیادہ جدید اسلحہ سے لیس تھے اوران سے برآمد ہونے والے ہتھیاروہ تھے جو عام طور پرمیدان جنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔

ملک کے تمام علاقوں میں اسلحے تک رسائی بہت آسان رہی حتیٰ کہ یہ اطلاعات بھی موصول ہوئیں کہ انتہائی مہلک ہتھیار یومیہ اورفی گھنٹہ کے حساب سے کرائے پربھی دستیاب تھے۔

ضبط شدہ غیر قانونی ہتھیاروں سے متعلق اعداد وشمار تمام صوبوں نے فراہم نہیں کیے تھے، تاہم بلوچستان، پنجاب اورخیبر پختونخوا نے جواعداد وشمار فراہم کیے وہ حیران کن تھے۔

2013ء کے دوران پنجاب میں غیر قانونی ہتھیار رکھنے پر آرمز آرڈیننس کے تحت 45,635 مقدمات درج کیے گئے اور 30,806 پستولیں/ ریوالور، 2,650 آتشیں ہتھیار، 6,545 شاٹ گنیں، 3,333 رائفلیں، 1,063 کلاشنکوفیں، 85 گرینیڈ اور 646,326 گولیاں ضبط کی گئیں۔

خیبر پختونخوا میں 3,995 رائفلیں، 7,538 پستول/ ریوالور، 4,634 کلاشنکوفیں، ایسی ہی دیگر 1,806 رائفلیں، 42 سٹین گنیں، 450 دستی بم، 5,320 ڈائنامائٹ، 8 لائٹ مشین گنیں، 4,169 ڈیٹونیٹرز، 13 راکٹ لانچرز، 41 بم، 5 میزائل اور تقریباً 20 لاکھ گولیاں قبضے میں لی گئیں۔

بلوچستان میں غیر قانونی ہتھیار رکھنے پر 901 افراد کو گرفتار کیا گیا اور غیر قانونی ہتھیار رکھنے پر

869 مقدمات درج کیے گئے۔ دھماکہ خیز مواد کے سوا ضبط شدہ اسلحے کی مقدار دیگر صوبوں سے کہیں زیادہ کم تھی۔ قبضے میں لیے گئے دھماکہ خیز مواد کی مقدار 72,188,560 کلوگرام تھی۔ 140 کلاشنکوفیں، 55 شاٹ گنز، 41 رائفلیں، 644 پستول / ریوالور، 26 گرنیڈز، 3 راکٹ لانچرز، 2 لائٹ مشین گنیں، 4 راکٹ شیل، 12 بارودی سرنگیں، 8 بم، ایک خودکش جیکٹ، 2,1934 گولیاں اور گولیوں کے 599 میگزین قبضے میں لیے گئے۔

اگست میں سندھ میں رینجرز کے سربراہ نے کراچی میں لاقانونیت اور تشدد سے متعلق ایک مقدمے کی سماعت کے دوران بتایا کہ پورٹس اینڈ شپنگ کے سابق وزیر کے دور میں اسلحے کے تقریباً 19,000 شپنگ کنٹینرز لاپتہ ہوگئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کراچی میں استعمال ہونے والے 78 فیصد غیر قانونی ہتھیار بیرون ملک تیار کیے گئے تھے۔ انہوں نے عدالت کو بتایا کہ ان میں اے کے 47 اور 9 ایم ایم گنز شامل تھیں جو زیادہ تر شہر میں ٹارگٹ کلنگ اور قتل کے دیگر واقعات میں استعمال کی جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ شہر میں لاکھوں کی تعداد میں لائسنس والے ہتھیار بھی تھے۔ مارچ میں وزیر داخلہ نے قومی اسمبلی کو بتایا کہ 2008ء سے لے کر 2012ء تک وفاقی حکومت نے اراکین پارلیمنٹ کی سفارش پر ممنوعہ ہتھیاروں کے 69,473 لائسنس جاری کیے تھے۔ ان میں خودکار ہتھیار، کلاشنکوف اور سب مشین گن شامل تھے۔ اس تعداد کا مطلب یہ تھا کہ ہر رکن اسمبلی نے ممنوعہ ہتھیاروں کے اوسطاً 200 لائسنس حاصل کر رکھے تھے جو کہ پانچ برسوں کے دوران جاری کیے گئے تھے۔

سندھ پولیس کے سربراہ نے اگست 2011ء میں کراچی میں ہونے والے تشدد کی تحقیقات کرنے والے سپریم کورٹ کے ایک بینچ کو بتایا کہ کراچی میں تشدد کی ایک وجہ ممنوعہ ہتھیاروں تک آسان رسائی اور اسلحے کے لائسنس کا غلط استعمال تھا۔ عدالت کو مطلع کیا گیا کہ گزشتہ پانچ سالوں کے دوران صوبائی ہوم ڈیپارٹمنٹ نے غیر ممنوعہ ہتھیاروں کے 180,956 لائسنس جاری کیے اور وفاقی وزارت داخلہ نے اسلام آباد میں ممنوعہ ہتھیاروں کے 46,114 اور غیر ممنوعہ ہتھیاروں کے 1,202,470 لائسنس جاری کیے۔

2013ء میں چھوٹے آتشیں ہتھیار متعدد اموات کا سبب بنے۔ سال کے دوران میڈیا کی خبروں کے مطابق شادی اور تقریبات کے دوران ہوائی فائرنگ کے نتیجے میں بڑی تعداد میں ہلاکتیں ہوئیں۔ ملک میں دستیاب ہتھیاروں کی بہتات کے باوجود قابل ذکر بات یہ ہے کہ تعداد کے اعتبار سے مسلح تشدد کے واقعات روزانہ ہونے والے مسلح تنازعات سے زیادہ نہیں تھے۔

ماورائے عدالت ہلاکتیں

پولیس مقابلے

پولیس کے ساتھ فائرنگ کے تبادلے میں مبینہ طور پر جرائم میں ملوث افراد کی ہلاکتوں میں کوئی کمی نہ آئی۔ افراد کی غیر قانونی ہلاکتوں کے واقعات پولیس پر شدید تنقید کے باوجود جاری رہے۔ اس حوالے سے ایسے واقعات کی آزادانہ تحقیقات کا کوئی طریقہ کار موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ محکمانہ تحقیقات بھی کبھی کبھار ہی ہوتی تھیں۔

ایچ آر سی پی نے اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں سے جو رپورٹ تیار کی اس کے مطابق 2013ء میں ملک بھر میں 357 پولیس مقابلے ہوئے۔ سب سے زیادہ واقعات (217) پاکستان کی تقریباً 60 فیصد آبادی والے صوبہ پنجاب میں رپورٹ ہوئے اور سب سے کم (10) بلوچستان میں پیش آئے۔ سندھ میں پولیس مقابلوں کے 95 اور خیبر پختونخوا میں 35 واقعات پیش آئے۔ پولیس مقابلوں کے تقریباً 61 فیصد واقعات پنجاب میں، 26 فیصد سندھ، 10 فیصد خیبر پختونخوا اور 3 فیصد بلوچستان میں پیش آئے۔ ان مقابلوں میں کل 503 مشتبہ افراد ہلاک اور 49 زخمی ہوئے۔ ایچ آر سی پی کے 2012ء کے جائزے کے مطابق ملک بھر میں 350 مقابلوں میں 403 مشتبہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ 2011ء کے اعداد و شمار کے مطابق 254 پولیس مقابلوں میں 337 مشتبہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔

2013ء میں 357 پولیس مقابلوں میں سے صرف 46 واقعات (13 فیصد) ایسے تھے جن میں

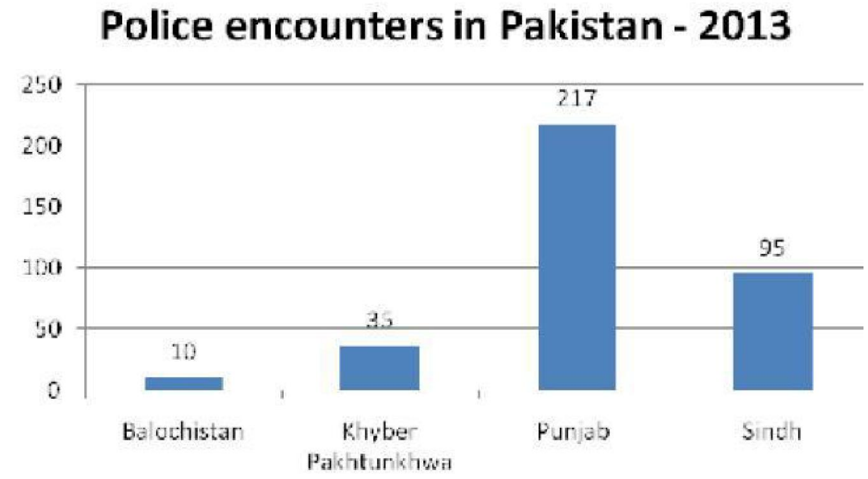

کوئی مشتبہ شخص ہلاک نہیں ہوا تھا۔ 280 (78 فیصد) پولیس مقابلے ایسے تھے جن میں ایک بھی پولیس اہلکار جاں بحق یا زخمی نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود 97 فیصد مقابلوں (280 میں سے 27) میں مشتبہ افراد ہلاک یا زخمی ہوئے۔

2013ء کے دوران پولیس مقابلوں میں مشتبہ افراد کی ہلاکتوں کا فی مقابلہ تناسب 1.4 فیصد اور زخمی ہونے والے افراد کا فی مقابلہ تناسب 0.19 فیصد تھا۔ محض اعداد وشمار سے یہ جاننا مشکل ہوسکتا ہے کہ طاقت کا استعمال کس حد تک اور کس اختیار کے تحت کیا گیا۔ تاہم فیصد تناسب ظاہر کرتا ہے کہ بے بہا طاقت کا استعمال کس حد تک کیا گیا۔

2013ء کے دوران پولیس مقابلوں کے اعداد وشمار

پولیس مقابلوں کی تعداد	357
ہلاک ہونے والے مشتبہ افراد کی تعداد	503
زخمی ہونے والے مشتبہ افراد کی تعداد	49
گرفتار ہونے والے مشتبہ افراد کی تعداد	122
جاں بحق ہونے والے پولیس اہلکاروں کی تعداد	50
زخمی ہونے والے پولیس اہلکاروں کی تعداد	99

چند شہر ایسے تھے جہاں دوسرے شہروں کی نسبت پولیس مقابلوں کا رواج عام تھا۔ کراچی ان میں

ایک اور پولیس مقابلہ جس میں کوئی پولیس والا تو زخمی نہ ہوا لیکن تمام مشتبہ افراد مارے گئے

Cities with most police encounters in 2013

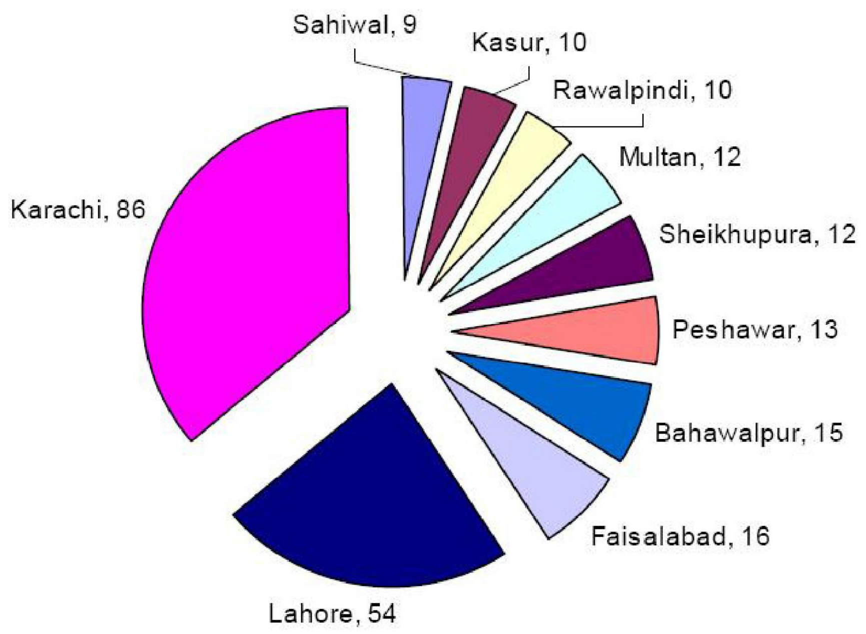

سرفہرست رہا جہاں 2013 تک دوران پولیس مقابلوں کے 86 واقعات پیش آئے جبکہ لاہور 54 پولیس مقابلوں کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہا۔ پولیس مقابلوں کے حوالے سے 10 سرفہرست شہروں میں سے 8 کا تعلق پنجاب، ایک کا سندھ اور ایک کا خیبر پختونخوا سے تھا۔ ملک بھر میں پولیس مقابلوں کے 237 یا 66 فیصد واقعات انہی شہروں میں پیش آئے۔ اس تعداد میں 2013ء کے دوران کراچی میں رینجرز کے ٹارگٹڈ آپریشن کے اعداد و شمار شامل نہیں تھے جہاں 22 واقعات میں 44 مشتبہ افراد ہلاک، تین زخمی اور چار گرفتار ہوئے۔ آپریشن کے دوران رینجرز کا ایک اہلکار ہلاک اور 8 اہلکار زخمی ہوئے۔ میڈیا کی خبروں کے مطابق صرف ایک واقعے کی تحقیقات کا حکم دیا گیا تھا۔

سندھ اور بلوچستان میں نعشیں گڑھوں میں پھینکنے کے واقعات

بلوچستان میں تقریباً ایک عشرے سے جبری گمشدگیوں کی صورت میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزی جاری رہی۔ 2010ء میں ویران علاقوں سے جبری طور پر گمشدہ افراد کی نعشیں برآمد ہونے کا سلسلہ شروع ہوا جو تا حال جاری ہے۔ 2013ء میں صوبے بھر میں 116 نعشیں برآمد ہوئیں; ان میں سے 87 کی شناخت ہو سکی اور بہت سے خاندانوں نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ ان گمشدگیوں میں سکیورٹی فورسز کا ہاتھ ہے۔

اسی طرح ہلاک ہونے والے افراد کی ہلاکتوں کا شبہ بھی سکیورٹی ایجنسیوں پر کیا جاتا ہے۔ دیگر 29 نعشوں کی شناخت ہی نہ ہوسکی۔

سندھ میں سیاسی کارکنوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ سندھ میں قوم پرست جماعتوں کے کارکنوں کی ہلاکتوں کی ذمہ دار ریاستی ایجنسیاں تھیں۔

ڈرون حملے

امریکی ڈرون فاٹا میں اپنے اہداف کو نشانہ بناتے رہے۔ پاکستان میں ڈرون حملوں کے آغاز سے لے کر اب تک پہلی مرتبہ ایک ایسے علاقے کو نشانہ بنایا گیا جو فاٹا کی حدود میں شامل نہیں تھا۔

میڈیا رپورٹس کے مطابق 2013ء میں پاکستان میں کل 31 ڈرون حملے کیے گئے۔ دو کے سوا باقی تمام ڈرون حملے وزیرستان میں ہوئے۔ ان میں سے چوبیس ڈرون حملے شمالی وزیرستان اور پانچ جنوبی وزیرستان میں ہوئے۔ ایک حملہ خیبر ایجنسی اور ایک حملہ خیبر پختونخوا کے علاقے ہنگو میں ہوا۔ اطلاعات کے مطابق ان حملوں میں 199 افراد جاں بحق اور 34 زخمی ہوئے۔

جن علاقوں میں ڈرون حملے کیے گئے وہاں صحافیوں اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کے داخلے پر پابندی کے باعث ڈرون حملوں کا نشانہ بننے والے افراد کی شناخت کی غیر جانبدارانہ تصدیق کا کوئی طریقہ موجود نہیں تھا لیکن ایچ آر سی پی جتنے اعداد و شمار اکٹھے کر سکتا تھا، ان کے مطابق جاں بحق اور زخمی ہونے والے افراد میں خواتین اور بچوں سمیت کئی عام شہری بھی شامل تھے، جن کا اس مسلح تنازعے سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ تاہم ایچ آر سی پی یہ پتہ نہیں لگا سکا کہ ہلاک اور زخمی ہونے والے افراد میں سے کتنے انتہا پسند جنگجو تھے اور کتنے عام شہری۔

چوکس منصف

بڑھتی ہوئی لاقانونیت کے دوران جرائم کی روک تھام میں حکام کی ناکامی پر عوام سخت مایوس ہو گئے۔ سال کے دوران میڈیا نے ایسے کئی واقعات کی اطلاع دی جن میں لوگوں نے جرائم میں ملوث افراد کے خلاف مقدمہ چلانے کا انتظار کرنے کی بجائے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کو ترجیح دی۔ ان واقعات سے نہ صرف پولیس اور نظام انصاف کے خلاف پائے جانے والے غصّے کا اظہار ہوتا تھا بلکہ اس سے بھی پریشان کن بات یہ تھی کہ اس سے معاشرے میں بڑھتی ہوئی درندگی کی بھی عکاسی ہوتی تھی۔ اس حوالے سے ایک شہر میں پیش آنے والے ایسے تین واقعات کا حوالہ دیا گیا تھا جن سے واضح ہوتا ہے کہ جب شہری یہ محسوس کرتے ہیں

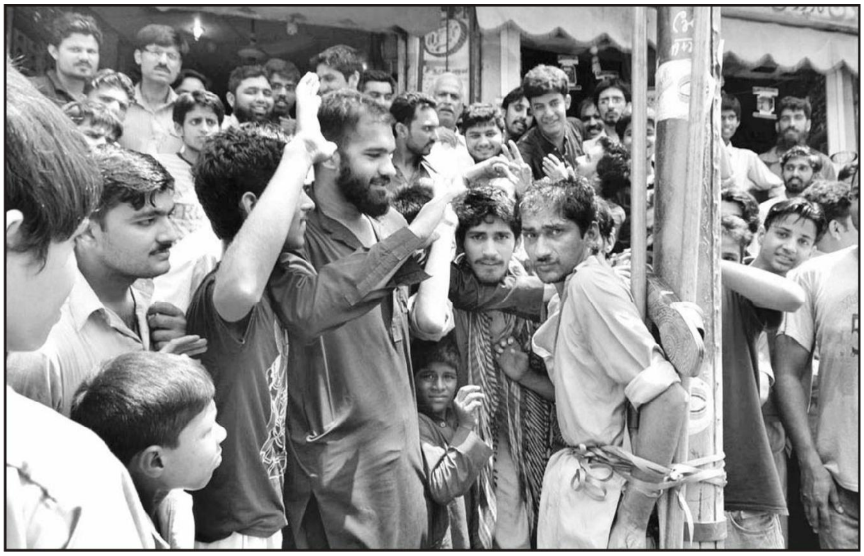

فوری انصاف کا ایک منظر۔ لاہور میں چوری کے شبہ میں پکڑے جانے والے شخص کی عوام کے ہاتھوں پٹائی

کہ ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ نہیں ہوا تو وہ پرتشدد رجحانات کی حمایت کرنے پر اُتر آتے ہیں۔

اگست میں کراچی میں ایک ہجوم نے کار سواروں سے اسلحے کے زور پر نقدی اور قیمتی اشیا چھیننے والے دو ڈاکوؤں میں سے ایک کو ہلاک کر دیا۔ ہجوم نے اسے پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے بُری طرح زدوکوب کیا۔ بعدازاں یہ ڈاکو ہسپتال میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہلاک ہو گیا۔

اکتوبر میں شہریوں کے ایک گروہ نے ان چار ڈاکوؤں میں سے دو کو گھیرے میں لے لیا جنہوں نے بینک سے نکلتے ہوئے دو افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ ایک ڈاکو کو ہجوم نے ہلاک کر دیا جبکہ دوسرے نے ایک دوکان کے اندر پناہ لے لی۔ ہجوم نے دوکان کے شٹر توڑنے کی ناکام کوشش کی تاہم پولیس کی بروقت آمد کے باعث دوسرے ڈاکو کی زندگی بچ گئی۔ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ پولیس ڈاکو کو ان کے حوالے کرے۔ ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے پولیس کو ہوائی فائرنگ کرنا پڑی۔

دسمبر میں کراچی کی اورنگی ٹاؤن مارکیٹ میں ہجوم نے دو مبینہ ڈاکوؤں کو ہلاک کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ جب پولیس وہاں پہنچی تو دونوں افراد زندہ تھے لیکن مشتعل لوگوں نے انہیں پولیس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں مارتے پیٹتے رہے جس سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ دونوں افراد کے رشتہ داروں نے ان ہلاکتوں کو انتقامی کارروائی قرار دیا۔ رشتہ داروں کے مطابق مرنے والوں نے اسی علاقے میں ہونے والے جوئے کے خلاف درخواست دائر کر رکھی تھی۔

انسانی حقوق کے محافظین

اگرچہ پرتشدد واقعات سے تمام شہری متاثر ہوئے تاہم چند حلقوں سے متعلق افراد کو خاص طور پر تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ سال کے دوران ملک بھر میں پیش آنے والے لاتعداد واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں سماجی کارکن یا انسانی حقوق کا محافظ ہونا کتنا خطرناک ہو چکا تھا۔ ایچ آر سی پی سے وابستہ کئی افراد کو نشانہ بنایا گیا۔ ان میں ایچ آر سی پی کی ایگزیکٹو باڈی کے رکن اور ایچ آر سی پی کے خیبر پختونخوا چیپٹر کے سابق چیئرپرسن ملک جرار ایڈووکیٹ بھی شامل تھے۔

وہ فروری کے مہینے میں پشاور میں اپنے بچوں کو سکول چھوڑنے گئے تھے کہ مسلح افراد نے انہیں گولی مار کر قتل کر دیا۔ جرار انسانی حقوق کے ایک نڈر محافظ، ایک انتھک کارکن، ایک نامور وکیل اور بنیادی طور پر عدم تشدد میں یقین رکھنے والے شخص تھے۔ ان کے قاتل تاحال آزاد ہیں۔

ایچ آر سی پی نے بلوچستان کے علاقے تربت سے تعلق رکھنے والے انسانی حقوق کے کارکن حیدر علی ایڈووکیٹ کے اغوا پر بھی تشویش کا اظہار کیا۔ انہیں 27 نومبر کو مبینہ طور پر قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اس وقت اغوا کیا جب وہ ضلعی عدالتوں سے گھر واپس جا رہے تھے۔ ایچ آر سی پی نے بلوچستان کے حکام کو خط لکھا کہ حیدر علی کو فوری طور پر بازیاب کرایا جائے اور حراست کے دوران ان کے ساتھ معقول طریقے سے پیش آیا جائے۔ سال کے آخر تک ان کا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔

دسمبر میں ایچ آر سی پی نے بلوچستان کے ضلع پنجگور میں اپنے کارکن احمد جان بلوچ کے قتل کی شدید مذمت کی۔ احمد جان بلوچ کو موٹر سائیکل سوار مسلح افراد نے ایک مارکیٹ میں گولی مار کر شدید زخمی کر دیا تھا۔ انہیں پنجگور ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹرز ہسپتال لے جایا گیا تھا لیکن ان کی تشویش ناک حالت کو دیکھتے ہوئے انہیں بعد ازاں کراچی منتقل کر دیا گیا جہاں ان کی موت واقع ہو گئی۔ کمیشن نے ان کے قاتلوں کی گرفتاری اور انسانی حقوق کے محافظین کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے اقدامات کرنے کا مطالبہ کیا۔ جہاں تک ایچ آر سی پی کے علم میں ہے سال کے دوران ان میں سے کسی بھی مطالبے کو پورا کرنے کے لیے کسی قسم کے اقدامات نہیں کیے گئے تھے۔ ایچ آر سی پی کا یہ بھی کہنا تھا کہ انسانی حقوق کے محافظین کے قاتلوں کو سزا سے استثنا حاصل تھا جس سے مجرموں کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔

سال 2013ء امدادی کارکنان کے لیے بھی آسان ثابت نہیں ہوا تھا۔ یونائیٹڈ نیشنز آفس فار دی کوآرڈی نیشن آف ہیومنٹیرینز افیئرز (او سی ایچ اے) کے مطابق پاکستان میں جنوری سے لے کر نومبر 2013ء تک مجموعی طور پر 91 امدادی کارکنوں پر حملے کیے گئے۔ ان میں 20 خواتین بھی شامل تھیں۔ تقریباً

ایک نڈر سماجی کارکن کو خاموش کر دیا گیا

13 مارچ کو کراچی میں ایک ٹارگٹ حملے میں ممتاز سماجی کارکن پروین رحمان کو قتل کر دیا گیا۔ وہ کام کے بعد اپنے گھر جا رہی تھیں کہ موٹر سائیکل سوار مسلح افراد نے ان کی گاڑی کو روکا اور انہیں گولی مار کر قتل کر دیا۔ پروین اورنگی پائلٹ پراجیکٹ کی ڈائریکٹر تھیں جو شراکتی اور عوامی حمایت سے چلائے جانے والے منصوبوں میں ایک مثال تھا۔ انہیں کافی عرصے سے جان سے مارنے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ پروین کراچی کے گرد و نواح کے دیہاتوں میں زمینوں پر قبضے سے متعلق تفصیلات منظر عام پر لائی تھیں اور انہوں نے ان لوگوں کی مدد کی تھی جن کی زمینوں پر قبضہ کیا گیا تھا، جس پر قبضہ گروپ ان سے سخت ناراض تھے۔ پولیس کا خیال ہے کہ ان کے قتل میں طالبان کا بھی ہاتھ ہو سکتا تھا۔ پروین ملک کے اُن پرعزم اور باہمت کارکنوں میں سے ایک تھیں جو غریب اور محروم لوگوں کے لیے کام کر رہی تھیں۔ ان کے قتل پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ ایچ آر سی پی نے ان کے قتل کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے بہترین بیٹوں اور بیٹیوں کی بلاوجہ ہلاکت پر آنسو بہانا کافی نہیں۔ کمیشن نے آزادی، انصاف اور انسانی حقوق کی فکر کرنے والے شہریوں سے کہا کہ وہ ان لوگوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں جو ان کی امیدوں کو مایوسیوں میں بدل دیتے ہیں۔ ایچ آر سی پی نے ہائی کورٹ میں ایک درخواست بھی دائر کی جس میں قاتلوں کی تلاش کا عمل تیز کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے کے لیے ہائی کورٹ سے مداخلت کا مطالبہ کیا گیا۔

پروین رحمان کو لینڈ مافیا کی طرف سے قتل کی دھمکیاں ملتی رہیں

29 امدادی کارکن جاں بحق، 41 زخمی اور 21 اغوا ہوئے۔خیبر پختونخوا سب سے زیادہ خطرناک علاقہ ثابت ہوا جہاں 37 (41 فیصد) کارکنوں پر حملے کیے گئے۔ان میں سے 17 کارکن جاں بحق، 7 زخمی اور گیارہ اغوا ہوئے۔سندھ میں 20 کارکنوں پر حملے کیے گئے، جن میں سے تین جاں بحق، 8 زخمی اور 9 اغوا ہوئے۔

پولیو کے قطرے پلانے والے کارکن اور ان کے محافظ سب سے زیادہ تشدد کا نشانہ بنے۔جاں بحق ہونے والے افراد میں سے 7 اور زخمی ہونے والوں میں سے 17 وہ پولیس اہلکار تھے جو پولیو ویکسین پلانے والوں کی حفاظت پر مامور تھے۔کراچی میں 11، خیبر ایجنسی میں 18، پشاور میں 14 اور صوابی میں 11 کارکنوں پر حملے کئے گئے۔اغوا کیے گئے 21 افراد میں سے 9 کو اوسطاً پانچ ہفتوں تک قید میں رکھنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔تاہم خواتین کو فوری طور پر رہا کر دیا گیا۔

امدادی کارکنان پر ہونے والے حملے (جنوری تا نومبر 2013ء)

علاقہ	ہلاک ہوئے	زخمی ہوئے	اغوا ہوئے	حملوں کا شکار ہونے والے افراد کی کل تعداد
خیبر پختونخوا	20	17	0	37
فاٹا	3	7	11	21
سندھ	3	8	9	20
بلوچستان	3	2	1	6
پنجاب	0	6	0	6
اسلام آباد	0	1	0	1
کل تعداد	**29**	**41**	**21**	**91**

(ماخذ: او سی ایچ اے)

ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق 2013ء میں ملک بھر میں پولیو کارکنوں پر ہونے والے حملوں کے نتیجے میں پولیو ویکسین پلانے والے 20 کارکن اور ان کی حفاظت پر مامور 9 پولیس اہلکار ہلاک ہوئے۔زیادہ تر حملے خیبر پختونخوا کے علاقے فاٹا اور کراچی میں ہوئے۔

سیاسی تشدد

2013ء انتخابات کا سال تھا اور انتخابات سے پہلے سیاسی جماعتوں اور ان کے امیدواروں پر حملوں کے باعث سیاسی تشدد میں اضافہ ہوا۔طالبان نے متحدہ قومی موومنٹ، عوامی نیشنل پارٹی اور پاکستان

پیپلز پارٹی کے کارکنوں پر حملے کیے اور انہیں دھمکیاں دیں۔ عسکریت پسندوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ ان جماعتوں کی ریلیوں اور اجتماعات سے دور رہیں۔ اس کے باعث ان تینوں جماعتوں کی انتخابی مہم بُری طرح متاثر ہوئی کیونکہ وہ اپنے امیدواروں اور پارٹی کارکنوں کی سلامتی کے بارے میں فکرمند تھے۔ انہوں نے الزام لگایا کہ ان کے خلاف حملوں کی یہ لہر قدامت پسند جماعتوں کو اقتدار میں لانے کی ایک سازش تھی۔

طالبان کی جانب سے انتخابی ریلیوں اور دفاتر کو بم دھماکوں اور خودکش حملوں کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں کئی انتخابی امیدوار جاں بحق اور زخمی ہوئے۔ انتخابات سے پہلے سیاسی رقابتیں بھی تصادم کا باعث بنیں۔

بلوچستان میں باغی گروہوں نے انتخابات لڑنے والی سیاسی جماعتوں کو دھمکیاں دیں اور الیکشن کمیشن کے عملے کو حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ بلوچستان میں دیگر جماعتوں کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ (ن) اور نیشنل پارٹی کے دفاتر اور چند امیدواروں پر بھی حملے کیے گئے۔

مارچ میں خیبر ایجنسی کے علاقے باڑہ میں انتخاب لڑنے والے امیدواروں نے 11 مئی کے انتخابات کو ملتوی کرنے کا مطالبہ کیا کیونکہ انہیں ایک جنگجو گروہ نے دھمکیاں دی تھیں اور امیدواروں کے تحفظ کے حوالے سے کوئی مؤثر منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی تاکہ وہ اپنی انتخابی مہم جاری رکھ سکتے۔ ان جذبات کا اظہار فاٹا سے باہر کے علاقوں میں کیا گیا جہاں سیاسی جماعتوں کا کہنا تھا کہ اگر ان کے امیدواروں یا قائدین کو نشانہ بنایا گیا تو وہ سیاسی جماعتوں کے تحفظ کو یقینی بنانے میں ناکامی پر الیکشن کمیشن آف پاکستان کو ذمہ دار ٹھہرائیں گی۔

10 مئی کو ایچ آر سی پی نے تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات پر تشویش کا اظہار کیا۔ ان واقعات میں سیاسی جماعتوں کے امیدواروں اور کارکنوں پر حملے ان کے قتل، انتخابی مہم کے لیے قائم کیے گئے دفاتر اور ریلیوں پر حملے اور ملتان سے سابق وزیرِاعظم یوسف رضا گیلانی کے بیٹے کا اغوا شامل تھا۔ ایچ آر سی پی نے سکیورٹی اداروں سے مطالبہ کیا کہ پولنگ کے دن زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا جائے تاکہ انتخابات کو نقصان سے محفوظ رکھا جا سکے۔

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کی جانب سے پیش کی گئی پاکستان سکیورٹی رپورٹ 2013ء کے مطابق، سال کے دوران سیاسی قائدین اور کارکنوں کے خلاف تشدد کے 422 واقعات پیش آئے۔ جن میں 527 افراد جاں بحق اور تقریباً 1,100 زخمی ہوئے۔

کراچی

ملک کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر حریفانہ سیاسی مفادات پر مشتمل گروہوں کی موجودگی کے باعث خطرناک صورتِ حال سے دوچار رہا۔ ان سیاسی جماعتوں اور گروہوں نے اپنے عسکری ونگ یا مجرموں

پر مشتمل گروہ ترتیب دے رکھے تھے۔

کراچی میں قتل عام کی شرح اتنی زیادہ تھی کہ ٹارگٹ کلنگ اور تشدد کے واقعات میں روزانہ تقریباً ایک درجن افراد کا جاں بحق ہونا ایک معمول بن چکا تھا۔

رینجرز اور امن و امان قائم رکھنے والے دیگر اداروں کی جانب سے کیے گئے سکیورٹی آپریشن کے ذریعے تشدد کے واقعات عارضی طور پر ہی روکے جا سکے۔ اگرچہ مشتبہ افراد کو گرفتار کیا گیا تاہم مقدمات کی تحقیقات اور جرائم میں ملوث افراد پر مقدمہ چلانے میں ناکامی ایک سنگین مسئلہ رہا۔

شہر کے بڑے علاقے لسانی سطح پر تقسیم رہے اور فرقہ وارانہ تشدد عروج پر رہا۔ ڈاکٹروں، وکلاء اور دیگر پیشہ ور ماہرین کو ان کی فرقہ وارانہ شناخت کی بنا پر نشانہ بنایا گیا۔ 2013ء کے دوران لیاری کے ہزاروں مکینوں کو تشدد سے بچنے کے لیے نقل مکانی کرنا پڑی۔ متاثرہ افراد میں کچھی برادری کے اراکین اور اولڈ سلاٹر ہاؤس کالونی کے مکین شامل تھے۔

کراچی میں ہلاکتوں اور لاقانونیت سے متعلق ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق، کراچی میں تشدد کے واقعات میں 3,218 افراد ہلاک ہوئے۔ یہ تعداد 2012ء کے مقابلے میں 14 فیصد زیادہ تھی۔ 2012ء میں تشدد کے واقعات میں 2,823 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ ٹارگٹ کلنگ میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہوا اور ٹارگٹ حملوں میں 1,006 افراد کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا جن میں سیاسی کارکن بھی شامل تھے۔ یہ تعداد 2012ء کے مقابلے میں 19 فیصد زیادہ تھی۔ 2012ء میں اسی قسم کے واقعات میں 843 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ 2013ء کے دوران کراچی میں 268 سیاسی کارکن ہلاک ہوئے، جبکہ 2012ء میں 356 کارکن ہلاک ہوئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ 2013ء میں 111 افراد کو ان کے مذہبی مسلک کی بنیاد پر قتل کیا گیا جبکہ 2012ء میں یہ تعداد 104 تھی۔ پولیس مقابلوں میں 159 افراد ہلاک ہوئے جبکہ 2012ء میں پولیس مقابلوں میں ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد 107 تھی۔

2013ء کے دوران کراچی میں جرائم اور لاقانونیت کے واقعات میں 136 بچے جاں بحق ہوئے جبکہ گزشتہ برس یہ تعداد 114 تھی۔ لیاری کے گروہوں کے درمیان قبضے کی جنگ میں 110 شہری جاں بحق ہوئے، جبکہ 2012ء میں جاں بحق ہونے والوں کی تعداد 121 تھی۔

تشدد کے واقعات میں پولیس کا بھی بھاری جانی نقصان ہوا۔ 2013ء میں کراچی میں 169 پولیس اہلکار جاں بحق ہوئے جبکہ 2012ء میں یہ تعداد 133 تھی۔

بلوچستان:

بلوچستان کے عوام نے انتخابات سے پہلے صوبے میں امن وامان کی صورت حال کی بہتری کے حوالے سے جو اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ صوبائی حکومت کے پہلے چھ ماہ کے دوران حقیقت کا روپ نہ دھار سکیں۔ تشدد کا ارتکاب کرنے والوں میں کالعدم فرقہ وارانہ گروہوں کے علاوہ علیحدگی پسند باغی گروہ اور سکیورٹی ایجنسیاں بھی شامل تھیں۔

صوبے میں جبری گمشدگیوں کا نشانہ بننے والے شہریوں کی تعداد کچھ زیادہ ہو سکتی ہے، لیکن 18 لاپتہ افراد کے اہل خانہ نے ایچ آر سی پی سے رابطہ کیا اور کمیشن کو اپنے مقدمات کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ دیگر متعدد خاندانوں نے تفصیلات فراہم کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ انہیں خوف تھا کہ ان کے لاپتہ رشتہ داروں کو قتل کر دیا جائے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ صوبہ بلوچستان کو دھماکوں اور دہشت گردی کی دیگر کارروائیوں سے بھی شدید نقصان پہنچا جن میں مذہبی اقلیتوں، گیس اور بجلی کی تنصیبات کے علاوہ سرکاری املاک کو نشانہ بنایا گیا۔ اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز نے 2013ء میں ہونے والی اموات کے حوالے سے بلوچستان کو ملک کا سب سے زیادہ متاثرہ علاقہ قرار دیا۔ 2013ء میں بلوچستان میں دہشت گردی کے 487 واقعات میں 727 افراد جاں بحق اور 1,577 زخمی ہوئے۔ جاں بحق ہونے والوں میں 560 عام شہری 97 پولیس اہلکار اور 26 عسکریت پسند شامل تھے۔ صوبائی دارالحکومت کوئٹہ صوبے کا سب سے زیادہ متاثرہ علاقہ تھا

الیکشن ڈے پر امیدواروں کے حامیوں کے درمیان تصادم

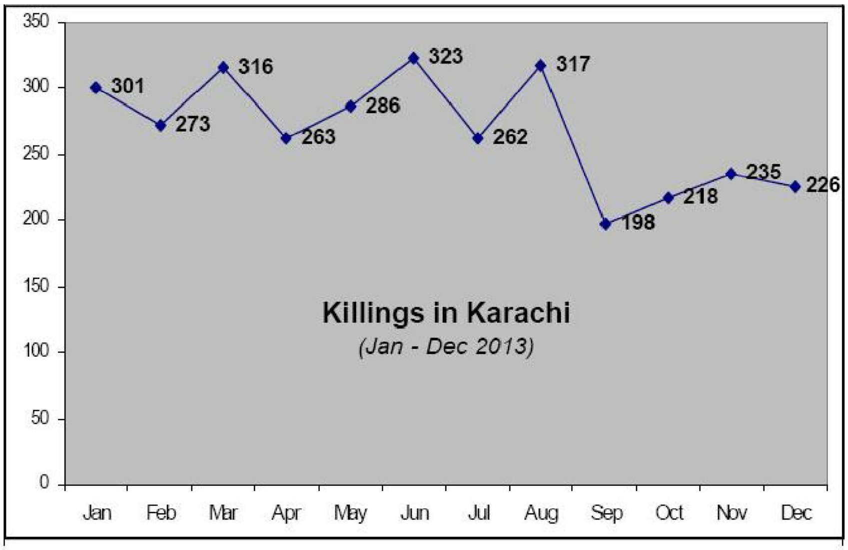

جنوری تا دسمبر 2013ء کے دوران کراچی میں ہونے والے قتل کی ماہانہ صورت حال

جہاں دہشت گردی کی 112 کارروائیوں میں 398 افراد جاں بحق اور 1,043 زخمی ہوئے۔

فرقہ پرست قاتلوں نے سال کے اوائل میں بلوچستان پر حملہ کیا۔ جنوری اور فروری کے مہینوں میں انہوں نے دھماکے کر کے کوئٹہ کی ہزارہ شیعہ برادری کے 200 افراد کو قتل کر دیا۔ لوگوں کی مایوسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خون جما دینے والی سردی میں اس کمیونٹی کے لوگ کئی روز تک سڑکوں پر خیمہ زن رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک ان کا حکومت کو برطرف کرنے کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا جاتا، وہ نعشوں کی تدفین نہیں کریں گے۔

صوبے میں لاقانونیت نے کاروبار اور صوبے کے اندر اور باہر سفر کو بُری طرح متاثر کیا۔ علیحدگی پسند باغیوں نے صوبے میں مقیم غیر بلوچوں کو نشانہ بنایا۔ اگست میں ایچ آر سی پی نے بلوچستان میں 13 مزدوروں کے قتل کی مذمت کی۔ قتل ہونے والے زیادہ تر افراد کا تعلق پنجاب سے تھا اور وہ عید منانے اپنے گھروں کو واپس آ رہے تھے۔ حملے کی ذمہ داری ایک باغی گروہ نے قبول کی اور اس نے اسے یہ کہتے ہوئے جائز ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ افراد سکیورٹی فورسز کے لیے کام کرتے تھے۔ تاہم مقامی پولیس کی رپورٹوں میں اس دعوے کی تردید کی گئی۔

فاٹا

افغانستان کی سرحد سے ملحقہ وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقے انتہا پسند گروہوں کے ظالمانہ حملوں کا براہِ راست نشانہ بنتے رہے۔ 2013ء کے دوران جبری بے دخلی، ڈرون حملے اور جرائم میں ملوث افراد اور

خودکش بمباری کے متعدد واقعات نے پشاور کو ہلا کر رکھ دیا

عسکریت پسند عناصر کی جانب سے شہریوں کا قتل اور اغواء علاقے کے اہم ترین مسائل تھے۔ علاقے میں سکیورٹی فورسز کے آپریشن لوگوں کی بے دخلی کا باعث بنے اور چند ایسی اطلاعات بھی موصول ہوئیں کہ جب کسی علاقے کو عسکریت پسندوں سے آزاد کروالیا جاتا تو اس کے بعد بے گھر افراد کو یہ کہا جاتا کہ وہ وعدہ کریں کہ اپنے علاقے میں واپس جانے کے بعد وہ طالبان کو اپنے علاقوں سے دور رکھنے کے لیے رضا کار فوج تشکیل دیں گے۔ علاقائی معیشت تباہ ہو چکی تھی اور یہ علاقہ جو صرف چند سال پہلے پورے ملک کو پھل اور سبزیاں فراہم کرنے کے حوالے سے جانا جاتا تھا، اب تقریباً ہر چیز کے لیے ملک کے دیگر علاقوں سے آنے والی رسد پر انحصار کرنے لگا تھا۔ 2013ء کے دوران فاٹا کے 7 قبائلی اضلاع میں 293 حملے کیے گئے جن میں 425 افراد جاں بحق اور 932 زخمی ہوئے۔

گلگت بلتستان

اگرچہ 2013ء میں شمالی علاقوں کو ملک کے دیگر علاقوں سے ملانے والی واحد شاہراہ پر شیعہ برادری بڑے پیمانے پر ہونے والی ہلاکتوں سے تو محفوظ رہی تاہم فرقہ وارانہ انتشار کی آگ بھڑکانا بہت آسان تھا۔

اس سال اس علاقے کو اس وقت ایک بڑا دھچکا لگا جب دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں سے ایک نانگا پربت کے بیس کیمپ پر 10 غیر ملکی کوہ پیماؤں کو قتل کر دیا گیا۔ گلگت بلتستان کی معیشت کا انحصار کافی حد تک سیاحت پر ہے اور ایک ایسے وقت میں، جب سیاحت کا موسم عروج پر تھا، سیاح پاکستان آنے سے کترانے

لگے۔ سڑک کی مرمت یا بعدازاں راولپنڈی میں فرقہ وارانہ تصادم کے بعد سکیورٹی خطرات کی بنا پر سڑک کی بندش اور بسوں کا قافلوں کی شکل میں سفر کرنا شہریوں کے مصائب میں مزید اضافے کا باعث بنا۔

خودکش حملے

2013ء کے دوران ملک کا کوئی بھی علاقہ دہشت گردی کی کارروائیوں سے محفوظ نہیں رہا لیکن چند علاقوں کو زیادہ شدت سے نشانہ بنایا گیا۔ خودکش حملوں کے سب سے زیادہ واقعات خیبر پختونخوا میں پیش آئے جن میں سکیورٹی فورسز، سیاسی قائدین، اقلیتی فرقوں اور مذہبی اقلیتوں کو نشانہ بنایا گیا۔

ستمبر میں دو خودکش حملہ آوروں نے پشاور کے آل سینٹس چرچ پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں 100 سے زائد لوگ جاں بحق ہوئے۔ ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ پاکستان کے مسیحی شہریوں کے خلاف حملے میں اتنی بڑی تعداد میں لوگ ہلاک ہوئے تھے۔

سفارشات

1- جدید طریق کار سے استفادہ کرتے ہوئے باقاعدہ تحقیقات کرنے اور جرائم میں ملوث افراد کے خلاف مؤثر قانونی کارروائی کرنے کے علاوہ اور کوئی متبادل راستہ موجود نہیں۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں سے یہ کہا جائے کہ وہ ان دونوں معاملات پر توجہ دیں۔ اس کے علاوہ انہیں متفرق ذمہ داریوں سے آزاد کیا جائے تاکہ جرائم کا جاں فشانی سے مقابلہ کیا جا سکے۔

2- اسلحے پر پابندی عائد کیے بغیر ملک میں جاری قتل عام کو کسی صورت نہیں روکا جا سکتا۔ ایسا صرف اس وقت ہو سکتا ہے، جب ریاست لوگوں کو یقین دہانی کرا سکتی ہو کہ ان کا تحفظ اس کی پہلی ترجیح ہے۔ ملک کو اسلحے اور دھماکہ خیز مواد سے پاک کرنے کے لیے صوبائی حکومتوں کو مل کر کام کرنا چاہیے اور اس حوالے سے پاکستان کو اپنے ہمسایہ ممالک سے تعاون کرنا چاہیے تاکہ انتہا پسندی کے اس عفریت سے نجات حاصل کی جا سکے۔

3- ریاست کو جنگ سے متاثرہ علاقوں فاٹا اور بلوچستان میں اپنی رٹ کی بحالی کے لئے اقدامات کرنے چاہئیں اور اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف کارروائی کرتے وقت قانونی حدود اور انسانی حقوق کا خیال رکھا جائے گا۔

4- فرقہ وارانہ دہشت گردی کے خطرے کا براہ راست مقابلہ کیا جائے اور اس کا ایک ہی دفعہ خاتمہ کر دیا جائے۔ ان دعووں کی تحقیقات کی جائے کہ فرقہ کی بنیاد پر قتل کرنے والے قاتلوں کو قانون نافذ

کرنے والے اداروں کے کن لوگوں کی حمایت حاصل ہے اور اگر کوئی قصوروار پایا جائے تو اس کے خلاف سخت قانونی کارروائی کی جائے۔

5- تمام سیاسی جماعتوں کو کراچی میں جاری احمقانہ قتل عام کو روکنے کے لیے مل کر کام کرنا چاہیے۔ انہیں عسکریت پسند اور مجرمانہ گروہوں کی حمایت ترک کر دینی چاہیے۔ وفاق اور صوبائی حکومتوں کو شہریوں کے قتل عام پر خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ قاتلوں کو گرفتار کیا جائے ان پر مقدمہ چلایا جائے اور سزا دی جائے تا کہ سزا سے استثنا کا خاتمہ کیا جا سکے۔

قید خانے، قیدی اور جبری گمشدگیاں

کسی بھی شخص کو جسے گرفتار کیا جاتا ہے' گرفتاری کی وجوہات بتائے بغیر [جتنا بھی جلدی ممکن ہو سکے] حراست میں نہیں رکھا جائے گا۔ اسے اپنی مرضی کے وکیل سے مشورہ کرنے اور قانونی تحفظ حاصل کرنے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

ہر وہ شخص جسے گرفتار کرنے کے بعد حراست میں رکھا گیا ہے' گرفتاری کے 24 گھنٹے کے اندر' مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ آئین پاکستان ۔ آرٹیکل- 10 (1)اور (2)]

ہر انسان کا احترام اور وقار اور بشرطیکہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے' خلوت اور تنہائی ناقابل دخل اندازی ہے۔

کوئی معلومات' شہادت' ثبوت حاصل کرنے کی خاطر' کسی شخص کو تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

آئین پاکستان [آرٹیکل-14-(1)اور (2)]

کسی شخص کو اذیت رسانی یا ظالمانہ' غیر انسانی یا رسوا کن سلوک یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-5]

ہر شخص کو ہر کہیں قانون کے روبرو خود کو انسان تسلیم کروانے کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل- 6]

کسی شخص کو غیر قانونی گرفتاری، حراست یا جلاوطنی کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 7]

2013ء کے دوران جیلوں کا نظام غیر معمولی مسائل کا شکار رہا۔ جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدیوں کی تعداد، قیدیوں کے ساتھ ہونے والا ناروا سلوک، تشدد، غیر تربیت یافتہ عملہ اور جوابدہی کا انتہائی ناقص طریق کار ان مسائل میں شامل ہیں۔ جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدیوں کی تعداد کا بنیادی سبب زیر حراست ملزموں کا جیل میں رکھا جانا ہے اور اس کی وجہ زیر حراست ملزموں کے مقدمات کی سماعت میں برسوں کی تاخیر ہے۔ اس کے علاوہ انتظامی مسائل بھی مقدمات کی سماعت میں تاخیر کا سبب بنتے ہیں۔ مثال

کے طور پر قیدیوں کو عدالتوں میں لے جانے والی گاڑیوں کو ایندھن دستیاب نہیں ہوتا اور یوں زیرِ حراست قیدیوں کو عدالتوں میں نہیں لے جایا جا سکتا جس کے باعث مقدمات کی سماعت میں تاخیر واقع ہوتی ہے۔

اس عرصے کے دوران سزا یافتہ قیدیوں کی بہتری ہمارے حکام کی ترجیحات میں شامل نہیں تھی۔ جیلوں میں قیدیوں کی گنجائش سے زیادہ تعداد کے باعث ان کی بہتری اور فلاح و بہبود کے اقدامات پر عملدرآمد نہ کیا جا سکا۔ سرکاری حکام نے اعتراف کیا ہے کہ اس سال کے دوران جیلوں میں منشیات اور اسلحہ کی دستیابی ناممکن نہیں تھی۔

ایک عام شکایت یہ تھی کہ جیل کا عملہ قیدیوں سے ان کے اہل خانہ کی ملاقات کروانے کے لیے رشوت کا مطالبہ کرتا ہے، اگرچہ 2013ء میں پنجاب کی 32 جیلوں میں اس وباء کو روکنے کے لیے چند اقدامات کیے گئے۔ ملک بھر کی جیلوں میں ہزاروں موبائل فونز کی برآمدگی سے متعلق رپورٹوں سے ان الزامات کو تقویت ملی کہ جیل کا عملہ رقم کے بدلے ایسی سہولیات فراہم کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بہت سے قیدی جیل کے اندر رہتے ہوئے کارروائیاں کرتے تھے۔ اس مسئلہ پر قابو پانے کے لئے پنجاب میں جیل کے عملے کو جیل کی حدود میں موبائل فون کے استعمال سے روک دیا گیا۔

نومبر میں وزیراعظم کو کراچی میں تشدد سے متعلق ایک بریفنگ کے دوران مطلع کیا گیا کہ سندھ کی جیلوں میں 41 جعلی قیدی موجود تھے، جبکہ اصل قیدی آزاد گھوم رہے تھے۔ معاملے کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

سال کے آخر میں چیف جسٹس آف پاکستان نے کہا کہ وہ لوگ جو تعزیراتی نظام سے واقفیت رکھتے تھے، حقیقت سے آگاہ تھے کہ پاکستان میں جیل کا نظام ہرجانہ اور انتقام کی بنیاد پر قائم ہے۔

نئی منتخب ہونے والی حکومت نے کافی سوچ و بچار اور سزائے موت کے متعدد مجرموں کی پھانسی کے احکامات جاری کرنے کے بعد، بالآخر سزائے موت پر عملدرآمد معطل کرنے کا وہ فیصلہ برقرار رکھا جو 2009ء میں کیا گیا تھا۔

ملک میں جبری گمشدگیوں کی غیر قانونی سرگرمیوں کا سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ یہ ملک کے دیگر علاقوں میں بھی پھیل گیا۔ اس معاملے سے متعلق اعلیٰ عدالتوں میں ہونے والی کارروائیاں بھی ان افراد کو ایسے جرائم کرنے سے نہ روک سکیں۔

جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدیوں کی موجودگی

ملک کے زیادہ تر علاقوں میں جیل حکام اور قیدیوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ رہا کہ جیلیں گنجائش سے زیادہ قیدیوں سے بھری پڑی تھیں۔ اس کی بڑی وجہ حکام کا خودسری کا رویہ ہے جس کے تحت وہ

عام شہریوں کی قیمت پر اہم شخصیات کے لیے ضرورت سے زیادہ سکیورٹی کی ایک تصویر

قید کے سوا سزا کے دوسرے طریقوں پر غور کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔ 2013ء کے آخر تک سندھ نے انسانی حقوق کے کمیشن کو اعداد و شمار مہیا نہیں کئے۔ تاہم دوسرے صوبوں کی جیلوں میں قید اُن ملزموں کی تعداد 64 فیصد (38097) تھی جن کے مقدمات زیر سماعت تھے۔ سندھ کے قیدیوں کے بارے میں سال بھر کے کوائف ظاہر کرتے ہیں کہ اس صوبے کی جیلیں بھی ایسی ہی بدنظمی کا شکار تھیں۔ سندھ کے استثنا کے ساتھ، جیلوں میں ان ملزموں کی تعداد جن کے مقدمات زیر سماعت تھے، جیلوں میں قیدیوں کی گنجائش (32794) کے مقابلے میں 16 فیصد زیادہ تھی۔

خیبر پختونخوا کی 22 جیلوں میں قیدیوں کی منظور شدہ گنجائش 7,982 قیدی ہے لیکن ان جیلوں میں 8,139 قیدی تھے۔ ان میں سے 5,217 قیدیوں کے مقدمات زیر سماعت تھے۔

بلوچستان میں صورتحال قدرے بہتر تھی۔ صوبے کی 11 جیلوں میں قیدیوں کی منظور شدہ تعداد 2,585 تھی اور وہاں موجود قیدیوں کی تعداد 2,862 تھی۔ زیر سماعت مقدمات والے قیدیوں کی تعداد 1,288 تھی۔ تاہم کم عمر بچوں کے حوالے سے صورتحال اس کے برعکس تھی، چونکہ صوبے کی جیلوں میں موجود کم عمر 107 قیدیوں میں سے صرف 3 کو سزا سنائی گئی۔

لیکن پنجاب کی صورتحال سب سے زیادہ خراب تھی جہاں 32 جیلوں میں 48,225 قیدی رکھے گئے تھے جبکہ گنجائش 21,527 قیدیوں کی تھی۔ مجموعی طور پر 31,401 قیدیوں کے مقدمات زیر سماعت تھے۔

2013ء کے آخر میں پنجاب کی 32 جیلوں میں سے صرف تین جیلوں میں قیدیوں کی تعداد منظور شدہ تعداد سے کم تھی۔ اٹھارہ جیلوں میں قیدیوں کی تعداد گنجائش سے 100 فیصد سے بھی زیادہ تھی۔ ان میں سے آٹھ جیلوں میں تو تعداد دوسو فیصد سے بھی زیادہ تھی۔ ملتان سنٹرل جیل میں 301 فیصد تک زیادہ تعداد تھی۔ اس جیل میں 229 قیدیوں کی گنجائش تھی جبکہ یہاں 919 قیدی رکھے گئے تھے۔ پنجاب میں 48225 قیدیوں میں سے صرف 16824 قیدی سزایافتہ تھے۔ ان میں سے 5907 قیدیوں کو سزائے موت دی گئی تھی۔ باقی 31401 قیدی اپنے مقدمات کی سماعت کے منتظر تھے۔ ان تمام قیدیوں میں 783 بچے تھے جن میں ایک لڑکی بھی تھی۔

گلگت بلتستان کی جیل میں قیدیوں کی منظور شدہ تعداد 700 تھی جبکہ وہاں 266 قیدی رکھے گئے تھے۔ گلگت بلتستان واحد علاقہ تھا جہاں قیدیوں کی مجموعی تعداد جیل عملے کی تعداد سے کچھ زیادہ تھی۔ عملے کی تعداد 249 تھی جبکہ 3 عہدے خالی تھے۔

تاہم زیرِ سماعت مقدمات کی شرح کے حوالے سے یہ علاقہ بھی دیگر علاقوں سے مختلف نہیں تھا۔ گلگت بلتستان کی جیلوں میں تقریباً 191 قیدی ایسے تھے جن کے مقدمات زیرِ سماعت تھے۔

پاکستان کی جیلوں میں قید افراد۔2013ء

علاقہ	جیلوں کی کل تعداد	قیدیوں کی منظور شدہ تعداد	قیدیوں کی کل تعداد	زیرِ سماعت مقدمات والے قیدی
پنجاب	32	21,527	48,225	31,401
خیبر پختونخوا	22	7,982	8,139	5,217
بلوچستان	11	2,585	2,862	1,288
گلگت بلتستان	7	700	266	191
کل تعداد	**72**	**32,794**	**59,492**	**38,097**

جیلوں میں قید خواتین اور بچے

علاقہ	خواتین	بچے	قیدیوں کی کل تعداد
پنجاب	838	783	48,225
خیبر پختونخوا	121	196	8,139
بلوچستان	39	107	2,862
گلگت بلتستان	2	0	266
مجموعی تعداد	**1,000**	**1,086**	**59,492**

ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق، 2013ء کے دوران جیلوں میں ایک خاتون قیدی

سمیت کم از کم 63 قیدی ہلاک اور 53 زخمی ہوئے۔اس کے علاوہ مختلف بیماریوں کے باعث تقریباً 28 قیدی جاں بحق ہوئے۔

جیلوں میں صحت کی سہولیات کی کمی برقرار رہی۔ کہا جاتا تھا کہ جیلوں کی خراب صورتحال سے قیدیوں کی صحت پر بُرے اثرات مرتب ہوئے۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قیدیوں کی خوراک کا معیار اور جیلوں کی صورتحال کو بہتر بنانا حکام کی ترجیح میں شامل نہیں تھا۔پنجاب کی جیلوں کے سربراہ کا کہنا تھا کہ حکومت ہر قیدی کی خوراک کے لیے 70 روپے یومیہ خرچ کرتی ہے، جو بہت سے لوگوں کے لئے حیرت کا باعث تھی۔

دسمبر میں پنجاب کی جیلوں کے سربراہ نے سپریم کورٹ کے ایک تین رکنی بنچ کو بتایا کہ گزشتہ ماہ کوٹ لکھپت جیل لاہور میں خواتین قیدیوں کے لیے تیار کیے گئے کھانے میں سے ایک چھپکلی برآمد ہوئی جس کے بعد 2 ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور ایک جیل وارڈن کو معطل کر دیا گیا۔

دسمبر کے اوائل میں پنجاب کی تمام 32 جیلوں میں قیدیوں کے اہل خانہ اور قیدیوں کے لئے مفت ہیلپ لائن کا اجراء کیا گیا جس کے باعث وہ اپنی شکایات حکام تک پہنچا سکتے تھے۔اس اقدام کا مقصد جیل اہلکاروں کو جوابدہ بنانا، کرپشن میں کمی لانا اور جیل اہلکاروں تک رسائی کے حوالے سے ملاقاتیوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا تھا۔

جیل توڑنا

سال کے دوران خیبر پختونخوا کے ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان کی جیل پر طالبان کا حملہ، اپریل 2012ء میں بنوں جیل پر حملے کی یاد دلاتا ہے جس میں 250 سے زائد قیدی بھی فرار ہو گئے تھے۔ بنوں جیل کا واقعہ حکام کی غفلت اور نااہلی کے باعث ظہور پذیر ہوا تھا۔اس واقعے کے حوالے سے ایک خفیہ سازش کے چند اشارے ملے۔

جولائی میں تقریباً 70 حملہ آور ڈیرہ اسمٰعیل خان جیل پر حملہ کر کے 250 سے زائد قیدیوں کو چھڑا کر لے گئے۔اس حملے کے دوران چار پولیس اہلکاروں اور چار شیعہ قیدیوں کے گلے کاٹ کر قتل کیا گیا۔

اس واقعے کے بعد قیدیوں اور جیلوں سے متعلق تمام تر بحث کا محور جیلوں کی سیکیورٹی میں اضافہ اور خطرناک مجرموں کو قید میں رکھنے کے لیے نئی ہائی سیکیورٹی جیلوں کی تعمیر رہا۔

دسمبر میں پنجاب کے وزیر برائے جیل خانہ جات نے صوبائی اسمبلی کو بتایا کہ 12 نئی جیلیں تکمیل کے آخری مراحل میں تھیں۔انہوں نے کہا کہ پنجاب کی جیلوں میں گنجائش سے 26,700 زیادہ قیدی موجود

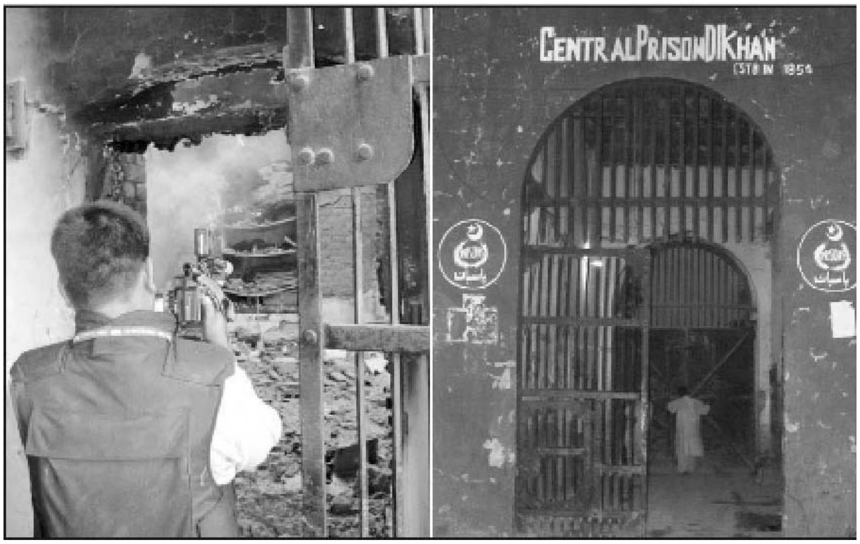

ڈیرہ اسماعیل خان کی سنٹرل جیل جہاں سے طالبان 250 سے زائد قیدی آزاد کروا کر لے گئے

تھے۔ تاہم حزب اقتدار یا حزب اختلاف کے قانون سازوں نے اس بات پر کوئی توجہ نہ دی کہ قیدیوں کی زیادہ تعداد کے پیش نظر کیا اقدامات کیے جائیں۔

جیلوں میں موبائل فون جام کرنے والی مشینوں کی تنصیب پر خاصی بحث ہوئی لیکن ان کی تنصیب صرف راولپنڈی کی اڈیالہ جیل میں کی گئی۔

جیلوں میں قید ماہی گیر

2013ء میں پاکستان اور ہندوستان نے اپنی سمندری حدود کی مبینہ خلاف ورزی کرنے پر تواتر کے ساتھ ماہی گیروں کی گرفتاریوں کا سلسلہ جاری رکھا چونکہ بحیرہ عرب میں دونوں ملکوں کی سمندری حدود کی حدبندی انتہائی ناقص طور پر کی گئی ہے اور ماہی گیری کے لیے استعمال ہونے والی کشتیوں میں وہ ٹیکنالوجی موجود نہیں تھی جو ان کی درست سمت کے تعین کے لیے درکار رہتی ہے۔ ایک دفعہ جب انہیں قید کر لیا جاتا ہے تو اس کے بعد وہ پاک بھارت تعلقات کے مجموعی محرکات میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور وہ اکثر اوقات سزا کی میعاد پوری ہونے کے بعد بھی جیلوں میں قید رہتے ہیں۔ دونوں ممالک کے درمیان ناخوشگوار سفارتی تعلقات کے باعث ان افراد کی واپسی سے متعلق شرائط کو پورا کرنے میں عام طور پر ایک طویل عرصہ لگتا تھا۔ قید کیے گئے ماہی گیروں کے لیے واحد امید یہ تھی کہ انہیں ''بحالی اعتماد کے اقدامات'' کے تحت یا انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر رہا کر دیا جائے۔

پاکستان کے ماہی گیروں نے 2013ء کے دوران کئی مرتبہ ریلیاں نکالیں جن میں انہوں نے اپنے اُن ساتھیوں اور رشتے داروں کی رہائی کا مطالبہ کیا، جنہیں بھارتی حکام نے سمندر میں مچھلیاں پکڑنے کے دوران گرفتار کیا تھا۔ انہوں نے شکایت کی کہ حکومت نے بھارت میں قید پاکستانی ماہی گیروں کو واپس لانے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ انہوں نے ان کی رہائی کو یقینی بنانے کے لیے حکومت سے مدد کی اپیل کی۔ کہا جاتا تھا کہ بھارتی جیلوں میں تقریباً 180 پاکستانی ماہی گیر قید تھے۔

دسمبر میں پاکستان فشر فوک فورم (پی ایف ایف) نے اس دس رکنی وفد کے مطالبات کی حمایت کی جس نے پاکستان انڈیا پیپلز فورم فار پیس اینڈ ڈیموکریسی اور نیشنل فش ورکرز فورم انڈیا کی نمائندگی کرتے ہوئے بھارتی وزیراعظم سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں بھارتی جیلوں سے پاکستانی ماہی گیروں کی رہائی پر زور دیا گیا تھا۔ پاکستان فشر فوک فورم نے پاکستانی اور بھارتی حکام سے کہا کہ وہ غریب ماہی گیروں کی گرفتاریوں کی روک تھام کے لیے کوئی مستقل حل تلاش کریں۔ اس نے سمندر کے 100 ناٹیکل میل تک کے علاقے کو فری زون قرار دینے کی تجویز پیش کی۔ پی ایف ایف نے دونوں ممالک کی حکومتوں سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ اُن ''ظالمانہ کارروائیوں'' سے گریز کریں جن کا تذکرہ ماہی گیری کی کشتیوں پر ہونے والی فائرنگ کے حوالے سے کیا جاتا ہے اور جس کے نتیجے میں متعدد ماہی گیر ہلاک ہوئے۔

میڈیا کی اطلاعات کے مطابق زیر جائزہ سال کے دوران پاکستان میں قید بھارتی ماہی گیروں کو گروہوں کی شکل میں رہا کیا گیا۔ پاکستان نے 25 مئی 2013ء کو 45 بھارتی ماہی گیروں، 17 جون کو ایک اور 9 جولائی کو 7 بھارتی سول قیدیوں کو رہا کیا۔ اطلاعات کے مطابق اکتوبر میں پاکستان نے چند روز قبل گرفتار کئے جانے والے 40 ماہی گیروں میں سے تیس کو رہا کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان افراد کو انسانی بنیادوں پر رہا کیا اس لئے کہ گرفتار ہونے والے ماہی گیروں میں بچے اور عمر رسیدہ لوگ بھی شامل تھے۔

اگست میں پاکستان کی وفاقی وزارت داخلہ نے اعلان کیا کہ بھارتی ماہی گیروں کو ان کی قومیت کی تصدیق کے بعد رہا کر دیا جائے گا، اس اعلان کے نتیجے میں پاکستان نے 337 بھارتی ماہی گیروں کو رہا کر دیا۔

قیدیوں کی رہائیوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ سمندر میں ماہی گیروں کی گرفتاریوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ دونوں اطراف کے ماہی گیروں کے مصائب کے خاتمے کے لیے ایک مستقل حل کی تلاش ایک پیچیدہ مسئلہ بنا رہا۔

بھارت میں قید پاکستانی

جولائی میں اسلام آباد نے بھارت کی جانب سے فراہم کردہ پاکستانی قیدیوں کی فہرست پر اعتراض

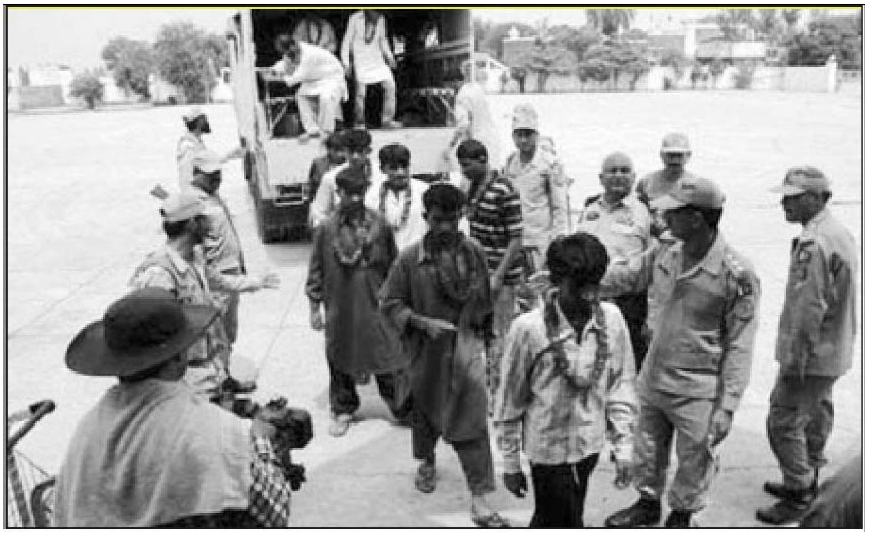

بھارتی جیلوں سے رہا ہو کر وطن واپس آنے والے پاکستانی ماہی گیر

کرتے ہوئے کہا کہ اس میں 99 پاکستانیوں کے ناموں کا اندراج نہیں تھا۔

پاکستان اور بھارت نے مئی 2008ء میں قیدیوں کی سفارت خانے تک رسائی کے معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ اس معاہدے کے تحت دونوں ممالک ہر سال یکم جنوری اور یکم جولائی کو قیدیوں کی فہرست کا تبادلہ کرتے تھے۔

وزیر اعظم پاکستان کے مشیر برائے خارجہ امور کا کہنا تھا کہ بھارت میں قید پاکستانی قیدیوں کی جو فہرست بھارت میں پاکستان ہائی کمشن کو دی گئی اس میں 386 پاکستانی قیدیوں کے ناموں کا اندراج تھا جبکہ اسلام آباد کو یقین تھا کہ بھارتی جیلوں میں قید پاکستانیوں کی تعداد 485 تھی۔

بھارت کی جانب سے فراہم کردہ فہرست کے مطابق بھارتی جیلوں میں 108 ماہی گیر اور 278 دیگر پاکستانی شہری قید تھے۔ لیکن پاکستانی دفتر خارجہ کا کہنا تھا کہ بھارت میں 172 ماہی گیر اور 313 دیگر شہری قید تھے۔ پاکستان نے یہ فہرست میڈیا، این جی اوز کی معلومات اور قیدیوں کے رشتے داروں کی جانب سے موصول ہونے والی درخواستوں کی بنیاد پر تیار کی تھی۔

پاکستانی حکام کی جانب سے جولائی میں بھارتی ہائی کمیشن کو فراہم کردہ فہرست کے مطابق پاکستان میں 491 بھارتی افراد قید تھے جن میں 437 ماہی گیر اور 54 دیگر شہری تھے۔

وزیر اعظم کے مشیر نے دعویٰ کیا کہ بھارت نے کسی بھی پاکستانی قیدی کو رہا نہیں کیا تھا حتیٰ کہ ان سول قیدیوں کو بھی نہیں جو اپنی سزا کاٹ چکے تھے اور جن کی قومیت کی تصدیق بھی ہو چکی تھی۔ دونوں ممالک

کے بیچ دوطرفہ معاہدے کے تحت دونوں حکومتوں پر یہ لازم تھا کہ وہ قیدیوں کی قومیت کی تصدیق اوران کی سزا پوری ہونے کے بعدانہیں ایک ماہ کے اندر رہا کردیں۔

قیدیوں کی ہلاکتیں اور ''انتقامی کارروائی''

اپریل میں لاہور کی جیل میں چند قیدیوں نے بھارتی قیدی سربجیت سنگھ کوشدید زخمی کردیا، جسے 1991ء میں بھارت کے لیے جاسوسی کرنے کے الزام میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ وہ ہسپتال میں کچھ عرصہ کوما میں رہنے کے بعد دم توڑ گیا۔ ایچ آر سی پی نے حملے کی مذمت کی اور حکومت سے حملے میں ملوث قیدیوں کوسزا دینے کا مطالبہ کیا۔ ایچ آر سی پی نے اس بات پر بھی زور دیا کہ دونوں ممالک اپنی جیلوں میں ایک دوسرے کے قیدیوں کے حالات کوبہتر بنائیں۔

سربجیت سنگھ کی موت اس وقت واقع ہوئی جب پاک بھارت ججوں کی مشترکہ کمیٹی کے اراکین پاکستانی جیلوں میں بھارتی قیدیوں کے حالات کا جائزہ لینے پاکستان آئے ہوئے تھے۔

اگلے ہفتے جموں کی ایک جیل میں قتل کے مجرم ایک سابق بھارتی فوجی نے ثناء اللہ نامی پاکستانی قیدی پر حملہ کیا۔ ثناء اللہ کے دماغ پر شدید چوٹیں آئیں اور بعدازاں وہ ایک ہسپتال میں دم توڑ گیا۔

دونوں قیدیوں کا قتل دونوں ممالک کی جیلوں میں قید بھارتی اور پاکستانی قیدیوں کے ساتھ ہونے والے برتاؤ کی جانب توجہ مبذول کرانے کا باعث بنا لیکن ان کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات نہ کیے گئے۔

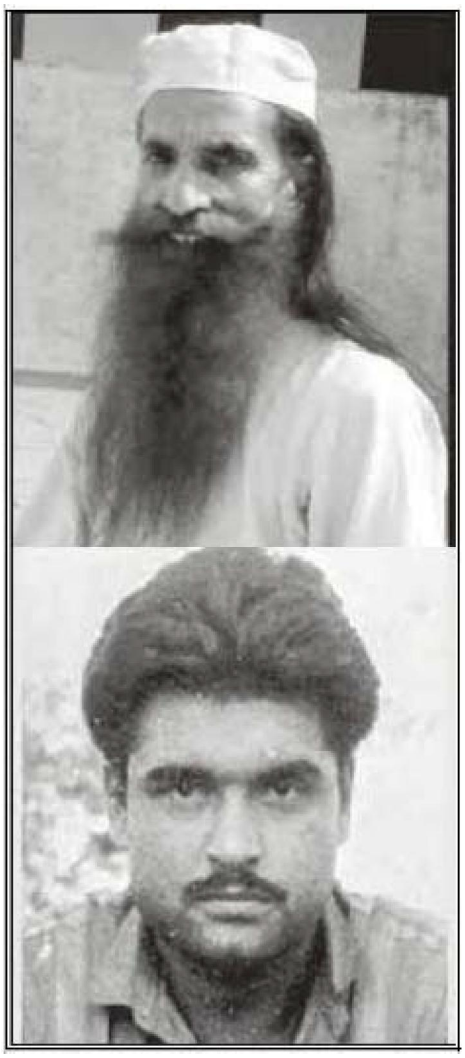

ثناء اللہ (اوپر) اور سربجیت (نیچے) جن کی قومیتوں نے ان کے قتل میں اہم کردار ادا کیا

سزائے موت

پاکستان میں 2013ء میں موت کی سزا پر پابندی برقرار رہی۔ سال کے دوران کسی کو بھی پھانسی نہیں دی گئی۔ تاہم 2013ء کے آخری چھ ماہ کے دوران ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب پانچ سالہ پابندی کا خاتمہ اور پھانسیوں کا دوبارہ آغاز ہو جائے گا۔ بالآخر اکتوبر میں حکومت نے پھانسیوں پر پابندی برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا تاہم ایسا دکھائی دیتا تھا کہ مستقبل قریب میں پھانسیوں پر مستقل پابندی شاید برقرار نہ رہے۔

جولائی میں ایچ آر سی پی نے تشویش کا اظہار کیا کہ جس صدارتی حکم کے تحت 2008ء میں سزائے موت پر پابندی لگائی گئی تھی، اس کی میعاد کے اختتام پر پابندی کا حکم دوبارہ جاری نہیں کیا گیا۔ یہ میعاد جون میں ختم ہو چکی تھی۔ ایچ آر سی پی نے وزیراعظم کو خط لکھا اور پابندی کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔ کمیشن نے واضح کیا کہ چونکہ ملک کی جیلوں میں سزائے موت کے آٹھ ہزار قیدی موجود ہیں اور ہزاروں مزید افراد کو ایسے جرائم میں گرفتار کیا گیا ہے یا ان پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے جن کی سزا موت ہے۔ کمشن کے مطابق ریاست کے ہاتھوں اتنی بڑی تعداد میں زندگیاں چھن جانے کا خطرہ پہلے کبھی نہیں تھا۔

ایچ آر سی پی نے وزیراعظم کو دعوت دی کہ وہ سزائے موت کی مخالفت میں ایچ آر سی پی کی طرف سے دی جانے والی وجوہات پر غور کریں۔ کمیشن نے نشاندہی کی کہ 2008ء میں حکومت کی جانب سے سزائے موت کی منسوخی سے لے کر اب تک کے عرصے کے دوران قانون، انصاف کے انصرام، پولیس تفتیش کے طریق کار میں پائی جانے والی خامیوں اور دیرینہ بدعنوانی کی صورتحال میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ کمیشن نے نشاندہی کی کہ سزائے موت کے باعث نظامِ انصاف کے غلط استعمال کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ اس نے اس حقیقت کی بھی نشاندہی کی کہ چونکہ یہ سزا غیر متبدّل ہے اس لیے یہ قابل قبول نہیں۔ اس نے حکومت کو یہ بھی باور کرایا کہ یہ دلیل صحیح ثابت نہیں ہوئی کہ پھانسی دینے سے خطرناک جرائم کی روک تھام ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ سزائے موت سے ملک کی امن عامہ کی صورتحال میں کوئی بہتری نہیں آئی۔

جس وقت سزائے موت پر دوبارہ عملدرآمد پر غور کیا جا رہا تھا، اس دوران طالبان نے دھمکی دی کہ اگر طالبان قیدیوں کو پھانسی دی گئی تو وہ حکمران جماعت سے اس کا بدلہ لیں گے۔ اس بات کا اندیشہ بھی موجود تھا کہ پھانسیوں کے دوبارہ آغاز سے پاکستانی برآمدات کی یورپی ممالک تک بلاٹیکس رسائی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

حکومت نے سزائے موت پر عارضی پابندی کی وجوہات کے بارے میں عوام کو آگاہ کرنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے، تاہم ایچ آر سی پی نے سزائے موت پر اپنا موقف دہرانے کے لیے 10 اکتوبر 2013ء کو سزائے موت کے خاتمے کے عالمی دن کے موقع پر اسلام آباد میں ایک سیمینار منعقد کیا۔ پروفیسر راجر ہڈ جو کہ سزائے موت کی مخالف مہم کا حصہ رہے ہیں، نے خطاب کیا اور سزائے موت کے حامی چند اسلامی

شاہ رخ جتوئی: وسائل رکھنے والے لوگ قتل کر کے بھی بچ جاتے ہیں

اور دوسرے ملکوں کے موقف میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ پیش کیا۔ سیمینار میں شریک ماہرین نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ملک میں سزائے موت کے خاتمہ تک اس پر عارضی پابندی برقرار رکھے۔

10 اکتوبر کو ایچ آر سی پی کے کارکنان نے سزائے موت کے معاملے کی جانب توجہ دلانے کے لیے ملک بھر میں ریلیوں کا انعقاد کیا اور سزائے موت کے خاتمہ کا مطالبہ کیا۔

اگست کے وسط میں اس وقت وفاقی حکومت نے سزائے موت پر عارضی پابندی برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا جب سزائے موت کے منتظر درجنوں قیدیوں کے ڈیتھ وارنٹ جاری کئے جا چکے تھے اور انہیں پھانسیاں دینے کے انتظامات کو آخری شکل دی جا چکی تھی۔ ایچ آر سی پی نے حکومت کے اس اقدام کو سراہا اور ملک میں سزائے موت کے نظام پر نظر ثانی کا مطالبہ کیا۔

اکتوبر کے اوائل میں سابق صدر آصف زرداری، جن کی جماعت نے پانچ سال تک سزائے موت پر پابندی برقرار رکھی، نے نئی حکومت پر زور دیا کہ وہ ان جرائم پر نظر ثانی کرے جن پر سزائے موت دی جاتی ہے۔ انہوں نے سزائے موت والے جرائم میں کمی لانے کے حوالے سے حکومت کو اپنی پارٹی کی مدد کی پیشکش کی۔ عین اسی دوران متعدد مذہبی قائدین نے سزائے موت کے خاتمے کے مطالبے کی مخالفت کی اور مجرموں کو فوری طور پر پھانسی دینے کا مطالبہ کیا۔

ستمبر میں سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے کہا کہ موت کی سزاؤں پر عملدرآمد میں تاخیر کراچی میں امن کی بحالی میں واحد رکاوٹ تھی۔ اگرچہ نئی حکومت نے سال کے آخر تک سزائے موت کے کسی بھی قیدی کو پھانسی نہیں دی تھی تاہم یہ اپنے مؤقف پر قائم رہی کہ یہ سزائے موت کو ختم نہیں کر سکتی۔ وزیر داخلہ نے بیان دیا کہ حکومت سزائے موت کو ختم کرنے یا سزائے موت کو عمر قید میں بدلنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔

دسمبر میں وفاقی شرعی عدالت، ایک آئینی ادارہ جو اس بات کا جائزہ لینے کا مجاز ہے کہ آیا قوانین

شریعت کے مطابق ہیں یا نہیں، نے حکومت کو حکم دیتے ہوئے کہا کہ تضحیک مذہب کے مقدمات میں عمر قید کی سزا کو ختم کرے۔ اس لئے کہ ایسے جرم میں موت کے سوا اور کوئی سزا نہیں دی جاسکتی۔ شرعی عدالت نے مزید کہا کہ موت کے سوا کوئی بھی دوسری سزا غیر قانونی ہوگی۔ عدالت نے کہا کہ اس نے یہ حکم دراصل 1990 میں جاری کیا تھا۔ اس نے حکومت کو حکم ہدایت کی کہ وہ چند ماہ کے اندر اس حکم پر عمل درآمد سے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ ایچ آر سی پی کی جانب سے حکومت کو سزائے موت پر عارضی پابندی عائد کرنے سے متعلق جو درخواست دی تھی، اس کے جواب میں وزارت قانون، انصاف اور انسانی حقوق نے 3 دسمبر 2013ء کے اپنے ایک خط میں کہا کہ حکومت سزائے موت پر پابندی برقرار رکھے ہوئے ہے مگر وزارت ''امن عامہ کی موجودہ صورت حال، بالخصوص دہشت گردی کی کارروائیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سزائے موت کے کمل خاتمہ کی حمایت نہیں کرتی۔ اس نے اپنے خط میں یہ بھی کہا کہ حدود آرڈی ننس کے تحت دی جانے والی موت کی سزاؤں کو آئین کے آرٹیکل A-2 اور آرٹیکل 227 کی روشنی میں ختم نہیں کیا جاسکتا۔

آخر میں وزارت نے کہا کہ سزائے موت کے معاملے کا تعلق صوبائی حکومتوں اور وفاقی وزارت داخلہ سے ہے اور حتمی جواب دینے سے پہلے ان کی آراء لی جائیں گی۔ اس رپورٹ کی اشاعت تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔

جیلوں سے متعلق سرکاری کوائف کے مطابق پاکستان میں سزائے موت کے سب سے زیادہ مجرم پنجاب کی جیلوں میں قید تھے۔ دسمبر 2013ء کے آخر میں پنجاب میں سزائے موت کے 5,907 مجرم (بشمول 85 خواتین) موجود تھے جو کہ دنیا بھر میں سزائے موت کے قیدیوں کی سب سے بڑی تعداد میں سے ایک تھی۔ ایچ آر سی پی نے مطالبہ کیا کہ پنجاب حکومت صوبے کی جیلوں میں موجود سزائے موت کے قیدیوں کی پھانسی پر بندش برقرار رکھے۔

پاکستان میں سزائے موت کے مجرموں کی تعداد

علاقہ	مجرموں کی تعداد
پنجاب	5,907
خیبر پختونخوا	206
بلوچستان	90
گلگت بلتستان	15
کل تعداد	6218

خیبر پختونخوا میں سزائے موت کے 206، بلوچستان میں 90 اور گلگت بلتستان میں 15 قیدی تھے۔ایچ آر سی پی نے سندھ کے محکمہ جیل خانہ جات سے کوائف فراہم کرنے کی درخواست کی لیکن اس سالانہ رپورٹ کے جاری ہونے تک مذکورہ کوائف فراہم نہیں کیے گئے تھے۔ 2013ء کے دوران عدالتوں نے مجرموں کو موت کی سزا سنانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق تقریباً 227افراد کو موت کی سزا سنائی گئی جن میں تین خواتین بھی شامل تھیں۔مجرموں میں سے تین کا تعلق مسیحی برادری سے تھا۔ یہ 227 مجرم مختلف جرائم بشمول منشیات کی سمگلنگ، اغوا برائے تاوان، قتل اور تضحیک مذہب کے قصوروار قرار دیئے گئے تھے۔

2004ءتا2013ء۔پاکستان میں موت کی سزائیں

سال	سزا پانے والوں کی تعداد	مجرموں کی تعداد جنہیں سزا دے دی گئی
2004ء	455	21
2005ء	362	52
2006ء	445	83
2007ء	319	134
2008ء	237	36
2009ء	277	0
2010ء	356	0
2011ء	313	0
2012ء	242	1
2013ء	227	0
کل تعداد	3,232	327

گمشدگیاں

2013ء میں جبری گمشدگیوں کے زیادہ تر واقعات، بلوچستان، خیبر پختونخوا اور سندھ میں پیش آئے۔ بلوچستان میں متعدد افراد کی مسخ شدہ لاشیں برآمد ہوئیں جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ جبری گمشدگیوں کا نشانہ بنے تھے۔ جبری گمشدگیوں کے واقعات خیبر پختونخوا میں بھی پیش آئے۔اس سال چند واقعات اندرون سندھ میں بھی رونما ہوئے جہاں قوم پرست جماعتوں نے دعویٰ کیا کہ ریاست کے کارندوں نے ان کے کارکنان کو اغوا کیا تھا۔سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ نے حکومت کو متعدد احکامات جاری کیے کہ وہ ان لاپتہ افراد کا پتہ لگائے اور انہیں عدالتوں میں پیش کرے۔

2013ء کے دوران بلوچستان میں جبری گمشدگیوں کا نشانہ بننے والے افراد کی تعداد کچھ زیادہ ہو سکتی ہے لیکن 18 لاپتہ افراد کے اہل خانہ نے کوئٹہ میں ایچ آر سی پی کے دفتر سے رابطہ کیا اور کمیشن کو واقعات کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اطلاعات کے مطابق مزید 38 افراد کو بلوچستان کے علاقے مکران سے اٹھایا گیا۔ ان میں سے تقریباً 23 افراد کیچ، 6 پنجگور اور 9 گوادر سے لاپتہ ہوئے تھے۔ 2013ء کے دوران مکران سے تعلق رکھنے والے 32 لاپتہ افراد کو رہا کر دیا گیا۔ 2013ء کے دوران بلوچستان میں لاپتہ افراد کی نعشوں کے ملنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس قسم کے واقعات پہلی بار 2010ء میں سامنے آئے تھے۔ صوبے بھر سے تقریباً 116 نعشیں برآمد ہوئیں۔ ان میں سے 87 نعشوں کی شناخت ہوگئی۔ بہت سے خاندانوں نے یا تو سکیورٹی ایجنسیوں کو لاپتہ افراد کے اغوا اور قتل کا قصوروار ٹھہرایا یا پھر ان کے ملوث ہونے کا شبہ ظاہر کیا، دیگر 29 نعشوں کی شناخت نہ ہوسکی۔ مکران میں 23 لاپتہ افراد کی مسخ شدہ نعشیں برآمد ہوئیں۔

لاپتہ افراد کے رشتہ داروں نے جبری گمشدگیوں کے خلاف بلوچستان سے اسلام آباد تک 2,000 کلومیٹر طویل پیدل مارچ کیا۔ مارچ کرنے والوں کی تعداد 20 تھی جن کی قیادت ایک 72 سالہ ریٹائرڈ بینک کلرک ماما قدیر بلوچ کر رہے تھے۔ تاہم ان کا یہ سفر صوبے کے لاپتہ افراد کی بازیابی کا سبب تو نہ بن سکا لیکن اس مارچ نے ملک بھر میں خصوصاً پنجاب کے عوام کو صورتِ حال سے آگاہی دی۔

2013ء میں خیبر پختونخوا میں جبری گمشدگیوں کے 37 واقعات منظر عام پر آئے ان میں سے 28 افراد مالاکنڈ ڈویژن کے ضلع بونیر سے لاپتہ ہوئے جبکہ 7 افراد فاٹا کے علاقوں کرم ایجنسی اور اورکزئی ایجنسی سے لاپتہ ہوئے۔ خیبر پختونخوا میں جبری گمشدگیوں کا نشانہ بننے والے 8 افراد کو 2013ء میں رہا کر دیا گیا۔ ان تمام افراد کا تعلق بونیر سے تھا۔ ایک لاپتہ شخص، جو کہ ڈیرہ اسماعیل خان سے لاپتہ ہوا تھا، لکی مروت کے حراستی مرکز میں قید پایا گیا۔ 2013ء میں فاٹا اور خیبر پختونخوا سے 11، خیبر ایجنسی کے علاقے جمرود سے 7 اور نوشہرہ اور ڈیرہ اسماعیل خان سے 2،2 لاپتہ افراد کی نعشیں برآمد ہوئیں۔ اندرون سندھ میں جبری گمشدگیوں کے 7 واقعات منظر عام پر آئے۔ یہ تمام لاپتہ افراد سندھ کی قوم پرست سیاسی جماعتوں کے حامی یا کارکنان بتائے جاتے تھے۔ دو لاپتہ افراد سجاد مرکھان اور عامر خاور کی نعشیں بعد ازاں دادو سے برآمد ہوئیں۔ سال کے اختتام پر تین لاپتہ افراد کو رہا کیا گیا اور دو تا حال لاپتہ تھے۔

ایچ آر سی پی کی درخواست خارج

مئی میں سپریم کورٹ نے ایک مختصر حکم کے ذریعے ایچ آر سی پی کی جبری گمشدگیوں کا شکار ہونے والے متعدد افراد کی بازیابی کے لیے 2007ء میں دائر کردہ درخواست خارج کر دی۔ یہ درخواست گزشتہ چھ

سال سے زیر التوا تھی اور اس عرصے کے دوران ایچ آر سی پی کی لاپتہ افراد کی فہرست میں موجود متعدد افراد ریاستی ایجنسیوں کی غیر تسلیم شدہ حراست سے رہا ہوئے۔

18 مئی کو سپریم کورٹ نے ایچ آر سی پی کی ایک درخواست اس بنیاد پر خارج کر دی کہ ایچ آر سی پی اس معاملے کو اس حکومتی کمیشن کے سامنے پیش کر سکتی تھی جو لاپتہ افراد کے معاملے کا جائزہ لینے کے لئے تشکیل دیا گیا تھا۔ ایچ آر سی پی نے یہ کہتے ہوئے اس فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی درخواست دائر کی کہ مختصر حکم کے ذریعے شکایات کا ازالہ نہیں ہوا تھا جن کا حوالہ درخواست میں دیا گیا تھا۔ ایچ آر سی پی نے یہ دلیل پیش کی کہ آئین کی دفعہ 184(3) کے تحت ایسا کمشن، جس کے ارکان کا تعلق عدلیہ سے نہ ہو، سپریم کورٹ کے دائرہ اختیار کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اس نے اس بات پر بھی زور دیا کہ چونکہ یہ معاملہ عوامی اہمیت کا حامل ہے اور اس کا تعلق بنیادی حقوق کی خلاف ورزی سے ہے اس لیے یہ سپریم کورٹ کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔ ایچ آر سی پی نے اس امر کی نشاندہی بھی کی کہ ایچ آر سی پی کی جانب سے سپریم کورٹ کو جمع کرائی گئی فہرست میں موجود 47 افراد کا تا حال کچھ اتہ پتہ نہیں تھا اور ان لوگوں کے اہل خانہ کو حکومت کی جانب سے تشکیل کردہ کمیشن تک رسائی حاصل نہیں تھی۔

ایچ آر سی پی نے اس بات کا بھی نوٹس لیا کہ سپریم کورٹ میں سماعت کے دوران ایچ آر سی پی کی جانب سے فراہم کردہ فہرست میں موجود متعدد افراد کو عدالت میں پیش کیا گیا اور انہوں نے سکیورٹی فورسز کی جانب سے ان کے غیر قانونی اغوا اور انہیں حراست میں رکھنے کے حوالے سے بیانات بھی دیئے۔ عدالت نے ذمہ داروں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی حالانکہ مقدمے کی متعدد سماعتوں کے دوران ریکارڈ کیے گئے۔ متعدد بیانات میں ذمہ داروں کی واضح طور پر نشاندہی ہو چکی تھی۔ ایچ آر سی پی کا یہ بھی کہنا تھا کہ ایچ آر سی پی کی درخواست پر غیر ارادی طور پر لاپتہ ہونے اور پھر بازیاب ہونے والے افراد کو حکم کے باوجود معاوضہ ادا نہیں کیا گیا۔ سال کے آخر تک نظر ثانی کی درخواست پر کوئی کارروائی نہ ہوئی۔

اڈیالہ - 7

نام نہاد اڈیالہ 11...... یہ اُن گیارہ افراد کا قصہ ہے جنہیں سکیورٹی ایجنسیوں نے 2010ء میں اس وقت اٹھایا تھا جب وہ دہشت گردی کے الزامات سے بری ہونے کے بعد راولپنڈی کی اڈیالہ جیل سے باہر نکلے ہی تھے۔ ان گیارہ افراد کے اہل خانہ کی آزمائش ختم ہوتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ان 11 افراد میں سے چار حراست کے دوران ہلاک ہو گئے تھے۔ بقیہ افراد کے اہل خانہ نے ان کے ٹھکانے کا پتہ لگانے اور ان سے ملنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ نومبر میں سپریم کورٹ نے سیکرٹری دفاع کو معاملے سے متعلق ایک

رپورٹ جمع کرانے کا حکم دیا۔ فاٹا سیکرٹریٹ کے ایک اہلکار نے سپریم کورٹ کو بتایا کہ ان سات افراد کو زیریں اورکزئی کے پولیٹیکل ایجنٹ نے سزا سنائی تھی جس کے بعد انہیں خیبر پختونخوا میں بنوں اور ہری پور کی جیلوں میں زیرحراست رکھا گیا تھا۔ عدالت نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ افراد کئی سالوں سے زیرحراست تھے عدالت نے یہ جاننا چاہا کہ ان سات افراد کو کس جرم کے تحت سزا دی گئی چونکہ قانون نافذ کرنے والے ادارے ماضی میں ان کے خلاف الزامات ثابت کرنے میں ناکام رہے تھے۔ چیف جسٹس یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ ان افراد کے خلاف نیا مقدمہ کیسے قائم ہوسکتا تھا۔ لاپتہ افراد کے وکلا کا کہنا تھا کہ انہیں حراست کے دوران تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

حراست اور گمشدگی

ستمبر میں پشاور ہائی کورٹ نے سکیورٹی فورسز سے کہا کہ یا تو وہ غیر قانونی حراستی مراکز میں رکھے گئے تمام افراد کو رہا کریں یا پھر انہیں سرکاری طور پر تسلیم شدہ حراستی مراکز میں منتقل کریں۔ ہائی کورٹ کے بنچ، جس کی سربراہی صوبائی چیف جسٹس کررہے تھے، نے وزارت دفاع کی رپورٹ کو مسترد کردیا جس میں جس بیجا سے متعلق درخواستوں میں شامل ڈیڑھ سو افراد کے حراستی مقام کے بارے میں لاتعلقی کا اظہار کیا گیا تھا۔ عدالت نے ایک روز پہلے بھی تقریباً 250 لاپتہ افراد کے مقدمات کے حوالے سے پیش کی گئی ایک ایسی ہی رپورٹ مسترد کی تھی۔

عدالت نے کہا کہ ایک شخص جو غیر قانونی حراست سے رہا ہوا تھا، نے ایک روز پہلے کہا تھا کہ اسے سکیورٹی فورسز نے اغوا کر کے غیر قانونی حراست میں رکھا تھا۔ بنچ نے نشاندہی کی کہ آئین کی دفعہ 10 کے تحت یہ لازم تھا کہ گرفتار کیے گئے شخص کو 24 گھنٹوں کے اندر اندر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے۔ بصورت دیگر گرفتاری ناجائز ہوگی اور غیر قانونی حراست سمجھی جائے گی۔ چیف جسٹس نے کہا کہ آرمی ایکٹ کے تحت غیر قانونی حراست ایک جرم تھا اور ایسے مقدمات کی سماعت دیوانی عدالت میں کی جاسکتی تھی۔

تاہم اس سال جبری گمشدگیوں کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

سفارشات

1- جیلوں کے نظام کو درپیش لاتعداد مسائل کے حل کے لیے فوری اقدامات کئے جائیں۔ زیرسماعت مقدمات سمیت دیگر افراد کو صرف اس صورت میں زیرحراست رکھا جائے جب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہو۔ مقدمات کی سماعت جلد از جلد مکمل کی جائے تاکہ جیلوں میں قیدیوں کی گنجائش سے

کہیں زیادہ تعداد پر قابو پایا جا سکے اور قیدیوں اور ان کے خاندانوں کی مشکلات ختم ہو سکیں۔

2- حکومت کو سزائے موت کے خاتمے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے چاہئیں دریں اثناء پھانسی پر پابندی برقرار رکھنی چاہیے۔ لوگوں کو سزائے موت پر پانچ سالہ پابندی کے بارے میں آگاہی دی جائے۔

3- پاکستان کو ماہی گیروں کی مسلسل حراست کے مسئلے کا ایک مستقل حل تلاش کرنے کے لیے بھارت کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ انہیں قیدیوں کو اپنی سزا اپنے ملک میں کاٹنے کی اجازت دینے کے امکان پر بھی غور کرنا چاہیے۔

4- حکومت کو غیر قانونی جبری گمشدگیوں کے خاتمے کو ترجیح دینی چاہیے۔ غیر تسلیم شدہ حراست میں موجود تمام افراد کو یا تو عدالت میں پیش کیا جائے یا پھر رہا کیا جائے۔ قواعد وضوابط کی عمل داری کے بغیر حراست میں رکھے گئے افراد کو معاوضہ ادا کیا جائے اور مجرموں پر قانون کے تحت مقدمہ چلایا جائے۔

3 - بنیادی آزادیاں

نقل وحرکت کی آزادی

ہرشہری کو پاکستان میں رہنے، داخل ہونے اورآزادانہ پورے ملک میں گھومنے پھرنے، ملک کے کسی بھی حصے میں رہائش اختیار کرنے یا مستقل طور پرآباد ہونے کا حق حاصل ہے۔البتہ یہ حق قانون کے تحت مفاد عامہ میں جائزطور پر عائد کی گئی کسی بھی پابندی سے مشروط ہے۔

آئین پاکستان [آرٹیکل- 15]

ہرشخص کوکسی بھی ریاست کی حدود میں گھومنے، پھرنے، سفرکرنے اور رہائش اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔

ہرشخص کواپنے ملک سمیت، کسی بھی ملک کوچھوڑنے اوراپنے ملک واپس آنے کا حق حاصل ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-17(2,1)]

سال 2013 کے دوران ریاستی اور غیرریاستی کرداروں کی طرف سے عائد کردہ قدغنوں کی بدولت پاکستانی شہریوں اور غیر ملکیوں کو اندرون پاکستان گھومنے پھرنے پر پابندی کے چیلنجوں کا سامنا رہا۔اس کے علاوہ شہریوں کو اپنی پسند کی جگہ پر رہائش رکھنے اور سکونت اختیار کرنے کے حق پر پابندیوں کا بھی سامنا رہا۔

ان چیلنجوں میں امن وامان کی ابترصورت حال، بلوچستان اورقبائلی علاقہ جات میں غیرمحفوظ سفر، گلگت بلتستان کو پاکستان سے ملانے والی شاہراہ قراقرم کی بندش، قاتلانہ حملے اورفرقہ وارانہ قتل وغارت شامل ہیں۔ پاسپورٹ کے اجرائمیں تاخیراورایگزٹ کنٹرول لسٹ میں کی جانے والی من مانیوں کی وجہ سے لوگوں کے بیرون ملک جانے کے منصوبے متاثّر ہوتے رہے۔تشدد کے بعد رونما ہونے والے کرفیو، سڑکوں کی بندش، مظاہروں، ٹریفک جام، اشرافیہ کی نقل وحرکت کی وجہ سے ٹریفک کی بندش، موٹرسائیکل کی ڈبل سواری پر پابندی اور جبری مشقّت پر پابندی جیسے عوامل پاکستانی عوام کی نقل وحرکت کی آزادی کی راہ میں مزاحم رہے۔سی.این.جی کی بدترین راشن بندی کی وجہ سے پمپوں پر گاڑیوں کی لمبی لائنیں، ملک کے بعض حصوں میں

ہفتے کے اکثر ایام میں اس مصفی ایندھن کی بندش اور پٹرول کی مہنگائی سے سفر کے اخراجات میں اضافہ ہوا۔ زلزلے کی تباہ کاریوں کی وجہ سے بلوچستان کے ضلع آواران کے باسی ذرائع آمدورفت کے ڈھانچے کی تباہی کی وجہ سے اپنے گھربار چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ دور دراز علاقہ ہونے کی وجہ سے بہت سی صورتوں میں متاثرین کی امداد تک رسائی بہت مشکل تھی۔ دوسری وجہ تھی امدادی ٹیموں پر دہشت گردوں کے حملے، کے خلاف مسلح افواج کی کارروائیوں اور متاثرین تک امداد پہنچنے میں رکاوٹ۔ حالت یہ تھی کہ متاثرین امداد کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ حکومت کے زیرِ انتظام چلنے والے نقل وحمل کے ذرائع مثلاً پی آئی اے اور ریلوے حسب معمول اپنی ناقص کارگزاری پر عمل کرتے رہے جس کے باعث لوگ ملک کے بیشتر حصوں تک پہنچنے کے حوالے سے مسائل کا سامنا کرتے رہے۔ سال کے دوران ملک کے کچھ حصوں میں مخصوص علماء کے داخلے پر پابندیاں لگیں تاکہ نفرت انگیز خطابات کو روکا جا سکے۔

فرقہ وارانہ قتل وغارت، کرفیو اور علماء پر پابندیاں

بسا اوقات سڑکوں کی بلاوجہ بندش کو آمدورفت کی آزادی کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ فرقہ وارانہ قتل وغارتگری اور بڑھتی ہوئی کشیدگی کی وجہ سے کئی پابندیاں لگائی گئیں۔ محرم کے مہینے میں اشتعال انگیزی کے تدارک کیلئے چند مذہبی علماء کے بڑے شہروں میں داخلے پر پابندیاں لگانے سے نفرت انگیز تقریروں اور تشدد آمیز واقعات کا تدارک ممکن ہوسکا۔ 27 علماء پر لاہور میں خطاب کرنے پر پابندی لگائی گئی اور 31 علماء کے لاہور میں داخلے پر پابندی لگائی گئی۔ اسی طرح علماء کے داخلے پر پابندیاں لگائی گئیں۔ 60 علماء پر ٹیکسلا میں داخلے پر پابندی لگی، 50 کا چکوال میں داخلہ بند کیا گیا جبکہ سرگودھا میں 25 اور نارووال میں نو علماء کے داخلے پر پابندی لگی۔ گورنمنٹ کے حکمناموں کے ذریعے کچھ فرقوں، قومیتوں اور گروہوں کے خلاف کی گئی اشتعال انگیز تقریروں کی آڈیو کیسٹوں کی تیاری، فروخت اور ان کے سرعام بجانے پر پابندیاں عائد کی گئیں۔

مذہبی کشیدگی کی ایک مثال راولپنڈی میں عاشورۂ محرم کے روز دیکھنے کو ملی جب نومبر میں جلوس کے راستے میں ایک قریبی سُنّی مسجد سے بیان ہونے والے نماز جمعہ کے وعظ سے لاقانونیت اور امن وامان کا مسئلہ پیدا ہوگیا جس نے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تصادم میں نو لوگ جاں بحق اور بہت سے زخمی ہوئے۔ دھماکہ خیز صورتحال کے پیشِ نظر کرفیو لگایا گیا، موبائل ٹیلیفون سروس بند کردی گئی اور امن وامان کو بحال کرنے کے لئے 5000 پولیس والوں کی کمک بھیجی گئی۔ کرفیو لگنے کی وجہ سے علاقہ مکینوں کو ضروریات زندگی کے حصول میں شدید مشکلات پیش آئیں۔ راولپنڈی میں عاشورہ محرم کے اس تصادم کے خلاف ملتان اور چشتیاں جیسے

فرقہ وارانہ تصادم کے بعد لگنے والے کرفیو نے راولپنڈی کے رہائشیوں کے لیے زندگی مشکل بنا دی

جنوبی شہروں میں احتجاج کے دوران ہنگامے پھوٹ پڑے۔اس واقعہ کے خلاف مذمتی ریلیاں نکالی گئیں جن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سڑکوں کی بندش نے آمدورفت کی آزادی کے حق کو زک پہنچائی۔اس کے بعد لاہور اور کراچی میں بھی علماء کو قتل کیا گیا اور ان ہلاکتوں کے بعد ملک بھر میں مذمتی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا جن کا نتیجہ سڑکوں کی بندش اور ٹریفک جام کی شکل میں نکلا۔کوئٹہ میں بم دھماکوں کے دوران ہونے والی ہزارہ شیعان کی سینکڑوں ہلاکتوں کے بعد جنوری اور فروری میں احتجاج کرنے والوں نے پاکستان بھر کے بڑے شہروں میں اہم شاہراہوں اور سڑکوں کو کئی روز تک بند کیے رکھا۔مظاہرین نے ائرپورٹ جانے والی سڑکوں کو بھی بلاک رکھا۔

سیاسی احتجاج، وی آئی پی آمدورفت اور نیشنل ہائی وے کی بندشیں

مختلف سیاسی پارٹیوں کے مظاہروں نے بڑے شہروں میں آمدورفت کی آزادی کے حق پر قدغن لگائی۔سال کا آغاز پاکستان عوامی تحریک کے دھرنے سے ہوا جس نے اسلام آباد میں ٹریفک کی روانی کو کئی روز تک شدید متاثر کیا۔پاکستان تحریک انصاف نے صوبہ پختونخوا میں نیٹو سپلائی روکنے کے لئے نیشنل ہائی وے کو بلاک کر دیا۔سڑک پر رواں ٹریفک کی بندش سے پیدا ہونے والی مشکلات کے پیش نظر سیاسی پارٹیوں سمیت ہر کسی کو قومی شاہرات کا بلاک کرنا منع ہے مگر اس کے باوجود یہ عمل جاری رہا۔دسمبر میں پاکستان تحریک انصاف

وی آئی پی موومنٹ نے عوام کو روکے رکھا

کے مہنگائی کے خلاف احتجاج کی وجہ سے لاہور کی مال روڈ کی دوکانیں بند کر دی گئیں۔ دیگر شہروں میں مختلف مسائل کے خلاف احتجاجی مظاہروں سے بھی تجارتی سرگرمیاں متاثر ہوئیں۔

کراچی میں موت کا کھیل

سال 2013ء کے دوران لسانی، سیاسی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہلاکتیں بلا روک ٹوک جاری رہیں۔لوگ کسی بھی وقت تشدد کے نتیجے میں ہونے والی اچانک فائرنگ کا نشانہ بننے کے خوف میں مبتلا رہے۔کئی لسانی گروہوں کا گڑھ سمجھے جانے والے علاقے دوسرے لوگوں کے لئے نو گو ایریا بنے رہے۔ حکومت کی جانب سے جاری آپریشن کے باوجود ہلاکتوں پر قابو نہ پایا جا سکا۔ٹارگٹ کلرز کے خلاف سکیورٹی اداروں کی کاروائی سے علاقے میں کرفیو جیسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔نومبر میں وزیر داخلہ نے بتایا کہ ٹارگٹ کلرز اور بھتہ خوروں کے خلاف آپریشن کے دوسرے مرحلے میں 9000 مشتبہ افراد گرفتار کئے گئے۔سال تو ختم ہونے کو آ گیا مگر آپریشن کی بدولت ٹارگٹ کلنگ کی تعداد میں نمایاں کمی کرنے کا کام ابھی بہت حد تک باقی ہے۔

بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں امن وامان کی صورت حال

حکومت کی جانب سے اپنا دبدبہ قائم کرنے کی کوششوں کے باوجود بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں آمد ورفت پر خطر رہی۔فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہزارہ قوم کے افراد کا قتل جاری ہے۔جنوری میں کوئٹہ کے

کراچی کے رہائشیوں کے احتجاج کے باوجود اہدافی قتل جاری رہے

ہزارہ ٹاؤن میں دو بم دھماکوں کے نتیجے میں 100 سے زیادہ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ ایران آنے جانے والے شیعہ زائرین کی بسیں قافلوں کی صورت میں حفاظتی دستوں کی کڑی نگرانی میں چلنے کے باوجود اکا دکا حملوں کا نشانہ بنتی رہیں۔ اکتوبر کے مہینے میں ایک قافلے پر حملے کے نتیجے میں ایف سی کے دو جوان مارے گئے۔ ہائی ویز پر حکومت کے افسران اور پیشہ ور ماہرین کے اغوا کی وارداتوں کے بعد بلوچستان میں رہنا اور سفر کرنا دوبھر ہو چکا ہے۔ اغوا ہونے والوں میں کیچ کے منتخب کونسلروں سمیت ڈاکٹر، کسٹم حکام اور کوئلے کے کان کن بھی شامل ہیں۔ عام شاہراہوں پر اغوا کی وارداتوں سے صوبہ بھر میں آمدورفت خطرناک ہو گئی ہے۔ ریاستی اور غیر ریاستی کرداروں پر اغوا کی وارداتیں کرنے کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ قلات، کوئٹہ اور چمن سمیت بلوچستان کے بڑے شہروں کو ملانے والی بڑی ہائی ویز کی تعمیر غیر مکمل ہے۔ دہشت گردوں کے تشدد اور علاقے میں جاری فوجی آپریشن کے وجہ سے قبائلی علاقے ملک کے دوسرے شہریوں کی دسترس سے دُور رہے۔

سی۔این۔جی کا بحران اور پٹرول کی قیمتیں

پٹرول کی قیمتوں میں اضافے اور نسبتاً سستی سی.این.جی کی کمیابی نے عوام الناس کے لئے سفر کرنا مشکل کر دیا ہے۔ سی.این.جی اسٹیشنوں پر گاڑیوں کی لمبی قطاروں میں لگ کر اپنی باری کا انتظار کرنے والوں کے نظارے اب عام سی بات ہیں۔ سی.این.جی اسٹیشن گیس کی بندش کی وجہ سے کئی ہفتے بند رہے اور اس دوران مہنگے پٹرول کے باعث سفر کا خرچہ کئی لوگوں کے لئے بہت بڑھ گیا۔ سی.این.جی پر چلنے والی گاڑیوں میں اضافے، صنعتوں کے لئے گیس کی اشد ضرورت اور سوئی گیس کی قلت نے ایسے بحران کی شکل اختیار کر لی جو

حکام بالا کی فوری توجہ کا متقاضی تھا۔آل پاکستان سی.این.جی ایسوسی ایشن (APCNGA) نے مطالبہ کیا کہ حکومت آئندہ دس سال کے لئے سی.این.جی پالیسی کا اعلان کرے۔

موٹرسائیکل کی ڈبل سواری پر پابندی

حکومت نے عاشورۂ محرم کے دوران تمام بڑے شہروں میں موبائل فون سروس معطل کردی اور امام حسین علیہ السلام کے چہلم اور داتا گنج بخشؒ کے عرس کے موقع پر بھی لاہور سمیت راولپنڈی اور اسلام آباد میں فرقہ وارانہ تصادم کے بعد لگنے والے کرفیو کے دوران یہ سروس بند رہی۔سکیورٹی وجوہات کی بنا پر تمام بڑے شہروں میں کریمنل پروسیجرا یکٹ کے تحت بار بار دفعہ 144 لگنے کی وجہ سے ڈبل سواری پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔اس پابندی کی وجہ سے غریب شہریوں کو کہیں آنے جانے کے لئے موٹر سائیکل سواروں سے مدد مانگنے میں دشواری پیش آتی رہی۔ چار سے زیادہ افراد کے اجتماع پر لمبے لمبے عرصوں کی پابندیاں لگائی گئیں۔

موٹرسائیکل پر تین افراد کی سواری پر پابندی اہلکاروں کے لیے نہیں

گزشتہ سالوں کی طرح موبائل فون سروس کے تعطل اور موٹرسائیکل کی ڈبل سواری پر پابندیاں امن وامان کی مخدوش صورتحال سے نپٹنے کے لئے انتظامیہ کے پسندیدہ موثر ہتھیار کے طور استعمال ہوئیں۔

پاسپورٹ کے اجراء میں تاخیر

سال 2013ء بالخصوص پہلے چھ ماہ کے دوران پاسپورٹ کے حصول میں تاخیر کی وجہ سے لوگوں کو بلا وجہ لمبے عرصہ کے لئے پاسپورٹ کے حصول میں طویل انتظار کرنا پڑا اس دوران انہیں اپنے سفر کے پروگراموں کو تبدیل یا منسوخ بھی کرنا پڑا۔ جون میں امیگریشن اور پاسپورٹ کے ڈائریکٹر جنرل نے بتایا کہ ارجنٹ کیٹگری کے 45000 پاسپورٹ جاری کر کے متعلقہ علاقوں کو بھیج دیئے گئے ہیں۔ان دعوؤں کے باوجود 2013ء میں اس تاخیر کی وجہ سے بہت سے طلباء اور پیشہ ور ماہرین کے بیرون ملک جانے کے

پروگرام چوپٹ ہوئے۔ پاسپورٹ کی ارجنٹ اور عام دونوں کیٹگریوں کے اجراء میں تاخیر ہوئی اور شہری مسلسل شکائتیں کرتے رہے کہ پاسپورٹ دفاتر کے باہر ایجنٹ رشوت کے عوض جلد پاسپورٹ جاری کرانے کی پیشکش کرتے ہیں۔

ایگزٹ کنٹرول لسٹ

ایگزٹ کنٹرول لسٹ حکام کے ہاتھوں میں لوگوں کو ملکی سرحدوں سے باہر جانے سے روکنے کا ایک وسیلہ ہوتی ہے۔ ایگزٹ فرام پاکستان کنٹرول آرڈیننس 1981ء کے مطابق حکومت پاکستان اس سسٹم کے ذریعے سرحدوں کو کنٹرول کرتی ہے۔ فیڈرل انوسٹی گیشن ایجنسی (FIA) ایگزٹ کنٹرول لسٹ کے ضابطوں کی عملداری اور ان امور کی انجام دہی کی نگرانی کی ذمہ دار ہے۔ مگر ای سی ایل کے معاملات میں شفافیت کی کمی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو ای سی ایل میں اپنے نام کی موجودگی کا ائرپورٹ پر جا کر ہی پتہ چلتا ہے۔ سال 2013ء کے دوران ای سی ایل میں ڈالا جانے والا سب سے نمایاں نام جنرل پرویز مشرف کا تھا جو ان پر چلنے والے بغاوت کے مقدمے کی وجہ سے ڈالا گیا۔

ہندوؤں کی ہجرت

پاکستان بڑھتی ہوئی مذہبی انتہاپسندی کی وجہ سے مذہبی اقلیتوں کے لئے مشکل ترین ملک بن چکا ہے۔ ہندو لڑکیوں کو اغوا کر کے انہیں جبراً اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنے کے خلاف ہندو برادری نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ ہندو شہریوں کی انڈیا کو ہجرت یا دوسرے مقاصد کے لئے جاری ویزوں پر بیرون ملک سے پاکستان لوٹنے سے انکار کی متعدد اطلاعات رپورٹ کی گئی ہیں۔

بلوچستان اور کراچی میں جبری بیدخلی

ستمبر میں آنیوالے زلزلے نے بلوچستان کے کیچ اور آواران کے اضلاع کو ہلا کر رکھ دیا۔ دراندازوں نے امدادی قافلوں پر حملے کئے اور مسلح افواج پر الزام لگایا کہ وہ اس آفت کی آڑ میں ان اضلاع میں اپنے پاؤں جمانا چاہتی ہیں۔ جن اضلاع میں زلزلہ متاثرین تک امداد پہنچنے میں سستی ہوئی وہاں کے مکین قریبی اضلاع میں منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے جہاں ان کی بنیادی ضروریات پوری ہوسکتی تھیں۔ سال کے دوسرے حصے میں کراچی کی کچھی برادری کے لوگ مسلسل جارحیت کا سامنا کرنے سے تنگ آ کر لیاری میں اپنے گھربار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

قراقرم ہائی وے کی بندش اور گلگت بلتستان سے رابطہ میں تعطل

گلگت بلتستان شیعہ اکثریتی آبادی والا واحد علاقہ ہے جس کے ساتھ زمینی رابطہ صرف شاہراہ قراقرم کے ذریعے ممکن ہے۔ملک کے باقی علاقوں میں مذہبی کشیدگی کی طرح یہاں اکثر کشیدگی سڑک کی بندش کا موجب بنتی ہے۔سال 2012ء کے بڑے پیمانے پر ہونے والے قتل عام کے اعادے سے بچنے کے لئے شیعہ حضرات کشیدگی کے عالم میں ہائی وے کی طرف جانے سے ہچکچاتے ہیں۔سڑک کی بندش سے ٹورازم

قراقرم ہائی وے کو بہتر بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر کام کیا گیا

کو بہت نقصان پہنچتا ہے جو علاقے کی معیشت کی بنیاد ہے۔نومبر میں راولپنڈی کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد شاہراہ قراقرم 13 روز تک بند رہی۔جس کے باعث مقامی افراد، سیّاح، طالبعلم، مریض اور سرکاری و پرائیویٹ ملازمین پھنسے رہے۔سال کے دوران اس سے پہلے یہ شاہراہ مرمت اور دیکھ بھال کے لئے پانچ دن بند رہی۔سڑک کی اس بندش سے علاقہ کا رابطہ ملک کے باقی حصوں سے کٹ جاتا ہے جب کہ موسم بار بار خراب ہونے سے پروازیں منسوخ ہوتی رہیں۔

لواری سرنگ کا بحران

حکومت کے 8.6 کلومیٹر لمبی لواری سرنگ کی تعمیر اور دیکھ بھال کے پروگرام میں تبدیلی کی وجہ سے سردیوں سے پہلے ہی لوگ ایک مصیبت میں پھنس گئے۔یہی ایک راستہ ہے جو 500,000 آبادی والے

چترال کا باقی ملک سے رابطہ بحال رکھتا ہے۔ سرنگ کی تعمیر کا کام 2005ء میں شروع ہوا۔ اگلے کئی برس تک یہ نامکمل سرنگ ٹریفک کے لئے کھلی رہی۔ 2011ء میں سرنگ ہفتے میں تین دن کیے لئے متبادل دنوں میں کھلتی تھی۔ تین روز کے لئے سرنگ کے کھلنے کی وجہ سے کوئی بحران پیدا نہ ہوا۔ لیکن نومبر 2013ء میں پہلی برفباری کے بعد نیا سٹنڈرڈ آپریٹنگ پروسیجر (SOP) آنے کی وجہ سے یہ تین دن کا رابطہ دو ہفتوں میں ایک بار کر دیا گیا۔ ہزاروں لوگ برف میں پھنس کر رہ گئے۔ جن کے پاس وسائل تھے انہوں نے کئی ہفتے دیر شہر کے ہوٹل کے کمروں میں گذارے۔ کچھ کو گاڑیوں میں سونا پڑا باقی واپس لوٹ گئے۔

چترال میں غذائی اشیاء کی کمی کے خلاف ہونے والے مظاہروں کی وجہ سے حکام بالا (SOP) پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہوگئے اور سرنگ ہفتے میں دو دن کھولنی شروع کر دی۔ حکام کے نزدیک لوگوں کی مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سرنگ بنانے کے پروگرام میں اس سے زیادہ تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی۔ سرنگ مکمل کرنے کی نئی ڈیڈ لائن 2017ء رکھی گئی ہے۔

جبری مشقت

جبری مشقت اندرون سندھ اور پنجاب کی اینٹ سازی کی صنعتوں میں جاری رہی۔ مزدوروں کو یا تو مسلح گارڈز کی نگرانی میں قید رکھا جاتا ہے یا ان کے اہل خانہ کو محبوس رکھ کر ان کی نقل وحرکت کی آزادی کا حق چھین لیا جاتا ہے تاکہ وہ قرض کے بندھنوں سے فرار نہ ہو سکیں۔ جبری مشقت کے غلاموں جیسے حالات کا رکو ختم کرنے کے حکومتی اقدامات نہ صرف بے اثر رہے بلکہ حکومت کی نا اہلی کھل کر سامنے آ گئی۔

سفارشات

1 ملک بھر میں امن وامان کی صورت حال کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے تاکہ ملکی اور غیر ملکی افراد کا سفر محفوظ بنایا جا سکے۔ حکومت کو بلوچستان اور قبائلی علاقوں سمیت تمام ملک میں اپنی عملداری قائم کرنی چاہیئے، قومی شاہراہوں کو سفر کے لئے یقینی محفوظ بنانا چاہئے، غیر ریاستی کارندوں کی قانون شکنی سے عوام کو نجات دلا کر انہیں دہشت گردی سے تحفظ دینے کے ساتھ ساتھ سکیورٹی فورسز کے غیر قانونی اقدامات کو بھی روکنا چاہئے۔

2 ای سی ایل (ECL) کو مشتہر ہونا چاہیے اور اس کا من مانا استعمال بند ہونا چاہئے۔ کسی کو بتائے اور اس کا موقف سنے بغیر اس کا نام ای سی ایل میں شامل نہ کیا جائے اور سب سے ضروری بات یہ کہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ پاسپورٹوں کے اجراء میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔

3 پی آئی اے اور پاکستان ریلوے کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے اور پابندیٔ اوقات کو سختی سے اپنایا جائے۔سی این جی اور پٹرول عوام کو سستے داموں مہیا کرنے کے اقدامات کئے جائیں۔سفر کی سہولت دینے کے لئے پبلک ٹرانسپورٹ کے نظام کو بہتر بنایا جائے۔

4 جبری مشقت کے غیر قانونی عمل کو ختم کرنے کے لیے خصوصی اقدامات کئے جائیں اس لئے کہ جبری مشقت کی وجہ سے غریب شہری اپنے آمدورفت کے اُس حق سے محروم ہو جاتے ہیں جن کی ضمانت آئین میں دی گئی ہے۔

5 ہائی ویز اور اہم راستوں پر احتجاج روکنے کے اقدامات کئے جائیں۔شہریوں کو یہ باور کرانا ضروری ہے کہ مطالبات منوانے کے لئے سڑکیں بلاک کرنا ضروری نہیں۔سیاسی ریلیوں اور مظاہروں کے لئے جگہیں مختص ہونی چاہئیں۔

فکر وضمیر اور مذہب کی آزادی

پاکستان کے عوام کی خواہش ہے کہ ایک ایسا نظام وجود میں لایا جائے، جس میں بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔ ان حقوق میں سماجی مساوات، مساوی مواقع کی فراہمی، سب کے لیے یکساں قانون، سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف، فکر وضمیر اور اظہار رائے کی آزادی، ایمان، عقیدے، عبادت اور تنظیم سازی کی آزادیاں بھی شامل ہیں۔ یہ حقوق اور آزادیاں قانون اور اخلاق عامہ کی حدود کے تابع ہوں گی۔ آئین پاکستان [دیباچہ]

قانون، امن عامہ اور اخلاقیات کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے، الف: ہر شہری کو اپنے مذہب پر قائم رہنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق حاصل ہو گا اور ب: ہر مذہبی گروہ، فرقے اور مسلک کو حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنے مذہبی ادارے قائم کرے، انھیں برقرار رکھے اور چلائے۔ آئین پاکستان [آرٹیکل - 20]

تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں، سب کی عزت اور حق برابر ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل عطا کیے گئے ہیں، انھیں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ سلوک اور رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 1]

ہر شخص کو فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے، اور یہ آزادی بھی، کہ کوئی شخص تنہا یا کچھ افراد مل کر اجتماعی طور پر، نجی حدود میں یا سر عام، تعلیم و تبلیغ، اعمال و عبادات کے ذریعے اپنے مذہب کا اظہار کریں۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 18]

کسی شخص پر اس طرح کا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا کہ اس کا عقیدہ اور مذہب اختیار کرنے کی آزادی مجروح ہو۔

کسی ریاست، ادارے، افراد کے گروہ یا فرد کی طرف سے کسی شخص کے ساتھ اس کے مذہب اور عقیدے کے باعث کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

مذہب کی بنیاد پر ہر طرح کے امتیازی سلوک اور عدم برداشت کے خاتمے کے لیے اقوام متحدہ کا اعلامیہ

[آرٹیکل : 1 (2) اور 2 (1)]

آئین نے شہریوں اور مختلف مذہبی فرقوں کو جن حقوق اور مذہبی آزادیوں کی ضمانت مہیا کی ہے، اس حوالے سے پاکستان میں صورتحال خوشگوار نہیں ہے۔ آئین میں تو حقوق موجود ہیں لیکن عام سطح پر یہ حقوق

کس حد تک شہریوں اور مذہبی فرقوں کو میسر کیے جا سکے، اس بارے میں ایک بڑا سوالیہ نشان سامنے آتا ہے۔ درحقیقت، زیرِ جائزہ سال کے دوران تشدد اور سزا سے استثنیٰ جو کہ ایک دوسرے کی مدد کرتے دکھائی دیتے تھے، کا رجحان برقرار رہا۔ انتہا پسند جنگجو گروہ جو مذہب کے نام پر تشدد اور ظلم کو جائز قرار دیتے ہیں اقلیتوں کے مسائل میں اضافے کا باعث بنے۔ اقلیتوں کو درپیش چیلنجز کا دوسرا اہم سبب علاقائی عناصر تھے جبکہ مذہبی اقلیتوں اور فرقوں کے اراکین کو عقیدے پر مبنی تشدد سے تحفظ فراہم کرنے یا پھر نفرت انگیز تقریر، دہشت گردی اور عدم رواداری کا مقابلہ کرنے میں حکومتی ناکامی کے باعث مذہبی فرقوں اور اقلیتوں کے مسائل میں اضافہ ہوا۔

ملک کے متعدد علاقوں میں مذہبی جنگجو گروہوں کی جانب سے کیے جانے والے متعدد حملوں کا نشانہ مذہبی اقلیتوں اور فرقہ وارانہ گروہوں کو بنایا گیا۔ 2013 کے دوران عقیدے پر مبنی تشدد کے زیادہ تر واقعات میں شیعہ برادری کے اراکین بالخصوص بلوچستان کی ہزارہ شیعہ برادری کو نشانہ بنایا گیا۔ ان تمام علامات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ انتہا پسندوں کی جانب سے کیے جانے والے وحشیانہ حملوں کے باعث مذہبی اقلیتوں، فرقوں اور حتیٰ کہ اعتدال پسند سنیوں کی زندگی بھی پہلے سے کہیں زیادہ کٹھن ہو جائے گی۔ محض مذہبی تعصب اور نفرت ہی پریشان کن پہلو نہیں تھے۔ عام لوگوں کی جانب سے تشدد کے استعمال اور پھر سزا سے بچ نکلنے کے باعث معاملات اور زیادہ پیچیدہ ہو گئے۔ 11 مئی کے عام انتخابات کے بعد قائم ہونے والی حکومت کو پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اقتدار کی پرامن اور جمہوری طریقے سے منتقلی کو نہ صرف سراہا گیا بلکہ اسے ملک کی غیر مستحکم جمہوریت کے لیے ایک سنگ میل قرار دیا گیا۔ تاہم نمائندگی کے معیار کے حوالے سے اقلیتوں کے شدید تحفظات برقرار رہے۔ سب سے اہم شکایت یہ تھی کہ مقننہ میں اقلیتی برادریوں کے لئے مختص نشستیں انتخابات کی بجائے نامزدگیوں کے ذریعے پُر کی گئیں اور یہ نامزدگیاں سیاسی جماعتوں کے سربراہوں نے کیں۔ اس طریقہ کار نے اقلیتوں کو ان کے اس حق سے محروم کر دیا جس کے جمہوری استعمال سے وہ اپنی پسند کے لوگوں کو منتخب کر سکتے تھے۔ احمدیوں نے اپنی علیحدہ ووٹر لسٹوں کو برقرار رکھنے کو امتیازی سلوک اور مشترکہ رائے دہندگی کی روح سے متصادم قرار دیا۔ احمدی برادری نے اپنا احتجاج ریکارڈ کرانے کے لئے 2013ء کے الیکشن سے علیحدگی اختیار کر لی۔ عقائد کی بنیاد پر غیر محفوظ برادریوں سے متعلق ایچ آر سی پی کے ماہرین پر مشتمل فورم نے 2013ء میں دو اجلاس کیئے۔ یہ فورم 2010ء سے مختلف عقائد رکھنے والی برادریوں کو درپیش مسائل کو اجاگر کرنے اور ان مسائل کو حل کرنے کے طریقے تجویز کرنے کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اگست میں منعقد کردہ پہلے اجلاس میں پاکستان کی مذہبی اقلیتوں کے سیاسی حقوق اور ان کی نمائندگی کے مسائل پر غور و خوض کیا گیا۔ دسمبر میں منعقد ہونے والے دوسرے اجلاس کے دوران بحث کا موضوع ''مذہبی اقلیتوں کو درپیش نئے

مسائل اوران کا حل'' تھا۔ اجلاس میں ستمبر میں پشاور کے چرچ پر ہونے والے خودکش بم دھماکے، سندھ کے ضلع بدین میں ایک ہندو کی لاش کی بے حرمتی، سندھ میں 11 مئی کے انتخابات کے دوران غیر مسلموں کو ووٹ نہ دینے کی ہدایت سے متعلق پمفلٹوں کی تقسیم، احمدیوں کو درپیش چیلنجز، نفرت انگیز تقاریر اور تشدد میں اضافے اور اگلے بلدیاتی انتخابات میں مذہبی اقلیتوں کے حصہ لینے کے امکان پر خصوصی طور پر بحث کی گئی۔ ماہرین کے گروہ نے ایک مرتبہ پھر انہی خدشات کا اظہار جن کا اظہار اس نے سابقہ اجلاسوں میں کیا تھا۔ اس نے مذہبی اقلیتوں کے خلاف تشدد، دیگر زیادتیوں اور امتیازی سلوک کی روک تھام اور مجرموں کو سزا سے حاصل استثنیٰ کے خاتمے میں حکام کی ناکامی کا بھی نوٹس لیا۔

فرقہ وارانہ تشدد

2013ء کے دوران شیعہ مسلمانوں بدترین تشدد اور نفرت انگیز تقاریر کا سامنا رہا۔ سال کا آغاز تشدد کی خوفناک کارروائیوں سے ہوا جن میں بلوچستان کی ہزارہ شیعہ برادری کو نشانہ بنایا گیا۔ فرقہ وارانہ تشدد کا سلسلہ ملک کے تمام علاقوں میں سال بھر جاری رہا لیکن ان میں سب سے زیادہ تسلسل کوئٹہ، کراچی، پشاور، ہنگو اور پارہ چنار میں دیکھنے میں آیا۔ 2013ء کے پہلے سات ہفتوں کے دوران کوئٹہ میں ہزارہ شیعہ برادری پر ہونے والے حملوں میں 200 سے زائد لوگ جاں بحق ہوئے۔ ان حملوں میں سینکڑوں افراد زخمی بھی ہوئے۔ 10 جنوری کو کوئٹہ میں علمدار روڈ پر ہونے والے دو دھماکوں کے نتیجے میں 100 سے زائد افراد جاں بحق اور تقریباً 200 زخمی ہوئے۔ ایک خودکش بمبار نے ہزارہ اکثریتی علاقے کے ایک سنوکر کلب کے قریب خود کو بم سے اڑا لیا۔ دس منٹ کے بعد جیسے ہی پولیس اور امدادی کارکن وہاں پہنچے تو ایک اور دھماکا ہو گیا۔ جاں بحق ہونے والے زیادہ تر افراد کا تعلق ہزارہ شیعہ برادری سے تھا۔ دوسرے دھماکے میں پولیس اہلکار، امدادی کارکن اور صحافی بھی جاں بحق ہوئے۔ واقعے کی ذمہ داری فرقہ وارانہ دہشت گرد گروہ لشکر جھنگوی نے قبول کی۔ غم زدہ خاندانوں نے اپنے تحفظ کے مطالبات پورے ہونے تک میتوں کو دفنانے سے انکار کر دیا۔ ہزارہ برادری کے اراکین کے رشتے داروں اور دوستوں نے دھماکوں میں جاں بحق ہونے والے افراد کی میتوں کے ہمراہ جما دینے والی سردی میں کوئٹہ کے اہم چوراہوں پر تین راتوں تک دھرنا دیا۔ مظاہرین اس وقت میتوں کو دفنانے پر رضامند ہوئے جب چوتھے دن وزیراعظم نے ان سے بات چیت کی اور وفاقی حکومت نے صوبائی حکومت کو برخاست اور بلوچستان میں گورنر راج کا اعلان کرتے ہوئے تحفظ مہیا کرنے سے متعلق ان کے تحفظ کے مطالبات منظور کر لیے۔ 16 فروری کا دن ہزارہ برادری کے لیے مزید تباہی لے کر آیا چونکہ کوئٹہ میں پانی کے ایک ٹینکر میں رکھے گئے دھماکہ خیز مواد کے پھٹنے کے نتیجے میں کم از کم 84 ہزارہ شیعہ جاں بحق ہو گئے جن

معمول کا منظر: سال کا آغاز کوئٹہ میں ہزارہ برادری کے شیعہ حضرات کے قتل عام سے ہوا

میں متعدد خواتین اور بچے شامل تھے۔ اس حملے کی ذمہ داری بھی لشکر جھنگوی نے قبول کی۔ اس حملے کی مذمت کرنے کے لیے ملک بھر میں احتجاجی مظاہرے کیے گئے۔ شیعہ برادری کے افراد نے مرکزی شاہراہوں پر رکاوٹیں کھڑی کیں اور تمام بڑے شہروں میں دھرنے دیے۔ انہوں نے ایئرپورٹ جانے والی شاہراہوں پر بھی رکاوٹیں کھڑی کیں۔ انہوں نے کوئٹہ کی سکیورٹی کی ذمہ داری فوج کو سونپے جانے تک میتوں کی تدفین سے انکار کر دیا۔ جب چوتھے روز انہیں یقین دہانی کرائی گئی کہ ان حملوں میں ملوث کالعدم انتہا پسند تنظیموں کے خلاف ٹارگٹڈ آپریشن کیا جائے گا تو پھر میتوں کی تدفین کا فیصلہ کیا گیا۔

ایچ آر سی پی نے فروری کے حملے کو جنگجوؤں کے خلاف کریک ڈاؤن کرنے میں حکومت کی ناکامی قرار دیا اور صدر مملکت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ہزارہ شیعہ افراد کی زندگی کے تحفظ کی ضمانت دینے کے لیے ذاتی طور پر مداخلت کریں۔ ایچ آر سی پی نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ وہ ہزارہ افراد کے تحفظ کے حوالے سے حکومت کے عزم کے اظہار کے لئے کوئٹہ کا دورہ کریں۔ اسلام آباد میں قائم ادارے پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کی جانب سے پاکستان بھر میں ہونے والے تشدد اور دہشت گردی کے واقعات پر تیار کردہ جائزے کے مطابق 2013ء میں ملک بھر میں فرقہ وارانہ حملوں کے 200 سے زائد واقعات پیش آئے جن میں 687 افراد جاں بحق اور 1319 زخمی ہوئے۔ جاں بحق اور زخمی ہونے والے افراد کی یہ تعداد 2012ء کے مقابلے میں 46 فیصد زیادہ ہے۔

2013 میں ہونے والے فرقہ وارانہ حملوں اور دہشت گردی کی وارداتوں میں جاں بحق ہونے

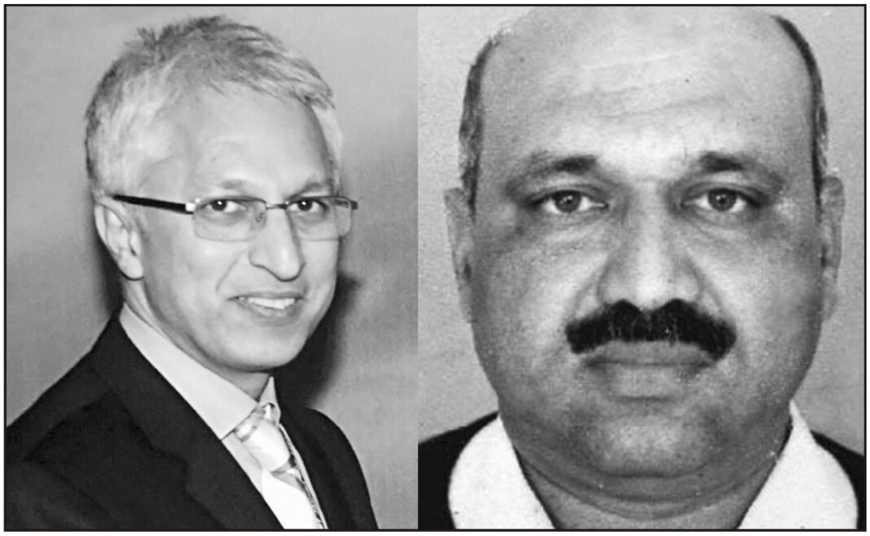

ملک جرار (دائیں) اور ڈاکٹر علی حیدر (بائیں) فرقہ واریت کا شکار بنے

والے افراد سے تقریباً 91 فیصد کوئٹہ، کراچی، پشاور، ہنگو، پاراچنار، اسلام آباد اور راولپنڈی میں جاں بحق ہوئے۔ 26 جولائی کو پاراچنار میں ہونے والے دو بم دھماکوں میں 57 شیعہ جاں بحق اور 100 سے زائد زخمی ہوئے۔ مارچ میں کراچی کے شیعہ اکثریتی علاقے عباس ٹاؤن میں ہونے والے ایک بم دھماکے میں 45 افراد جاں بحق اور 130 سے زائد زخمی ہوئے۔ حکام اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار کافی دیر تک دھماکے کی جگہ سے دور رہے۔ علاقہ مکینوں نے اپنے طور پر امدادی کارروائیاں کرتے ہوئے لاشوں کو باہر نکالا اور زخمیوں کو ہسپتال منتقل کیا۔ ایسے ہی دیگر متعدد واقعات میں مساجد اور بازاروں میں شیعہ برادری کے افراد کو گولیاں مار کر قتل کیا گیا۔ فروری کی ایک صبح کو لاہور میں ہونے والے ٹارگٹڈ حملے میں آنکھوں کے ایک معروف سرجن ڈاکٹر علی حیدر اور ان کے بارہ سالہ بیٹے کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ پولیس کا ماننا تھا کہ چونکہ ڈاکٹر کا تعلق شیعہ فرقے سے تھا اس لیے ان کا قتل فرقہ وارانہ انتہا پسندوں کی کارروائی کا نتیجہ تھا۔ فروری میں پشاور میں موٹر سائیکل پر سوار مسلح افراد نے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی کونسل کے رکن اور ایچ آر سی پی خیبر پختونخوا چیپٹر آفس کے وائس چیئر پرسن ملک جرار ایڈووکیٹ کو گولی مار کر قتل کر دیا۔ کہا جاتا تھا کہ جرار کو مبینہ طور پر فرقہ وارانہ انتہا پسندوں نے قتل کیا تھا۔ سال کے آخر تک نہ ہی حیدر اور نہ ہی جرار کے قاتلوں کو گرفتار کرنے کے لیے کسی بھی قسم کے ٹھوس اقدامات کیے گئے۔ 2013ء میں پاکستان میں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے شیعہ ڈاکٹروں، وکیلوں اور دیگر پیشہ ور افراد کو قتل کیا گیا۔ روزنامہ ڈان میں ایک مصنف نے لکھا کہ ڈاکٹر حیدر کے قتل سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اب پاکستان میں شیعہ افراد کی جان و مال کو تحفظ حاصل نہیں ہے۔

گزشتہ ہفتے اس مصنف نے کوئٹہ اور پشاور کے شیعہ افراد پر زور دیا تھا کہ وہ یا تو لاہور اور کراچی منتقل ہو جائیں یا پھر بیرون ملک سیاسی پناہ حاصل کر لیں۔ شیعہ برادری کے خلاف ایک نفرت انگیز مہم سال بھر جاری رہی۔ جس میں وال چاکنگ اور مذہبی پیشواؤں کی مخالفانہ تنقید شامل تھی جن میں انہیں کافر قرار دیا گیا اور انہیں قتل کرنے کو کہا گیا۔ ذمہ داروں کے خلاف کسی قسم کی قانونی کارروائی نہ کی گئی۔ سیاسی مختار کل جنہوں نے یہ سب ہونے دیا اور جو مذہبی انتہا پسندوں کو چیلنج کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے، نے بعد ازاں پاکستان میں متعصبانہ فرقہ واریت میں اضافے کی وجوہات پر حیرت کا اظہار کیا۔

مذہبی اقلیتی گروہ

2013ء میں مختلف مذہبی اقلیتی برادریوں کو درپیش چیلنجز زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن ان کی شدت کا انحصار آبادی، سماجی مرتبہ اور برادریوں کے جغرافیائی محل وقوع پر تھا۔ مندرجہ ذیل ابواب صرف ان اہم واقعات کا احاطہ کرتے ہیں جو میڈیا کے ذریعے منظر عام پر آئے یا جن کی نشاندہی متعلقہ برادریوں یا سول سوسائٹی نے کی اگرچہ یہ ابواب پاکستان کی مذہبی اقلیتی برادریوں کے ساتھ بڑے پیمانے پر ہونے والی زیادتیوں کی ایک جامع فہرست پیش کرنے کا دعویٰ تو نہیں کرتے تاہم ان میں اہم رجحانات اور چیلنجوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

احمدی

پاکستان میں احمدیوں کو 1974ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔ ایک عشرے کے بعد ضابطہ تعزیرات پاکستان کی ایک ترمیم (دفعہ 298 بی اور سی شامل کرتے ہوئے) کے ذریعے ان پر پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ اپنی شناخت مسلمان کے طور پر نہیں کرائیں گے۔ 2013ء میں پاکستان کے احمدی شہریوں کی مشکلات برقرار رہیں۔ وہ ایک انتہائی قابل نفرت اور نہ ختم ہونے والی مہم کا نشانہ بنتے رہے۔ ٹارگٹڈ حملوں میں متعدد احمدی جاں بحق اور زخمی ہوئے۔ ایک طرف تو احمدیوں کے ساتھ اس قدر امتیازی سلوک روا رکھا جاتا تھا، بالخصوص تعلیم اور ملازمت میں، کہ ان کے لیے گزر بسر کرنا مشکل ہو گیا تھا اور دوسری طرف انہیں میت کی تدفین کے حوالے سے بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مارچ میں ایک اخبار کے اداریے میں پاکستان میں احمدیوں کی صورتحال کا خلاصہ پیش کیا گیا۔ اداریے میں کہا گیا کہ انہیں (احمدیوں کو) کسی قسم کے حقوق اور تحفظ حاصل نہیں اور چند معمولی جرائم کی بنا پر جیل بھیجا جا سکتا ہے جن کا تصور صرف اختراعی اور فساد انگیز ذہن والے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ میڈیا کی رپورٹوں اور احمدی برادری سے حاصل ہونے والی معلومات

عید کے موقع پر احمدیوں کو ہراساں کرنے کے نئے طریقے سوچے گئے

کے مطابق 2013ء میں 7احمدیوں کو ان کے عقیدے کی بنا پر قتل کر دیا گیا۔ احمدیوں پر حملے کے 16 واقعات پیش آئے جن میں سے چند قریب قریب جاں لیوا ثابت ہوئے۔گزشتہ سال کی طرح 2013 میں احمدیوں کے قتل کے سب سے زیادہ واقعات کراچی میں پیش آئے۔کراچی میں 6اور لاہور میں ایک احمدی کو قتل کر دیا گیا۔ان ساتوں افراد کو گولی مار کر قتل کیا گیا۔کراچی میں قتل ہونے والے تینوں احمدیوں کا تعلق ایک ہی خاندان سے تھا اور انہیں چند ہفتوں کے دوران باری باری قتل کیا گیا۔احمدیوں پر ہونے والے حملوں کے 16واقعات میں انہیں عام طور پر بندوق بلکہ خنجروں سے بھی نشانہ بنایا گیا اور ایک واقعے میں لاہور کے علاقے گوالمنڈی میں ایک نوجوان نے ایک احمدی ڈاکٹر پر تیزاب پھینک دیا۔سندھ میں احمدیوں پر حملوں کے واقعات بدین، نواب شاہ، لاڑکانہ اور پنجاب میں لاہور، قصور، سیالکوٹ اور جہلم میں پیش آئے۔ایک واقعہ اسلام آباد میں بھی پیش آیا۔ جہاں دیگر مذہبی اقلیتی گروہوں کے اراکین نے 11 مئی کے پارلیمانی انتخابات کے دوران رائے دہی کے موجودہ نظام کے موثر پن کو پرکھنے کی کوشش کی وہاں احمدی اس سے محروم رہے اور ایک مشترکہ رائے دہی کے نظام میں ان کا نام ووٹرز کی علیحدہ فہرست میں شامل رہا۔احمدیوں نے اس امتیازی سلوک کے خاتمے میں ناکامی کے خلاف اپنا احتجاج درج کروانے کے لئے عام انتخابات سے علیحدگی اختیار کرنے کا اعلان کیا۔نتیجتاً احمدیوں کو یہ موقع نہ ملا کہ وہ انتخابات کو اپنے خدشات دور کرنے کے طریقے تلاش کرنے کے موقعے کے طور پر استعمال کرسکیں۔

اکتوبر میں صوبہ پنجاب کے شہر لاہور میں پولیس نے یہ اعلان کرتے ہوئے احمدی برادری کے متعدد اراکین کو قربانی کرنے سے روک دیا کہ عید پر قربانی کی رسم ایک اسلامی حکم تھا جبکہ احمدی مسلمان نہیں تھے۔کم از کم دو مقدمات میں پولیس نے احمدیوں کے گھروں کا دورہ کیا اور ان سے ضمانت لی کہ وہ عید پر

جانوروں، جوکہ ان کے گھروں میں موجود تھے، کی قربانی نہیں کریں گے۔ اطلاعات کے مطابق ان میں سے ایک شخص کو تھانے میں زیرحراست رکھا گیا اوراسے اس وقت تک رہانہیں کیا گیا جب تک کہ اس نے تحریری طور پر یہ اقرار نہ کیا کہ وہ کسی بھی جانور کی قربانی نہیں کرے گا۔ رپورٹس کے مطابق پولیس نے احمدیوں کے گھر کا دورہ اس وقت کیا جب مذہبی پیشواؤں نے مساجد میں اعلانات کئے کہ احمدی اسلامی رسومات کی پیروی کررہے تھے۔ راولپنڈی میں حکام نے احمدیوں کوعید کی نماز کے لیے جمع ہونے کی اجازت نہ دی۔

2013ء میں پولیس نے مجموعی طور پر 36 احمدیوں کوجھوٹے الزامات کی بنیاد پر دہشت گردی کے قوانین کے تحت گرفتار کرلیا۔ زیریں عدالتوں کے مجسٹریٹ اکثر احمدیوں کی ضمانت مسترد کردیتے تھے جبکہ اعلیٰ عدالتوں کے جج یا توغیر ہمدردانہ رویہ اپنائے رکھتے تھے یا پھران فسادی افراد سے خوفزدہ رہتے تھے جوکہ ایسے مقدمات کی سماعت کے دوران کمرہ عدالت میں موجود ہوتے تھے۔ نومبر میں پولیس نے لاہور میں 72 سالہ احمدی، مسعود احمد جوکہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھا کواس کے کلینک میں سے گرفتار کرلیا اوراس پر ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298 سی کے تحت مقدمہ درج کیا گیا۔ اطلاعات کے مطابق مقدمے کے مدعی نے طبی مشورے کے لئے مسعود احمد کے کلینک کا دورہ کیا۔ اس نے ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے کہا کہ وہ اسے اپنے عقیدے کے بارے میں بتائیں۔ جب اس نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا تو مدعی نے ایک خفیہ ڈیوائس کے ذریعے اس کی باتیں ریکارڈ کرلیں۔ بعدازاں اس نے یہ ریکارڈنگ ثبوت کے طور پر پولیس کے حوالے کی کہ جب وہ مسعود احمد سے مشورہ لینے گیا تو اس نے اسے تبلیغ کی اور قرآن کی آیات کا حوالہ دیا۔ عمررسیدہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر کوقرآن کا حوالہ دیتے ہوئے خودکو مسلمان ظاہر کرنے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا اورکیمپ جیل لاہور میں منتقل کردیا گیا۔ جج نے اسے ضمانت دینے سے انکار کردیا اور ریاستی وکیل کومشورہ دیا کہ فراہم کردہ ثبوت ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295 اے اور 298 سی کے تحت کارروائی کا تقاضہ کرتا ہے۔ اول الذکر دفعہ انسداد دہشت گردی کی عدالت میں مقدمہ چلانے کی اجازت دیتی ہے اور موخرالذکر کی سزا موت ہے۔ سال کے اختتام تک ہومیو پیتھک ڈاکٹر جیل میں تھا۔

احمدیوں کومیتوں کی تدفین کے حوالے سے جن دھمکیوں اورامتیازی سلوک کا سامنا رہا ہے وہ سلسلہ 2013ء میں بھی جاری رہا۔ جنوری میں احمدی مخالف انتہا پسندوں نے ضلع حافظ آباد کے علاقے ڈاہرانوالی کے مشترکہ قبرستان میں ثناء اللہ نامی احمدی کی میت کی تدفین کے دودن بعداس کی لاش قبر کھود کر باہر پھینک دی۔ اپریل میں ضلع رحیم یارخان کے گاؤں 133 پی میں پولیس نے مقامی مذہبی پیشواؤں کے دباؤ کے تحت مشترکہ قبرستان میں ایک احمدی خاتون سیمابی بی کی لاش قبر سے باہر نکال دی۔ احمدیوں کومشترکہ قبرستان میں

تدفین کی اجازت نہ دینے کے تین واقعات پیش آئے۔ان میں سے دو واقعات ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کے گاؤں کٹھووالیمیں پیش آئے۔مرحومین میں ایک ڈیڑھ سالہ بچی شامل تھی جسے انتہا پسندوں نے یہ کہتے ہوئے دفنانے کی اجازت نہ دی کہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کے قبرستان میں نہیں دفنایا جاسکتا۔چار دن کے بعد گاؤں کے مسلمان رہائشی کی جانب سے فراہم کردہ زمین میں بالآخر بچی کو دفنا دیا گیا۔اس سے پہلے گاؤں میں کسی نے بھی مشترکہ قبرستان میں کسی احمدی کی تدفین پر اعتراض نہیں کیا تھا۔احمدیوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک پرامن برادری کے طور پر رہ رہے تھےاور باہر سے آنے والے انتہا پسندوں نے مقامی لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسایا تھا اور پولیس نے غنڈوؤں کا ساتھ دیا تھا۔اس واقعہ کے ایک ہفتے کے بعد جب احمدیوں نے ایک عمر رسیدہ خاتون کی میت کو مشترکہ قبرستان میں دفنانے کی کوشش کی تو انہیں ایک مرتبہ پھر روک دیا گیا اور کہا گیا کہ وہ میت کو ربوہ لے جائیں جو کہ پاکستان میں احمدی برادری کا ہیڈکوارٹر ہے۔اگلے روز اسے بھی گاؤں کے ایک مسلمان کی جانب سے فراہم کردہ زمین میں دفنا دیا گیا۔اس مرتبہ انتہا پسندوں نے اس اقدام کی بھی یہ کہتے ہوئے مخالفت کی کہ یہ زمین قبرستان کا حصہ تھا۔ پولیس نے زمین کی ملکیت کی تصدیق کرنے کے بعد سخت سکیورٹی کے تحت تدفین کی اجازت دے دی اور مرحومہ کے خاندان سے کہا کہ وہ قبر کو محفوظ بنالیں۔اس تدفین کی مخالفت کرنے والے گروہ کے ایک رکن نے ایک اخبار کے نمائندے کو بتایا کہ پنچائت نے فیصلہ کیا تھا کہ احمدیوں کو قبرستان استعمال کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہئے کیونکہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کی قبروں کے قریب دفن کرنا غیر مناسب تھا۔اس نے دعویٰ کیا کہ پولیس احمدیوں کی حمایت کر رہی تھی اور ریونیو ڈیپارٹمنٹ کا افسر جس نے فراہم کردہ زمین کی ملکیت کی تصدیق کرنے کے بعد سخت سکیورٹی کے تحت تدفین کی اجازت دے دی اور مرحومہ کے خاندان سے کہا کہ وہ قبر کو محفوظ بنالیں۔انتہا پسند ذہن رکھنے والوں نے اس افسر کو بھی احمدی قرار دے دیا۔اگرچہ قانون احمدیوں کو اپنی عبادت گاہوں میں مینار تعمیر کرنے سے نہیں روکتا تاہم حکام انہیں مجبور کرتے ہیں کہ یا تو وہ انہیں مسمار کردیں یا پھر انہیں ڈھانپ کر رکھیں۔2013ء کے دوران متعدد واقعات میں پولیس نے مذہبی پیشواؤں کے مطالبے پر احمدیوں کی عبادت گاہوں کے مینار مسمار کئے۔ستمبر میں پیش آنے والے ان واقعات میں سے دو واقعات سیالکوٹ اور ایک ضلع بہاولپور میں پیش آئے۔جولائی میں پولیس نے ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کے علاقے گوجرہ کے ایک گاؤں 213 ج ب میں مقامی مذہبی پیشواؤں کی شکایت پر احمدیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی عبادت گاؤں کے مینار ڈھانپ کر رکھیں۔احمدیوں کو انہیں لوہے کی چادروں سے ڈھانپنا پڑا تھا۔

زیر جائزہ سال کے دوران ایک احمدی کے زیر ملکیت اخبار اور پرنٹنگ پریس کو نشانہ بنایا گیا۔

اپریل میں پولیس نے لاہور میں ایک احمدی اخبار الفضل سے وابستہ 16 احمدیوں کے خلاف تضحیک مذہب اور دہشت گردی کے الزامات پر مقدمہ درج کیا۔ملزمان میں ایک ہاکر، ایڈیٹر اور ایک پرنٹر شامل تھا۔ چار ملزمان کو گرفتار کیا گیا۔ ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295 بی اور 298 سی اور انسداد دہشت گردی ایکٹ کی دفعہ 11 ڈبلیو کے تحت درج کئے جانے والے ان مقدمات میں مدعی نے احمدیوں پر احمدی برادری کے اخبار الفضل، جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ اس میں تضحیک مذہب پر مبنی مواد موجود تھا، کی طباعت اور تقسیم کا الزام عائد کیا۔ جماعت احمدیہ پاکستان نے ایک پریس ریلیز میں کہا کہ روزنامہ الفضل کی اشاعت صرف احمدیوں کے لیے ہوئی تھی۔ اس میں کسی قسم کا تضحیک مذہب پر مبنی مواد نہیں تھا اور مقدمے میں عائد کردہ الزامات من گھڑت تھے۔ اس نے الزام عائد کیا کہ مقامی مذہبی پیشواؤں نے اخبار کے ہاکر خالد اشفاق کا جو کہ اخبار کے ایک خریدار طاہر محمود کے گھر اخبار تقسیم کرنے گیا تھا، کا پیچھا کیا اور زبردستی گھر میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے خالد، طاہر محمود اور ان کے بچوں کو مارا اور انہیں 45 منٹ تک قید کئے رکھا۔ انہوں نے ان سے اخبار کے ایڈیٹر اور پرنٹر کے بارے میں استفسار کیا تاکہ انہیں درخواست میں نامزد کیا جا سکے۔ بعدازاں انہوں نے پولیس سے رابطہ کیا اور مقدمہ درج کروایا۔ احمدیوں کا کہنا تھا کہ مذہبی پیشواؤں کا ایک گروہ بشمول حسن معاویہ نامی شخص جو کہ احمدیوں کے خلاف درج ہونے والے مقدمات میں تسلسل کے ساتھ خود کو رضا کارانہ طور پر گواہ کے طور پر پیش کرتا رہا ہے، پنجاب کے دارالحکومت میں احمدیوں کے خلاف مقدمات درج کرواتا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ سرکاری مشینری احمدیوں کا تحفظ کرنے کی بجائے چند انتہا پسندوں کا آلہ کار بن چکی تھی۔

ایسی ہی ایک کارروائی میں پولیس اور مذہبی پیشواؤں نے مشترکہ طور پر ایک احمدی کے زیرملکیت ایک پریس پر چھاپا مارا اور اس کے مالک کے ساتھ ساتھ تین احمدی اور چھ غیر احمدی ملازمین کو گرفتار کر لیا۔ غیر احمدیوں کو رہا کر دیا گیا جبکہ دیگر تمام افراد پر ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298 بی اور 298 سی کے تحت مقدمہ درج کر لیا گیا۔ متعدد سماعتیں ملتوی ہونے کے بعد سیشن جج نے ملزمان کی درخواست ضمانت کی سماعت کی اور ان کی درخواست مسترد کر دی۔ انہوں نے اپریل میں ضمانت کے لیے ہائی کورٹ میں درخواست دائر کی۔ انتہا پسند بظاہر جج کو دھمکانے کی کوشش کرتے ہوئے بڑی تعداد میں عدالت کے احاطے میں اکٹھے ہو گئے۔ عدالت کی بیرونی دیوار پر ایک بہت بڑا احمدی مخالف بینر لگایا گیا تھا۔ اس روز ضمانت کی درخواست کی سماعت نہ ہو سکی۔ مئی میں ضمانت کی درخواست کی سماعت ہوئی۔ جج نے دلائل سنے جس کے بعد اس نے ملزمان کی ضمانت زبانی طور پر منظور کر لی۔ اس اعلان سے کمرہ عدالت میں ایک فساد برپا ہو گیا اور جج کو بمشکل دو منٹ کے بعد اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔

چند دنوں بعد تمام ملزمان کی ضمانت منظور کر لی گئی ماسوائے ایک شخص کے جسے ایک دوسرے مقدمے

میں قصوروار ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ پانچ ماہ تک زیرِ حراست رہا تھا۔ سال کے آخر تک اس کے مقدمے کا فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا لیکن پرنٹنگ پریس کو بند کر دیا گیا جس کے باعث عملے کے تمام افراد کا روزگار خطرے میں پڑ گیا۔

28 مئی 2010ء کو انتہا پسندوں نے احمدیوں کی عبادت گاہوں پر بیک وقت دو حملے کر کے 86 احمدیوں کو قتل کر دیا تھا۔ جب ملک کی اعلیٰ ترین خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کے چیف لیفٹننٹ جنرل شجاع پاشا امریکہ کے ہاتھوں ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی ہلاکت کا سبب بننے والے واقعات کی چھان بین کے لئے تشکیل کردہ کمیشن کے سامنے پیش ہوئے تو انہوں نے لاہور میں 2010ء کے حملے کا حوالہ دیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ملک کے حالات کس قدر مایوس کن تھے۔ اس معاملے پر ان کے بیانات کمیشن کی رپورٹ کے پیرا نمبر 497 میں درج تھے جو کہ جولائی 2013ء میں الجزیرہ ٹی وی کے ذریعے منظرِ عام پر آئے تھے۔ اس پیرے میں بتایا گیا کہ: ڈائریکٹر جنرل نے بتایا کہ آئی ایس آئی قصبوں اور شہروں میں ہائی ویلیو ٹارگٹ (ایچ وی ٹی) کے بارے میں جانتی تھی۔ آئی ایس آئی جانتی تھی کہ کراچی میں ایسے "نوگوایریاز" موجود تھے جہاں جرائم میں ملوث افراد رہائش پذیر تھے۔ لیکن پولیس وہاں کارروائی کرنے کی ہمت نہیں کرتی تھی۔ لاہور اور دیگر شہروں میں بھی تقریباً ایسی ہی صورتحال تھی۔ لاہور میں پولیس نے ان لوگوں کو تحفظ فراہم کیا جنہوں نے گزشتہ سال 2010ء میں قادیانیوں پر حملہ کیا تھا اور ہسپتال پہنچنے میں بھی ان کی مدد کی جہاں زخمیوں کا علاج کیا جا رہا تھا۔ صوبائی حکومت کو صورتحال کے بارے میں آگاہ کیا گیا تھا لیکن اس نے اس کا اور آئی ایس آئی کی فراہم کردہ معلومات پر توجہ نہ دی۔ ہسپتال میں ایک بھی سپاہی تعینات نہیں کیا گیا تھا چونکہ ہر جگہ بددیانت سیاسی اثر ورسوخ بیچ میں حائل تھا۔ کسی بھی حکومتی نمائندے نے ان بیانات پر ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔

احمدیوں کے خلاف انتہائی نفرت انگیز مہم، بالخصوص عوامی ریلیوں میں کی جانے والی شدید تنقید سال بھر جاری رہی لیکن 7 ستمبر کو مذہبی پیشوا ربوہ میں اکٹھے ہوگئے جہاں انہوں نے احمدیوں کے خلاف انتہائی نفرت انگیز تقریریں کیں۔ اکتوبر میں ایک بار پھر ربوہ میں اجتماع کیا گیا جس میں تقریباً نو ہزار افراد شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں بھی احمدیوں کے خلاف نفرت انگیز تقاریریں کی گئیں۔ علماء نے لوگوں کو اکسایا کہ وہ احمدیوں کے خلاف مقدس جنگ کا آغاز کریں اور پاکستان میں ان کی مکمل بیخ کنی کریں۔ انتظامیہ نے نفرت پھیلانے والے ان مقررین کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔

مسیحی

گرجا گھروں اور مسیحی آبادیوں پر ہونے والے جان لیوا حملوں کی بناء پر 2013ء پاکستان کی مسیحی برادری کے لئے تاریک ترین سال تھا۔ زیرِ جائزہ سال کے دوران چرچوں یا ان کی حفاظت پر تعینات پولیس

اولڈ سلاٹر ہاؤس کالونی سے بے گھر ہونے والے افراد

کراچی کا علاقہ اولڈ سلاٹر ہاؤس کالونی، جہاں سینکڑوں مسیحی اور ہندو خاندان بدترین غربت کی زندگی بسر کر رہے ہیں 2013ء کے آخری چند ماہ کے دوران مذہبی اقلیتی برادری کے ساتھ پیش آنے والے تشدد اور سراسیمگی کے واقعات کی بنا پر خبروں کی زینت بنا رہا۔ علاقہ کے مکین جرائم میں ملوث گروہوں کے مابین جاری علاقائی جنگ کا نشانہ بنے رہے اور ان کا کہنا تھا کہ حکام اور سیکیورٹی اہلکاروں نے جو علاقے میں لاقانونیت کے خاتمے کے ذمہ دار تھے، ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ اگست میں اس علاقے کے ایک مسیحی سماجی کارکن، وکٹر ولیم بھٹہ کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے قاتلوں کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ 26 اکتوبر کو یوسف جوجا اقبال اور یونس عنایت نامی دو مسیحی کارکنوں کو مسلح افراد جو کہ کالونی کی حدود میں داخل ہوئے تھے، نے ان کے گھروں سے باہر بلا کر قتل کر دیا۔ گھر کے احاطے میں ایک گرنیڈ بھی پھینکا گیا۔ شدید فائرنگ کے باعث کالونی میں خوف وہراس پھیل گیا اور چند رہائشیوں نے مدد کے لئے رینجرز کے ایک دستے سے رابطہ کیا جو کہ وہاں سے 250 گز کے فاصلے پر تعینات تھا۔ رینجرز نے انہیں بتایا کہ وہ ان کی مدد نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں افسران بالا کی جانب سے اس قسم کے احکامات موصول نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بعد خوف میں مبتلا تقریباً 600 خاندانوں نے وہاں سے نقل مکانی شروع کر دی جو کہ اگلے روز تک جاری رہی۔ خوفزدہ رہائشی اپنے دوستوں اور عزیز و اقارب کے ہاں رہنے لگے اور اولڈ سلاٹر ہاؤس کالونی میں محض 15 خاندان باقی رہ گئے۔ خالی ہونے والے چند کوارٹروں میں جرائم میں ملوث گروہوں نے لوٹ مار بھی کی۔ میڈیا میں جبری نقل مکانی اور ہلاکتوں کی خبر پہلی بار دو ہفتے بعد منظر عام پر آئی۔ 6 دسمبر کو اولڈ سلاٹر ہاؤس کے سابق مسیحی کونسلر نے علاقے کی صورتحال کے بارے میں ایچ آر سی پی کو شکایتی خط لکھا۔ 9 دسمبر کو اس سابق کونسلر کی ہمشیرہ ''ر''، جس نے ایچ آر سی پی کو خط لکھا تھا، اپنا سامان لینے اپنے گھر واپس گئی۔ 5 مسلح افراد نے اسے گن پوائنٹ پر روک لیا اور اس سے اس کے بھائی کے بارے میں استفسار کیا۔ انہوں نے اسے دھمکیاں دیں اور تشدد کیا اور پھر اسے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا۔ 10 دسمبر کو ایچ آر سی پی نے وزیراعلیٰ سندھ اور ڈائریکٹر جنرل رینجرز کو شکایتی خطوط بھیجے۔ 12 دسمبر کو ''ر'' نے اپنے خاندان کی حمایت اور ان کے زور دینے پر بالآخر تھانہ بغدادی میں مقدمہ درج کروا دیا۔ اسے طبی معائنے کے لیے سول ہسپتال لے جایا گیا۔ سال کے آخر تک پولیس نے مجرموں کو گرفتار کرنے کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ ایچ آر سی پی نے حکومت اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو خطوط کے ذریعے یاددہانی کرائی لیکن انہوں نے کوئی کارروائی نہیں کی۔

23 دسمبر کو کرسمس سے دو روز قبل اولڈ سلاٹر ہاؤس کے گرجاؤں میں دو ماہ کے بعد عبادات کا آغاز ہو گیا لیکن سینکڑوں خاندان علاقے سے دور رہے کیونکہ قانون نافذ کرنے والے حکام کی حمایت کی عدم موجودگی میں وہ اپنی

زندگیوں کو خطرے میں محسوس کرتے تھے۔ 2014ء کے پہلے دن ایچ آر سی پی کی فیکٹ فائنڈنگ ٹیم نے کراچی کے گردونواح میں بے گھر/ متاثرہ خاندانوں سے ملاقات کی۔ بے گھر ہونے والے رہائشیوں نے الزام عائد کیا کہ جرائم میں ملوث گروہوں نے رینجرز کے اہلکاروں کی ملی بھگت سے انہیں جبری طور پر بے دخل کیا تھا کیونکہ انہوں نے ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ اس علاقے میں موجود تھے اور ان سے مدد کے لیے رابطہ کیا گیا تھا۔ رہائشیوں کا خیال تھا کہ رینجرز انہیں اولڈ سلاٹر ہاؤس سے بے دخل کرنے کے بعد اس علاقے کو اپنے زیر استعمال لانا چاہتی تھی تاہم اس دعوے کی تائید کے لیے ایچ آر سی پی کو کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا گیا تھا۔ ایچ آر سی پی نے وزیر اعلیٰ سندھ اور ڈائریکٹر جنرل رینجرز کو خط لکھا کہ وہ صورتحال کا بغور جائزہ لیں لیکن اس حوالے سے کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

اہلکاروں پر حملے کے پانچ واقعات رونما ہوئے جن میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی چرچ پر ہونے والا خودکش حملہ بھی شامل تھا۔ 22 ستمبر کو دو خودکش حملہ آوروں نے خیبر پختونخوا کے شہر پشاور میں آل سینٹس چرچ کو نشانہ بنایا۔ حملہ آوروں نے یہ حملہ اس وقت کیا جب اتوار کی عبادت اختتام کو پہنچی تھی اور سینکڑوں عبادت گزار وہاں سے جانے کو تھے۔ حملہ آوروں نے چرچ کے باہر اس کی حفاظت پر مامور دو پولیس اہلکاروں کو گولی مار کر قتل کر دیا۔ حملے میں جاں بحق ہونے والے افراد کی تعداد کے حوالے سے کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ حکومت اور میڈیا کی اطلاعات کے مطابق تقریباً 85 افراد جاں بحق اور 100 سے زائد زخمی ہوئے لیکن مسیحی برادری کا دعویٰ تھا کہ جاں بحق ہونے والوں کی تعداد اس سے دوگنی تھی۔ خلاف قانون تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) جسے ملک میں ہونے والی دہشت گردی کی زیادہ تر کارروائیوں کا ذمہ دار قرار دیا جاتا تھا، نے اس حملے سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ایک اور جنگجو گروہ نے یہ کہتے ہوئے حملے کی ذمہ داری قبول کی کہ یہ حملہ امریکی ڈرون حملوں میں معصوم لوگوں کی ہلاکت کا انتقام تھا۔ اس کا مزید کہنا تھا کہ جب تک پاکستان میں ڈرون حملے جاری رہیں گے وہ ''غیر ملکیوں'' کو قتل کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ وفاقی اور صوبائی حکومت نے تین روزہ سوگ کا اعلان کیا لیکن انہوں نے مجرموں کا سراغ لگانے کے لیے خاطر خواہ اقدامات نہیں کئے۔ خیبر پختونخوا حکومت نے جاں بحق ہونے والے افراد کے ہر خاندان کو پانچ لاکھ روپے کی امداد دینے کا اعلان کیا۔ 22 ستمبر کے حملے کے بعد اہم گرجاؤں پر پولیس اہلکار تعینات کر دیئے گئے اور آل سینٹس چرچ پر بائیومیٹرک سسٹم نصب کر دیا گیا۔ سول سوسائٹی کے کارکنان نے پاکستان کی مسیحی برادری سے یکجہتی کا اظہار کرنے اور امن کے لیے خطرے کا باعث بننے والی طاقتوں کی مخالفت کرنے کے لئے لاہور میں سینٹ انتھونی چرچ اور اسلام آباد کے اَور لیڈی آف فاطمہ چرچ (Our lady of Fatima church) کے باہر

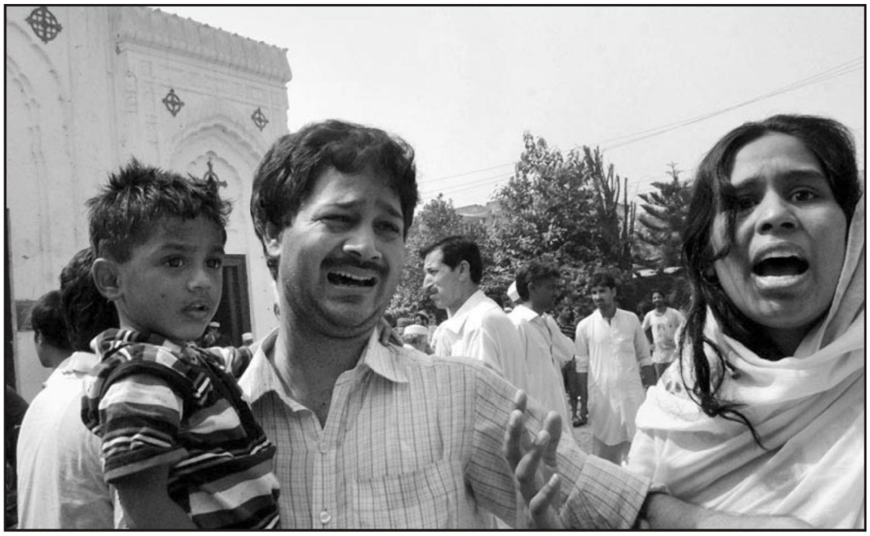

پشاور کے چرچ پر حملہ پاکستان میں مسیحیوں کے خلاف انتہائی خوفناک واقعہ تھا

انسانی زنجیر بنائی۔ پشاور میں چرچ پر حملے کے بعد احتجاج کے دوسرے دن کراچی میں چند مسیحیوں اور مسلمانوں کا آپس میں تصادم ہوگیا۔ تصادم کے دوران ایک مسلمان ہلاک ہوگیا اور شہر کے عیسائی اکثریتی علاقوں میں تین گھروں اور پانچ گاڑیوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ جب ایک مسجد کی انتظامیہ نے شکایت کی کہ احتجاج میں شریک افراد نے خلفاء راشدین کے ناموں پر پتھر اور لاٹھیوں سے وار کئے تو پولیس نے تین مسیحیوں کے خلاف تضحیک مذہب کے الزام کے تحت مقدمات درج کر لئے۔ اپریل میں نامعلوم افراد نے پنجاب کے ضلع وہاڑی کے ایک گاؤں میں ایک چرچ کو جلانے کی کوشش کی۔ انہوں نے عمارت کو نقصان پہنچانے کے علاوہ بائبل کی بے حرمتی کی اور فرار ہوگئے۔ اس طرح کا ایک حملہ پشاور میں سواتی گیٹ کے قریب واقع اسمبلی آف گاڈ چرچ پر کیا گیا۔ اس وقت چرچ پر تعینات کئے گئے پولیس اہلکاروں میں سے ایک ڈیوٹی پر موجود تھا جسے دو مسلح افراد نے گولی مار کر قتل کر دیا۔ جولائی میں اسی چرچ کے باہر مسلح افراد نے ایک پولیس کانسٹیبل کو قتل کر دیا۔ اگست میں لاہور کے علاقے بہار کالونی میں نامعلوم انتہا پسندوں نے ایک چرچ کو نذر آتش کر دیا۔ جس کے نتیجے میں بائبل کے نسخے، فرنیچر اور لاکھوں روپے مالیت کے بجلی کے آلات جل کر راکھ ہوگئے۔ نومبر میں پشاور کے علاقے امید آباد میں سمبل آف گاڈ چرچ کی حفاظت پر مامور ایک پولیس اہلکار کو موٹر سائیکل پر سوار نامعلوم افراد نے قتل کر دیا۔ مارچ میں لاہور میں مسلمان بلوائیوں نے اس الزام دہی کے بعد کہ ایک مسیحی شخص نے توہین مذہب کا ارتکاب کیا تھا، جوزف کالونی نامی مسیحی آبادی کو نذر آتش کر دیا۔ 100 سے زائد گھروں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ اگرچہ صوبائی حکومت نے متاثرہ خاندانوں کے لئے معاوضے اور تباہ شدہ گھروں کی تعمیر نو کا

جوزف کالونی کے مکانات تو دوبارہ تعمیر ہو گئے لیکن مسیحی اقلیت کا اعتماد بحال نہیں ہوا

اعلان کیا تاہم گھروں کو نذرِ آتش کرنے سے روکنے میں ناکامی پر حکام پر شدید تنقید کی گئی۔ جوزف کالونی حملے کے چند ہفتوں کے بعد گوجرانوالہ کی فرانسس کالونی میں مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک جھڑپ ہوئی۔ اس کا آغاز اس وقت ہوا جب ایک مسلمان امام نے مسجد کے باہر موبائل پر موسیقی چلانے پر ایک مسیحی لڑکے کو ڈانٹا۔ کچھ ہی دیر بعد لوگوں کے ایک گروہ نے فرانسس کالونی میں مسیحیوں کے گھروں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ پولیس ایک مرتبہ پھر اس حملے کو روکنے میں ناکام رہی۔

زیرِ جائزہ سال کے دوران مسیحی مردوں اور مسلم خواتین کے مابین شادی کے تین واقعات پیش آئے جو دونوں برادریوں کے مابین تصادم کا باعث بنے۔ سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں ایک مسیحی نوجوان نے ایک مسلمان خاتون سے شادی کر لی جس کے بعد ایک پنچائت نے وہاں پر رہائش پذیر مسیحی برادری کو گاؤں چھوڑنے کا حکم دیا۔ اگلے ماہ سرگودھا کے ایک گاؤں میں ایک اور مسلمان خاتون جس نے ایک مسیحی شخص کے ساتھ گھر سے فرار ہو کر شادی کر لی تھی، کو دھمکیاں دی گئیں اور مسیحی شخص کو گاؤں چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ اسی ماہ کے دوران سرگودھا میں چند جاگیرداروں نے چار مسیحی خاندانوں سے زبردستی اشٹام پیپر پر دستخط کروائے اور ان کے ذریعے ان کی جائیداد ہتھیا لی۔ جاگیرداروں نے ان کے گھروں میں لوٹ مار بھی کی اور انہیں علاقے سے بے دخل کر دیا۔ اطلاعات کے مطابق یہ تنازعہ اس وقت شروع ہوا جب ایک مسلمان خاتون نے ان چار خاندانوں میں سے ایک سے تعلق رکھنے والے ایک مسیحی شخص سے شادی کر لی تھی۔ 2013ء کے دوران جبری طور پر مذہب کی تبدیلی کے تین مبینہ واقعات بھی منظرِ عام پر آئے۔ ایک مسیحی خاندان کے مطابق، ایک

15 سالہ مسیحی لڑکی کو اغواء کیا گیا، اسے زبردستی مسلمان کیا گیا اور کراچی میں ایک وزیر کے ملازم سے اس کی شادی کردی گئی۔ یہ واقعہ جنوری میں پیش آیا اور پولیس وزیر کے اثر ورسوخ کی وجہ سے مبینہ طور پر کارروائی کرنے سے ہچکچاتی رہی۔

پنجاب کے ضلع چیچہ وطنی میں دو مسیحی لڑکیوں کو جن کی عمریں 13 اور 8 برس تھیں، مبینہ طور پر اغواء کیا گیا اور ان کی شادیاں مسلمان مردوں سے کردی گئیں۔ لڑکیوں کے اہل خانہ نے اس بات کا انکشاف جولائی میں ایک پریس کانفرنس میں کیا۔ اکتوبر میں اسلام آباد میں مسلح افراد ایک مسیحی شخص کے گھر میں زبردستی داخل ہوئے اور اسے اور اس کے دو بھتیجوں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کی۔ پولیس نے ملزمان کو گرفتار کرلیا۔ مسیحی ملازمین کے خلاف امتیازی سلوک کا ایک منفرد واقعہ جولائی میں میڈیا کے ذریعے منظر عام پر آیا۔ کیپٹیل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) نے عملے کے چند مسیحی اراکین کو سی ڈی اے کے زیارت کے پروگرام کے تحت 2012ء میں کرسمس کے اجتماع میں شرکت کے لئے ویٹی کن سٹی بھیجا تھا۔ چونکہ عملے کے زیادہ تر افراد کے پاس پاسپورٹ نہیں تھے اور وہ ان پڑھ تھے، اس لیے ان کا انتخاب رائے دہی کے مقرر کردہ طریقہ کار کے مطابق نہیں ہوا تھا اور دس ملازمین کو ذاتی پسند کی بنیاد پر منتخب کرلیا گیا اور انہیں ایک ہفتے کے لیے روم بھیج دیا گیا۔ واپسی پر انہیں بتایا گیا کہ رائے دہی کی عدم موجودگی میں ان کا انتخاب غیر قانونی تھا اور یہ کہ ان میں سے ہر ایک کو دو لاکھ روپے واپس کرنے ہوں گے۔ اطلاعات کے مطابق یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر ملازم کی تنخواہ میں سے ہر ماہ چھ ہزار روپے کی کٹوتی کی جائے گی۔ عملے کے ایک رکن نے میڈیا کو بتایا کہ تنخواہ میں کٹوتی جون سے شروع ہوچکی تھی۔

ہندو

ہندو برادری پاکستان کا سب سے بڑا مذہبی اقلیتی گروہ ہے اور ان کی آبادی 20 لاکھ سے زیادہ ہے۔ 2013ء میں ہندوؤں کو امتیازی سلوک کا سامنا رہا اور انہوں نے نوجوان ہندو لڑکیوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے حوالے سے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ اچھوت ذاتوں سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں کو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ہاتھوں بھی امتیازی سلوک کا سامنا رہا۔ پاکستان میں اچھوت ذات والے ہندوؤں کی ایک خاصی بڑی تعداد زمین سے محروم ہے اور وہ سندھ اور پنجاب کے دیہی علاقوں میں زرعی زمینوں پر کام کررہے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ 11 مئی کے عام انتخابات سے پہلے نچلی ذات کے چند ہندوؤں نے سندھ کے ضلع میرپور خاص میں احتجاجی مظاہرہ کیا۔ ان کی شکایت یہ تھی کہ سیاسی جماعتوں نے صرف اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو ٹکٹ دیئے تھے اور یہ کہ نچلی ذات کے ہندوؤں کے نمائندوں کو

زیادہ ٹکٹ دیئے جانے چاہئیں۔عام انتخابات میں سندھ میں متعدد سیاسی جماعتوں نے مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے امیدواروں کو نامزد تو کیا لیکن ایسا ان علاقوں میں کیا گیا جہاں سے ہندو امیدوار یقینی طور پر انتخاب جیت سکتے تھے۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے سندھ کی صوبائی اسمبلی کے دو حلقوں کے لئے ہندو امیدواروں کو ٹکٹ دیئے۔حلقہ پی ایس 61 میں پی پی پی کے امیدوار مہیش کمار نے مخالف امیدوار کے 29,346 ووٹوں کے مقابلے میں 42,137 ووٹ حاصل کر کے کامیابی حاصل کی تھی۔ملانی پاکستان میں مذہبی اقلیتی کے وہ پہلے رکن بن گئے جنہیں بلاواسطہ طور پر صوبائی یا وفاقی مقنّنہ کے لیے منتخب کیا گیا۔پی پی پی کے دوسرے ہندو امیدوار گیان چند تھے جو کہ حلقہ پی ایس 60 میں ارباب غلام رحیم سے ہار گئے تھے۔انہوں نے 53,437 ووٹوں کے مقابلے میں 34,796 ووٹ حاصل کئے۔یہ دونوں حلقے سندھ کے ضلع تھرپارکر میں تھے۔اس حلقے میں ایک مقامی مدرسے کی جانب سے انتخابات سے پہلے پمفلٹ تقسیم کئے گئے جن میں مسلمانوں پر زور دیا گیا کہ وہ ہندوؤں کو ووٹ نہ دیں۔پمفلٹوں میں ہندوؤں کو کافر کہا گیا تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہندو امیدوار کو ووٹ دینا اسلام کی مخالفت کے مترادف تھا۔یہ شبہ ظاہر کیا گیا کہ مدرسے کی جانب سے یہ پمفلٹ ضلع کے ایک بااثر سیاسی خاندان کی ایماء پر جاری کئے گئے تھے۔تاہم مذکورہ خاندان نے پمفلٹ سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔2013ء کے انتخابات سے پہلے الیکشن کمیشن آف پاکستان کی جانب سے سیاسی جماعتوں کے امیدواروں کے لیے جاری کردہ ضابطہ اخلاق میں مذہب یا فرقے کے نام پر ووٹ مانگنے کی خاص طور پر ممانعت کی گئی تھی۔کسی شخص کے خلاف مذہب،نسل،ذات یا صنف کی بنا پر مہم چلانے پر بھی پابندی تھی۔تاہم حکام اور ای سی پی نے پمفلٹ تقسیم کئے جانے کے بعد کوئی کارروائی نہیں کی۔

تاہم سندھ کے چند علاقوں میں انتخابی کامیابی کی امید نہ ہونے کے باوجود اہم پیش رفت دیکھنے میں آئی۔نچلی ذات سے تعلق رکھنے والی ہندو خاتون ویرو کوہلی پاکستان میں جبری مشقت کرنے والی پہلی خاتون تھیں جنہوں نے عام انتخابات میں حصہ لیا۔انہوں نے حیدرآباد میں سندھ اسمبلی کے حلقہ پی ایس 50 سے آزاد امیدوار کے طور پر انتخابات میں حصہ لیا۔اگرچہ اس کے مخالف امیدوار نے 35652 ووٹ حاصل کئے اور ویرو نے صرف 503 ووٹ لیے لیکن اس کا امیدوار بننا ہی ایک اہم فیصلہ تھا جس کو جبری مشقت کرنے والے محنت کشوں نے بے حد سراہا۔اور اس عمل کو نچلی ذات کی محروم برادری سے تعلق رکھنے والی خواتین کے لئے ایک سنگ میل قرار دیا گیا۔

ہندو اور سکھ برادریوں نے اپنی متعلقہ برادریوں کے افراد کی شادیوں کے اندراج کے لیے کوئی

طریقہ کار موجود نہ ہونے پر تشویش کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ اس کے باعث شادی شدہ جوڑوں کو پولیس کے ہاتھوں استحصال اور ہراسیمگی کا سامنا کرنا پڑا اور طلاق، شریک حیات کو خرچ کی ادائیگی اور جائیداد میں حصے جیسے معاملات کے حوالے سے پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ سرکاری ریکارڈ کی غیر موجودگی میں شادی شدہ جوڑوں کو اپنی شادی کے ثبوت کے طور پر اکثر اپنی شادی کے دعوت نامے یا شادی کی تصاویر پیش کرنا پڑتی تھیں۔ جولائی میں سندھ کے صوبائی وزیر قانون نے ہندو برادری سے تعلق رکھنے والے قانون سازوں کے مشورے سے ہندوؤں کی شادی اور جبری طور پر مذہب کی تبدیلی کے متعلق ایک مسودہ قانون کی تیاری کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دینے کا اعلان کیا۔ سال کے آخر تک اس مسودہ قانون کے حوالے سے کوئی پیش رفت دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہندو برادری کے اراکین نے خاص طور پر سندھ میں، ہندو لڑکیوں کی جبری تبدیلیٔ مذہب کی مذمت کی، اگرچہ صحیح تعداد کا پتہ لگانا مشکل ہے تاہم سندھ اسمبلی کے لیے منتخب ہونے والے ہندو قانون ساز مہیش ملانی نے دعویٰ کیا کہ ہندو عدم تحفظ کے بڑھتے ہوئے احساس کے باعث، جس کا سبب ہندو لڑکیوں کی جبری تبدیلیٔ مذہب جیسے مسائل تھے، نسبتاً محفوظ علاقوں کی جانب ہجرت کرنے پر مجبور تھے۔

24 فروری کو قوم پرست سیاسی جماعتوں کے رہنما اور سول سوسائٹی کے اراکین کراچی پریس کلب کے باہر جمع ہوئے اور ہندو لڑکیوں کے اغواء اور جبری تبدیلیٔ مذہب کے خلاف یوم سیاہ منایا۔ کارکنان نے رِنکل کماری کی تصاویر اٹھا رکھی تھیں۔ انہوں نے ایک رکن پارلیمنٹ کے خلاف نعرے لگائے جس پر الزام تھا کہ انہوں نے 24 فروری 2012 کو رِنکل کماری کے اغواء اور اس کے بعد اسے جبری طور پر مسلمان بنانے اور اس کی شادی ایک مسلمان مرد سے کرنے میں مدد کی تھی۔ مظاہرین کا کہنا تھا کہ سندھ صوفیوں کی سرزمین تھی لیکن چند عناصر انتہا پسندوں کو جمہوری اور لبرل طاقتوں کے خلاف استعمال کرتے ہوئے انتہا پسندی کے بیج بو رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کا نام استعمال کرنے والے جرم کا ارتکاب کرنے کے بعد سزا سے بچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اکتوبر میں سندھ کے ضلع بدین میں پیش آنے والے واقعے سے سندھ میں بڑھتی ہوئی عدم رواداری اور انتہا پسندی کی عکاسی ہوتی ہے۔ 5 اکتوبر کو بدین کے علاقے پنگریو سے تعلق رکھنے والا ایک فوک سنگر، بھورو بھیل، ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔ اس کا تعلق ایک ہندو برادری سے تھا جو کہ اپنی میتوں کی تدفین کرتے ہیں۔ بھیل کو پنگریو کے حاجی فقیر قبرستان میں دفن کیا گیا جہاں برادری کے مطابق ماضی میں متعدد ہندوؤں کو دفنایا گیا تھا۔ اسی دن چند مسلمان نوجوانوں نے مرحوم کے خاندان کو خبردار کیا کہ کسی ہندو کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جا سکتا۔ اطلاعات کے مطابق مقامی مسجد کے ذریعے اعلان کرتے ہوئے ہندو برادری پر زور دیا گیا کہ وہ لاش کو کہیں اور منتقل کر دیں ورنہ یہ کام وہ خود کریں گے۔ بھیل برادری

کے سینکڑوں اراکین اور سندھ کی قوم پرست جماعتوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان ارکان اور سول سوسائٹی کے افراد نے تھانے کے باہر احتجاج کیا۔ 6 اکتوبر کی صبح ایک گروہ نے قبر کھودی اور بھیل کی لاش کو قبر سے نکال کر باہر رکھ دیا۔ لاش کئی گھنٹوں تک وہیں پڑی رہی کیونکہ علاقہ میں موجود گروہ کے خوف کی وجہ سے لواحقین لاش کو وہاں سے اٹھا نہیں سکتے تھے۔ شام کے وقت ایک مقامی زمیندار نے نعش کی تدفین کے لیے زمین فراہم کی۔ بھیل کے خاندان نے مقامی مذہبی پیشواؤں پر مسلمان برادری کو اکسانے اور قریبی قصبوں سے مدرسے کے طالب علموں کو بلانے کا الزام عائد کیا۔ ایک سینئر وزیر جس نے اکتوبر کے آخر میں متاثرہ خاندان سے ملاقات کی، کا کہنا تھا کہ ایک مخصوص گروہ بدین میں قبرستان کی زمین پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ لوگوں کو اس جرم کے ارتکاب پر اکسانے والے افراد کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کی گئی۔ دسمبر میں ضلع بدین کے علاقے ٹنڈو باگو میں ایک اور ہندو شہری اللہ ڈینو بھیل کی لاش کو قبر سے باہر نکال دیا گیا۔ ایک مسلمان مذہبی پیشوا کا دعویٰ تھا کہ بھیل کی لاش کو قبرستان کے اس حصے میں دفنایا گیا تھا جو مسلمانوں کے زیر ملکیت تھی۔ اس کے بعد پولیس نے مداخلت کی اور نعش کو اسی قبر میں دفنا دیا۔ مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں سے مذاکرات کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ قبرستان کو دونوں برادریوں میں تقسیم کرنے کے لیے ایک دیوار تعمیر کی جائے گی۔

سکھ

پاکستان میں زیادہ تر سکھ خیبر پختونخوا، پنجاب اور افغان سرحد سے ملحقہ وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں (فاٹا) میں رہائش پذیر ہیں۔ فاٹا کی مختلف ایجنسیوں میں رہائش پذیر سکھوں کو جنگجو انتہا پسندوں جو کہ گزشتہ عشرے کے دوران وہاں کافی طاقت حاصل کر چکے تھے، کی جانب سے اغواء، دھمکیوں اور حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ یہ گروہ اسلام کے نام پر اپنی کارروائیوں کو جائز قرار دیتے ہیں، تاہم وہ علاقے جہاں ان کی گرفت مضبوط ہے وہاں سکھوں کو عام طور پر اغواء برائے تاوان اور لوٹ مار کے دیگر متعدد طریقوں کے ذریعے نشانہ بنایا گیا۔ جنگجوؤں کی جانب سے سکھوں سے مطالبات کرنے اور جزیہ (اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حفاظت کے لیے وصول کی جانے والی رقم) وصول کرنے کے جواب میں حکام نے خاطر خواہ کارروائی نہ کی۔ برادری کی فراہم کردہ رپورٹ کے مطابق 2013 کے دوران فاٹا کی خیبر ایجنسی میں طالبان نے جزیہ وصول کرنے کے بعد اس کی رسیدیں بھی سکھوں کو دیں۔

8 جنوری کو خیبر ایجنسی کے علاقے جمرود میں خیبر کے علاقے لنڈی کوتل کے رہائشی ایک سکھ تاجر مہندر سنگھ کی سر کٹی مسخ شدہ لاش برآمد ہوئی جسے دو ماہ قبل اس کی جڑی بوٹیوں کی دکان سے اغواء کیا گیا تھا۔ ایک جنگجو گروہ نے اس کے قتل کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ وہ ان کے مخالف گروہ کے لیے

جاسوسی کرتا تھا۔ اس سے قبل مہندر کے بھائی کو بھی اغواء کیا گیا تھا۔ جنگجوؤں نے اس کے سر کے بال کاٹنے کے بعد اسے رہا کر دیا تھا۔ جون میں حکومت نے مہندر کے خاندان کو پانچ لاکھ روپے معاوضے کے طور پر دیئے۔ 21 جنوری کو نامعلوم افراد نے خیبر پختونخوا کے دارالحکومت پشاور کے محلّہ جوگن شاہ سے رکبیر سنگھ نامی سکھ تاجر کو اغواء کر لیا۔ رکبیر کو 32 دن کے بعد رہا کر دیا گیا۔ میڈیا کی رپورٹوں کے مطابق پولیس نے اس کی بازیابی میں کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا اور سکھ برادری کے اراکین کا خیال تھا کہ رکبیر کے خاندان نے اس کی رہائی کے لیے تاوان ادا کیا تھا۔

پشاور میں پانچ سو سکھ خاندان رہائش پذیر تھے جن میں سے زیادہ تر محلّہ جوگن شاہ میں رہائش پذیر تھے۔ پشاور میں رہائش پذیر زیادہ تر سکھ خیبر ایجنسی کی وادی تیراہ کے علاوہ فاٹا کے قبائلی علاقوں اورکزئی اور کرم ایجنسی میں جاری جنگ اور لاقانونیت کے باعث وہاں سے نقل مکانی کر کے آئے تھے۔ جنوری میں رکبیر سنگھ کے اغواء کے بعد محلّہ جوگن شاہ میں بیس پولیس اہلکار تعینات کئے گئے تھے چونکہ سکھ برادری نے خدشات کا اظہار کیا تھا کہ اغواء اور راہزنی کے واقعات کے باعث وہ خود کو غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ فروری کے اوائل میں تمام پولیس اہلکاروں کو وہاں سے واپس بلا لیا گیا جس پر سکھ رہائشیوں نے احتجاج کیا۔ فروری میں کرم ایجنسی کے رہائشی ایک سکھ چرن سنگھ کو اس وقت اغواء کر لیا گیا جب وہ اپنی کار کی رجسٹریشن کروانے کے لیے کوہاٹ جا رہا تھا۔ سال کے آخر تک اس کے ٹھکانے کا پتہ نہیں لگایا جا سکا تھا۔ متروکہ وقف املاک بورڈ (ای ٹی پی بی) جو کہ ملک میں مذہبی مقامات اور مذہبی اقلیتوں کی املاک کی دیکھ بھال کرتا ہے، نے لاہور میں گوردوارے کی زمین کا کچھ حصہ 200 پلاٹوں کے بدلے میں جو کہ اطلاعات کے مطابق سکھ برادری کے افراد کو دیے جانے تھے، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کو دے دیا جس پر سکھ برادری کے نمائندگان نے سپریم کورٹ سے مداخلت کا مطالبہ کیا۔ سپریم کورٹ نے معاملے کا از خود نوٹس لیا اور زمین کی ڈی ایچ اے کو منتقلی کو روک دیا۔ چیف جسٹس نے اس بات کا نوٹس لیا کہ ای ٹی پی بی سکھوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے تشکیل دیا گیا تھا اور اسے ان کی جائیداد کے تبادلے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ متروکہ وقف املاک بورڈ (مینجمنٹ اینڈ ڈسپوزل) ایکٹ 1975 کے تحت، ای ٹی پی بی کو زمین کا تبادلہ کرنے سے پہلے گوردوارہ کمیٹی سے اجازت لینی چاہئے تھی۔ بعد ازاں عدالت نے ڈی ایچ اے اور ای ٹی پی بی کے بیچ زمین کے تبادلے کے معاہدے کو کالعدم قرار دے دیا۔

11 مئی کے پارلیمانی انتخابات سے پہلے پنجاب کے ضلع نارووال سے تعلق رکھنے والے رمیش سنگھ اروڑا پنجاب اسمبلی کے لیے نامزد ہونے والے پہلے سکھ رکن بن گئے۔ انہیں پاکستان مسلم لیگ نواز (پی ایم ایل ن) نے مذہبی اقلیتوں کے لیے مخصوص نشست پر نامزد کیا تھا۔ خیبر پختونخوا کی صوبائی اسمبلی میں پاکستان

تحریک انصاف نے بھی ایک سکھ سورن سنگھ کو اقلیتوں کی مخصوص نشست کے لیے نامزد کیا۔ اگست کے آخر میں پاکستان سکھ کونسل نے چند ماہ کے دوران سندھ کے پانچ شہروں کے متعدد ہندو مندروں میں سکھوں کی مقدس کتاب گروگرنتھ صاحب کی بے حرمتی پر تشویش کا اظہار کیا۔ ادارے کے نمائندوں نے اسے پاکستان میں سکھ اور ہندو برادری کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی ایک سازش قرار دیا۔

گزشتہ برسوں کی طرح اس سال بھی پاکستان میں سکھوں کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے والے یاتریوں نے ان مقامات کی دیکھ بھال کرنے پر حکومت کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ سکھ یاتریوں کے ویزے کا طریقہ کار آسان اور تیز رفتار ہونا چاہئے۔

فہرست میں اضافہ

2013ء کے دوران ان مسلم فرقوں میں سے چند ایک کو بھی نشانہ بنایا گیا جو اس سے پہلے عقیدے پر مبنی تشدد سے محفوظ تھے۔ اگست میں کراچی میں اسماعیلی مسلم برادری کے دو کمیونٹی سنٹر اور عبادت گاہوں پر ہونے والے دستی بم حملوں میں دو افراد جاں بحق اور 28 زخمی ہو گئے۔ کسی نے بھی واقع کی ذمہ داری قبول نہ کی لیکن پولیس نے طالبان کے ملوث ہونے کا شبہ ظاہر کیا اس لئے کہ برادری کو اس سے قبل انتہا پسند جنگجو گروہ کی جانب سے دھمکیاں موصول ہوئی تھیں۔ ان حملوں سے قبل پر امن اور ترقی پسند اسماعیلی برادری کو گلگت بلتستان اور چترال میں صرف فرقہ وارانہ تنازعات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ستمبر میں کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کے ایک واقعے میں بوہرہ مسلم برادری سے تعلق رکھنے والے باپ اور بیٹے کو قتل کر دیا گیا۔ یہ شبہ ظاہر کیا گیا کہ اس واقعہ کے پیچھے فرقہ وارانہ مقاصد کارفرما تھے۔ حملہ آوروں نے ایک 9 ایم ایم پستول کا استعمال کیا تھا جو کہ کراچی میں ٹارگٹ کلرز کا پسندیدہ ہتھیار ہے۔

اکتوبر میں کراچی میں بوہرہ برادری کے ایک رکن کو قتل کر دیا گیا جب کہ اس کا ایک رشتہ دار زخمی ہوا۔ پولیس کو یقین تھا کہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہونے والا ٹارگٹ حملہ تھا۔ مقتول کے خاندان کا کہنا تھا کہ وہ ایک تاجر تھا اور اس کی کسی سے دشمنی بھی نہیں تھی اور نہ ہی اس سے بھتے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ شہر میں تاجروں اور دکانداروں کے لیے ایسے مطالبات ایک عام بات تھی۔ دسمبر میں کراچی میں بوہرہ برادری کے ایک اور رکن کو قتل کر دیا گیا۔ پولیس نے شبہ ظاہر کیا کہ ان ٹارگٹ حملوں کے پیچھے فرقہ وارانہ محرکات تھے۔ بوہرہ برادری کے اراکین کے خلاف تشدد کے واقعات 2012ء کے آخر میں منظر عام پر آنا شروع ہوئے جب حیدرآباد میں 72 گھنٹوں کے دوران ہونے والے ٹارگٹ کلنگ کے مختلف واقعات میں برادری کے 4 افراد کو قتل کر دیا گیا۔ چند ماہ پہلے کراچی میں بوہرہ اکثریتی علاقے کی ایک مارکیٹ میں ہونے والے بم دھماکے میں برادری

کے چھ افراد جاں بحق ہوئے تھے۔

گزشتہ چند سالوں کے دوران ملک کے مختلف علاقوں میں ہونے والے دہشت گردی کے حملوں میں صوفیوں کے مزاروں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ 25 فروری کو سندھ کے ضلع شکار پور میں غلام شاہ غازی کے مزار پر ہونے والے بم دھماکے میں چار افراد جاں بحق اور 27 زخمی ہوئے۔ اس حملے کے بعد سندھ پولیس چیف نے مزارات، مساجد اور امام بارگاہوں پر سکیورٹی اہلکار تعینات کر دیے۔ 27 فروری کو سندھ اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں مذہبی سکالروں اور مزاروں پر حملوں کی مذمت کی گئی۔ دسمبر میں خیبر پختونخوا کے شہر چارسدہ میں بابا صاحب کے مزار کے باہر ہونے والے دھماکے کے باعث اس کی بیرونی دیوار کو نقصان پہنچا۔

تضحیکِ مذہب کا قانون

2013ء کے دوران چونکہ تضحیکِ مذہب کے قانون کے غلط استعمال کی روک تھام کے مطالبات زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئے تھے، اس لیے تضحیک مذہب کے حوالے سے الزامات لگائے جاتے رہے۔

اگرچہ پاکستان میں اس قانون کے تحت بہت سے لوگوں کو سزا دی گئی ہے تاہم تضحیک مذہب کے مجرموں کے خلاف کبھی سزائے موت کا استعمال نہیں کیا گیا، تاہم تضحیک مذہب کے درجنوں ملزمان کو مقدمہ شروع ہونے سے پہلے قتل کر دیا گیا۔ اگرچہ اس قانون کے غلط استعمال سے مذہبی اقلیتوں کو مسائل کا سامنا رہا تاہم بہت سے مسلمان بھی تضحیک مذہب کے الزام کے تحت پابند سلاسل رہے۔ انسانی حقوق کی وکالت کرنے والی ایک معتبر تنظیم، قومی کمیشن برائے امن وانصاف کے زیر جائزہ واقعات کے مطابق، ضابطہ تعزیرات پاکستان کے ''مذہب سے متعلق جرائم'' کے باب کے تحت 41 افراد پر تضحیک مذہب کا الزام عائد کیا گیا۔ اس باب میں ضابطہ تعزیرات پاکستان کی 295 سے لے کر 298 سی تک کی دفعات شامل ہیں۔ دفعہ 295 سی جو کہ توہین رسالت کے زمرے میں آنے والے جرم کی سزا موت ہے۔ قانون میں قرآن پاک کی بے حرمتی کی سزا عمر قید ہے۔ مذکورہ 41 افراد میں 13 مسیحی، 17 احمدی اور 9 مسلمان شامل تھے جبکہ 2 ملزموں کے مذہب کا پتہ نہ چل سکا۔ ان میں سے آٹھ افراد پر دفعہ 295 سی کے تحت الزام عائد کیا گیا تھا جبکہ ایک ضمانت کی درخواست کی سماعت کرنے والے ایک جج نے تجویز پیش کی کہ ایک دوسرے شخص پر جس پر ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298 سی کے تحت الزام عائد کیا گیا تھا، اس کے خلاف بھی دفعہ 295 اے اور 295 سی کے تحت کاروائی ہونی چاہئے۔ ان آٹھ ملزمان میں تین خواتین شامل تھیں۔ ان آٹھ افراد میں تین مسلمان، چار مسیحی اور ایک احمدی شامل تھا۔ حتیٰ کہ جب قیاس کردہ تضحیک مذہب کا مبینہ ارتکاب محض ایک فرد نے کیا تب بھی پوری برادری کو اس کی قیمت ادا کرنا پڑی۔ ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ مارچ میں پیش آیا جب لاہور میں

سول سوسائٹی کے بہادر افراد ہی تضحیک مذہب کے قانون میں اصلاح کا مطالبہ کر سکتے تھے

ایک مسیحی شخص ساون پر تضحیک مذہب کا الزام عائد کیا گیا جس کے بعد پوری مسیحی آبادی کو نذر آتش کر دیا گیا۔ واقعے کی شروعات اس وقت ہوئی جب مسلمان نوجوان نے ساون پر تضحیک مذہب کا الزام لگایا۔ 8 مارچ کو قریبی مسجد سے لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جوزف کالونی میں ساون کے گھر گیا۔ پولیس نے لوگوں کو پرسکون کرنے کے لیے ساون کے خلاف مقدمہ درج کر لیا اور اس کے باپ کو حراست میں لے لیا جسے لوگوں نے مارنا شروع کر دیا تھا۔ متعدد خاندان بظاہر پولیس کے کہنے پر اپنی زندگیوں کو خطرے میں محسوس کرتے ہوئے رات کو علاقہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اگلے روز (9 مارچ کو) لوگوں کی ایک بڑی تعداد جوزف کالونی پہنچی اور 100 سے زائد گھروں میں لوٹ مار کرنے اور انہیں نذر آتش کرنے کے علاوہ ایک چرچ کو نذر آتش کر دیا اور متعدد دکانیں لوٹ لیں۔ اگلے روز پولیس نے ساون کو حراست میں لے لیا۔ میڈیا نے ایک پولیس افسر کے بیان کا حوالہ دیا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملزم پر تضحیک مذہب کا جھوٹا الزام لگایا گیا تھا لیکن پولیس لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے مقدمہ درج کرنے پر مجبور تھی۔

پنجاب اسمبلی کی مخصوص نشست پر منتخب ہونے والے مسیحی رکن پرویز رفیق نے اقلیتی برادریوں پر مسلسل حملوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔ پنجاب حکومت نے ہر خاندان کے لیے پانچ، پانچ لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا اور ان کے گھروں کی تعمیر نو کے لیے رقم فراہم کی۔ اس المناک واقعے کے بعد لاہور کے علاوہ دیگر شہروں میں بھی مسیحی برادری نے احتجاجی مظاہرے کیئے۔ مظاہرین اور پولیس کے درمیان چند جھڑپوں کی اطلاعات بھی وصول ہوئیں۔ مسیحی آبادیوں کو نذر آتش کرنے کے واقعات اس سے پہلے پنجاب کے دیگر علاقوں میں بھی پیش آئے تھے جن میں گوجرہ اور شانتی نگر کے واقعات قابل ذکر ہیں۔ 2009ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے علاقے گوجرہ میں ایک مسیحی شخص پر قرآن کی بے حرمتی کا الزام عائد کیا گیا جس کے بعد تقریباً 60 گھروں کو نذر آتش کرنے کے علاوہ 7 افراد کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔ 2013ء کے آخر تک واقعے کے ذمہ داروں میں سے کسی کو بھی سزا نہیں دی گئی۔ ایچ آر سی پی کا فیکٹ فائنڈنگ مشن جوزف کالونی

حملے کی تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ پولیس اور صوبائی حکومت اس حملے کو روک سکتے تھے چونکہ وہ حملے کے امکان سے واقف تھے لیکن وہ ضروری اقدامات کرنے میں ناکام رہے۔ کالونی کی حفاظت کے لیے تعینات کئے گئے چند درجن پولیس اہلکار 3000 افراد کے ہجوم کے لیے انتہائی ناکافی ثابت ہوئے تھے۔ بہت سے مذہبی سکالروں اور اراکین پارلیمنٹ نے تضحیک مذہب سے متعلق قانون کے غلط استعمال کے خلاف آواز اٹھائی۔ سپریم کورٹ نے پولیس کو جوزف کالونی کے مسیحیوں کو تحفظ فراہم کرنے کا حکم دیا۔

الزامات، سزا اور رہائی

دسمبر 2013ء میں تین افراد کو تضحیک مذہب کے مقدمات میں موت کی سزا سنائی گئی۔ ایک مقدمے میں پنجاب کے ضلع بہاولپور میں ہارون آباد کے رہائشی 34 سالہ ریاض احمد اور 38 سالہ اعجاز احمد کو موت کی سزا سنائی گئی۔ ان پر الزام عائد کیا گیا تھا کہ انہوں نے 2011ء میں خدا کو دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ جج نے دونوں افراد پر ایک ایک لاکھ روپے کا جرمانہ بھی عائد کیا۔ ایک دوسرے واقعے میں ہارون آباد کے ایک اور رہائشی کو مبینہ طور پر اپنے کمرے کی دیواروں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گستاخانہ خاکے بنانے پر موت کی سزا سنائی گئی۔

اس سال ان دو مسیحی افراد کو رہا کر دیا گیا جنہیں تضحیک مذہب کا ارتکاب کرنے پر گرفتار کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک 56 سالہ برکت مسیح تھا جس پر 2011ء میں اس کے آبائی قصبے خیر پور میں دو مسلم مردوں نے اس وقت تضحیک مذہب کا الزام عائد کیا جب اس نے انہیں ایک مندر کی چابیاں دینے سے انکار کر دیا تھا جہاں وہ خاکروب کے طور پر کام کرتا تھا۔ برکت کے وکیل نے بتایا کہ مقدمے کا دفاع کرنے پر مقامی وکیل برادری اس کے خلاف ہوگئی تھی اور مخالف وکیل اور اس کے ساتھیوں نے ''تضحیک مذہب کا ارتکاب کرنے والے شخص کی حمایت'' کرنے پر اسے دھمکیاں دی تھیں۔ اس نے بتایا کہ اسے کسی قسم کا تحفظ فراہم نہیں کیا گیا تھا۔ ایک اور مسیحی، یونس مسیح، جسے ستمبر 2005ء میں تضحیک مذہب کے الزام کے تحت گرفتار کیا گیا تھا اور جسے مئی 2007ء میں موت کی سزا سنائی گئی تھی، کو ثبوت موجود نہ ہونے پر ہائی کورٹ نے رہا کر دیا۔ اس کے وکیل نے کامیابی سے دلائل پیش کئے کہ یونس کے خلاف کوئی بلاواسطہ ثبوت موجود نہیں تھا اور یہ کہ یہ مقدمہ سنی سنائی بات پر مبنی تھا۔

خالد جدون نامی مذہبی پیشوا جس نے ایک چودہ سالہ لڑکی رمشا مسیح پر قرآن کے اوراق جلانے کا الزام عائد کیا تھا، کو ایک عدالت نے ثبوت نہ ہونے پر رہا کر دیا۔ اس سے پہلے یہ بات آشکار ہوئی تھی کہ اس نے ثبوت میں تحریف کی تھی جس کے بعد اسے اسی الزام کے تحت گرفتار کر لیا گیا تھا۔ وکیل استغاثہ الزام ثابت

کرنے میں ناکام رہا جبکہ تمام گواہان نے اپنے الزامات واپس لے لئے۔ فروری میں پنجاب کے ضلع ملتان میں پولیس نے امریکہ میں پاکستان کی اس وقت کی سفیر شیری رحمان کے خلاف تضحیک مذہب کا مبینہ ارتکاب کرنے پر مقدمہ درج کیا۔ ملتان کے رہائشی نے شیری رحمان پر الزام عائد کیا کہ انہوں نے نومبر 2010ء میں ٹی وی پر نشر ہونے والے پروگرام کے دوران ملک کے تضحیک مذہب قوانین پر گفتگو کے دوران تضحیک مذہب کا ارتکاب کیا تھا۔ درخواست گزار نے پہلے ایک زیریں عدالت اور پھر لاہور ہائیکورٹ سے درخواست کی کہ وہ پولیس کو شیری رحمان کے خلاف مقدمہ درج کرے کا حکم دے مگر وہ اس میں ناکام رہا۔ جنوری 2013ء میں سپریم کورٹ کے ایک بنچ نے ملتان پولیس کے چیف کو حکم دیا کہ وہ قانون کے مطابق کارروائی کریں۔

رہائی کے بعد پیش آنے والی مشکلات

وہ افراد جن پر تضحیک مذہب یا قرآن کی بے حرمتی کا الزام عائد کیا جاتا ہے ان کی مشکلات رہائی کے بعد بھی ختم نہیں ہوتیں۔ اپریل میں جوزف کالونی پر بحث کے حوالے سے سینٹ کمیٹی برائے قومی ہم آہنگی کے اجلاس کے دوران ایک رکنِ سینٹ نے بتایا کہ تضحیک مذہب کے ملزم کو عدالت میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے آٹھ سے دس سال لگ جاتے ہیں۔

انسانی حقوق کے کارکنان اس بات سے واقف ہیں کہ جو ملزمان بے گناہ پائے جاتے ہیں ان کی مشکلات رہائی کے بعد بھی کم نہیں ہوتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عدالتیں صرف انصاف فراہم کرسکتی ہیں وہ تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتیں اور پولیس صرف ایک خاص مدت تک شہریوں کے تحفظ کو یقینی بنا سکتی ہے اوران کے پاس نقل مکانی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

اسلام آباد سے تعلق رکھنے والی کم سن لڑکی رمشا مسیح جس پر قرآنی آیات کی بے حرمتی کا الزام عائد کیا گیا تھا اس کے اہل خانہ رمشا کی رہائی کے بعد روپوش ہوگئے کیونکہ انہیں دھمکیاں موصول ہوئی تھیں۔ میڈیا رپورٹس سے یہ پتہ چلا کہ رمشا اور اس کے اہل خانہ اپنی زندگیوں کو خطرے میں محسوس کرتے ہوئے مارچ میں پاکستان چھوڑ کر کینیڈا آباد ہو گئے تھے۔

17 مئی کو آزاد کشمیر میں ایک بڑے ہائیڈرو پراجیکٹ تعمیر کرنے والی چینی تجارتی کمپنی کے ایک چینی ایڈمنسٹریشن منیجر پر قرآن کی بے حرمتی کا الزام عائد کیا گیا جس پر سینکڑوں مشتعل ملازمین نے کمپنی کے دفاتر پر حملہ کر دیا۔ اس کو ایک ہفتے پہلے ہی الزام سے بری کیا گیا تھا چونکہ پولیس کا کہنا تھا کہ قرآن کی بے حرمتی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ لی پر الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس نے ایک پاکستانی ڈاکٹر، جس نے اپنا کمرہ خالی

کرنے سے انکار کر دیا تھا، کا سامان کمرے سے باہر نکالنے کے دوران قرآن کا ایک نسخہ زمین پر پھینکا تھا۔ ایک وزیر نے بتایا کہ پراجیکٹ پر تشدد میں ملوث 35افراد کی شناخت ہو چکی تھی اور ان کے خلاف قانونی کاروائی پر غور کیا جا رہا تھا۔

دسمبر کے آخر میں پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن (پی آئی اے) کے ایک سینئر پائلٹ پر مبینہ طور پر توہین رسالت کے ارتکاب الزام عائد کیا گیا جس کے بعد وہ رخصت پر چلا گیا۔ ایئر لائن کے ملازمین کی تنظیم کے صدر نے شکایت کی تھی کہ پائلٹ نے کلمے کے بارے میں حقارت آمیز الفاظ استعمال کیے تھے۔ معاملے کی تحقیقات کے لیے تشکیل کردہ کمیٹی نے اپنے حقائق پی آئی اے کے چیئرمین کو پیش کیے۔ کمیٹی کے حقائق کو خفیہ رکھا گیا تاہم پائلٹ کو قصوروار قرار دیا گیا اور اس کی برطرفی کی سفارش کی گئی۔ اطلاعات کے مطابق پائلٹ ایئر لائن میں موجود ''انتہا پسندوں'' سے بچنے کے لیے رخصت پر چلا گیا۔ اس کے دوستوں نے اسے یہ مشورہ بھی دیا کہ اسے اپنی جان بچانے کے لیے ملک چھوڑ دینا چاہیے۔

اصلاحات

اپریل میں قومی ہم آہنگی کے متعلق سینیٹ کی قائمہ کمیٹی نے جوزف کالونی پر حملے پر بحث کرتے ہوئے تضحیک مذہب کے جھوٹے الزامات لگانے والوں کو سخت سزا دینے کی سفارش کی۔ کمیٹی نے تجویز پیش کی کہ تضحیک مذہب کا جھوٹا الزام لگانے والوں کو وہی سزا دی جانی چاہیے جو کہ تضحیک مذہب کا ارتکاب کرنے والوں کو دی جاتی ہے۔ مارچ میں جوزف کالونی کے واقعے کے اگلے روز رویت ہلال کمیٹی کے سربراہ نے دیگر بہت سے مذہبی سکالروں کے ساتھ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ تضحیک مذہب کے ملزم کے مقدمے کی سماعت وفاقی شرعی عدالت میں ہونی چاہیے۔ وفاقی شرعی عدالت اس بات کا جائزہ لینے اور یہ تعین کرنے کی مجاز ہے کہ آیا موجودہ قوانین شریعت کے مطابق ہیں یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ تضحیک مذہب کے مقدمات کے اندراج کے طریقہ کار میں کی جانے والی تبدیلیوں کے باعث تھانے میں ان مقدمات کا اندراج مشکل ہو گیا تھا، جن کے باعث مسلمانوں میں بے چینی پائی جاتی تھی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ان تبدیلیوں کو منسوخ کیا جائے۔ ستمبر میں اسلامی نظریاتی کونسل نے (سی آئی آئی) جو کہ ایک ایسا آئینی ادارہ ہے جو اسلامی معاملات کے بارے میں پارلیمنٹ کو مشورہ دینے کا ذمہ دار ہے، تضحیک مذہب قانون کے غلط استعمال پر تفصیلی غور کیا لیکن اس میں تبدیلی سے متعلق کسی بھی رائے کو فوری طور پر رد کر دیا گیا۔ کونسل کے رکن ایک مذہبی پیشوا نے کہا کہ اس قانون کا غلط استعمال پاکستان کی بدنامی کا باعث بن رہا ہے اور مذہبی سکالروں کو خوامخواہ بدنام کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ غلط الزام لگانے والوں کو بھی سزائے موت دی جانی

چاہئے کیونکہ ملزم سے منسوب کئے گئے الفاظ کا اظہار دراصل الزام عائد کرنے والے شخص نے کیا تھا۔اس پر چند دیگر اراکین مشتعل ہوگئے اور انہوں نے اس مذہبی پیشوا سے اسلامی نظریاتی کونسل سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا۔تضحیک مذہب قانون میں ترامیم کی مخالفت کرنے والے اراکین جو کہ واضح طور پر اکثریت میں تھے، اپنی بات پر قائم رہے کہ وہ تضحیک مذہب کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف شکایت درج کروانے والوں کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتے۔ انہوں نے کہا کہ ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 197 میں پہلے ہی جھوٹا مقدمہ درج کرانے کی سزا مقرر ہے اور تضحیک مذہب میں ترمیم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

پی ٹی آئی کے رہنما جاوید ہاشمی نے کہا کہ طاقت حاصل کرنے کے لیے مذہب کا غلط استعمال کیا جا رہا تھا۔انہوں نے کہا کہ تضحیک مذہب کے قانون میں بہت سی خامیاں تھیں جس کی وجہ سے بہت سے معصوم لوگ جیلوں میں قید ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اسی لیے قانون پر نظر ثانی کی ضرورت تھی۔

قدامت پسند جماعت سے تعلق رکھنے والے قانون ساز نے تضحیک مذہب قانون کا دفاع کیا اور کہا کہ یہ کافی موثر تھا۔اس نے پی ٹی آئی کے قانون سازوں سے کہا کہ وہ قانون میں ترمیم کے لیے بل پیش کریں یا پھر اسلامی نظریاتی کونسل یا وفاقی شرعی عدالت سے رجوع کریں۔ دسمبر میں وفاقی شرعی عدالت نے ایک درخواست میں تضحیک مذہب کے لیے مقرر کردہ عمر قید کی سزا کو ختم کرنے کے احکامات جاری کئے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی سزا صرف موت ہے اور کوئی دوسری سزا دینا خلاف قانون ہوگا۔ عدالت نے غور کیا کہ اس نے 1990ء میں سے یہ واضح کیا تھا کہ سزا کے طور پر عمر قید کی سزا کو ختم کیا جانا چاہئے چونکہ کسی بھی پیغمبر کی بے حرمتی نا قابل برداشت ہے اور تضحیک مذہب کا ارتکاب کرنے والے کسی بھی شخص کو صرف سزائے موت دی جانی چاہیے۔ عدالت نے اس حکم کے نفاذ کے لیے حکومت کو دو ماہ کے اندر رپورٹ پیش کرنے کو کہا۔

سفارشات

1۔ جب تک کسی مذہبی اور فرقہ وارانہ اقلیتی گروہوں کے اراکین کے خلاف نفرت انگیز مہم کو روکا نہیں جاتا اور جب تک نفرت انگیز تقاریر کو ہوا دینے والوں کو انصاف کے کٹہرے میں نہیں لایا جاتا، اس وقت تک مذہبی عقائد کے نام پر ہونے والے قتل عام کو روکنا ناممکن ہے مختلف ذرائع بشمول نصابی کتب اور مثالی شخصیات پر انحصار کے ذریعے ہم آہنگی اور رواداری کو فروغ دیا جائے۔ یہ ضروری ہے کہ تمام شہریوں کے انسانی حقوق کو مذہبی اقلیت یا اکثریت کی بجائے مساوات کے سیاق وسباق میں دیکھا جائے۔

2۔ تضحیک مذہب کے قانون میں فوری طور پر اصلاح کی ضرورت ہے تا کہ انتہا پسندوں اور موقع پرستوں کے ہاتھوں اس کے غلط استعمال کی روک تھام کی جا سکے۔ مذہبی سکالروں کی خدمات حاصل کرتے

ہوئے لوگوں کو اس ضرورت کے بارے میں وضاحت پیش کی جانی چاہیے۔

3۔ تضحیک مذہب یا مقدس کتابوں کی بے حرمتی کے مقدمات میں ججوں کو دی جانے والی باقاعدہ اور منظم دھمکیوں کی روک تھام کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں تاکہ مشتبہ شخص کے حقوق کے تحفظ کے لیے قواعد وضوابط کی عملداری اور انصاف کو یقینی بنایا جاسکے۔

4۔ اس بات کے خاطر خواہ شواہد موجود ہیں کہ عقائد پر مبنی تشدد میں ملوث افراد قانون نافذ کرنے والے اداروں میں سرائیت کر چکے ہیں۔ حقیقت سے نظریں چرانے کی بجائے ان عناصر کی فوری طور پر نشاندہی کی جائے اور ان کا خاتمہ کیا جائے۔ سزا سے استثنیٰ کے خاتمے کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان شکایات کی بھی سنجیدگی سے تحقیقات کرنے کی ضرورت ہے کہ پولیس مشکلات پیدا کرنے والوں کا ساتھ دیتی ہے۔

5۔ ہندوؤں اور سکھوں کے لیے قوانین کی تدوین کو ترجیح دی جانی چاہیے۔ یہ کام ان برادریوں کے مشورے سے کیا جائے۔

6۔ پاکستان کی مذہبی اقلیتی برادریوں میں کسی بھی چیز کے باعث اس قدر مایوسی اور ناامیدی نہیں پھیلی جتنی کہ جبری تبدیلی مذہب اور مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہونے سے پھیلی ہے۔ ریاست کو ایک طریقہ کار متعارف کروانا چاہیے تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ متاثرہ لڑکیوں اور ان کے خاندانوں کو عدالتوں میں موجود فسادی لوگوں اور انسانی حقوق کی اس سنگین پامالی کی سرپرستی کرنے والے سیاستدانوں کی جانب سے سراسیمگی اور دھمکیوں کا سامنا کئے بغیر انصاف ملے۔

اظہار رائے کی آزادی

ہر شہری کو تقریر کرنے اور آزادی سے اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ پریس آزاد ہوگا۔ یہ آزادیاں ان معقول پابندیوں کے تابع ہوں گی، جو عظمت اسلام، ملک کی سلمیت یا ملکی دفاع یا غیر ممالک سے دوستانہ تعلقات یا امن عامہ یا اخلاقیات کے تحفظ یا توہین عدالت یا جرم کے ارتکاب کو روکنے، یا اس کی ترغیب کے امکانات کے پیش نظر قانون کے مطابق عائد کی جائیں گی۔

آئین پاکستان [آرٹیکل - 19]

ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور ظاہر کرنے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ ہر شخص آزادی کے ساتھ، بغیر کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہ سکے اور جس ذریعے سے بھی چاہے، ملکی سرحدوں سے بالاتر ہو کر خیالات و معلومات کی جستجو کر سکے، وصول کر سکے، ارسال کر سکے۔

انسانی حقوق کا عالمی اعلان [آرٹیکل - 19]

ایک طویل اور سخت جدوجہد کے ذریعے حاصل کی جانے والی اظہار رائے کی آزادی کو ان عناصر کی طرف سے شدید چیلنجوں کا سامنا ہے جن کے خلاف یہ آزادی حاصل کی گئی تھی۔ ایک ایسے ملک میں جسے جمہوری تو سمجھا جاتا ہے لیکن عام لوگوں کو بعض اطلاعات تک رسائی پر لگائی جانے والی بندشوں کے حوالے سے اعتماد میں کم کم ہی لیا جاتا ہے۔ زیر بحث عرصے کے دوران صحافیوں کو نشانہ بنانے کا عمل جاری رہا لیکن سال بھر میں ایک بھی ملزم کو انصاف کے کٹہرے میں نہیں لایا گیا۔ آزادیٔ اظہار کو کچلنے پر بضد ان عناصر نے بہت سے صحافیوں کو ڈرا دھمکا کر مجبور کر دیا کہ وہ اپنے تحفظ کی خاطر خود پر سنسر شپ عائد کر لیں۔ 2013ء کے دوران جنوبی ایشیا میں فرائض کی ادائیگی کے دوران جاں بحق ہونے والے صحافیوں کی تعداد کے حوالے سے پاکستان سرفہرست ہے۔ آئین میں دیئے گئے اپنے حق کا استعمال کرتے ہوئے اس عرصہ میں گیارہ پاکستانی صحافیوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ متعلقہ حکام نے پاکستان میں صحافت کو کم خطرناک بنانے کے لئے کوئی اقدامات نہیں کئے۔

اس سب کچھ کے باوجود صحافی اوران کے دوسرے ساتھی خبریں مہیا کرنے کے لئے اپنی زندگیاں مسلسل خطرے میں ڈالتے رہے۔ اگرچہ گزشتہ کئی برسوں کے دوران صحافیوں کی زندگیوں کو شدید خطرات لاحق رہے لیکن ان کی اوسط تنخواہیں افراطِ زر میں اضافے کے باوجود کم ہی رہیں۔

خیبر پختونخوا اور پنجاب کے صوبوں میں آزادیٔ اظہار کے فروغ اور حکومتی کارکردگی کے حوالے سے اطلاعات تک عوام کی رسائی کے عمل میں بہتری دیکھنے میں آئی۔ تاہم یہ اقدامات عوامی مطالبات کے مقابلے میں ناکافی تھے۔ ''نظریہء پاکستان'' اور ''قومی تحفظ'' جیسی اصطلاحات کو اطلاعات تک رسائی کو روکنے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا۔

سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ پر ریاستی کنٹرول کے باعث عوام کے لئے آزادیٔ اظہار کا عمل ڈانواڈول رہا۔ 2013ء کے دوران سرکاری سطح پر کئی مرتبہ یہ دعویٰ کیا گیا کہ یوٹیوب پر پابندی جلد ختم کردی جائے گی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ دوسرے بے ضرر انٹرٹیمنٹ ویب سائٹس کو بھی کچھ وقت کے لئے بندش کا نشانہ بنایا گیا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ حکام کے خیال میں ان ویب سائٹس کا مواد قومی تحفظ کے حوالے سے مناسب نہیں تھا۔

ٹیلی ویژن کے چند صحافیوں کی طرف سے میڈیا کے احتساب سے متعلق سپریم کورٹ میں دائر کی گئی رٹ پٹیشن پر عدالت عظمیٰ کی ہدایت پر وزارت اطلاعات نے ان صحافیوں کی ایک طویل فہرست جاری کی جنہوں نے ان خفیہ فنڈز سے فائدہ اٹھایا تھا۔ غیر اخلاقی رویہ اور اثر ورسوخ کے الزامات نے کافی مدت تک پاکستانی میڈیا کو جکڑے رکھا۔ اس 15 صفحاتی دستاویز کے مطابق کچھ ادائیگیاں ایسی بھی تھیں جو اہانت آمیز نہیں تھیں، اس لئے کہ یہ وہ رقوم تھیں جو حکومتی سربراہان کے غیر ملکی دوروں کے دوران ساتھ جانے والے صحافیوں کی رہائش اور سفری اخراجات پر خرچ کی گئی تھیں۔ بہرحال ناقدین کا کہنا تھا کہ صحافیوں کو ادا کی گئی رقم یا ان اخراجات کا مقصد حکومت کی کارگزاریوں کی مثبت تشہیر تھا۔

صحافیوں کا تحفظ

اخباری رپورٹوں کے مطابق 2013ء کے دوران پاکستان میں 11 صحافی مارے گئے۔ ہر 33 ویں دن ایک صحافی فرض کی ادائیگی کے دوران مارا جاتا رہا ہے۔ یہ شرح جنوبی ایشیائی ممالک میں سب سے زیادہ ہے۔ (Committe to Protect Journalists (CPT) صحافیوں کے تحفظ کی کمیٹی کی سالانہ رپورٹ برائے سال 2013ء کے مطابق گزشتہ پانچ برسوں کے دوران ملک میں پریس کے خلاف تشدد خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔ اسی وجہ سے 2013ء میں پاکستان کو صحافیوں کے لیے دنیا کا آٹھواں خطرناک ترین ملک قرار دیا گیا۔ اس سے پچھلے سال پاکستان اس درجہ بندی میں دسویں نمبر پر تھا۔ بلوچستان اور سندھ میں ناقص امن وامان کے باعث غیر یقینی صورتحال رہی۔ بلوچستان میں صحافیوں کو کئی اطراف سے

صحافیوں کے قتل کے خلاف کوئٹہ میں میڈیا سے متعلق افراد کا احتجاج

دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کو ڈرایا دھمکایا اور ہدف بنایا جاتا رہا۔ انتہا پسند قوم پرستوں اور ملاؤں کے ساتھ ساتھ ریاستی حکام کی طرف سے بھی انہیں دھمکایا جاتا رہا۔

2011 میں بلوچستان ہائی کورٹ نے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کو پابند کر دیا کہ وہ ایسی تنظیموں کی جانب سے جاری کردہ بیانات کی نشر و اشاعت نہیں کریں گے جن پر اینٹی ٹیررازم ایکٹ مجریہ 1997ء کے تحت پابندیاں عائد ہوں۔ ہائی کورٹ کے حکم میں کہا گیا کہ ایسے مواد کی نشر و اشاعت کرنے والے ٹی وی چینل یا اخبار کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی اور اس کے نتیجے میں متعلقہ اداروں کے ذمہ دار افراد کو جیل کی سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگرچہ 2013ء کے دوران کسی بھی ادارے کو ایسی پابندیوں یا خلاف ورزی کرنے پر کارروائیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا، تاہم بلوچستان کے صحافیوں کا کہنا ہے کہ وہ مشکل صورتحال کا سامنا کر رہے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب انتہا پسند انہیں کوئی بیان شائع یا نشر کرنے کے لئے بھیجتے ہیں تو اس کے ساتھ بیان کو شائع نہ کرنے کی صورت میں قتل کی دھمکیاں بھی ملتی ہیں۔ تحریک طالبان پاکستان کی جانب سے ایک فتویٰ جاری کیا گیا جس میں میڈیا پر ان کے خلاف پراپیگنڈہ اور ان کے بیانات کو شائع نہ کرنے کا الزام لگایا گیا۔ اس فتویٰ میں ایک وارننگ بھی شامل تھی جس میں کہا گیا اگر میڈیا طالبان کے خلاف یک طرفہ رپورٹنگ جاری رکھے گا تو وہ میڈیا سے منسلک افراد کو بھی ہدف بنائیں گے۔ اس فتویٰ میں ہدف کے طور پر صحافی حامد میر اور کالم نویس حسن نثار کی تصاویر بھی شامل تھیں۔ یہ فتویٰ ابتداً 2012ء میں جاری کیا گیا پھر میڈیا کی ملالہ یوسف زئی

کو دی گئی بھرپور کوریج کے ضمن میں دوبارہ فتویٰ جاری کیا گیا جہاں ملک کی سکیورٹی کی صورتحال پریشان کن حد تک خطرناک رہی، وہیں صحافیوں کو سیاستدانوں کی طرف سے بھی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ 3 جنوری کو ایم کیو ایم کے لیڈر کے دھمکی آمیز بیانات کے خلاف صحافیوں کو سینٹ کی کارروائی کے دوران اجلاس سے واک آؤٹ کرنا پڑا۔ صحافی سینیٹرز کی اس یقین دہانی پر ایوان میں واپس آئے کہ ان کے تحفظات ایم کیو ایم تک پہنچائے جائیں گے۔ صحافیوں نے شکایت کی کہ سیاسی جماعت کے قائد نے ٹیلی فونک خطاب کے دوران ان کے بارے میں توہین آمیز الفاظ کا استعمال کیا اور صحافیوں کو طرزِ عمل نہ بدلنے کی صورت میں نتائج کی دھمکی دی۔ ایم کیو ایم کے قائد نے صحافیوں سے غیر مشروط معافی بھی مانگ لی تھی۔ صحافی بڑھتی ہوئی دھمکیوں اور حملوں کی روشنی میں ریاست سے مستقل تحفظ کا تقاضا کر رہے ہیں۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی زیرِ ہدایت 12 جنوری کو خیبر پختونخوا یونین آف جرنلسٹس اور پشاور پریس کلب کے زیرِ اہتمام ہونے والے احتجاج میں صحافیوں نے تحفظ فراہم نہ کرنے پر میڈیا ہاؤسز اور حکام کی مذمت کی۔

ان کا کہنا تھا کہ پیشہ وارانہ فرائض کی انجام دہی کے دوران مارے جانے والے صحافیوں کو ہیلتھ انشورنس کی سہولت مہیا نہیں کی لیکن ان آلات کی انشورنس ہوئی ہوتی ہے جنہیں وہ استعمال کرتے ہیں۔ مظاہرین نے مطالبہ کیا کہ ان کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے Standard operating procedures بنایا جائے۔ انہوں نے مارے جانے والے صحافیوں کے خاندانوں کی امداد کے لیے خصوصی فنڈ کے اجراء کا مطالبہ بھی کیا۔

اقوام متحدہ نے پاکستان سمیت پانچ ملکوں میں صحافیوں کے تحفظ کی ناگفتہ بہ صورتحال کے حوالے سے ایک ایکشن پلان شروع کیا ہے۔ مارچ میں شروع کئے جانے والے اس پلان کا مقصد پاکستان میں صحافیوں کے تحفظ کی کوششوں کو فروغ دینا ہے۔ نگران وزیرِاعظم نے پُرخطر علاقوں میں ہدف بننے والے صحافیوں کی امداد کے لیے ویلفیئر فنڈ کے قیام کی منظوری دے دی ہے۔ کسی بھی صحافی کی موت اور معذوری کی صورت میں اس کے خاندان پر بوجھ کم کرنے کے لیے مالی مدد فراہم کرنا لازمی ہوگا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ وزارت اطلاعات پیمرا (Pemra) کے ذریعے اس فنڈ کے لئے ایک کروڑ روپے کی رقم مختص کرے گی۔

2013ء میں صحافیوں پر ہونے والے حملے

جنوری

کوئٹہ میں علمدار روڈ پر سنوکر کلب میں دو دھماکوں میں 100 افراد جاں بحق ہوئے۔ سماء نیوز کا کیمرہ مین عمران شیخ، نیوز نیٹ ورک انٹرنیشنل کا فوٹوگرافر محمد اقبال اور سماء ٹی وی کے رپورٹر سیف الرحمان جو دھماکے کی کوریج کے لیے موقع پر پہنچے لیکن دوسرے دھماکے میں مارے گئے۔ اس دوسرے دھماکے میں مزید

تین صحافی بھی زخمی ہوئے۔

فروری

☆ لاڑکانہ میں روزنامہ جنگ کا نمائندہ ایک حملہ کے دوران بچ گیا جبکہ اس حملے میں اس کا بیٹا اور دو بھتیجے اور ایک پوتا جاں بحق ہوگئے۔ یہ حملہ ایک مقامی زمیندار نے کروایا جس کے جرائم کی رپورٹ اس صحافی نے شائع کروائی تھی۔ اس صحافی کو فروری میں دوبارہ ہدف بنایا گیا جس میں اس کا چچازاد بھائی مارا گیا۔ زمیندار کی زیادتیوں کے خلاف سپریم کورٹ نے ازخودنوٹس لیا۔

☆ صحافی خوشنودعلی شیخ کراچی میں ٹریفک حادثے میں ہلاک ہوئے تاہم عینی شاہدین اور ان کے خاندان والے اس حادثہ کو ٹارگٹ کلنگ کہتے ہیں۔ خاندان والوں کا کہنا ہے کہ ان کو مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں۔ 26 تاریخ کو خوشنودعلی ہمت کر کے گھر سے باہر ایک سٹور تک گئے۔ قبل اس کے کہ وہ گاڑی سے باہر نکلتے ایک اور گاڑی ان کی گاڑی سے ٹکرا گئی۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ دوسری گاڑی نے جان بوجھ کر نشانہ بنایا۔

☆ صحافی اور میرانشاہ پریس کلب کے صدر ملک ممتاز خان کو نارتھ وزیرستان میں نامعلوم افراد نے گولی مار کر ہلاک کر دیا یہ نامعلوم افراد سیاہ رنگ کے شیشوں والی کار میں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ تحریک طالبان کے ترجمان نے اس قتل میں ملوث ہونے سے انکار کیا اور واقعہ کی مذمت بھی کی۔ ان کا کہنا ہے کہ ملک اچھا رپورٹر تھا اور قبائلی افراد کی فلاح کے لیے کام کرتا تھا۔

مارچ

☆ قلات پریس کلب کے صدر محمود خان آفریدی کو نامعلوم حملہ آوروں نے اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جب وہ قلات ٹاؤن کے پی سی او میں موجود تھے۔ جرم کے مرتکب افراد موقع واردات سے موٹر سائیکل پر فرار ہو گئے۔

☆ کالم نویس اور ایک ٹی وی چینل پر حالات حاضرہ کے اینکر پرسن جاوید چوہدری نے کوہسار پولیس کو دو ٹیلی فون نمبروں سے دھمکی آمیز کالز موصول ہونے کی رپورٹ درج کروائی۔ ٹیلی فون کرنے والوں نے ان کو بچوں سمیت اغواء اور قتل کی دھمکی دی تھی۔ پولیس نے شکایت پر پرچہ درج کر لیا ہے اور ٹیلی فون نمبرز متعلقہ حکام کو بھیج دیئے ہیں۔

☆ لاہور میں موٹر سائیکل سوار 3 افراد نے پنجاب اسمبلی کے باہر صحافیوں کے احتجاجی کیمپ پر ہوائی فائرنگ کی۔ مختلف اخبارات کے پانچ صحافی بھوک ہڑتالی کیمپ میں موجود تھے۔ پولیس نے موقع

واردات سے گولیوں کے خول کے علاوہ مطلوبہ معلومات/حقائق اکٹھے کئے لیکن جرم کے مرتکب افراد کونشاندہی کے باوجود حراست میں نہیں لیا گیا۔

☆ لاہور میں کالعدم تحریک لشکر جھنگوی کی طرف سے سینئر فوٹوگرافر اظہر جعفری کو دی جانے والی قتل کی دھمکیوں کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا۔لشکر جھنگوی نے ایسے پمفلٹ تقسیم کئے جن میں اظہر جعفری اوران کے خاندان والوں کوقتل کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ یہ پمفلٹ لاہور میں ان کے زیر تعمیر گھر کے پتہ پرارسال کئے گئے تھے۔ ویسی ہی دھمکی آمیز تحریریں ان کے گھر کی دیواروں پر لکھی گئیں۔سینکڑوں کی تعداد میں میڈیا کے کارکن اورصحافیوں نے احتجاج میں حصہ لیا۔

☆ سکھر میں انٹیلی جنس ایجنسی کے لوگ پولیس سٹیشن میں داخل ہوکر غیرقانونی طور پرایک مشکوک شخص کولاک اپ سے آزاد کروا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ اس شخص کوایک دن پہلے ہی زمین پر ناجائز قبضہ کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ افراد اپنے ہمراہ ایس ایچ او کے علاوہ پولیس کے دوسپاہیوں کو بھی لے گئے۔ جب صحافی موقع واردات پر پہنچے تو انٹیلی جنس ایجنسی کے آدمیوں نے صحافیوں کو رائفل کے بٹ مارے۔فوٹوگرافر ابراہیم سوہریانی شدید زخمی ہوگئے جبکہ پولیس کے تینوں افراد کو کچھ گھنٹوں بعد رہا کردیا گیا۔

اپریل

☆ صحافی عمار سہیل کواوکاڑہ میں مقامی میلہ کی کوریج کرتے ہوئے 25 نامعلوم افراد نے اغواء کرلیا۔ اغواء کاروں نے موبائل اورنقدی چھین لیےاورعمار سہیل کوشدید تشدد کا نشانہ بنایا۔

☆ نجی ٹی وی میں کام کرنے والے دوصحافی مینگورہ پختونخوا کے سیدوشریف ہسپتال میں ٹریفک حادثے میں زخمی اور جاں بحق ہونے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آئے۔ ہسپتال میں موجود پولیس نے صحافیوں کو مارااورانہیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دیں۔سوات پریس کلب کے عہدیدار پولیس کے پاس ذمہ داران کے خلاف مقدمہ درج کروانے گئے۔اس کے بعد صحافیوں نے ڈپٹی انسپکٹر جنرل، ڈی آئی جی کے پاس جانے کا فیصلہ کیا جس کے گارڈ نے ڈی آئی جی سے ملنے سے روکا اورایک صحافی شاہد علی خان پرتشدد کیا۔صحافیوں نے مقامی عدالتوں سے رجوع کیا اور وہاں احتجاجی مظاہرہ کیا۔

☆ گوجرانوالہ میں اُن چار صحافیوں کو بری طرح زدوکوب کیا گیا جنہوں نے لاک اپ میں ایک قیدی پرتشدد کے عملے کی کوریج کی تھی۔ زیرحراست قیدی نے عدالت کو بتایا کہ اسے قید کے دوران بری

اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران ہلاک کیے جانے والے صحافیوں کا البم

طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ جب صحافی پورے واقعہ کی تفصیل جاننے کے لیے پولیس اسٹیشن پہنچے تو پولیس نے حنیف کھوکھر، علی رضا، امجد علی اور ناصر کو بری طرح مار پیٹ کر زخمی کر دیا۔

☆ بلوچستان کے اخبار ''تاوار'' کے کراچی میں قائم بیورو آفس پر نامعلوم افراد نے حملہ کیا اور قیمتی سامان چرا کر دفتری ریکارڈ کو آگ لگا دی۔ (CPNE) کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز نے اس واقعے کی شدید مذمت کی اور واضح کیا کہ روز نامہ تاوار سے منسلک صحافی حاجی عبدالرحمان ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ سے لاپتہ ہیں جبکہ اسی اخبار میں کام کرنے والے تین صحافی پچھلے تین برسوں میں مارے جا چکے ہیں۔

☆ پشاور کے ایک صحافی عارف شفیع جو کابل کی خبر رساں ایجنسی کے لیے کام کرتے تھے، پشاور میں یونیورسٹی روڈ پر موٹر سائیکل میں نصب بم پھٹنے سے جاں بحق ہو گئے۔ وہ چھٹی پر تھے اور کابل واپس جانے والے تھے۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ دھماکے کے ہدف تھے یا نہیں۔

مئی

☆ مئی میں نیویارک ٹائمز اسلام آباد کے بیورو چیف ڈیکلان والش (Declan Walsh) کو

عام انتخابات کے موقع پر پاکستان چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ ان کو مطلع کیا گیا کہ قابل اعتراض سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا ویزا منسوخ کر دیا گیا ہے۔ ان کو ملک چھوڑنے کے لیے 72 گھنٹے دیئے گئے تھے۔ ان کو سال کے آخر تک ملک میں واپس آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی حالانکہ وزیر اعظم نے کیس کا جائزہ لینے کا وعدہ کیا تھا۔

نیویارک ٹائمز کے اسلام آباد بیورو چیف کو ملک چھوڑنے کا حکم دیا گیا

☆ پنجاب کے ضلع بہاولنگر میں متعدد اخبارات کے لیے کام کرنے والا ایک 25 سالہ صحافی احمد علی جوئیہ کو مجرموں کے ایک گروہ نے اس بنا پر گولی مار کر قتل کر دیا کہ اس نے ملزموں کے خلاف تفتیش میں پولیس کی مدد کی تھی۔ قتل، چوری اور اغواء کے 150 جرائم میں ملوث مقبول عرف کولی ساہی کی طرف سے صحافی کو کافی عرصے سے دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ اس کو تحفظ نہیں دیا گیا اور اس کو گولی مار کر گاؤں میں ہلاک کر دیا گیا۔

☆ پشاور میں اخباری فوٹوگرافر سردار محمود الحسن کو نامعلوم افراد نے اس وقت زدوکوب کیا جب وہ موٹر سائیکل پر اپنے گھر واپس جا رہے تھے۔ اس حملے میں انہیں شدید قسم کے کئی زخم آئے۔ پشاور میں صحافیوں نے حملہ کی مذمت کی اور حملہ آوروں کو گرفتار کرنے اور صحافیوں کو جانی تحفظ دینے کا مطالبہ کیا ہے۔

جولائی

☆ اے۔آر۔وائی ٹیلی ویژن کے بیورو چیف اور حیدرآباد یونین آف جرنلسٹس کے صدر فرحان آفندی کو حیدرآباد میں ایک رات ان کے گھر سے اٹھا لیا گیا۔ مسلح افراد جو اپنا تعلق کراچی پولیس سے بتا رہے تھے ان کے گھر آئے اور انہیں ساتھ لے گئے۔ حیدرآباد پریس کلب میں ان کی رہائی

کے لئے کئی مظاہرے کیئے گئے۔

☆ پشاور میں خیبر ٹیچنگ ہسپتال کی انتظامیہ اور ڈاکٹروں نے صحافیوں کو مار پیٹ کے بعد کمرے میں بند کر دیا۔ صحافیوں نے ایک زخمی پولیس اہلکار کے علاج میں لاپرواہی پر اعتراض کیا تھا۔ کانسٹیبل زخموں کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گیا۔ اس بارے میں صحافیوں کا کہنا تھا کہ پولیس اہلکار کی موت مناسب طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وزیر اعلیٰ خیبر پختونخوا نے اس کی انکوائری کا حکم دیا ہے۔

☆ صحافی حاجی حنیف گاؤں کوٹلی احمد شاہ سے گوجرانوالہ شہر جا رہے تھے کہ دو نامعلوم مسلح افراد نے ان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

☆ دی نیوز اور روزنامہ جنگ کے سوات میں نمائندہ عیسیٰ خان خیل نے ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں انہوں نے کہا کہ ان کو نامعلوم ٹیلی فون نمبر سے دھمکی آمیز کالیں موصول ہو رہی ہیں۔ فون کرنے والے نامعلوم شخص نے انہیں دھمکی دی کہ اگر انہوں نے رپورٹنگ بند نہ کی تو انہیں خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عیسیٰ خان خیل نے حکومت سے تحفظ دینے کی درخواست کی ہے۔

☆ نجی ٹی وی چینل کی رپورٹر حذیفہ قریشی کو ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹس انسٹی ٹیوشنز (ای او بی آئی) میں ہونے والی کرپشن پر تفصیلی رپورٹ نشر کرنے پر ایف آئی اے کے سابقہ سربراہ کے بیٹوں نے شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔ جب وہ رپورٹ نشر ہوئی تو چیف جسٹس نے معاملہ کا از خود نوٹس لیا اور رپورٹر کی حفاظت کا بھی حکم جاری کیا۔ ایف آئی اے کے سابق سربراہ کے بیٹوں نے حذیفہ قریشی

دوسروں کو تنبیہ کرنے کے لیے کراچی میں ایکسپریس میڈیا کے دفتر پر حملہ کیا گیا

کو اپنے دفتر میں بلا کر زدوکوب کیا۔ سیکرٹری داخلہ کے احکامات پر دونوں بھائیوں کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا۔

اگست

☆ جنوبی وزیرستان میں وانا کے ایک قریبی گاؤں میں سینئر قبائلی صحافی ظفر وزیر کے گھر کو دھماکہ میں شدید نقصان پہنچا۔ دھماکے کے وقت ظفر وزیر گھر پر موجود نہ تھے۔ تاہم ان کا خاندان محفوظ رہا۔ ظفر وزیر پاکستان کے پشتو زبان کے واحد چینل اے وی ٹی اور دنیا نیوز کے لیے کام کرتے تھے۔

☆ کراچی میں ایکسپریس میڈیا گروپ کے دفتر پر نامعلوم موٹر سائیکل سوار مسلح افراد نے حملہ کیا۔ مسلح افراد نے 20 بار عمارت پر فائرنگ کی جس سے عملہ کے دو افراد زخمی ہو گئے۔ نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا ہے۔

☆ کراچی کے نواح میں لاپتہ ہونے والے صحافی عبدالرزاق بلوچ کی تشدد زدہ نعش ملی۔ وہ روزنامہ تاوار میں بطور سب ایڈیٹر کام کرتے تھے اور مارچ سے کراچی کے علاقے لیاری سے لاپتہ تھے۔ صحافی کی نعش کو اس بری طرح سے مسخ کر دیا گیا تھا کہ خاندان والوں کو لاش کی شناخت کے لیے متعدد بار مردہ خانے جانا پڑا۔ ان کی جیب میں ایک نوٹ چھوڑ دیا گیا تھا جس پر ان کا نام درج تھا۔

ستمبر

☆ اسلام آباد میں انگریزی اخبار کے کرائم رپورٹر اسرار احمد کو نامعلوم افراد کی جانب سے فون پر قتل کی دھمکیاں ملیں۔ انہوں نے پولیس کو شکایت درج کرائی لیکن پولیس نے مقدمہ درج نہ کیا۔ نیشنل پریس کونسل اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے حکومت سے صحافیوں کو تحفظ مہیا کرنے کی اپیل کی ہے۔

☆ کراچی میں انگریزی کے ہفتہ وار اخبار فرائیڈے ٹائمز کے نمائندے علی چشتی کو پولیس نے اس وقت روکا جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس اپنے گھر جا رہے تھے۔ تقریباً آدھے درجن پولیس اہلکاروں نے ان کو زبردستی گاڑی سے باہر نکالا اور پولیس کی گاڑی میں ڈالا۔ وہ چشتی اور ان کے ڈرائیور کو لے کر داؤد ریا کے علاقے میں گئے اور انہیں سادہ لباس میں ملبوس افراد کے حوالے کر دیا۔ وہاں ان کو نو گھنٹے تک محبوس رکھا گیا اور شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔ مجرموں نے چشتی کو 24 گھنٹوں میں شہر چھوڑنے کا کہا۔ مقامی اور بین الاقوامی صحافتی اداروں نے واقعے کی مذمت کی اور مکمل تفتیش، پولیس اہلکاروں اور دوسرے افراد کو گرفتار کرنے کا تقاضا کیا جو صحافی پر تشدد کرنے

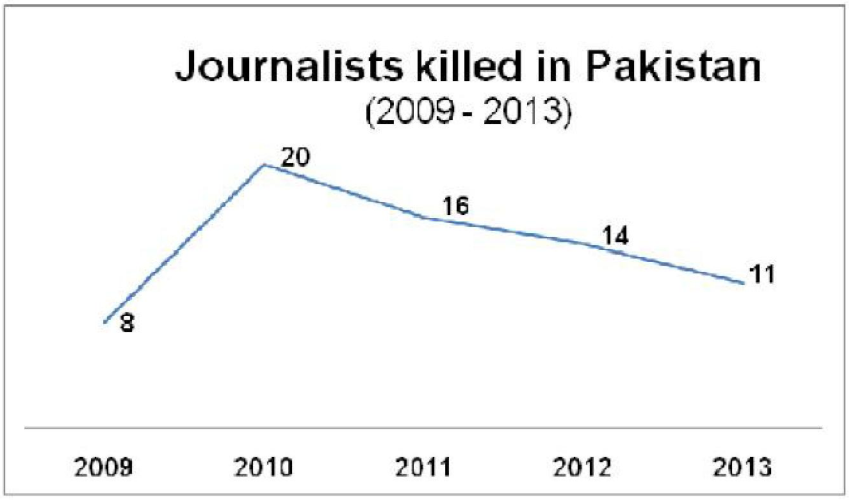

میں ملوث تھے۔

اکتوبر

☆ روزنامہ ایکسپریس ٹربیون کے چیف رپورٹر رانا تنویر کو مذہبی اقلیتوں کے مسائل نمایاں کرنے پر دھمکی آمیز خط موصول ہوا۔ ایک صفحہ کے اس خط میں ملتان ڈاکخانہ اور لاہور گارڈن ٹاؤن کے ڈاکخانے کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ خط انہیں لاہور میں قائم ایکسپریس ٹربیون کے دفتر میں موصول ہوا۔ خط میں تنویر کو احمدیوں اور عیسائیوں کی حمایت کرنے پر مرتد قرار دیا گیا تھا۔ اس میں درج تھا کہ تنویر کو توبہ کرنی چاہئے۔ اور اگر وہ باز نہ آیا تو اسے مار دیا جائے گا۔

☆ عظیم ورسک، جنوبی وزیرستان کے ایک مقامی اخبار کے لیے کام کرنے والے صحافی لال وزیر کو افغان بارڈر کے قریب قبائلی علاقے سے نامعلوم افراد نے اغواء کرلیا۔ اغواء کے 24 گھنٹے بعد لال وزیر کو مقامی بازار میں آزاد کردیا گیا۔ لال وزیر نے اپنے اغواء کے بارے میں بات کرنے سے انکار کردیا۔

☆ ایک نجی ٹیلی ویژن چینل کے رپورٹر ایوب خان خٹک کو کرک ضلع کے گاؤں وارانہ میں اسی علاقہ کے دو افراد نے گولی مار کر ہلاک کردیا۔ بتایا گیا ہے کہ ایوب کو اس لئے ہلاک کیا گیا کیونکہ اس نے ان کے خلاف مقدمہ درج کروایا تھا۔

☆ اسلام آباد کے دو صحافی ڈان نیوز کے شکیل اور ایکسپریس نیوز کے قمر المنور کو مجسٹریٹ کے بیٹے اور اس کے دوستوں نے زدوکوب کیا کیونکہ انہوں نے ملزموں کی اس وقت ویڈیو فلم بنائی تھی جب وہ

ایک پولیس اہلکار پر تشدد کر رہے تھے۔ پولیس اہلکار نے ان کی اس گاڑی کو روکا تھا جس پر ملزمان نے پولیس کی ریوالونگ لائٹ لگا رکھی تھی اور شیشوں پر سیاہ کاغذ لگا رکھے تھے۔ پولیس اہلکار نے ان کو ٹکٹ جاری کرنے کی کوشش کی لیکن مجسٹریٹ کے بیٹے اور اُس کے دوستوں نے اسے برا بھلا کہا اور اسے زدکوب کیا۔ جب صحافیوں نے اس واقعہ کی کوریج کی تو ان کو بھی مارا گیا۔

☆ کراچی میں چار صحافی اور ایمرجنسی کی صورتحال سے نمٹنے والے ادارے کے اراکین اور پولیس اہلکار اس وقت شدید زخمی ہو گئے جب وہ امام بارگاہ میں ہونے والے دھماکہ کی کوریج کر رہے تھے کہ اسی دوران دوسرا دھماکہ ہو گیا۔

دسمبر

☆ کراچی میں ایکسپریس میڈیا گروپ کے دفاتر کو ایک بار پھر نشانہ بنایا گیا۔ موٹر سائیکل سوار چار مسلح افراد نے عمارت پر دستی بم پھینکے اور فائرنگ بھی کی۔ جب سکیورٹی گارڈ نے جوابی فائرنگ کی تب حملہ آور فرار ہو گئے۔

☆ ملاّ فضل اللہ کی سربراہی میں کام کرنے والی دہشت گرد تنظیم پاکستان طالبان کا کہنا ہے کہ وہ ایسے صحافیوں اور میڈیا کے اداروں کو نشانہ بنائے گی جنہوں نے بھارتی کھلاڑی سچن ٹنڈولکر اور پاکستانی کھلاڑی مصباح الحق سے متعلق فرضی بیانات کو طالبان کے ترجمان سے منسوب کیا تھا۔ طالبان کا کہنا ہے کہ ان کی مشاورتی کمیٹی نے متفقہ طور پر صحافیوں کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔

مواد کا معیار

میڈیا انڈسٹری نے تقریباً دس سال پہلے اس وقت کافی ترقی کر لی تھی جب ذرائع ابلاغ کے متعدد ادارے وجود میں آئے۔ اس لیے اس دور کو پاکستان میں ذرائع ابلاغ کے انقلاب سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس سے قبل خبریں دینے اور تفریح مہیا کرنے والے جو چینل موجود تھے وہ ریاستی کنٹرول میں تھے۔ اس دس سالہ عرصہ کے دوران جہاں ذرائع ابلاغ نے خود کو عوام کی آواز کے طور پر مستحکم کیا ہے وہیں ایک ایسی صنعت کے طور پر ابھر کر سامنے آئے جس کو کسی باضابطے میں لانے کی ضرورت ہے۔ اس کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا اور اس پر سنسنی پھیلانے کا الزام بھی لگایا۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ لگاتار دکھائی جانے والی بریکنگ نیوز کا فالو اپ بہت کم دکھایا جاتا ہے۔ 15 اگست کو خودکار اسلحہ سے لیس درمیانی عمر کا ایک شخص محمد سکندر اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ پانچ گھنٹوں سے زیادہ عرصے تک اسلام آباد پولیس کے ساتھ معرکہ آرا رہا۔ پولیس کے پاس بے

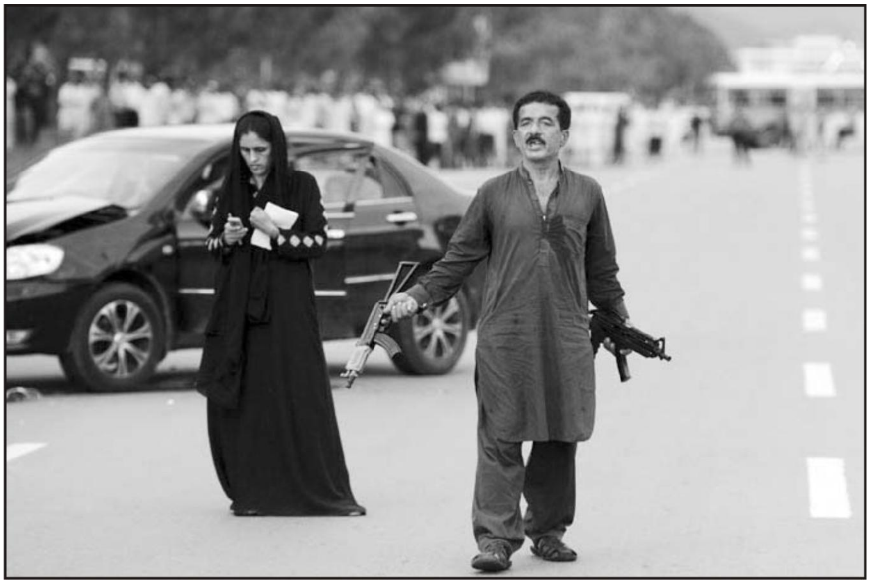

نیوز چینلز نے سکندر کو براہِ راست انٹرویو کیا

بس کر دینے والی بندوقیں نہیں تھیں۔ تب ایک غیر مسلح شہری کو یہ معرکہ ختم کرنے کے لئے آگے بڑھنا پڑا۔ یہ دونوں باتیں بے حد اہم ہیں۔ اس سارے واقعے میں میڈیا کے کردار کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ حکام کی متعدد بار درخواست کرنے کے باوجود نہ صرف یہ کہ میڈیا کے ارکان خطرناک حد تک مسلح شخص اور اس کی گاڑی کے قریب کھڑے رہے بلکہ کچھ اینکر پرسنز نے سکندر اور اس کی بیوی سے لائیو موبائیل فون پر رابطہ بھی کیا اور اس کے مطالبات عوام کے سامنے رکھنے کی پیشکش کی۔ سکندر اور اس کی بیوی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بیان دیا کہ وہ محض ملک میں شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں۔ اینکر پرسنز اور پروڈیوسروں کے رویے پر تنقید کی گئی کہ اس حرکت نے لوگوں کے ذہنوں کو الجھا دیا ہے کہ آیا سکندر ایک فاتر العقل شخص تھا، دہشت گرد تھا یا ایک ایسا شخص جو اپنے آپ کو اچھے مسلمان کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔

میڈیا کے غیر ذمہ دارانہ رویے کا ایک اور واقعہ اس وقت سامنے آیا جب ایک ٹی وی چینل کا عملہ لاہور کے ایک مساج پارلر میں گھس گیا اور وہاں موجود خواتین کو فاحشائیں قرار دے دیا۔ میڈیا کے خدائی خدمتگار ہونے کا ایک تازہ ترین واقعہ سامنے آیا جس میں حکام کی جانب سے سرچ وارنٹ کے بغیر ایک نجی عمارت پر چھاپہ مارا گیا۔ اسی سے مماثل ایک اور واقعہ یاد آتا ہے جو ایک دوسرے نجی چینل کی میزبان کی جانب سے 2012ء میں وقوع پذیر ہوا۔ میزبان نے کراچی کے پارکوں میں نوجوان جوڑوں کو ہراساں کیا۔ میزبان کے مطابق یہ نوجوان جوڑے اپنے والدین سے ''بددیانتی'' کر رہے تھے جس کی حوصلہ شکنی ہونی چاہئے تھی۔

اس شو کو ناظرین کی جانب سے انتہائی منفی فیڈ بیک ملا لیکن یہ فیڈ بیک ظاہری طور پر دوسرے پروگرامز کے میزبانوں کو ایسی حرکات سے روکنے میں ناکام رہا۔ ایسے ہی ایک مذہبی ٹی وی پروگرام میں میزبان نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے لاوارث بچے بے اولاد جوڑوں کو تحفتاً دیئے۔ کچھ حلقوں نے شو پر بچوں کی فلاح و بہبود اور تحفظ میں کمی کے حوالے سے پروگرام پر شدید تنقید کی۔ ایسے لگتا تھا جیسے لاٹری کا پروگرام ہو جس میں سوال کا صحیح جواب دینے پر انعام میں بچہ دیا جاتا ہو۔ اگرچہ ان بچوں کو جوڑوں کے حوالے کرنے والے ادارے نے کہا کہ بچوں کو اپنانے والے والدین کے بارے میں پوری طرح چھان بین پہلے کی جا چکی تھی لیکن ناقدین کا کہنا تھا کہ بچوں کی فلاح و بہبود کو ٹی وی کی ریٹنگز پر قربان کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ تصور کریں کہ اس بچے کو اس وقت کتنی اذیت ہوگی جب اس کو پتہ چلے گا کہ اس کے والدین اس کو ایک گیم شو سے انعام کے طور پر جیت کر لائے تھے۔

پیمرا کا کردار

میڈیا کے ناقدین تسلسل کے ساتھ پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا) کو تنقید کا نشانہ یہ کہہ کر بنا رہے ہیں کہ ادارہ اپنے طے شدہ کردار کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے اختیارات کے استعمال میں اخلاقی تنزلی کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ فروری میں پیمرا نے ٹی وی چینلز اور ریڈیو چینلز کو ہدایت کی کہ وہ ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے پروگرام چلا کر لوگوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے سے گریز کریں اور نوجوان نسل کے ذہنوں کو پراگندہ نہ کریں۔ پیمرا نے ایک مراسلہ بھی جاری کیا جس میں کہا گیا کہ ویلنٹائن ڈے منانا ہماری قومی مذہبی اور ثقافتی اقدار کے خلاف ہے۔

ایک مسئلہ جسے متعدد موقعوں پر پیمرا نے اٹھایا وہ تھا مقررہ حد سے زیادہ ٹی وی چینلز پر دکھایا جانے والا غیر ملکی مواد۔ 30 مارچ کو آٹھ ٹی وی چینلز کو پیمرا کی طرف سے حد سے زیادہ غیر ملکی مواد نشر کرنے پر جرمانہ کیا گیا۔ پیمرا کے قوانین کے مطابق کسی بھی چینل پر غیر ملکی مواد دس فیصد سے زیادہ نہیں دکھایا جا سکتا اور اس میں صرف چھ فیصد بھارتی مواد ہو سکتا ہے۔

حکومت نے ستمبر میں فنانس ایکٹ 2013ء کے تحت غیر ملکی مواد دکھانے پر ٹیکس عائد کر دیا اور پیمرا کو اس کی وصولی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ غیر ملکی مواد کی ہر قسط پر ایک لاکھ روپے ٹیکس لگایا گیا۔ تاہم اس مسئلہ پر عوامی رائے حاصل نہیں کی جا سکی۔ غیر ملکی ڈراموں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اور اپنی ملکی انڈسٹری کے تحفظ کے لیے سزا کے طور پر اقدامات اٹھانا عوام کی پسند پر پابندیاں لگانے کے مترادف ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ غیر ملکی مواد تک عوام کی رسائی ملکی انڈسٹری کے لیے یوں بہتر ہے کہ اس میں مقابلہ کے باعث متعلقہ ادارے اور افراد

اپنی انڈسٹری کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ اس طرح ملکی مواد کے معیار کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

چیئرمین کی برطرفی اور پھر دوبارہ تقرری کی وجہ سے پیمرا ابھی تنازعہ کا شکار رہا۔ نیب کے ہاتھوں چیئرمین کے اثاثوں کی تحقیقات سال کے دوران جاری رہی۔ سپریم کورٹ نے جنوری میں ایک پٹیشن کی سماعت کے دوران اس تقرری کو سپریم کورٹ کے احکامات کی خلاف ورزی قرار دے دیا تھا۔ رشید احمد پر ناجائز طور پر عہدہ لینے اور بدعنوانی کا الزام تھا۔ 15 جنوری 2013ء کو جاری کردہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے پیراگراف 6 میں کہا گیا کہ پیمرا کے چیئرمین کی تقرری پیمرا آرڈیننس میں درج اصولوں کے مطابق ہوگی۔ 16 دسمبر کو حکومت نے پیمراء کے چیئرمین کی تقرری کو غیر قانونی اور سپریم کورٹ کی ہدایات کے منافی قرار دیتے ہوئے منسوخ کر دیا۔ اس سے اگلے ہی روز اسلام آباد ہائی کورٹ نے ملازمت کی برخاستگی کے نوٹس کو معطل کرتے ہوئے پیمرا کے سربراہ کو ان کے عہدہ پر بحال کر دیا۔ دو دن بعد یعنی 19 دسمبر کو وفاقی حکومت نے رشید احمد کی بحالی کو چیلنج کرتے ہوئے موقف اختیار کیا کہ اسلام آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ آئین کے آرٹیکل 9,4, 10-A اور 25 کی خلاف ورزی ہے۔ سپریم کورٹ نے حکومتی پٹیشن کو یہ کہہ کر اس فیصلہ کو موخر کر دیا کہ حکومت اسلام آباد ہائی کورٹ کو زیرِ سماعت مقدمہ کا فیصلہ کرنے دے۔ 27 دسمبر کو اسلام آباد ہائی کورٹ نے چیئرمین پیمرا کی برطرفی کے حکم کو مسترد کرتے ہوئے ان کو بحال کر دیا۔

میڈیا کا احتساب

میڈیا کو عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں خاصا وقت لگا لیکن صحافیوں، میڈیا سے متعلق افراد اور اینکرز کو خفیہ فنڈ سے مبینہ طور پر ملنے والی رقوم کے انکشاف نے اس اعتماد کو بری طرح متاثر کیا۔ حامد میر، ابصار عالم اور اسد کھرل کی جانب سے سپریم کورٹ میں ایک پٹیشن دائر کی گئی جس کے مطابق کچھ صحافیوں اور میڈیا کے اداروں کو مشتبہ سرگرمیوں کے لیے وزارت اطلاعات کی طرف سے غیر قانونی طور پر فنڈز دیئے گئے تھے۔ 2012ء میں جب عدالت نے چھان بین شروع کی اور فنڈ منجمد کر دیئے تو وزارت اطلاعات نے الزامات سے انکار کر دیا۔

اپریل 2013ء میں سپریم کورٹ کے احکامات کی روشنی میں ان 282 صحافیوں کے ناموں کی فہرست جاری کی گئی جنھوں نے سیکرٹ فنڈ سے فائدہ اٹھایا تھا۔ ان ادائیگیوں کی رقم 17 کروڑ 70 لاکھ روپے بنتی تھی۔ اس مسئلے پر میڈیا جو عمومی طور پر بے حد طاقتور اور پرجوش رہتا تھا، خاموش رہا۔ بہرحال میڈیا کے کچھ حصے نے اس بات پر شدید تنقید کی کہ فائدہ اٹھانے والوں کے نام مشتہر کئے گئے۔ بہرحال بعض میڈیا والوں کا کہنا ہے کہ عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جان سکیں کہ کون کون سے صحافی اپنے پیشہ کے حوالے سے خفیہ فنڈ سے

مستفید ہوتے رہے ہیں۔

قانون سازی اور پالیسی سازی کے مسائل

سال 2013ء میں کچھ نئی قانون سازی ہوئی لیکن میڈیا کی آزادی کے بارے میں کچھ معاملات سامنے آئے۔ دسمبر میں سائبر کرائم بل (Cyber Crime Bill) کا حتمی مسودہ تیار کیا گیا جس کو وفاقی کابینہ کی منظوری کے لیے پیش کیا جانا تھا۔ کابینہ کی منظوری کے بعد یہ بل پارلیمنٹ میں ووٹ کے لیے پیش کیا جانا تھا۔ اس بل کا تمام حلقوں میں خیر مقدم کیا گیا اور اس کو ملک میں ٹیلی کمیونیکیشنز کے اجراء کے بعد ایک اہم پیش قدمی قرار دیا گیا۔ حکومت کو اس کی ضرورت اس لئے تھی کہ لوگوں کو یہ باور کرایا جا سکے کہ وہ شناخت کی چوری، فنانشل جرائم، سائبر ٹیریرازم اور سنجیدہ نوعیت کے دوسرے جرائم سے محفوظ ہیں۔ 2007ء میں دی پریوینشن آف الیکٹرانک کرائمز آرڈیننس (The Prevention of Electronic Crimes Ordinance) کی منظوری کے لئے کوششیں کی گئیں لیکن پارلیمنٹ نے اس کی منظوری نہ دی۔

مختلف میڈیا گروپس نے میڈیا کے معاملات میں حکومتی مداخلت کی شکایات کیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میڈیا تبھی واچ ڈاگ اور احتسابی ذریعہ بن سکتا ہے جب وہ آزاد ہو اور اس کا نظام نجی افراد کے ہاتھوں میں ہو۔ 13 فروری کو جاری کی گئی پریس ریلیز میں کونسل آف نیوز پیپرز ایڈیٹرز (CPNE) نے مطالبہ کیا تھا کہ حکومت اشتہاروں کے حوالے سے مرکزیت کی پالیسی کو ختم کرے۔ نئی پالیسی 1964ء کی سنٹرلائزڈ میڈیا پالیسی کی طرح مشتہرین کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ فیصلہ کریں کہ انہیں کس اخبار یا ریڈیو یا ٹی وی چینل کو اشتہار دینے ہیں۔ بلکہ اس کے تحت اشتہاری کمپنی کے انتخاب کا فیصلہ ایک فرد کے ہاتھوں میں مرتکز ہے۔ اور یوں حکومت کی طرف سے نامزد کردہ فرد ذرائع ابلاغ کے مالی معاملات کو طے کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ اور یوں حکومت بالواسطہ طور پر اخبارات کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتی رہے گی۔ اس تجویز میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ حکومت پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن (PTV)، پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن (PBC) اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان پر سے اپنا کنٹرول ختم کرے اور انہیں آزاد اور خودمختار ادارے بنائے۔

سپریم کورٹ نے میڈیا کے ضابطہء اخلاق کے اصولوں کو منظم اور باضابطہ بنانے کی تجاویز تیار کرکے ایک کمیشن کی تشکیل کی۔ دو رکنی کمیشن میں ریٹائرڈ جج ناصر اسلم زاہد اور سابقہ وزیر اطلاعات جاوید جبار شامل تھے۔ کمیشن نے جولائی میں تجویز دی کہ میڈیا لاز ریویو ٹاسک فورس بنائی جائے جو تیزی سے ترقی کرتی ہوئی انڈسٹری کی ضروریات کے مطابق میڈیا کے قوانین کو نئے حالات کے مطابق ڈھالے۔ 1500 صفحاتی رپورٹ میں نشاندہی کی گئی کہ 64 وفاقی میڈیا قوانین اور 8 صوبائی میڈیا قوانین پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

اس رپورٹ میں بتایا گیا کہ میڈیا کو ضابطے کے اندر لانے کے لئے اس کے اپنے بنائے گئے ضابطوں (دستور العمل) پر عمل درآمد سے خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلے گا بلکہ میڈیا کے لئے ضابطہء اخلاق تیار کرنے کے لئے پارلیمانی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ پی ٹی وی اور حکومت کی ملکیت میں کام کرنے والے پی بی سی اور اے پی پی میں ریاست کی شراکت کم کی جائے۔ مختلف میڈیا گروپس اور یونینوں نے بھی مطالبہ کیا ہے کہ آٹھویں ویج بورڈ ایوارڈ کا اعلان کیا جائے اور یہ ایوارڈ نہ صرف میڈیا کے اداروں کے مستقل ملازمین کے لیے ہو بلکہ کنٹریکٹ ملازمین کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک میڈیا کے ورکرز اور کیمرہ پرسنز پر بھی اس کا اطلاق ہونا ضروری ہے۔

مقررہ میعاد کے بعد قائم ہونے والے ویج بورڈ کو تنخواہوں کا تعین کرنا چاہئے۔ ایک قابل تحسین اقدام کے طور پر خیبر پختونخوا اسمبلی نے 9 مارچ کو ایک قانون منظور کیا جس کے مطابق پرنٹنگ پریس، ڈیکلریشن (عہد نامہ) اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کے مالکان کو پابند کیا گیا کہ وہ ڈیکلریشن جمع کرائیں گے کہ وہ اپنے ملازمین کو ویج بورڈ ایوارڈ کے مطابق تنخواہیں ادا کر رہے ہیں۔ اس قانون کا نام ہے ''خیبر پختونخوا پریس، نیوز پیپرز، نیوز ایجنسیز اینڈ بک رجسٹریشن ایکٹ مجریہ 2013ء''۔ اس ایکٹ کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا اور اس میں قانون پر عملدرآمد نہ کرنے پر سزائیں رکھی گئی ہیں۔ اس کے مطابق اخبارات کی غیر قانونی اشاعت اور ڈیکلریشن کے بغیر پرنٹنگ پریسوں کو چلانا بھی مستوجب سزا ہوگا۔ اس ایکٹ کی منظوری کے بعد پرانا پریس ایکٹ منسوخ ہوگیا۔

صحافیوں اور مزدوروں کے حقوق کے حوالے سے اسے کامیابی قرار دیتے ہوئے خیبر پختونخوا اسمبلی نے 9 مارچ کو ایک قانون کی منظوری دی جس کے تحت چھاپہ خانوں، اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کے مالکان کے لئے لازمی قرار دے دیا گیا کہ وہ ایک ڈیکلریشن داخل کریں گے جس میں وہ فیصلہ کریں گے کہ وہ اپنے ملازمین کو ویج بورڈ ایوارڈ کے مطابق تنخواہیں ادا کرتے ہیں۔ اس قانون کو خیبر پختونخوا پریس، نیوز پیپرز، نیوز ایجنسیز، اینڈ بک رجسٹریشن ایکٹ 2013 کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ایکٹ متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ اس ایکٹ کے تحت قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سزائیں بھی رکھی گئی ہیں۔ ان خلاف ورزیوں میں غیر قانونی طور پر اخبارات شائع کرنا، ڈیکلریشن کے بغیر چھاپہ خانہ چلانا وغیرہ شامل ہے۔ یہ ایکٹ پرانے سنٹرل پریس ایکٹ کی جگہ نافذ کیا گیا ہے۔

حکومت نے آزادئ اظہار پر کچھ قدغنیں لگانے کی بات بھی کی تا کہ اس بات کی ضمانت مل سکے کہ انفرادی سطح پر پارٹیوں یا افراد کو براہ راست نشانہ نہ بنایا جاسکے۔ سابق وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات قمر زمان

کائرہ نے 25 فروری کو منعقد ہونے والے سیمینار، جس کا موضوع تھا ''پاکستان کے لئے جمہوریت کیوں ضروری ہے'' میں کہا کہ عدلیہ میڈیا کو ایسے ریمارکس کو چھاپنے یا نشر کرنے سے روکے جو مقدمات کی سماعت کے دوران دیئے جاتے ہیں تا کہ یہ تاثر نہ ملے کہ کسی سیاسی جماعت کو نشانہ بنایا گیا ہے۔انہوں نے کہا کہ ججوں کے ریمارکس کو میڈیا کے اداروں کی طرف سے اچھالنے سے سیاسی جماعتوں کی انتخابی مہم کو نقصان پہنچتا ہے۔

دی پنجاب فریڈم آف انفارمیشن ایکٹ جو 2011ء سے پائپ لائن میں تھا، کی منظوری دسمبر میں صوبائی قانون سازوں نے دی۔ ''پنجاب ٹرانسپرنسی اینڈ رائٹ ٹو انفارمیشن بل مجریہ 2013ء اس بل پر حزب مخالف کے ساتھ ساتھ آزاد اور غیر جانبدار ماہرین نے بھی خاصی تنقید کی۔اس قانون کا مقصد حکومتی معاملات کے بارے میں انفارمیشن تک عوام کی رسائی کو مزید شفاف بنانا تھا۔تاہم اسمبلی میں بحث کے دوران ''قومی مفاد'' یا ''تیسری پارٹی'' جیسی مبہم اصطلاحات پر کافی لے دے ہوئی۔بل کی شق 9B جس کا عنوان تھا ''استثنیات''۔اس میں استثنیات کی ایک طویل فہرست شامل تھی جن میں ایسی بے شمار مثالیں اور نظیریں پیش کی گئی تھیں کہ کس طرح اطلاعات تک رسائی کو ناممکن بنایا جاتا ہے کبھی یہ کہہ کر کہ ان اطلاعات کو عام کرنے سے قومی دفاع یا تحفظ کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور کبھی یہ بہانہ بنا کر کہ نظم ونسق یا بین الاقوامی تعلقات اس سے متاثر ہو سکتے ہیں،اطلاعات تک رسائی کو ناممکن بنایا جاتا ہے۔

جولائی میں خیبر پختونخوا کی کابینہ نے رائٹ ٹو انفارمیشن لاء کی منظوری دی جس کے تحت عوام کو اطلاعات تک رسائی کی ضمانت دی گئی تھی تا کہ حکومتی معاملات میں شفافیت کو فروغ مل سکے۔اس قانون کے تحت حکومت کے تمام معاملات کو سرکاری ویب سائٹ پر دکھایا جانا تھا تا کہ عوام کو معلوم ہو کہ صوبائی حکومت کیا کر رہی ہے۔اس قانون کے تحت ہر شخص کو اجازت تھی کہ ایک درخواست کے ذریعے ریاست کی کارگزاری کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔صوبائی حکومت نے ایک اکاؤنٹیبلٹی کمشن (احتساب کمشن) قائم کرنے کا منصوبہ بھی بنایا ہے تا کہ ایسے متعلقہ سرکاری ملازمین کے خلاف قدم اٹھایا جا سکے جو حصول اطلاعات کی درخواستوں کو نظر انداز کرنے کے مرتکب ہوں گے۔کابینہ نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ سرکاری محکموں میں ہونے والے نیلام ذرائع ابلاغ کی موجودگی میں کئے جائیں گے اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان نیلاموں کو ناجائز اور غیر قانونی قرار دے دیا جائے گا۔

مالی معاملات

پیشہ وارانہ عدم تحفظ، تنخواہوں کی عدم ادائیگی یا ان ادائیگیوں میں تاخیر کے باعث صحافت ایک انتہائی مشکل پیشہ بن چکا ہے۔اگر چہ ساتویں ویج بورڈ ایوارڈ کا اعلان سال 2001ء میں کیا گیا تھا لیکن اس پر عملدرآمد نہ ہونے کی شکایات جاری ہیں۔مارچ میں ساتویں ویج بورڈ ایوارڈ کے نفاذ سے متعلق ایک پٹیشن کی

کیبل ٹی وی آپریٹرز نے بجلی کی کمی کے باعث کافی نقصان اٹھایا

سماعت کے دوران چیف جسٹس آف پاکستان نے کہا کہ صحافیوں اور میڈیا کے افراد کی تنخواہوں کے حوالے سے کوئی سمجھوتہ یا سودے بازی نہیں ہونی چاہئے۔ سماعت کے دوران یہ نکتہ بھی اٹھایا گیا کہ چند اخبارات ابھی تک مقرر کردہ تنخواہوں سے کہیں کم تنخواہیں ادا کر رہے ہیں۔ جبکہ دوسرے اخبارات تنخواہوں کی ادائیگی میں تاخیر کر رہے ہیں اور بعض اوقات یہ تاخیر برسوں پر محیط ہوتی ہے۔

تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے علاوہ اخبارات کی سرکولیشن میں کمی نے میڈیا ہاؤسز کو اس حد تک متاثر کیا کہ اس صورتحال سے نکلنے کے لئے بیل آؤٹ پیکج کے مطالبات کئے گئے تاکہ اخبار کو بند ہونے سے بچایا جاسکے۔ 12 فروری کو آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی نے ایک پریس ریلیز جاری کی جس میں کہا گیا کہ اخباری صنعت ایک شدید مالی بحران کا سامنا کر رہی ہے اور اسے زندہ رکھنے کے لئے وفاقی حکومت کی طرف سے بیل آؤٹ پیکج کی اشد ضرورت ہے۔ پریس ریلیز میں مزید کہا گیا کہ مالیاتی سست روی کے باعث اشتہاروں میں شدید کمی آ گئی ہے اخباری صنعت کو درپیش اس مالی خسارے کو گزشتہ چار برسوں کے دوران وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے سرکاری اشتہارات کے بلوں کی عدم ادائیگی نے مزید ہوا دی ہے۔

ملک میں کیبل ٹی وی کی شروعات کے باعث اطلاعات کو پھیلنے سے روکنا ممکن نہیں رہا اس لئے اطلاعات تک شہریوں کی رسائی بڑھ گئی ہے، تاہم بجلی کے تعطل نے اس آزادی کو کافی متاثر کیا۔ بجلی کے بحران نے کیبل آپریٹرز کی آمدن کو بھی بہت حد تک متاثر کیا۔ ملک میں کیبل آپریٹرز ایسوسی ایشن آف پاکستان نے 29 اپریل کو ایک کنونشن منعقد کیا جس میں بتایا گیا کہ بجلی کی ترسیل کے بے ترتیب ہونے کے باعث کیبل آپریٹروں کا کاروبار بہت متاثر ہوا ہے۔ جنریٹروں کے استعمال سے اخراجات میں اضافہ ہوا ہے جبکہ آمدنی کم ہوئی ہے۔ ایسوسی ایشن کے سینئر نائب صدر نے مطالبہ کیا کہ کسی چینل کو بھی کیبل آپریٹرز کے معاملات میں

مداخلت کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔اور پیمرا کو اشتہاروں پر ملنے والی پانچ فیصد کمشن میں کمی ہونی چاہئے۔ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ خیبر پختونخوا کے 25 کیبل آپریٹرز کے لائسنس بحال کئے جائیں جو غیر ملکی مواد نشر کرنے کی بنیاد پر معطل کئے گئے تھے۔پیمرا کے سربراہ نے کیبل آپریٹروں سے ملاقات کی اور انہیں کہا کہ وہ بھارتی چینلز کے مواد کو دکھانا بند کر دیں اس لئے کہ اس سلسلے میں پیمرا کی فیس ادا نہیں کی ہے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایسی نشریات سنسر بورڈ کے مقرر کردہ معیار پر پوری نہیں اترتیں۔

سوشل میڈیا اور ویب

یوٹیوب پر حکومتی پابندی کیخلاف شہریوں کے سخت احتجاج کے باوجود 2013ء کے دوران حکومت سوشل میڈیا میں مداخلت کرتی رہی اور مزید ویب سائٹس تک رسائی کو محدود کرتی رہی۔ستمبر 2012ء میں یوٹیوب پر پابندی لگادی گئی اس کا مقصد ایسی ویڈیوز کو پاکستان میں دکھانے سے روکنا تھا جنہیں ملحدانہ یا گستاخانہ سمجھا جاتا تھا۔اگرچہ یوٹیوب پر پابندی ختم کرنے کے کئی اعلانات کئے گئے لیکن 2013ء کے اختتام تک صورتحال میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔دسمبر میں پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) نے اعلان کیا کہ گوگل اس بات پر رضا مند ہو گیا تھا کہ وہ یوٹیوب کی مقامی شکل کو متعارف کروائے گا جس میں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی جس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے یا جو نظریہ پاکستان کے منافی ہو۔انسانی حقوق کی تنظیموں اور گروہوں نے جو، اظہار رائے کی آزادی اور اطلاعات تک رسائی کے لئے جدوجہد کرتی چلی آ رہی ہیں، اس قسم کے سنسر پر سخت تنقید کی۔ پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) نے نومبر کو انٹرنیٹ مووی ڈیٹا بیس (IMBD) کو کسی نوٹس کے بغیر روک دیا۔اور اس بارے میں عوام سے رائے نہیں لی۔اس صورتحال کا پتہ اس وقت چلا جب انٹرنیٹ استعمال کرنے والے افراد کو ویب سائٹ تک رسائی نہ ملی۔ایم بی ڈی وہ ویب سائٹ ہے جو دنیا بھر کی فلموں کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔اس پابندی کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔ بہرحال اس حکومتی اقدام پر انتہائی سخت تنقید کی گئی۔اگرچہ چند روز بعد یہ پابندی اٹھالی گئی تاہم پی ٹی اے نے اس پابندی کی وجوہات نہیں بتائیں۔اگرچہ آئی ایم بی ڈی پر سے پابندی اٹھالی گئی ہے اس کے باوجود اس ویب سائٹ کا ایک پیج بند رہا۔یہ پیج ڈیوڈ وٹنے کی مختصر دورانیے کی فلم ''دی لائن آف فریڈم'' کے لئے مخصوص تھا۔یہ فلم دسمبر 2013ء میں ریلیز کی گئی تھی۔فلم میں بلوچستان میں سکیورٹی فورسز کو ایک نوجوان کو اغواء کرنے کے بعد اس پر تشدد کرتے اور قتل کرتے دکھایا گیا ہے۔ بلوچستان میں رونما ہونے والے واقعات کو دکھانے والی ویب سائٹس تک بھی عوام کی رسائی ممکن نہ رہی۔4 اکتوبر کو حکومت سندھ نے سکائی پے، وہاٹ ساپ اور وائبر جیسی انسٹنٹ میسجنگ اور انٹرنیٹ ٹیلی فونی سروسز پر سکیورٹی کی وجوہات پر جو پابندی

یوٹیوب اس سال بھی پابندی کا شکار رہا

عائد کی تھی وہ تین ماہ تک قائم رہی۔

صوبائی وزیر اطلاعات نے پابندی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ایسی سروسز کو دہشت گرد اپنے اہداف پر حملوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ تاہم حکومت نے موبائل فون استعمال کرنے والے لوگوں کی طرف سے شدید تنقید کے پیش نظر اس پابندی کو زیادہ دیر تک جاری نہ رکھا۔ انہی پابندیوں کے سبب ایک آزاد امریکی واچ ڈاگ ''دی فریڈم ہاؤس'' نے پاکستان کو ان دس ملکوں کی فہرست میں شامل کر دیا جو 2013ء کے دوران انٹرنیٹ فریڈم کے حوالے سے عالمی سطح پر شدید تنقید کا نشانہ بنے۔

عوام کے لئے اظہار رائے کی آزادی

ملک میں ویب سائٹس پر پابندیاں عائد کرنے اور ٹیلی ویژن چینلوں پر نشر کئے جانے والے مواد کو ایک نظم میں لانے کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیچوں بیچ سنسر شپ کا معاملہ عوامی نمائندوں کے بحث ومباحثہ

میں سامنے آیا۔ فروری میں قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران سوال جواب کے سیشن میں وفاقی وزیر اطلاعات نے کہا کہ نجی چینلوں پر نشر ہونے والے مواد کو سنسر کرنا ناممکن ہے۔ مزید کہا کہ پیمرا کے پاس اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ پاکستان کے متعدد چینلوں پر نشر ہونے والے مواد کو نظم وضبط میں لا سکے اور اس مواد کی چھان پھٹک کر سکے۔ انہوں نے مزید کہا کہ عدالت عظمیٰ کو ابھی یہ واضح کرنا ہے کہ فحاشی کیا ہوتی ہے۔ اسے یہ بھی دیکھنا ہے کہ دوسرے ملکوں میں فحاشی کی تعریف کیا ہے۔ یہ ایک مشکل کام ہے اور ایسے معاملات اکثر ابہام کا شکار کر دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ وضاحت بھی کی کہ پیمرا سنسر کرنے والا ادارہ نہیں ہے۔ ان دعوؤں کے باوجود حکومت اخلاقیات ٹھونسنے کے کام میں مصروف نظر آئی۔

5 اپریل کو پاکستان مسلم لیگ نواز کے امیدوار اور ایک معروف صحافی ایاز امیر کے کاغذات نامزدگی ریٹرننگ آفیسر نے مسترد کر دیئے۔ ریٹرننگ آفیسر نے کہا کہ ایاز امیر نے نظریہء پاکستان کے خلاف دو کالم لکھے تھے اور اس طرح وہ اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتے جس کا تعین امیدواروں کے لئے آئین میں کیا گیا ہے۔ ایاز امیر نے اپنے کاغذات نامزدگی چکوال سے داخل کئے تھے۔ اور ایک شخص نے الیکشن کمشن آف پاکستان میں ان کے خلاف درخواست دی تھی۔ نتیجتاً ایاز امیر انتخاب سے باہر ہو گئے اور انہوں نے اپنی پارٹی بھی چھوڑ دی۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ایک سائل نے 7 ستمبر کو لاہور میں کالم نویس اجمل نیازی کے خلاف ایک شکائت درج کرانے کے لئے پولیس سے رجوع کیا اور الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے مضامین میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اللہ تعالیٰ کو سیکولر کے طور پر پیش کیا ہے اور اس طرح انہوں نے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ جب پولیس نے مقدمہ درج کرنے سے انکار کیا تو اس شخص نے لاہور ہائی کورٹ سے رجوع کیا جس نے پولیس کو کالم نویس کے خلاف مقدمہ درج کرنے کی ہدایت کی۔

حکومت کے کچھ اداروں کو قانون کے تحت تحفظ دیا گیا ہے جس کے تحت ان پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔ ان کے کردار کے حوالے سے اس وقت تک کوئی بحث نہیں ہو سکتی جب تک متعلقہ میڈیا ہاؤس کو ایسی سرگرمیوں سے باز رہنے کا نوٹس جاری نہیں کر دیا جاتا۔

4 جنوری کو سپریم کورٹ نے اسامہ بن لادن کے خلاف امریکی فوجی آپریشن کے نتیجہ پر میڈیا کے کردار کے متعلق مقدمے کی سماعت کے دوران رائے دی کہ اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ کوئی فوج اور عدلیہ کا مذاق اڑائے اس لئے کہ دونوں اداروں کو آئین کے تحت تحفظ حاصل ہے۔ میڈیا کی آزادی پر چار کرنے والوں نے سوال اٹھایا کہ ایسی صورت میں مقدمے کے حوالے سے عوام کی رائے کیسے حاصل کی جا سکے گی۔ انہوں نے کہا کہ صحافیوں اور ماہرین کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ بتائیں کہ اسامہ بن لادن کا

گھر، جس پر امریکہ کی سپیشل فورسز نے حملہ کیا تھا، وہ ملٹری اکیڈمی کے کتنا قریب تھا اور فوج کو اس کے بارے میں کچھ علم نہیں کیوں نہیں تھا۔ امریکی فوجی آپریشن ہمارے انٹلی جنس اداروں کی ناکامی ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بولنے اور بحث کرنے کی آزادی دینے سے انکار کی بجائے مسلح افواج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کو چاہئے تھا کہ وہ قوم کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتے اور 2 مئی 2011ء کو ہونے والے واقعات کے بارے میں عوام کو اعتماد میں لیتے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کے قتل سے متعلق واقعات کی تحقیقات کرنے والے عدالتی کمشن کی رپورٹ سرکاری طور پر جاری نہیں کی گئی تھی۔ حالیہ برسوں کے دوران ہونے والی عدالتی تحقیقات کا یہی حشر ہوا ہے۔ تاہم الجزیرہ ٹی وی نے جولائی 2013ء میں یہ رپورٹ جاری کردی۔ غیر ملکی مواد گرما گرم مباحث اور احتجاجوں کا موضوع بنا رہا۔ قومی اسمبلی میں اطلاعات ونشریات سے متعلق قائمہ کمیٹی نے حکومت سے کہا کہ ان اوقات میں، جب ٹی وی پروگرام زیادہ دیکھے جاتے ہیں، کسی بھی زبان میں غیر ملکی مواد نشر کرنے پر پابندی لگا دی جائے۔ جنوری میں کمیٹی نے سفارش کی کہ اگر ان پروگراموں کو نشر کرنے کی اجازت دی جاتی ہے تو پھر ان پروگراموں کو اردو اور انگریزی کے سب ٹائٹلز کے ساتھ دکھایا جائے۔ ٹی وی چینلوں پر غیر ملکی مواد کی شرح دس فیصد ہے۔ کمیٹی نے یہ تجویز دی کہ ایسے تمام اشتہاروں پر پابندی عائد کردی جائے جن میں غیر ملکی اداکاروں نے کام کیا ہو۔ پاکستانی اداکاروں اور میڈیا کے لوگوں نے بھی غیر ملکی مواد نشر کرنے کے خلاف احتجاجی مظاہرے کئے اور کہا کہ اس سے ملکی صنعت بُری طرح متاثر ہو رہی ہے۔

قوموں کے درمیان امن قائم کرنے کے لئے میڈیا کو پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا گیا۔ دی ساؤتھ ایشیا فری میڈیا ایسوسی ایشن (سیفما) نے لاہور اور امرتسر میں کانفرنس منعقد کی جس کا مقصد پاکستان اور بھارت کے درمیان پرامن اور برابری کی سطح کے تعلقات قائم کرنا اور انہیں فروغ دینا تھا۔ اس سلسلے میں ایک اعلامیہ بھی جاری کیا گیا جس میں تجویز کیا گیا کہ جنوبی ایشیا کو ایسا علاقہ بنا دیا جائے جہاں آنے جانے میں آسانیاں ہوں اور دونوں ملک تمام سطحوں پر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے نظر آئیں۔ امرتسر میں 6 جنوری کو جبکہ لاہور میں 8 اور 9 جنوری کو کانفرس ہوئی تھی۔ سارک کے آٹھ رکن ممالک کے صحافیوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی اور متفقہ طور پر اعلان کیا کہ وہ ہر قسم کے تشدد اور انتہا پسندی کو مسترد کرتے ہیں اور انسانی رواداری اور جمہوری تصور کو فروغ دیتے رہیں گے۔

مقتول صحافی کے لئے انصاف

جہاں سلیم شہزاد کا قتل معمہ ہی رہا، وہیں دوسرے مقدمات کے ذریعے انصاف کے حصول کی راہ

میں حائل مشکلات اجاگر ہوکر سامنے آئیں۔ 2011ء میں کراچی میں ایک ٹی وی رپورٹر ولی خان بابر کے قتل کے ملزمان کے خلاف مقدمہ کی سماعت سنٹرل جیل کے اندر جاری رکھنا پڑی۔ جولائی میں اینٹی ٹیررازم کورٹ (ATC) نے ملزموں کے بیانات ریکارڈ کئے۔ نومبر میں اے ٹی سی III کے سپیشل پبلک پراسیکیوٹر عبدالمعروف کی رہائش گاہ (کراچی) پرحملہ کیا گیا۔ عبدالمعروف اس مقدمے سے منسلک تھے۔ کراچی میں ان کی رہائش گاہ پرحملہ کیا گیا۔ حملہ کرنے والے متعدد افراد نے رات کے وقت ان کے گھر کی چھت توڑ کر گھر کے اندر گھسنے کی کوشش کی۔ لیکن پراسیکیوٹر نے حملہ آوروں پر فائرنگ کی جس پر وہ بھاگ گئے۔ یاد رہے کہ پبلک پراسیکیوٹر کو مقدمہ کی پیروی کرنے کی پاداش میں قتل کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ قتل کے تین سال بعد یہ بات واضح ہوئی کہ مقدمہ انتہائی حساس نوعیت کا تھا اور وہ لوگ جو اظہار رائے کی آزادی کوختم کرنا چاہتے ہیں، کسی ممکنہ سزا کے خوف سے بالاتر ہوکر اپنا کام کرتے رہیں گے۔ اس مقدمہ کے چار ملزم جیل میں مقدمے کے فیصلے کے منتظر تھے اور توقع تھی کہ یہ فیصلہ 2014ء کے ابتدائی دنوں میں سنا دیا جائے گا۔ بابر کے قتل میں نامزد دو افراد کامران عرف ذیشان اور فیصل موٹا مفرور تھے۔

سفارشات

1۔ حکومت کی کارکردگی سے متعلق دستاویزات تک عوام کی رسائی کوکسی قسم کے تحفظات کے بغیر بلاخیر قابل عمل بنایا جائے۔ ان دستاویزات میں بجٹ، سرویز اور انکوائری رپورٹیں وغیرہ شامل ہیں۔

2۔ صحافیوں کے قاتلوں کے خلاف مقدمات قائم کرنے اور انہیں سزائیں دینے کے عمل کو یقینی بنایا جائے تا کہ مستقبل میں اس قسم کے حملوں کی روک تھام ممکن ہو سکے۔ اُن صحافیوں کوسکیورٹی مہیا کی جائے جنہیں دھمکیوں کا سامنا ہے۔

3۔ صحافیوں، خصوصاً تصادم والے اور قبائلی علاقوں میں فرائض انجام دینے والے صحافیوں کوہیلتھ اور لائف انشورنس کی سہولت دی جائے۔ اس کے علاوہ ایسے صحافیوں کوایسی سہولتیں مہیا کی جائیں جن سے ان کے فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹیں پیدا نہ ہوں۔ فرائض کی ادائیگی کے دوران جاں بحق ہونے والے یا معذوری کا شکار ہونے والے صحافیوں کے خاندانوں کو مالی امداد اور دوسری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

4۔ حکومت کو انٹرنیٹ پر ویب سائٹس اور پیجز تک رسائی کی راہ میں رکاوٹیں نہیں ڈالنی چاہئیں اور نہ ہی ان پر پابندی لگانی یا ان تک رسائی کو محدود کرنا چاہئے۔ یوٹیوب اور اس قسم کی دوسری ویب سائٹس کوکھول دینا چاہئے۔

اجتماع کی آزادی

ہر شخص کو پرامن طور پر بغیر کسی ہتھیار کے 'اجتماع کرنے کا حق حاصل ہوگا' بشرطیکہ اس سلسلے میں مفاد عامہ کے پیش نظر کوئی معقول قانونی پابندی عائد نہ کردی گئی ہو۔

آئین پاکستان [آرٹیکل- 16]

ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ آزادی سے پرامن اجتماع منعقد کرے اور تنظیم بنائے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل- 20 (1)]

کسی بھی قسم کی ناانصافی کے ازالے کے لیے حکومت کی توجہ حاصل کرنے یا پرامن اجتماع کرنے کے حق کو پاکستان کے آئین اور بین الاقوامی انسانی قوانین کے تحت تسلیم کیا گیا ہے اور اس کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ پرامن اجتماع، جنہیں عام طور پر مارچ اور ریلیوں کے طور پر جانا جاتا ہے، کا انعقاد اس لیے کیا جاتا ہے تا کہ قانون سازاداروں یا ان کے منتخب نمائندوں تک رسائی سے محروم لوگوں کو آواز اٹھانے کا موقع مل سکے۔

ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کے پرامن اجتماع کی آزادی کی حفاظت اور اس کا احترام کرے، حتیٰ کہ غیر متشدد سیاسی احتجاج کے دوران بھی۔ کوئی بھی حکومت اس حق کا کس قدر احترام کرتی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہی لگایا جاسکتا ہے کہ معاشرے میں پرامن اجتماع کی کتنی آزادی ہے۔ یعنی جب لوگ قانون کی حفاظت میں رہ کر پُرامن احتجاج کے لیے جمع ہوتے ہیں، تو نہ صرف اپنے بنیادی مقصد، اپنی رائے اظہار میں کامیاب ہوتے ہیں، بلکہ وہ ان آزادیوں کے ہونے کی تصدیق بھی کررہے ہوتے ہیں، جو بین الاقوامی منشور برائے بنیادی حقوق اور آئین پاکستان، دونوں کے آرٹیکل نمبر 19 میں لوگوں کو دی گئی ہیں،۔ آزادیٔ اظہار کی آزادی کے حوالے سے پُرامن اجتماع کے تصور میں ایسے اجتماعات شامل نہیں ہیں، جن میں

طاقت کا استعمال کیا جائے یا طاقت کے استعمال کا منصوبہ بنائیں، طاقت کے استعمال کی دھمکی دیں یا لوگوں کو طاقت کے استعمال پر اکسائیں۔ تاہم پر امن شرکاء کے انفرادی حقوق دیگر افراد کی متشدد کارروائیوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ چنانچہ، بدامنی اور تشدد پر ریاستی ردعمل مظاہرین کے اشتعال کے تناسب سے ہونا چاہئے۔

حکام کو یہ بھی چاہئے کہ وہ کسی واقعے پر فوری ردعمل کے طور پر منعقد ہونے والے اجتماعات کو بھی تحفظ دیں اور جب تک اجتماع پر امن رہے، اجتماع کے شرکاء سے تعاون کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے پولیس کو وسائل کی فراہمی ضروری ہے تا کہ اجتماعات کو محفوظ رکھا جا سکے اور ٹریفک کے نظام کا بندوبست کیا جا سکے۔ خودرو، بیک وقت اور غیر قانونی اجتماعات پر بھی معقول ردعمل کا اظہار ہونا چاہئے۔ غیر ضروری پابندیوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اور حکام کی تشویش کو دور کرنے کی خاطر احتجاج کی شدت سے متناسب رکاوٹوں کا استعمال کرنا چاہئے۔ اجتماعات پر وسیع تر پابندیاں عائد کرنے یا انہیں ممنوع قرار دینے کی وجہ بسا اوقات امن عامہ قرار دی جاتی ہے۔ محض بدامنی کے امکان کی بجائے توجہ کا مرکز منتظمین کے مذکورہ ارادے ہونے چاہئیں اس لیے کہ نظم وضبط کو برقرار رکھنے اور عوامی اجتماعات کو سہل بنانے کی ذمہ داری حکام پر ہی عائد ہوتی ہے۔ حکام سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اجتماع کو یقینی پُرامن بنانے کے لیے مناسب اقدامات کریں بجائے اس کے کہ وہ اجتماعات پر پابندی عائد کرنے یا انہیں ممنوع قرار دینے کے لیے بدامنی کے امکان کا سہارا لیں۔

اجتماع کے وقت، نوعیت اور مقام پر جائز قسم کی پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔ تاہم، جہاں تک ممکن ہو سکے، ایسی پابندیاں منتظمین کے ساتھ مذاکرات یا مشاورت کے بعد ہی عائد کی جانی چاہئیں اور اجتماع کو ممنوع قرار دینے کی بجائے متبادل وقت یا مقام کی پیشکش کی جانی چاہئے۔

پر امن اجتماع کو ممنوع قرار دینے کا عمل ہمیشہ واضح اور مصدقہ شہادت کی بنیاد پر اور آخری حربے کے طور پر ہونا چاہئے۔ عوامی اجتماعات کی ذمہ دار انتظامیہ کا شفاف ہونا ضروری ہے۔ اجتماع کے منتظمین کو پولیس یا دیگر اداروں کے خدشات کو چیلنج کرنے کا موقع ملنا چاہئے اور ان کے پاس کسی بھی قسم کی پابندیوں کے خلاف عدالت میں اپیل دائر کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ عوامی اجتماعات کو حدود کے اندر رکھنے کے لیے معمول کے طریقوں سے مختلف قسم کی مہارتیں اور صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ متحارب مفادات اور حقوق میں توازن لانے کے لیے ضروری ہے کہ پولیس افسران انسانی حقوق کے معاملات اور ہجوم کو قابو میں رکھنے کے اصولوں اور طریق کار میں پوری طرح تربیت یافتہ ہوں اور تحفظ فراہم کرنے اور امن عامہ برقرار رکھنے کے لیے ضروری وسائل سے لیس ہوں۔

خواتین ہیلتھ ورکرز کا ملازمتوں کو باقاعدہ بنانے اور اُجرتوں کی ادائیگی کے لیے مظاہرہ

مئی 2013ء میں ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ 31 دسمبر تک مسلم لیگ ن کی موجودہ حکومت نے مرکز اور صوبہ پنجاب میں اپنی پانچ سالہ مدت کے پہلے سال کا نصف مکمل کرلیا تھا لیکن اسے سیاسی، مذہبی معاملات پر اور توانائی کے بحران کے خلاف احتجاجی مظاہروں کا سامنا کرنا پڑا۔اس کے علاوہ حکومت کو ڈاکٹرز،طبی عملہ،صحافیوں،کلرکوں، کسانوں اور اساتذہ جیسے پیشہ ور لوگوں کی جانب سے بھی احتجاجی مظاہروں کا سامنا کرنا پڑا۔ وزیراعظم نے ایک مرتبہ پھر کہا کہ پرامن احتجاج کرنا تمام پاکستانیوں اور سیاسی جماعتوں کا ناقابل تنسیخ حق ہے۔انہوں نے پنجاب حکومت کو ہدایت جاری کی کہ وہ اس امر کو یقینی بنائے کہ سیاسی جماعتوں سمیت تمام شہریوں کو اس حق کی راہ میں کسی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ دہشت گردی کے حملے اجتماع کی آزادی کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں جن میں عبادات اور جنازہ کے اجتماعات کو نشانہ بنایا گیا۔ بم دھماکوں کے نتیجے میں سینکڑوں عبادت گزار جاں بحق ہوئے۔احتجاجی مظاہروں میں تشدد کا مظاہرہ بھی کیا گیا جس کی ذمہ دار بعض اوقات مظاہرین جبکہ بعض اوقات پولیس تھی۔ احتجاجی مظاہروں کے دوران کم از کم دو افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے اور سرکاری املاک کو بھی نقصان پہنچا۔امن عامہ سے متعلقہ دفعہ 114 جیسی پابندیوں کا نفاذ جاری رہا۔

توانائی اور ایندھن کے معاملے پر احتجاجی مظاہرہ

2013ء احتجاجی مظاہروں کا برس تھا جن کا بنیادی سبب توانائی کی قلت کو پورا کرنے کے لیے کی

جانے والی معمول کی لوڈ شیڈنگ تھی۔ توانائی کی کھپت میں تیز تر اضافہ اور کم پیداوار کے باعث لوگوں کو بجلی کی قلت کا شکار ہونا پڑا۔ موسم سرما میں باورچی خانوں میں استعمال ہونے والے گیس کی غیر معمولی بندش غریب طبقوں کے لیے دہری ضرب تھی۔ ایک متنازعہ فیصلہ میں حکومت نے سی این جی کی قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ کرنے کا حکم صادر کیا۔ ملک کے 3400 گیس سٹیشنوں میں سے تقریباً نصف سٹیشن اس اندیشے کے باعث احتجاجاً بند ہوگئے کہ قیمتوں میں مقابلے کی فضا ختم ہوگئی تھی۔ اس بندش کے نتیجے میں گاڑیوں میں سی این جی کا استعمال کرنے والے لوگوں کو ایندھن کے حصول کے لیے بُری طرح سے کش مکش کا شکار ہونا پڑا۔

ملک بھر میں 12 سے 20 گھنٹے تک کے لئے بجلی کی منصوبہ بندی اور غیر متوقع بندش اور قدرتی گیس کی لوڈ شیڈنگ نے کاروبار کو شدید متاثر کیا، بے روزگاری میں اضافہ ہوا اور دارالحکومت اسلام آباد، لاہور، پشاور، ملتان، فیصل آباد اور گوجرانوالہ سمیت متعدد شہروں میں مشتعل احتجاجی مظاہروں کا سبب بنی۔ مشتعل مظاہرین نے توانائی کے سرکاری دفاتر کے باہر احتجاجی ریلیاں نکالیں۔

توانائی کی غیر اعلانیہ بندش اور لوڈ شیڈنگ سے خصوصی استثناء کے خلاف درخواست کی سماعت کرتے ہوئے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے رائے دی کہ اگر لوگوں کو بجلی اور گیس کی فراہمی کی جاتی تو وہ سڑکوں پر نہ نکلتے۔ احتجاجی مظاہروں میں ستمبر میں کمی واقع ہوئی جب حکومت نے توانائی پیدا کرنے والے اداروں کو قرضہ ادا کیا اور نتیجتاً بجلی کی لوڈ شیڈنگ پہلے سے کم ہوگئی۔

بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے خلاف مظاہرے اکثر پُرتشدد ہوجاتے ہیں

مذہبی وفرقہ وارانہ حملے اور احتجاج

جنوری میں ہزاروں کی تعداد میں ہزارہ شیعہ مرد، خواتین اور بچے کوئٹہ میں انتہائی سردی میں چار راتیں خیمہ زن رہے اور کوئٹہ میں ایک ہی وقت میں ہونے والے بم دھماکوں میں ہلاک ہونے والے 92 افراد کو دفن کرنے سے انکار کرتے رہے۔ انہوں نے صوبائی حکومت کی برطرفی کے بعد چار روزہ احتجاجی مظاہرہ ختم کر دیا۔ نعشوں کو دفنانے سے انکار ایسے معاشرے میں شدید نوعیت کا احتجاج ہے جہاں عام حالات میں نعش کو جلد از جلد دفنایا جاتا ہے۔ کوئٹہ میں ہلاکتوں سے غمزدہ شیعہ کمیونٹی اور دیگر شہریوں نے ملک بھر کے شہروں میں اظہار یک جہتی کے طور پر احتجاجی مظاہروں کا اہتمام کیا۔ فروری میں کوئٹہ کے ہزارہ شیعہ برادری پر ایک اور تباہ کن حملہ احتجاجی مظاہروں اور چار روز تک ملک بھر میں شاہراہوں کی بندش کا سبب بنا۔

فروری میں ہنگو میں بم دھماکے کے نتیجے میں 30 افراد ہلاک اور 56 زخمی ہوئے جس کے خلاف ملک بھر میں احتجاجی مظاہرے کئے گئے۔ ایک بمبار نے ہنگو کے پٹ بازار جہاں شیعہ اور سنی مساجد واقع ہیں، میں ایک موٹر سائیکل میں نصب بم سے دھماکہ کیا۔

مارچ میں عباس ٹاؤن کراچی میں ہونے والے حملے کے خلاف پیدا ہونے والے غم و غصے کے باعث ملک بھر میں احتجاجی ریلیاں نکالی گئیں۔ حملے میں 45 افراد ہلاک اور 100 سے زائد زخمی ہو گئے تھے۔ کئی شہروں میں ہڑتال کی گئی جس سے معاشرتی و کاروباری سرگرمیاں معطل ہو گئیں۔ وکلاء نے عدالتوں کا

لاہور میں مسیحی اپنے گھروں کو جلائے جانے کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں

بائیکاٹ کیا اور یوم افسوس منایا۔شیعہ آبادی کے اکثریتی علاقے میں بم دھماکے سے ہلاک شدگان کے نمازِ جنازہ میں ہزاروں غم گسار شریک ہوئے۔مردوں،خواتین اور بچوں،جن میں سے زیادہ تر نے ماتھے پر سیاہ پٹیاں باندھی ہوئی تھیں، جب ان کے پاس سے تابوت گزرتے تھے تو وہ اپنے سینوں کو پیٹتے اور آہ وزاری کرتے تھے۔ مسلح افراد نے ان تین افراد کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا جو تباہ کن بم دھماکے کا نشانہ بننے والوں کے اجتماعی جنازے میں شرکت کر کے واپس آ رہے تھے۔ اہل سنت والجماعت (اے ایس ڈبلیو جے) نے لاہور میں موٹر سائیکل سوار حملہ آوروں کا نشانہ بننے والے اپنے صوبائی رہنما شمس الرحمان معاویہ کے قتل کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔

اگست میں سنی تحریک نے جاوید فاروقی کے قتل کے خلاف ریلیاں نکالیں جبکہ جماعت اہل سنت نے مولانا اکبر فاروقی کے قتل کے خلاف دھرنا دیا۔دونوں کو کراچی میں قتل کیا گیا تھا۔

نومبر میں یوم عاشور کا جلوس راولپنڈی کی سڑک پر جا رہا تھا کہ نامعلوم افراد نے وہاں ڈیوٹی پر معمور پولیس اہلکاروں سے بندوقیں چھین لیں اور ایک مقامی سنی مسجد پر فائرنگ کرنا شروع کر دی۔اس دوران 8افراد ہلاک اور 80 سے زائد زخمی ہو گئے۔اس کشیدگی کے نتیجے میں راجہ بازار میں واقع دوکانات کو آگ لگا دی گئی۔ صورتحال پر قابو پانے کے لیے فوج کو بلانا پڑا تھا۔شہر کے بعض حصوں میں 24 گھنٹے تک کرفیو نافذ رہا۔

17 دسمبر کو مذہبی رہنماؤں اور کارکنوں نے مولانا ناصر عباس ملتانی کے قتل کے خلاف مال روڈ، لاہور پر گورنر ہاؤس کے سامنے 18 گھنٹے تک احتجاجی دھرنا دیے رکھا۔تحریک نفاذ فقہ جعفریہ (ٹی این ایف جے) اور مجلس وحدت المسلمین (ایم ڈبلیو ایم) نے پرامن طریقے سے منتشر ہونے سے قبل اپنے مقتول رہنما کی نماز جنازہ ادا کی۔دھرنے کی بدولت شہر میں ٹریفک رُکی رہی کیونکہ مال سے ملحقہ شہر کی تمام شاہراہیں سارا دن بند رہی تھیں جس کے باعث موٹر سواروں خصوصاً کام کی جگہوں پر جانے والے مسافروں اور طلباء کو انتہائی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔فروری میں کم از کم سات افراد اس وقت زخمی ہو گئے تھے جب لیاقت بازار کوئٹہ میں اے ایس ڈبلیو جے کی ریلی پر مسلح افراد نے فائرنگ کی۔فائرنگ کے فوری بعد، اے ایس ڈبلیو جے کے رہنما اور کارکن سول ہسپتال کوئٹہ پہنچے اور واقعے کے خلاف احتجاجی دھرنا دیا۔اے ایس ڈبلیو جے کے کارکنوں نے جناح روڈ کو بند کر دیا تھا۔

مارچ میں، لاہور میں ایک مسیحی آبادی پر حملے کے خلاف کراچی، لاہور، مظفر گڑھ، گوجرانوالہ، فیصل آباد، ڈیرہ غازی خان، ملتان، وہاڑی اور سکھر سمیت متعدد شہروں میں احتجاجی مظاہرے کئے گئے۔3,000 سے زائد مسلمانوں نے لاہور کے مسیحی علاقہ جوزف کالونی پر دھاوا بول دیا، ان الزامات کے بعد کہ علاقہ کے

ایک مسیحی رہائشی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تضحیک آمیز الفاظ ادا کئے تھے، ہجوم نے 100 سے زائد گھروں کو آگ لگا دی تھی۔ رہائشیوں نے بظاہر پولیس کی ہدایت پر علاقہ چھوڑ دیا تھا جس کے باعث کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔

('فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی' والا باب ملاحظہ کریں)۔

مسیحیوں نے بطور احتجاج تبلیغی سکول بھی بند کر دیئے تھے۔ پاکستان بھر میں احتجاجی مظاہرے کئے گئے اور شمعیں جلائی گئیں یہ مظاہرے پشاور میں واقع گرجا گھر میں خودکش دھماکوں کے باعث 100 سے زائد افراد کے ہلاک ہونے پر کئے گئے تھے۔ مظاہرین نے مسیحیوں کو بہتر تحفظ کا مطالبہ کیا۔

پشاور کے کوہاٹی گیٹ میں واقع تاریخی آل سینٹس چرچ، پر دوپہر کے وقت حملہ کیا گیا۔ دو خودکش بمباروں نے اس وقت خود کو دھماکہ خیز مواد سے اڑا دیا جب اتوار کے روز ہونے والی عبادت میں شریک ہونے والے سینکڑوں افراد گرجا گھر سے باہر نکل رہے تھے۔ سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے حملے کی مذمت کی مگر اس کے باوجود مشتعل ہجوم نے سڑکوں کا رخ کیا اور مذہبی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ریاستی ناکامی کی مذمت کی۔ اسلام آباد، لاہور، کراچی اور پشاور میں حملے کے خلاف احتجاجی مظاہرے کئے گئے جن میں مظاہرین نے حکام سے مطالبہ کیا کہ اقلیتوں کے تحفظ کے لیے مزید اقدامات کئے جائیں۔ 600 سے زائد مظاہرین نے اسلام آباد میں ایک مرکزی شاہراہ کو کئی گھنٹوں تک بند کئے رکھا اور بعدازاں 2000 مظاہرین پارلیمان کے باہر جمع ہوئے۔ پشاور میں مظاہرین نے اس ہسپتال کی کھڑکیاں توڑ دیں جہاں زخمیوں کا علاج معالجہ کیا جا رہا تھا۔

سیاسی احتجاج

جبری گمشدہ افراد کے اہل خانہ نے اکتوبر میں بلوچستان سے اسلام آباد تک 2000 کلومیٹر کا کٹھن احتجاجی مارچ شروع کیا۔ 72 سالہ ریٹائرڈ بینک کلرک، ماما قدیر بلوچ کی سربراہی میں 20 پُرعزم افراد کے گروپ میں 9 نوجوان خواتین اور ایک 11 سالہ لڑکا بھی شامل تھے۔ صعوبت والے سفر کے باوجود، ان کی مہم پر بہت کم لوگوں نے توجہ دی۔ سپریم کوٹ اور ہائی کورٹس نے حکومت کو کئی نوٹس جاری کئے جن میں جبری گمشدہ افراد کی بازیابی اور انہیں عدالتوں میں پیش کرنے کے متعدد احکامات جاری کئے۔

بلوچستان نیشنل فرنٹ (بی این ایف)، قوم پرست جماعتوں اور تنظیموں کے ایک اتحاد کی اپیل پر کوئٹہ اور بلوچ اکثریتی آبادی پر مشتمل دیگر علاقوں میں بلوچستان میں ہونے والے انتخابات کے خلاف ہڑتال کی گئی۔ سکیورٹی خدشات کے باعث بلوچستان میں اخبارات بھی تقسیم نہیں کئے گئے تھے۔ 2013ء کے

طالبان کی جانب سے ہونے والی خونریزی کے خلاف شہری سڑکوں پر نکل آئے

اوائل میں پاکستان عوامی تحریک کے سربراہ مولانا طاہرالقادری نے اسلام آباد میں پی پی پی کی حکومت اور لاہور میں مسلم لیگ (ن) کی موجودہ حکومت کے خلاف شاہراہوں پر احتجاجی مظاہروں کی قیادت کی۔ جنوری میں قادری نے دھمکی دی کہ وہ اپنے ہزاروں حمایتیوں کے ہمراہ وفاقی پارلیمان کے نزدیک اس وقت تک خیمہ زن رہیں گے جب تک حکومت مستعفی نہیں ہوگی۔ بعدازاں طاہرالقادری نے حکومت کے ساتھ معاہدہ طے پاجانے کا اعلان کر کے اپنا چار روزہ احتجاج ختم کیا۔ ڈاکٹر طاہرالقادری اپنے گرم اور بلٹ پروف کنٹینر کے اندر سے خطاب کرتے رہے جب کہ ان کے حواری باہر یخ بستہ سردی میں بارش سے بھیگتے رہے۔

دوسری جانب انسانی حقوق کی تنظیموں، این جی اوز کے کارکنان، مختلف یونیورسٹیوں کے طلبہ، وکلا اور فنکار پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر جمہوریت کی حمایت میں موم بتیاں جلاتے رہے۔ بینر اور پلے کارڈز اٹھائے مظاہرین جمہوریت کے خلاف کسی بھی ممکنہ غیر جمہوری اقدام کے خلاف نعرے لگاتے رہے۔ اس موقع پر سابق صدر سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن عاصمہ جہانگیر، ایچ آر سی پی کے سیکرٹری جنرل آئی اے رحمان اور ڈپٹی سپیکر رانا مشہود احمد نے خطاب کیا۔ پی ٹی آئی نے پنجاب اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں انتخابات میں مبینہ دھاندلی کے خلاف پرامن دھرنے دیے جن میں پی ٹی آئی کے سینکڑوں کارکن شریک ہوئے۔

کراچی کے ایک حلقہ میں انتخابات سے ایک روز قبل پی ٹی آئی سندھ کی نائب صدر زہرہ شاہد کے قتل کے خلاف بھی مظاہرے کیے گئے۔

پنجاب میں ایک نئے سرائیکی صوبے کے قیام کے حق اور مخالفت میں بھی مظاہرے کیے گئے۔

سول سوسائٹی کے کارکنان نے پنجاب کی تقسیم کے لئے بنائے جانے والے پارلیمانی کمیشن کی سفارشات کے نفاذ اور پنجاب کی تقسیم اور نئے صوبے کے قیام کے حق میں مظاہرے کئے۔ 26 جنوری کو پنجاب میں نئے صوبوں کی تشکیل کے لئے قائم پارلیمانی کمیشن نے جنوبی پنجاب میں نئے صوبے کے لئے "بہاولپور جنوبی پنجاب" کا نام تجویز کیا۔ (متحدہ قومی موومنٹ) ایم کیو ایم نے کریک ڈاؤن کے دوران اپنے کارکنوں کی گرفتاری اور منظر امام اور ساجد قریشی سمیت دیگر قانون سازارکان سمیت سیاسی کارکنوں کی ہلاکتوں کے خلاف احتجاج کیا۔ان احتجاجی سرگرمیوں کے دوران شہر میں پٹرول پمپ، دکانوں اور کاروباری دفاتر سمیت تمام سرگرمیاں بند رہیں۔

لاہور میں پی ٹی آئی نے جماعت اسلامی اور عوامی مسلم لیگ نے وفاقی حکومت کے خلاف افراط زر، ڈرون حملوں، توانائی کے بحران اور دیگر مسائل پر احتجاجی مظاہرے کئے۔

سندھ میں متنازعہ قانون کے تحت مقامی حکومتوں کے انتخابات کرانے کے منصوبے پر ایم کیو ایم نے صوبائی حکومت کے خلاف احتجاج کیا۔

جئے سندھ قومی محاذ (جسقم) کے اعلان پر سندھ میں کراچی سمیت بیشتر اضلاع میں 3 ستمبر کو مکمل یا جزوی ہڑتال رہی۔ جسقم نے یہ ہڑتال اپنے سربراہ بشیر قریشی کے خلاف مبینہ طور پر سندھ حکومت کی جعلی رپورٹ کے خلاف کی۔

جون میں کوئٹہ کے جنوب میں 80 کلومیٹر دور قائم زیارت ریذیڈنسی پر حملہ کے خلاف پاکستان بھر کے لوگوں نے احتجاج کیا۔اس عمارت میں پاکستان کے بانی محمد علی جناح نے اپنے آخری ایام گزارے تھے،اور اسے ان کی وفات کے بعد قومی یادگار قرار دے دیا گیا تھا۔

ستمبر میں روات اور اس کے گردونواح میں بازاری نرخ سے کم شرح پر مجوزہ اکنامک زون کے قیام کے لئے حکومت کی جانب سے زمین حاصل کرنے کے خلاف سیکڑوں دیہاتیوں نے اسلام آباد ہائی وے بند رکھی۔احتجاج سے ہائی وے کئی گھنٹے تک آمدورفت کے لئے بند رہی جس سے پیدل اور موٹر سائیکل سواروں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ان میں سے متعدد افراد کو شدید دھوپ میں کئی گھنٹے کھڑے رہنا پڑا۔اس کثیر المقاصد کاروباری زون میں مارگلہ کی پہاڑیوں سے پرے جڑواں دارالحکومت، ہوائی اڈے اور اسلام آباد ہائی وے کے اطراف میں کثیر منزلہ عمارتوں کے قیام کے منصوبے شامل تھے جن کی قدر ایک اعشاریہ تین کھرب (12 ارب ڈالرز) کے لگ بھگ تھی۔

قیمتوں میں اضافہ اور سرکاری ریلوے کی نجکاری کے خلاف بھی احتجاجی مظاہرے کئے گئے۔

ڈرون حملوں کے خلاف مظاہرے

دسمبر میں خیبر پختونخوا اور شمال مغربی قبائلی علاقوں میں ڈرون حملوں کے خلاف ہزاروں افراد نے لاہور میں سڑکوں پر احتجاج کیا۔ چالیس کے قریب مذہبی اور سیاسی جماعتوں پر مشتمل دفاع پاکستان کونسل یا ڈیفنس آف پاکستان کونسل کے زیر اہتمام مظاہرے میں پانچ ہزار کے قریب افراد شریک ہوئے۔ جنہوں نے امریکہ کے خلاف نعرے بازی کی اور ڈرون حملوں کے فوری خاتمے کا مطالبہ کیا۔ (امن وامان کا باب بھی ملاحظہ کریں)۔

نومبر میں پی ٹی آئی نے پاکستانی سرزمین پر ڈرون حملے رکوانے کے لئے نیٹو سپلائی روک کر احتجاجی تحریک کا آغاز کیا۔ نیٹو سپلائی خیبر پختونخوا سے گزرتی ہے جہاں پی ٹی آئی کی جماعت اسلامی کے ساتھ مخلوط حکومت ہے۔ وزیراعظم نے اس اقدام پر تنقید کی اور کہا کہ سپلائی روکنا صرف وفاقی حکومت کا استحقاق ہے، لیکن پی ٹی آئی کے سربراہ نے خیبر پختونخواہ میں ڈرون مخالف جذبات ابھارنے کے لئے اپنی سیاسی حیثیت کا استعمال کیا۔ پارٹی کارکنان نے صوبہ بھر میں مختلف شاہراہوں پر نیٹو سازوسامان سے لدے ٹرکوں کی نشاندہی کے لئے 24 گھنٹے نگرانی کرنے والی چوکیاں قائم کیں۔ افغانستان سے سامان لانے اور لے جانے والے ڈرائیوروں کے تحفظ کے لئے امریکہ اور نیٹو حکام نے اس راستے کا استعمال روک دیا۔ انہوں نے جنوبی پاکستان یا شمالی افغانستان اور ازبکستان میں اپنا سازوسامان منتقل کرنا شروع کردیا۔

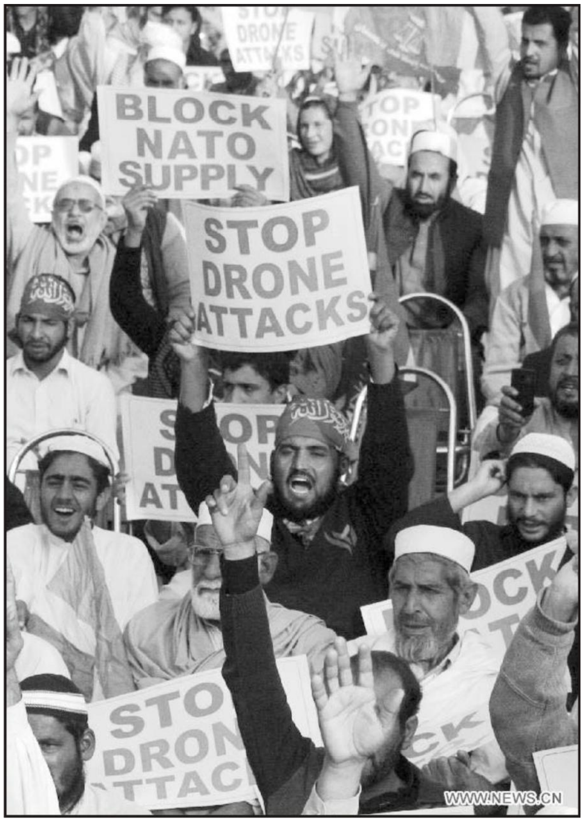

شمال مغرب میں ڈرون حملوں کے خلاف مظاہرہ

سرکاری ملازمین کے احتجاجی مظاہرے

17 ستمبر کو کوئٹہ سے اغوا ہونے والے ماہر امراض قلب مناف ترین کی فوری بازیابی کے لئے سرکاری ہسپتالوں کے ڈاکٹروں نے کام کرنے سے احتجاجاً انکار کر دیا جس سے بلوچستان میں صحت کے مسائل سنگین ہو گئے۔ ڈاکٹر 49 روز سے احتجاج پر تھے اور صبح گیارہ بجے کے بعد او پی ڈی نہیں جاتے تھے لیکن پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے باعث ان کا احتجاج شدت اختیار کر گیا۔ بعض ڈاکٹروں نے علامتی بھوک ہڑتال بھی کی۔ ڈاکٹر ترین بلوچستان سے بھتہ کے لئے اغوا کئے جانے والے چھبیسویں ڈاکٹر تھے۔ اب تک امن وامان کی خراب صورت حال کے باعث 80 ڈاکٹر بلوچستان چھوڑ کر جا چکے ہیں اور 20 کے قریب قتل کئے جا چکے ہیں، جن میں سے کئی کی لاپتہ رہنے کے بعد گولیوں سے مسخ لاشیں بازیاب ہوئیں۔

پنجاب کے سرکاری ہسپتالوں میں تعینات ینگ ڈاکٹر بہتر معاوضے اور سہولیات کے لئے کئی روز ہڑتال پر رہے جنہیں دیگر صوبوں کے ڈاکٹروں کی حمایت بھی حاصل رہی۔ نجی علاج گاہوں تک دسترس نہ رکھنے کے باعث غریب مریضوں کو اس ہڑتال نے بری طرح متاثر کیا۔ لیڈی ہیلتھ ورکرز نے مستقل کئے جانے اور واجبات کی ادائیگی کے لئے پنجاب اسمبلی کے سامنے مال روڈ کو بند رکھا جس سے آمدورفت کا سلسلہ کئی گھنٹے تک منقطع رہا۔

مارچ میں سندھ ایجوکیشن فاونڈیشن کے زیرانتظام لرننگ ایجوکیشن پروگرام کے تحت پڑھنے والے

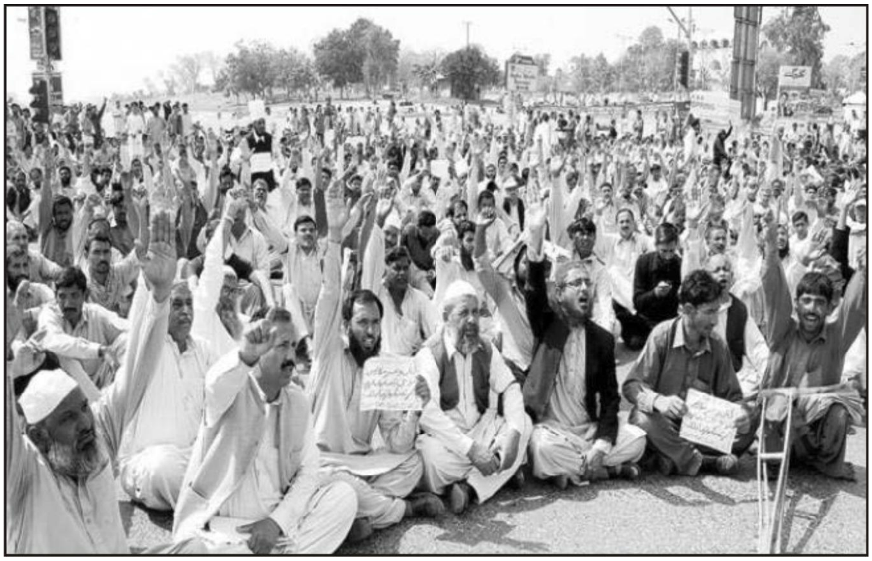

اساتذہ کو اپنے مطالبات منوانے کے لیے دھرنوں کا راستہ اختیار کرنا پڑا

سینکڑوں طلبہ اپنے اساتذہ سمیت سکولوں کی بندش کے خلاف کراچی پریس کلب کے سامنے احتجاج کے لئے جمع ہوئے۔ اس پروگرام کا آغاز 2009 میں کیا گیا تھا جس کے تحت سندھ بھر کے نئے بننے والے تعلیمی اداروں کو 5 سے 18 سال کی عمر کے ہر طالب علم کے لئے 250 تا 300 روپے ادا کئے جا رہے تھے۔

جون میں پنجاب اسمبلی کے باہر کلرکوں اور اساتذہ نے تنخواہوں میں اضافہ کے لئے مظاہرہ کیا۔

جنسی تشدد کے خلاف احتجاج

لاہور میں پانچ سالہ بچی سے اجتماعی زیادتی کے واقعہ کے خلاف ملک بھر میں جنسی تشدد کا شکار افراد اور بچوں کے تحفظ کے لئے احتجاجی مظاہرے کئے گئے۔

وکلاء کے خلاف احتجاجی مظاہرے

نومبر میں، وکلاء نے عدالتی کارروائیوں کا بائیکاٹ کرتے ہوئے ریلیوں کا انعقاد کیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ پنجاب کی پانچ ڈویژنوں میں ہائی کورٹ بینچ قائم کئے جائیں۔

صحافیوں کے احتجاج

صحافی 2013ء میں اپنے دس ہم کار ساتھیوں کے قتل، قتل کی دھمکیوں، برطرفیوں اور میڈیا ہاؤسز پر حملوں کے خلاف اور اجرتی بورڈ ایوارڈ کے نفاذ کے لیے سارا سال سڑکوں پر سراپا احتجاج رہے۔

کسانوں کے احتجاج

اپریل میں 3000 سے زائد چھوٹے کاشتکار اور حصہ دار ہاری نے لطیف آباد میں نذیر فلائی اوور کے قریب اور حیدرآباد میں ریلوے کی پٹڑی پر دھرنا دے کر ریلوے ٹریفک میں تعطل کا سبب بنے رہے۔ یہ کاشتکار پانی میں اپنے حصے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

بین الاقوامی معاملات

پاکستانی دوسرے ممالک میں ہونے والے واقعات پر بھی اپنے غم وغصہ کا اظہار کرنے کے لیے سڑکوں پر آتے رہے۔ فروری میں پاکستان کے مختلف علاقوں کے اندر بھارت میں کشمیری کارکن افضل گورو کو پھانسی دیے جانے پر مظاہرے کئے گئے۔ افضل گورو جو ایک وقت میں پھلوں کا تاجر رہا تھا، کو 2001ء میں بھارتی پارلیمان پر قاتلانہ حملے میں شریک ہونے کا مجرم ٹھہرائے جانے کے بعد نئی دہلی کی تہاڑ جیل میں پھانسی

پر لٹکایا گیا تھا۔

14 اگست کو مصر میں ایک ہی دن میں (فوجی حکومت کے) تشدد کریک ڈاؤن کے نتیجے میں 600 سے زائد افراد کی ہلاکت کے خلاف کئی شہروں میں ریلیاں نکالی گئیں۔ مصر میں نشانہ بننے والے لوگ اخوان المسلمون کے صدر محمد مرسی کی حمایت میں باہر آئے تھے۔

ستمبر میں دائیں اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے سیاسی کارکنوں، طلبہ، ٹریڈ یونینسٹوں اور شہریوں نے مذمتی اور احتجاجی مظاہرے کئے، ان کا موقف تھا کہ امریکہ شام پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لوگوں نے شام میں مقدس مقامات کی بے حرمتی کے خلاف بھی کراچی، اسلام آباد اور کوئٹہ میں احتجاجی مظاہرے کئے۔ مظاہرین نے اسرائیل اور امریکہ کے خلاف نعرے لگائے، ان کا کہنا تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مخاصمت کے بیج بو رہے ہیں۔

دسمبر میں، بنگلہ دیش کی جماعت اسلامی کے رہنما عبدالقادر ملا کو جنگی جرائم کی پاداش میں پھانسی دیئے جانے پر عوام میں غم وغصہ کی شدید لہر دوڑ گئی۔ بہت سے لوگوں نے ملک بھر میں مشتعل احتجاجی مظاہرے کئے اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ معاملہ کو اقوام متحدہ میں لے جایا جائے۔ یہ مظاہرے تمام بڑے شہروں میں کئے گئے تھے۔

تشدد

سڑکوں پر ٹائر جلانے کے علاوہ ہنگامہ آرائی کرنے والوں نے یوٹیلیٹی مراکز، قانون نافذ کرنے والے اداروں، بنکوں اور دکانوں پر حملے کئے۔ شمال مغربی صوبے خیبر پختونخوا کے ضلع بنوں میں اس وقت ہنگامے پھوٹے پڑے جب حکام نے بجلی کے بلوں کی عدم ادائیگی پر بجلی کی ترسیل منقطع کردی۔ فیصل آباد کے قریب کھڑریانوالہ اور بلوچنی کے علاقوں کے 52 دیہاتوں سے آئے مظاہرین نے پتھراؤ کر کے پانچ پولیس اہلکاروں کو زخمی کر دیا۔ وہ ایک نجی ایجنسی کی طرف سے توانائی کی ترسیل بند ہونے کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ پولیس نے جوابی لاٹھی چارج کر کے سینکڑوں دیہاتیوں کو زخمی کر دیا۔ پولیس نے ان دیہاتیوں کا پیچھا کیا اور چند گھروں میں گھس کر مبینہ طور پر بچوں اور خواتین پر تشدد کیا۔ بے قابو ہجوم نے لاہور روڈ پر متعدد دکانوں کو لوٹا۔ پولیس نے درجنوں مظاہرین کو گرفتار بھی کیا۔

کراچی، عباس ٹاؤن میں بم حملوں کے بعد مختلف علاقوں میں دو ایمبولینسوں سمیت آٹھ مسافر بسوں کو روک کر تشدد کیا گیا، زیادہ تر واقعات کی اطلاعات کراچی کے علاقہ سہراب گوٹھ سے موصول ہوئیں۔ ان میں سے بعض عباس ٹاؤن کے مقتولین کے نماز جنازہ کے شرکاء تھے جنہوں نے قبرستان پہنچتے ہی

مشتعل ہوکر کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میں بسوں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ فائرنگ کے نتیجے میں عباس ٹاؤن میں متعدد افراد زخمی ہو گئے۔ پولیس نے بھی دعویٰ کیا کہ اس فائرنگ کے نتیجے میں ان کے متعدد اہلکار بھی زخمی ہوئے جو کہ ہسپتال میں ہیں۔ ایک علاقے میں پولیس اہلکاروں کو اغواء کرنے کی ناکام کوشش کی اطلاع بھی موصول ہوئی۔ علاقے میں تعینات کی گئی ریسکیو ٹیموں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ انچولی اور انڈس پلازا سے فائرنگ ہونے کی اطلاعات بھی موصول ہوئیں۔

لاہور میں اہلسنت والجماعت کے رہنما شمس الرحمان معاویہ کے قتل کے خلاف احتجاج میں چند مشتعل نوجوانوں نے اپنی بے چینی کا اظہار گاڑیوں کو نقصان پہنچا کر کیا۔ انہوں نے نعرے لگائے اور سڑکوں کو بلاک کر کے ٹائر جلائے۔

دسمبر میں لیاقت بازار کوئٹہ میں اس وقت کم از کم ایک شخص ہلاک اور ایک زخمی ہو گیا جب ایک مذہبی تنظیم نے تاجروں اور دکانداروں کو احتجاجاً دکانیں بند کرنے پر مجبور کرتے ہوئے فائر کھول دیا۔ احتجاج شروع ہونے کے ایک گھنٹے کے بعد ہی کوئٹہ سنسان نظر آنے لگا جب تمام دکانوں، ہوٹلوں اور تجارتی مراکز کو بند کیے جانے پر مجبور کیا گیا۔

جوزف کالونی کے کچھ متاثرین نے لاہور، فیروز پور روڈ پر واقع میٹرو بس کے دفتر میں گھس کر املاک کو نقصان پہنچایا۔ پولیس نے مزید نقصان سے بچنے اور مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس کا استعمال کیا۔

ملتان میں اس وقت ایک لڑکا ہلاک اور ایک بچہ زخمی ہو گئے جب لوگ نئے صوبے کے قیام کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ اس امر کا پتہ نہیں چلایا جا سکا کہ جانی نقصان کا سبب بننے والی گولیاں کس نے چلائی تھیں۔

اگست میں اس وقت صحافی سراپا احتجاج بن گئے جب پاکستان تحریک انصاف کے کارکنوں کے ساتھ کشیدگی پیدا ہونے کے بعد لاہور میں کیمرا مین زخمی ہو گیا۔ تحریک انصاف 22 اگست کو ہونے والے ضمنی انتخابات میں ہونے والی مبینہ دھاندلی کے خلاف احتجاج کرتی رہی ہے۔ صحافی برادری کے احتجاج کے بعد تحریک انصاف پنجاب کے صدر نے معذرتی بیان جاری کیا اور واقعہ کی ذاتی طور پر تفتیش کی یقین دہانی کروائی۔

17 جنوری کو پولیس نے 12 طلبہ کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس اور لاٹھی چارج کا استعمال کیا اور ہوائی فائرنگ کی۔ یہ طلبہ اپنی تحصیل کے پر امن قبائلیوں کے خلاف کریک ڈاؤن میں ہلاک ہونے والے 15 افراد کی نعشوں کو گورنر ہاؤس پشاور کے سامنے رکھ کر احتجاج کر رہے تھے۔ پولیس کے مطابق اس

کارروائی میں 18 مظاہرین کو گرفتار کیا گیا۔ متعدد زخمی صحافتی کارکن بھی اس کارروائی کی کوریج کرتے ہوئے زخمی ہوئے۔

فروری میں، ینگ ڈاکٹرز نے لاہور میٹرو بس سروس کی افتتاحی تقریب میں وزیراعلیٰ پنجاب سے ملاقات نہ ہوسکنے پر ہنگامہ کھڑا کردیا۔ ینگ ڈاکٹرز اپنے مطالبات منوانے کے لیے ایک عرصہ سے بھوک ہڑتال پر تھے۔ پولیس نے احتجاجی مظاہرہ کے خلاف کریک ڈاؤن کرکے کچھ ڈاکٹروں کو گرفتار کیا اور انہیں گھسیٹتے ہوئے پولیس کی گاڑیوں میں ڈال کر لے گئے۔ پولیس نے رکن پارلیمنٹ شوکت بسرا پر بھی لاٹھی چارج کیا جو احتجاج میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔ پولیس نے بسرا پر ڈاکٹروں کو بھڑکانے کا الزام عائد کیا۔

3 دسمبر کو اسلام آباد میں سرکاری طور پر چلائے جانے والے 'ماڈل' کالجز کے اساتذہ نے 40,000 طلبہ کے مڈٹرم امتحانات روک لئے، انہوں نے یہ احتجاج الاؤنس اور نوکریوں میں تحفظ کے مطالبات منوانے کے لیے کیا تھا۔ مرد اساتذہ نے چار ماڈل کالجز میں ہنگامہ کھڑا کردیا تھا جہاں پرنسپل نے طالبات سے امتحانی پرچے چھین کر امتحان ملتوی کردیا۔ شام تک احتجاج کرنے والوں کو کامیابی ہوگئی۔ کیپٹل ایڈمنسٹریشن اینڈ ڈویلپمنٹ ڈویژن (CADD) اور ایف ڈی ای (FDE) کے اعلیٰ سطحی افسران کے ساتھ ایک اجلاس میں اساتذہ کے تمام مطالبات کو تسلیم کرنے کا تحریری وعدہ کیا گیا۔

پابندیاں

راولپنڈی انتظامیہ نے پاکستان عوامی تحریک کے طاہر القادری کی قیادت میں ہونے والے لانگ مارچ کو روکنے کے لیے دو دن (جنوری 16,15) کے لیے دفعہ 144 کا نفاذ کردیا۔

سندھ کی نگران حکومت نے انتخابات کے بعد پورے صوبے میں مظاہرے اور عوامی اجتماعات پر پابندی عائد کردی۔ مشاہدہ کاروں کا کہنا ہے کہ اس اقدام کا مقصد (11 مئی کی مبینہ دھاندلی کے خلاف) ان دھرنوں اور احتجاجی مظاہروں کا مقابلہ کرنا تھا جن کا رجحان کراچی سے نکل کر دوسرے شہروں میں پھیل چکا تھا۔ سیاسی جماعتوں نے نگران حکومت کی اس پابندی کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا، اور احتجاجی مظاہروں اور دھرنوں کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ انسانی حقوق کے کارکنوں اور قانونی ماہرین نے حکومت کے اس موقف کو مسترد کردیا کہ یہ پابندی لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے لگائی گئی تھی۔

یہ سرکاری اقدام ایچ آر سی پی کی چیئرمین کے لیے بھی حیرانی کا باعث تھا، جنہوں نے کہا: ''ہم شدت سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ریلیوں اور احتجاجی مظاہروں پر پابندی لگانا منصفانہ قدم نہیں ہے اور جمہوری اقدار کی روح کے خلاف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرا خیال ہے کہ سیاسی جماعتوں کو اب اس سے آگے

بڑھنا چاہیئے، جبکہ الیکشن کمیشن آف پاکستان نے پہلے ہی نوٹس لے کر حلقہ این۔اے 250 کے متعدد پولنگ سٹیشنز کے انتخابات کی کالعدمی کے احکامات جاری کردیئے ہیں لہذا کسی کو بھی اس حد تک نہیں جانا چاہیئے جس سے جمہوری عمل پر منفی اثرات مرتب ہوں اور جس سے پوری کارروائی میں کوئی رخنہ پڑے''۔

ہنگو میں، ضلعی حکومت نے دفعہ 144 نافذ کرتے ہوئے موٹر سائیکل پر تین افراد کی سواری اور اسلحے کی نمائش پر پابندی عائد کردی۔اس کے ساتھ ساتھ سکیورٹی اشخاص اور پیراملٹری فورسز کے دستے تعینات کیئے گیئے۔

جولائی میں سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے قومی ورثہ و یکجہتی نے سفارشات پیش کیں کہ قائداعظم محمد علی جناح کے مزار کے سامنے کے عوامی مقامات کے تحفظ کے لیے عوامی تجاویز حاصل کی جائیں۔کمیٹی نے زور دیا کہ ایسا قابل عمل طریقہ کار تشکیل دیا جائے جس سے کراچی میں مزار قائد کے احاطے میں عوامی اجتماعات اور ریلیوں پر پابندی عائد کی جاسکے۔

سفارشات

1۔ مذہبی اور مسلکی اقلیتوں کے اجتماعات کو تحفظ فراہم کرنے میں ریاست کی ناکامی، ان کی آزادئ اجتماع کو سلب کرنے کے مترادف ہے۔فساد پیدا کرنے والوں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے اور مذہبی و مسلکی رواداری میں بہتری لانے کے لیے مختلف مذہبی برادریوں اور رہنماؤں اور سول سوسائٹی کے تعاون سے ان اجتماعات کی حفاظت کو یقینی بنانے والی کثیر جہتی سوچ کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

2۔ حکومت کو چاہیئے کہ سیاسی جماعتوں کے اجتماعات کو دہشت گرد حملوں سے حفاظت فراہم کرنا اپنی پہلی ترجیح بنائے۔دوسری صورت میں ملک کے ایک بڑے حصے میں جمہوری حقوق کی فراہمی اور سیاسی سرگرمیاں شدید متاثر ہوں گی۔آتش گیر اسلحہ اور دھماکہ خیز مواد تک آسان رسائی کو روکنا بھی لازمی ہے۔

3۔ اجتماعات پر دفعہ 144 کے ضرورت سے زیادہ نفاذ سے گریز کیا جانا چاہیئے۔پرامن اجتماع کے حق میں رکاوٹ صرف ایسے شاذ و نادر مواقع پر ہی ڈالی جانی چاہیئے جب مفاد عامہ کو گزند پہنچنے کا ثبوت دیا جاسکے۔

4۔ پولیس اور ہجوم کو قابو کرنے والے دیگر اداروں کو ایسے مواقع کے لیے خصوصی تربیت دلوائی جانی

چاہئے تاکہ وہ طاقت کے غیر ضروری استعمال سے باز رہیں۔انہیں اس امر کا بھی اعادہ کروایا جانا چاہئے کہ شہریوں کی جانب سے پُرامن اجتماع کے حق کے ناجائز استعمال سے وہ تحمل کرنے کے فریضے سے بری الذمہ نہیں ہوجاتے اور ممکنہ حد تک طاقت کا کم استعمال کیا کریں۔

5۔ 2013ء میں ہونے والے بڑے پیمانے کے مظاہرے،اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ ارباب اختیار کی توجہ نہ حاصل کرنے پر لوگوں میں کس قدر بے چینی پائی جاتی ہے جبکہ پرامن اجتماع کے حق کی فراہمی کے ذریعے حکومت عوام کو اس بات کی یقین دہانی کرائے کہ اس سے قبل کہ وہ سڑکوں کا رُخ کریں اُن کے مطالبات پر توجہ دی جائے گی۔

انجمن سازی کی آزادی

ہر شہری کو تنظیم سازی اور یونین سازی کا حق حاصل ہوگا، بشرطیکہ اس سلسلے میں پاکستان کے اقتدار اعلیٰ، ملک کی سالمیت، امن عامہ یا اخلاق کے مفاد میں قانون کے تحت کوئی معقول پابندی عائد نہ کی گئی ہو۔ آئین پاکستان [آرٹیکل - 17]

ہر شخص کو پرامن اجتماع کرنے اور تنظیم بنانے کی آزادی ہے۔ کسی شخص کو کسی تنظیم میں شامل ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا جانا چاہیے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 2,1-20]

انجمن سازی کی آزادی ایک ایسا بنیادی انسانی حق ہے جو ثقافت کے تحفظ، رواداری کے بڑھاوے، جامع اور تکثیری معاشرے کی تشکیل کے لیے بے حد ضروری ہے۔ چونکہ اس حق کے ذریعے بہتر ماحول پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی، معاشی اور ثقافتی مظاہر کو تحفظ مہیا کیا جا سکتا ہے تاہم اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ اجتماعی حقوق کا دفاع کیا جائے اور اقلیتوں کی آزادی کو تحفظ مہیا کیا جائے۔ انجمن سازی کی آزادی، فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی اور آزادئ اظہار کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یہ شفاف ٹرائل کے حق، حق زندگی، قانون کی حکمرانی، اذیت رسانی سے تحفظ کے حق اور کسی انجمن میں شریک نہ ہونے کے حق کے ساتھ بھی جڑی ہوئی ہے۔

انجمن سازی کی آزادی پر کسی بھی قسم کی پابندی لگاتے وقت تکثیریت اور رواداری کے اصولوں کا احترام کیا جائے اور خواتین، مردوں، نوجوانوں، معذور افراد، اقلیتی گروہوں سے تعلق رکھنے والے افراد، غیر مقبول یا متنازعہ آراء رکھنے والے افراد یا خطرات میں گھرے دیگر گروہوں پر اس حق کا اطلاق مساوی طور پر ہونا چاہئے۔ بدقسمتی سے، پاکستان میں 2013ء کے دوران اس بنیادی انسانی حق کی متعدد خلاف ورزیاں دیکھنے میں آئیں۔ بعض سیاسی جماعتوں، انسانی حقوق کی تنظیموں، خصوصاً خواتین اور مذہبی اقلیتوں کے لیے کام

کرنے والی تنظیموں اور خودمختار ٹریڈ یونینوں کو امتیازی سلوک، دھمکیوں یا تشدد، خوف وہراس، ایذا رسانی، دہشت یا انتقامی کارروائیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) پر حملے کئے گئے۔ ٹریڈ یونین رہنماؤں اور مزدوروں کو دھمکیاں دی گئیں اور سیاسی کارکنوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

سیاسی جماعتیں

تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) نے 11 مئی کے عموی انتخاب سے قبل اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی 'سیکولر' جماعتوں عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) اور پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) کو خاص طور پر نشانہ بنایا جائے گا۔ ٹی ٹی پی نے مزید کہا کہ انہیں دیگر جماعتوں سے بھی اچھے کی توقع نہیں ہے۔ نشانہ نہ بنائی جانے والی جماعتیں بھی ڈر کی وجہ سے اپنے حریفوں پر ہونے والے حملوں پر خاموش رہیں۔

انتخابی مہم کے دوران اے این پی کو کم از کم چھ بڑے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ 16 اپریل کو ایک خود کش بمبار نے پشاور میں ایک انتخابی جلسے کے باہر خود کو بم دھماکے سے اڑا کر اے۔ این۔ پی کے 16 کارکنوں کو ہلاک کر دیا۔ اے این پی کے سینئر رہنما غلام احمد بلور حملے میں معمولی طور پر زخمی ہوئے۔ حملے کا ہدف اُن کا بھتیجا ہارون بلور تھا۔ جس کے والد اے این پی کے صوبائی وزیر تھے جنہیں دسمبر 2012ء میں قتل کیا گیا تھا۔

فاٹا کے رہائشیوں نے 2013ء میں جماعتی انتخابات کا پہلی بار ذائقہ چکھا

سکیورٹی خدشات کے باعث، تین سیاسی جماعتیں انتخابی مہم کے دوران بڑے جلسوں کا انعقاد نہیں کر سکی تھیں۔ پاکستان کی سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے بیٹے بلاول بھٹو زرداری جو پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرپرسن ہیں، سکیورٹی خدشات کے باعث عوام میں نہ آئے۔اور انتخابی جلسوں میں ویڈیو ٹیپ کے ذریعے ان کی ریکارڈ شدہ تقریر نشر کی جاتی رہی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو گزشتہ انتخابات کے دوران 2007ء میں راولپنڈی میں اس وقت گولی اور بم حملے کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا گیا تھا جب وہ انتخابی مہم کے سلسلے میں منعقدہ جلسہء عام سے خطاب کرنے کے بعد واپس جا رہی تھیں۔

- 31 مارچ کو ضلع بنوں، کے پی کی صوبائی اسمبلی کی نشست کے انتخابی امیدوار عدنان وزیر کے قافلے کو ایک سڑک کنارے نصب بم کا نشانہ بنایا گیا۔ اس بم دھماکے کے نتیجے میں زخمی ہونے والے چھ افراد میں عدنان وزیر بھی شامل تھے۔ ٹی ٹی پی نے حملے کی ذمہ داری قبول کی جو اے این پی کے دو کارکنوں کی ہلاکت کا سبب بنا تھا۔
- 10 اپریل کو سندھ کے شہر حیدر آباد میں پارٹی کے امیدوار فخر الاسلام کو ہلاک کر دیا گیا۔ طالبان نے اس حادثہ کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ اس سے اگلے دن ایک اور امیدوار، ایس ایم شیراز کو کراچی میں ہلاک کر دیا گیا۔
- 12 اپریل کو پشاور میں قومی اسمبلی کے حلقہ نمبر 4 سے اے این پی کے امیدوار ارباب ایوب جان اور ان کے بیٹے ارباب عثمان کو جو خیبر پختونخوا (کے پی) کی صوبائی اسمبلی کی نشست کے امیدوار تھے، ان کے گھر کے قریب بم دھماکے کا نشانہ بنایا گیا مگر وہ محفوظ رہے۔
- اُسی دن، جنگجوؤں نے خیبر پختونخوا سے قومی اسمبلی کی نشست کے ایک اور امیدوار مناف آفریدی کے گھر پر دستی بم پھینکے۔ تاہم کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔
- 15 اپریل کو خضدار، بلوچستان سے مسلم لیگ (ن) کے امیدوار ثناء اللہ زہری کو بم دھماکے کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں زہری کے بیٹے، بھائی اور بھتیجے سمیت 4 افراد ہلاک ہوئے۔ اس دھماکے میں کم از کم 25 افراد زخمی ہو گئے تھے۔
- 21 اپریل کو تربت، بلوچستان میں نیشنل پارٹی کے سربراہ ڈاکٹر مالک کے گھر پر حملہ کیا گیا۔
- 21 اپریل کو پشین، بلوچستان میں ایک انتخابی جلسے پر حملہ کر کے اے این پی کے دو کارکنوں کو ہلاک کر دیا گیا۔
- 22 اپریل کو صوابی میں اے این پی کے دفتر پر دستی بم سے حملہ کیا گیا جس کے باعث دو افراد زخمی ہوئے۔

- 25 اپریل کو نصرت بھٹو کالونی، کراچی میں ایم کیو ایم کے دفتر میں بم دھماکہ کیا گیا جس کے نتیجے میں کم از کم پانچ افراد ہلاک اور 10 سے زائد زخمی ہو گئے۔ شمالی ناظم آباد میں پیپلز چورنگی کے نزدیک ایم کیو ایم کے انتخابی کیمپ میں بم دھماکہ ہوا جس کے باعث 5 افراد ہلاک اور 15 زخمی ہو گئے۔
- 26 اپریل کو کراچی میں اے این پی کے امیدوار بشیر جان کے انتخابی جلسے کو بم دھماکے کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں 11 افراد ہلاک اور 50 سے زائد زخمی ہو گئے۔
- 27 اپریل کو کراچی کے علاقے لیاری کے مضافات میں پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) کی ایک کارنر میٹنگ کو نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں ایک خاتون سمیت کم از کم تین افراد ہلاک اور تقریباً 20 زخمی ہو گئے۔ پی ایس۔11 سے پی پی پی کے امیدوار عدنان بلوچ بھی زخمیوں میں شامل تھے۔
- اُسی دن شہر کے علاقہ اورنگی ٹاؤن میں ایم کیو ایم کے انتخابی دفتر کو دو مختلف بم دھماکوں کا نشانہ بنایا گیا جن میں دو افراد ہلاک اور 25 زخمی ہو گئے۔

این جی اوز پر حملے

انجمن سازی کی آزادی کے ذریعے سول سوسائٹی کی تنظیمیں معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کے بتدریج حصول میں کردار ادا کر سکتی ہیں۔ مگر ان کی آزادی کو محدود کرنے اور اس کی پامالی کے لیے استعمال کئے جانے والے حربوں کا بنیادی سبب غیر سرکاری شعبے اور سول سوسائٹی تنظیموں پر کیا جانے والا شک وشبہ ہے۔ انہیں حکومت کی جانب سے شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور غیر ریاستی عناصر کے حملوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

این جی اوز کے ملازمین اور سول سوسائٹی کے کارکنوں پر حملے

این جی اوز، سول سوسائٹی اور امدادی تنظیموں کے ملازمین اور کارکنوں پر متعدد حملوں کا سبب نشانہ بننے والوں کی ان اداروں کے ساتھ وابستگی سمجھا گیا ہے۔ امدادی امور کی رابطہ سازی کے لیے قائم یونائٹڈ نیشنز آفس فار دی کوآرڈی نیشن آف ہیومینی ٹیرین افیرز (اوچا) کے مطابق جنوری 2013ء سے نومبر تک 20 خواتین سمیت 91 امدادی کارکنوں پر حملہ کیا گیا۔ تقریباً 29 امدادی کارکنوں کو ہلاک، 41 کو زخمی اور 21 کو اغواء کیا گیا۔ خیبر پختونخوا سب سے زیادہ خطرناک علاقہ تھا جہاں 37 ملازمین پر حملہ کیا گیا۔

پولیو ورکرز اور ان کی حفاظت پر مامور پولیس اہلکاروں کو سب سے زیادہ نشانہ بنایا گیا۔ ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق، 2013ء میں ویکسینیشن ٹیموں پر حملوں کے نتیجے میں 20 پولیو ورکرز اور 9 پولیس اہلکار ہلاک ہوئے۔ (امن امان کا باب ملاحظہ کریں) 5 جنوری کو، شمال مغربی شہر چارسدہ میں

سول سوسائٹی اور حقوق کے تحفظ کے سرگرم ارکان کو متعدد خطرات کا سامنا رہا

الخدمت فاؤنڈیشن نامی این جی او کے دو امدادی ورکرز کو ہلاک کیا گیا

31 جنوری کو، 'ہینڈز' نامی این جی او کے چار مرد کمیونٹی ورکرز کو کراچی کے مضافات سے اغواء کیا گیا۔ یہ تنظیم محروم اور پسماندہ علاقوں کے رہائشیوں کو صحت، تعلیم، امداد اور دیگر ترقیاتی خدمات فراہم کر رہی تھی۔ معروف سماجی ورکر اور اورنگی پائلٹ پراجیکٹ (او پی پی) کی ڈائریکٹر پروین رحمان پر 13 جنوری کو کراچی میں ہدف بنا کر حملہ کیا گیا جس میں وہ جاں بحق ہوگئیں۔ او پی پی شراکتی اور نچلے سطح کے ترقیاتی اقدامات کے لیے ایک ماڈل بن چکا تھا۔ انہیں کراچی کے اردگرد واقع دیہاتوں میں زمین پر قبضہ گیری کو قلمبند کرنے اور قبضے کے نتیجے میں زمین سے محروم ہونے والوں کی معاونت کرنے پر قبضہ گروپوں کی طرف سے قتل کی دھمکیوں کا سامنا تھا۔ 4 اکتوبر کو نامعلوم مسلح افراد نے کوئٹہ میں ایک این جی او کے ڈائریکٹر نور محمد کو اغواء کیا۔ امدادی کارکنوں نے ستمبر میں بلوچستان میں آنے والے زلزلے کے بعد پیدا ہونے والی انسانی ضروریات پر توجہ دی تو ان کی گاڑیوں کو اندھا دھند فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا اور انہیں اپنی نقل و حمل اور امدادی کام پر سرکاری پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

آئی آر آئی این کے مطابق ملک میں 16 لاکھ لوگوں کو انتہائی سنگین صورتحال کا سامنا تھا۔ 15 لاکھ افراد اس برس مون سون کے سیلاب سے متاثر ہوئے، تقریباً 10 لاکھ افراد اندرون ملک نقل مکانی پر مجبور ہوئے اور 5 سال سے کم عمر کے 15 فیصد بچے شدید غذائی کمی کا شکار ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود، سکیورٹی

خطرات اور غیر ضروری کاغذی کارروائی کے باعث امدادی این جی اوز کے لیے امداد کی فراہمی ایک مشکل مرحلہ رہا۔

شعبہ صحت میں کام کرنے والوں کو خاص طور پر خطرات کا سامنا رہا۔ صحت سے متعلق کام سے وابستہ افراد کو درپیش دھمکیوں کی نشاندہی نومبر 2011ء میں اچھی طرح ہوگئی تھی جب پاکستان۔افغانستان بارڈر پر سات قبائلی ایجنسیوں میں سے ایک خیبر ایجنسی میں 11 اساتذہ کو اس وقت اغواء کرلیا گیا تھا جب وہ اپنے سکول میں پولیو ویکسینیشن دے رہے تھے۔

حکومت پاکستان کی 'معاشی رابطہ کمیٹی' نے نومبر میں ایک نیا ضابطہ کار نافذ کیا جس کے تحت بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کے لیے اپنے کام کو جاری رکھنے کے لیے حکومتی منظوری کا حصول ضروری قرار دیا گیا۔ ان تنظیموں کے لیے لازمی قرار دیا گیا کہ وہ حکومت کو اپنی سرگرمیوں اور فنڈنگ کے ذرائع سے مکمل طور پر آگاہ کریں اور یہ شرط عائد کی گئی کہ غیر ملکی عملہ افرادی قوت کا 10 فیصد سے زائد نہیں ہوگا۔ آئی این جی اوز نے ان تجاویز کو خوش آئند قرار نہیں دیا تھا۔

ٹریڈ یونینیں

آئین کی متعدد دفعات بشمول دفعہ 17 جو ٹریڈ یونینیں قائم کرنے کا احاطہ کرتی ہے، میں مزدوروں کے حقوق کو تحفظ دیا گیا ہے۔ پاکستان میں لیبر قوانین آجر اور اجیر دونوں کو ٹریڈ یونین/انجمنیں قائم کرنے اور ان سے وابستہ ہونے کا حق دیتے ہیں۔ پاکستان میں ٹریڈ یونین کے اندراج اور صنعتی تنازعات کے تصفیے کے لیے خصوصی قانون موجود ہے جسے صنعتی تعلقات ایکٹ، (انڈسٹریل ریلیشنز ایکٹ) کہا جاتا ہے۔

یونین مخالف امتیازی سلوک

اپریل میں، گرافٹ فوڈز پاکستان کی انتظامیہ نے کیڈبری پاکستان پراگریسیو ایمپلائز یونین کے اراکین کو نکال دیا اور یونین رہنماؤں پر اس وقت حملہ کیا جب تنخواہوں، فوائد اور ملازمت کے تحفظ پر مذاکرات تعطل کا شکار ہوگئے۔ اجتماعی معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یونین رہنما محمد سلیم کے خلاف تادیبی کارروائی شروع کی گئی جس کا مقصد اُنہیں ملازمت سے برخواست کرنا تھا۔

ہڑتال میں پولیس کی مداخلت اور سودکاری سے انکار

مارچ میں پولیس نے کراچی میں ایک ہوٹل پر چھاپہ مارا اور ایک احتجاجی دھرنے میں شریک 50 یونین اراکین اور رہنماؤں کو گرفتار کرلیا۔ یونین رہنما غلام محبوب پر فوجداری الزامات عائد کئے گئے اور انہیں 14 گھنٹے تک زیر حراست رکھا گیا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے یونین کے ساتھ سوداکاری کرنے یا مصالحتی گفت وشنید میں شامل ہونے سے انکار کردیا۔

اٹھارہویں ترمیم کی منظوری کے بعد لیبر کنکرنٹ لسٹ میں شامل نہیں ہے۔ چنانچہ مرکزی حکومت اب لیبر کے معاملات پر قانون سازی نہیں کرسکتی۔

بین الاقوامی ٹریڈ یونین کنفیڈریشن، قومی ٹریڈ یونین سنٹرز کی کنفیڈریشن نے 2013ء میں اپنی رپورٹ میں پاکستان کو ان ممالک کی فہرست میں رکھا تھا جو ٹریڈ یونین کے حقوق کی خلاف ورزیوں کی زد میں تھے۔ 14 اپریل کو ٹریڈ یونین رہنما اور سول سوسائٹی کے اراکین کراچی میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) میں اکٹھے ہوئے تھے تاکہ وہ سیاسی جماعتوں کو مزدور طبقے کی حالت زار سے آگاہ کرنے کے لیے کوئی حکمت عملی طے کرسکیں۔

کالعدم تنظیمیں

کالعدم جنگجو تنظیموں، جن میں سے بعض خیراتی سرگرمیوں میں مشغول تھیں، نے اپنے اصلی یا مختلف ناموں سے کام کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ انہوں نے مختلف امور پر ملک کے متعدد علاقوں میں ریلیاں بھی نکالیں۔

ایک کالعدم تنظیم کے سربراہ، جنہیں بین الاقوامی پابندیوں کا سامنا ہے، ریلیوں میں نمودار ہوتے رہے جن میں سے ایک ریلی 6 ستمبر کو اسلام آباد میں منعقد ہوئی تھی۔ وہ ہندوستان کو ایک دہشت گرد ریاست کہہ کر اس کی مذمت کرتے جبکہ ان کے ہزاروں حمایتی حریف ایٹمی ملک کے خلاف ''مقدس جنگ'' کے نعرے

ٹریڈ یونینوں نے نج کاری کی شدید مخالفت کی

لگاتے۔ دیگر اقدامات کے علاوہ، انسداد دہشت گردی (دوسری ترمیم) ایکٹ 2013ء منظور کیا گیا تاکہ کالعدم تنظیموں کا نئے ناموں سے کام کرنے کی بڑھتی ہوئی روش پر قابو پایا جا سکے۔ ترمیمی قانون کے مطابق، ''اگر کالعدم تنظیم کا کوئی ایک یا تمام عہدیداران، کارکنان اور وابستہ افراد کسی مختلف نام سے ایک نئی تنظیم قائم کرتے ہیں، تو انہی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے شبہ پر مذکورہ تنظیم کو بھی کالعدم ہی تصور کیا جائے گا''۔

ترمیم نے اس امر کی نشاندہی کی کہ اگر کالعدم تنظیم کے اراکین یا عہدیداران ممنوعہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں تو حکومت ان افراد کے خلاف کارروائی کر سکتی ہے۔ ترمیم کے مطابق ان افراد کے بیرون ملک سفر، پاسپورٹ کے حصول، کسی قسم کی مالیاتی امداد بشمول بنک کے قرضہ جات اور کریڈٹ کارڈز کے حصول پر پابندی عائد کی جا سکتی ہے۔ مزید برآں، کسی قسم کے اسلحہ کے لائسنس، اگر پہلے ہی جاری کئے جا چکے تھے تو وہ معطل تصور کئے جائیں گے اور اسلحہ فوری طور پر نزدیکی پولیس اسٹیشن میں جمع کروایا جائے گا۔

قانون کی ایک نئی دفعہ کے تحت، حکومت اب کسی بھی ایسے فرد کی امتناعی حراست کا حکم دے سکتی ہے جس کا انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت کسی جرم سے تعلق رہا ہو۔ اس حراست کی مدت کو ایک ہی وقت میں 30 دن تک توسیع دی جا سکتی ہے مگر 90 سے زائد دنوں تک توسیع نہیں دی جا سکتی۔

4 مارچ کو سندھ حکومت نے صوبے میں نئے ناموں سے کام کرنے والی کالعدم تنظیموں کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

سفارشات

1۔ ریاست کو اجتماع کی آزادی کو یقینی بنانا چاہئے جس کی ضمانت بین الاقوامی قومی دستاویزات میں دی گئی تھی۔ اگر ایک انجمن قائم کرنے یا اس میں شامل ہونے کے حق کی پامالی کی جاتی ہے تو اس کا فوری موثر ازالہ ہونا چاہئے۔

2۔ ایک کثیر الجہتی حکمت عملی اختیار کی جائے جو بیک وقت حق کے نفاذ کو آسان بنانے اور اس انسانی حق کی اہمیت کے متعلق آگاہی دینے کو توجہ کا مرکز بنائے اور غیر ریاستی عناصر کو اس حق کی پامالی کرنے سے روکنے کے لیے اقدامات اٹھائے جائیں۔

3۔ خواتین اور مردوں کو این جی اوز کے ساتھ وابستگی کی بنا پر لاحق خطرہ ناقابل قبول ہے اور اس سے ترجیحی بنیادوں پر نبٹا جائے۔ این جی او ورکرز پر تشدد یا دھمکیاں یا تشدد کی ترغیب پر حکام کا ردعمل خاموشی پر مبنی نہیں ہونا چاہئے۔

4 - فروغِ جمہوریت

سیاسی عمل میں شرکت

ریاست اپنے اختیارات،عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔

جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور سماجی انصاف کے اصولوں کا جو تصور اسلام نے پیش کیا ہے، اس کی مکمل پاسداری کی جائے گی۔

بنیادی حقوق کی مکمل ضمانت دی جائے گی جہاں تک کہ قانون اور اخلاق عامہ اس کی اجازت دیں۔

آئین پاکستان [دیباچہ]

ریاست علاقائی سطح پر منتخب نمائندوں کے ذریعے مقامی حکومت کے (بلدیاتی) اداروں کی حوصلہ افزائی کرے گی، اور ان (بلدیاتی) اداروں میں کسانوں، مزدوروں اور عورتوں کو خصوصی نمائندگی دینے کا اہتمام کیا جائے گا۔

آئین پاکستان [آرٹیکل-32]

۔۔۔یہ ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عمل داری کے ذریعے یقینی بنایا جائے، ورنہ انسان عاجز آ کر جبر و استبداد اور ظلم کے خلاف خود بغاوت پر مجبور ہو جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [ابتدائیہ]

تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوتی ہے۔ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-1]

ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طریقے سے منتخب کیے گئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔

ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق حاصل ہے۔

عوام کی مرضی حکومت کے اختیار و اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ اس مرضی کے اظہار کے لیے متعین مدت کے بعد ایسے حقیقی انتخاب منعقد کرائے جائیں گے، جن میں عام اور مساوی حق رائے دہی کا استعمال خفیہ رائے شماری یا اس جیسے کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے شماری کے ذریعے کیا جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-21]

انتخابی جمہوریت کا ناہموار راستہ

پاکستان میں جمہوری طرزِ حکومت کی تلاش کے حوالے سے 2013ء کا سال ایک انتہائی اہم اور نازک مرحلہ تھا۔ منتخب حکومت نے اپنی طبعی مدت کسی پے چیدگی کے بغیر مکمل کی تھی اور اسی طرح براہ راست

منتخب ہونے والی قومی اور صوبائی اسمبلیوں نے بھی اپنی آئینی مدت مکمل کی تھی۔ دہشت گردوں کی دھمکیوں اور ابتری پھیلانے والی قوتوں کی طرف سے مسائل پیدا کرنے کے باوجود عام انتخابات کا انعقاد ہوا۔ انتخابات کے نتائج کو آبادی کی بڑی اکثریت نے تسلیم کیا اور جس طرح آسوں اور امیدوں کے ساتھ نئی حکومت قائم ہوئی وہ اس حقیقت کا واضح اظہار تھا کہ عوام جمہوری عمل کے ساتھ پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ عمل ہے جو واضح کرتا ہے کہ عام لوگ نمائندہ اور ذمہ دار طرزِ حکومت کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔

لیکن جمہوری عمل کی طرف جانے والا یہ تمام راستہ ناہموار تھا۔ سال کے شروع ہی میں ایک مذہبی رہنما نے کینیڈا کو چھوڑا۔ جہاں اس نے اپنی مستقل بودو باش اختیار کر رکھی تھی۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے پیروکاروں کو اکٹھا کیا۔ یہ تعداد میں کافی تھے اور ان میں مرد، عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ وہ اپنے ان پیروکاروں کو لے کر شدید سردی اور بارش میں جلوس کی شکل میں اسلام آباد کی طرف روانہ ہوگیا۔ ملک کے دارالحکومت اسلام آباد کے مرکزی علاقے میں اپنے مطالبات کو منوانے کے لئے دھرنا دیا۔ اسکا مطالبہ تھا کہ انتخابات نئے الیکشن کمشن کے تحت کروائے جائیں۔ مخلوط حکومت نے اس شخص کو ''پاور بروکر'' کی حیثیت دینے کا اعلان کر کے وقت حاصل کیا۔ آخر کار عدالت عظمیٰ نے ایک ہی جھٹکے میں ہجوم کو اپنی طرف متوجہ کرنے والے اس شخص کو اس کی حیثیت جتادی اور یوں الیکشن کمشن بچ گیا۔

انتخابی فہرستوں میں بہت ہی خامیاں اور غلطیاں تھیں جنہیں عدالتی ہدایات اور عوامی تشویش کو سامنے رکھتے ہوئے الیکشن کمشن کے حکام کو دن رات کام کرنا پڑا اور کراچی میں تو گھر گھر ووٹروں کی چیکنگ کی گئی اور یہ کام تقریباً پولنگ کے دن تک جاری رہا۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ایک ہی دن کرانے کے امکان پر سوالات اٹھائے گئے اس لئے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی مدت کی تکمیل کی تاریخیں مختلف تھیں۔ تاہم مخلوط حکومت اور حزب اختلاف کی جماعتوں نے اتفاق کرلیا کہ تمام اسمبلیوں کے انتخابات ایک ہی روز کروائے جائیں۔ اسطرح فیصلہ ہوا کہ قومی اسمبلی اور چاروں اسمبلیوں کے کے انتخابات ایک ہی روز یعنی 11 مئی کو کروائے جائیں گے۔

تاہم الیکشن کمیشن آف پاکستان قانون میں جن بہت سی ترامیم یا تبدیلیوں کو متعارف کروانا چاہتا تھا 'اُن کے حوالے سے اسمبلی میں پیش کرنے کے لئے الیکشن کمیشن نے جو بل کا جومسودہ تیار کیا' حکومت نے اسکا راستہ روک دیا۔ امیدواروں کے کاغذات نامزدگی کی منظوری کے لئے جو شرائط رکھی گئی تھیں ان پر حکومت اور الیکشن کمشن کے درمیان تناؤ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ بہر حال اس معاملے میں الیکشن کمشن آف پاکستان فاتح ٹھہرا۔ اور کامیابی عدالت عظمیٰ کی ''مہربانی'' کی وجہ سے ہوئی۔ سپریم کورٹ نے بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کو

2008ء کے مقابلے میں 2013ء کے انتخاب میں خواتین نے دوگنی تعداد میں انتخاب لڑا

ووٹ ڈالنے کا حق دینے کی ہدایت کی جسے حکومت نے تسلیم کرتے ہوئے قومی اسمبلی سے قانون سازی کروائی لیکن اس سب کچھ میں کافی تاخیر ہوچکی تھی اس لئے اسے عملی طور پر نافذ نہیں کیا جاسکا۔

الیکشن کمشن آف پاکستان نے انتہائی عرق ریزی کے ساتھ ایک مثالی منصوبہ تیار کیا تھا جس کا مقصد تھا کہ انتہائی شفاف اور آزادانہ انتخابات کروائے جائیں تاکہ دنیا جان سکے کہ پاکستان جدید ترین اور انتہائی جمہوری ریاست ہے لیکن تمام فریقوں یعنی انتظامیہ' سیاسی جماعتوں اور عام لوگوں نے ان تبدیلیوں کی مخالفت کردی جس نے الیکشن کمشن کو مایوسی کا شکار کردیا۔ نتیجے کے طور پر الیکشن کمشن آف پاکستان نے اپنی پیشہ ورانہ قابلیت کی قیمت پر صرف ایک بات پر زور دینا شروع کردیا اور وہ تھا امیدواروں کی اخلاقی اہلیت۔

عبوری حکومتوں کے قیام کے لئے جو طریق کار طے کیا گیا' اسکا انحصار کسی حد تک مخلوط حکومت اور حزب مخالف کے درمیان اعتماد پر تھا۔ تاہم 2013ء کے انتخابات میں اس اعتماد میں کافی حد تک کمی دیکھنے میں آئی۔ خیبر پختونخواہ نے وزارت اعلیٰ کے لئے ایک ریٹائرجج کا انتخاب بغیر کسی ہنگامے کے کیا۔ سندھ میں بھی اسی طرز پر عبوری وزیراعلیٰ کا انتخاب کیا گیا جس پر تمام سیاسی جماعتیں رضامند تھیں۔ بلوچستان میں مختصر سی تلاش کے بعد ایک سینئر سیاستدان کو وزیراعلیٰ نامزد کردیا گیا۔ لیکن عبوری وزیراعظم کے لئے کسی شخصیت کے چناو پر حکومت اور اپوزیشن کا متفق ہونا ممکن نہیں تھا اس لئے اس عہدے کیلئے بلوچستان سے ایک سابقہ جج کا انتخاب الیکشن کمشن کو سونپ دیا گیا۔ جس نے میر ہزار خان کھوسو کو اس عہدے کے لئے منتخب کیا۔ یہ فیصلہ بھی اتفاق رائے سے نہ ہوسکا۔ جہاں تک سب سے اہم صوبہ پنجاب کا تعلق ہے' تو اس کے لئے الیکشن کمشن آف

پاکستان نے حزب اختلاف کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ حکومتی جماعت کے نامزد فرد کو بطور عبوری وزیر اعلیٰ تسلیم کر لے اور اسمیں کمشن کامیاب بھی رہا۔

الیکشن کمشن کو انتخابات کے دوران امن عامہ کو ٹھیک رکھنے کے لئے فوج کی خدمات حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ تاہم انتخابی عمل کے لئے جوڈیشنل آفیسرز کی خدمات حاصل کرنے کے لئے الیکشن کمشن کو عدالت عظمیٰ سے رجوع کرنا پڑا۔

اگرچہ پولنگ والے دن کہیں کہیں تشدد کے واقعات سامنے آئے تاہم انتخابی تحریک کو دہشت پسندوں کی طرف سے خطرے نے گھیر رکھا تھا۔ خود کش حملوں اور ٹارگٹ حملوں نے خیبر پختونخواہ میں امیدواروں اور ان کی جماعتوں کو اپنی انتخابی مہم محدود رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ خاص طور پر عوامی نیشنل پارٹی اس صورتحال کا بری طرح شکار ہوئی۔ کسی حد تک پاکستان پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم بھی دہشت گروں کی دھمکیوں کی وجہ سے متاثر ہوئی دونوں پارٹیوں نے دہشت گردی کی فضا کو کم ووٹ پڑنے کی وجہ قرار دیا۔ تاہم ووٹوں کی کم تعداد کی اس کے علاوہ اور بھی وجوہات تھیں۔

بہرحال ایک بات تو واضح ہے کہ 11 مئی کے انتخابات نے انتخابی جمہوریت پر عوام کے اعتماد کی تصدیق کر دی اس لئے کہ ووٹروں نے دہشت گردی کے خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا تاہم بلوچستان اور خیبر پختونخواہ میں ووٹ ڈالنے کی شرح کم رہی۔ آٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ ووٹروں میں سے چار کروڑ ساٹھ لاکھ ووٹروں نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔ نتائج سے واضح ہوتا ہے کہ قومی اسمبلی کی نشستوں کے لئے پڑنے والے ووٹوں کی شرح 55.02 فی صد جبکہ صوبائی اسمبلیوں کے لئے ووٹوں کی شرح 55.68 فیصد رہی۔ پانچوں اسمبلیوں کے لئے پڑنے والے ووٹوں کی شرح 55.14 فیصد رہی۔ بہرحال مختلف علاقوں میں یہ شرح مختلف رہی۔ مثال کے طور پر فاٹا، جنوبی وزیرستان میں یہ شرح 11.37 فیصد جبکہ پنجاب کے ضلع بہاولنگر میں یہ شرح 87.77 فیصد رہی۔

ملک بھر سے انتخابات میں متعدد بے قاعدگیوں کی اطلاعات موصول ہوئیں لیکن الیکشن کمشن اس حوالے سے کوئی کردار ادا نہ کر سکا اس لئے کہ پولنگ کا عمل اس کے قابو میں بالکل نہ رہا تھا۔ ان بے قاعدگیوں میں انتخابی میٹریل، خصوصاً نہ مٹنے والی روشنائی کی بے حد کمی، پولنگ سٹیشنوں پر نظم و ضبط کا فقدان اور بارسوخ افراد کو ایک سے زیادہ ووٹ دینے کے واقعات کو نظر انداز کرنا شامل ہیں۔ قومی اسمبلی کے نتائج کے مطابق مختلف سیاسی جماعتوں کو ملنے والی نشستوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

پارٹی	عام نشستیں	خواتین کی مخصوص نشستیں	غیر مسلموں کی مخصوص نشستیں	کل تعداد
پاکستان مسلم لیگ (نواز)	145	35	6	186
پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز	32	7	1	40
پاکستان تحریک انصاف	28	6	1	35
ایم کیو ایم	18	4	1	23
جے یو آئی۔ایف	10	3	1	14
پی ایم ایل۔ایف	4	0	1	5
جماعت اسلامی	3	1	0	4
پی کے ایم اے پی	3		1	4
این پی پی	2	0	1	3
پی ایم ایل کیو	2	0	0	2
متفرق	8	0	0	8
آزاد	8	0	0	8

(رپورٹ کی تیاری کے وقت دس نشستوں کے نتائج آنا باقی تھے)

نتائج سے واضح ہوگیا کہ پارلیمنٹ کے ایوان زیریں میں مسلم لیگ (ن) کو برتری حاصل تھی مخلوط حکومت (پی پی پی' اے این پی اور پی ایم ایل کیو) کے امیدواروں کو بھاری شکست کا سامنا کرنا پڑا۔تاہم سندھ میں پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز نے اپنی واضح برتری قائم رکھی جبکہ عوامی نیشنل پارٹی نیشنل اسمبلی اور خیبر پختونخواہ میں بری طرح شکست کھا گئی۔ پاکستان تحریک انصاف نے خیبر پختونخواہ میں اپنی قوت کا بھرپور مظاہرہ کیا وہ خیبر پختونخواہ میں سب سے بڑی جماعت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔اور مرکز میں بھی وہ ایک سیاسی قوت کے طور پر سامنے آئی تاہم وہ قومی اسمبلی میں پاکستان پیپلز پارٹی کی دوسری بڑی حیثیت کو ختم کرنے میں ناکام رہی۔ چنانچہ وہ قائدِ حزب اختلاف کی دوڑ میں شکست کھا گئی۔ مذہبی جماعتوں کا جہاں تک تعلق ہے تو ان میں سے جمعیت العلمائے اسلام (فضل گروپ) نے دوسری مذہبی جماعتوں کی نسبت بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔اور وہ اس قابل ہوگئی کہ خیبر پختونخواہ میں طاقت کے توازن کو اپنے ہاتھ میں رکھ سکے۔ جماعت اسلامی خیبر پختونخواہ تک ہی محدود رہی جہاں اس نے قومی اسمبلی کی چار نشستیں حاصل کیں تاہم خیبر پختونخواہ صوبہ میں اتنی نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی جس کے باعث وہ صوبائی حکومت میں پی ٹی آئی کی حصہ

دار بن سکے۔ دوسرے مذہبی گروہ مثلاً جے یو آئی (ایس)، جمعیت اہل حدیث (ساجد میر) اور تحریک اسلامی قومی سطح پر ایک بھی نشست حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

ہارنے والوں نے واضح طور پر اپنی شکست کو تسلیم کر لیا لیکن تحریک انصاف نے ایک منظم طریقے کی دھاندلی کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ اس نے دھاندلی کے خلاف احتجاجی مہم کا آغاز کر دیا اور متعدد مقامات پر دھرنے دیئے۔ آخر کار اس نے اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کی 25 نشستوں کے انتخابی نتائج کو تبدیل کیا گیا تھا۔ اس نے بیلٹ پیپروں پر لگائے گئے انگوٹھوں کے نشانات کی جانچ پڑتال کرنے کا جو مطالبہ کیا تھا، اس کے نتائج حوصلہ افزا نہیں نکل سکے۔ اس لئے کہ یہ عمل اس قدر آسان نہیں تھا جتنا اس کو سمجھا گیا تھا۔ یہ کام بہت مہنگا ہونے کے ساتھ ساتھ بہت مشکل بھی تھا اور نادرا کے سربراہ کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے اس لئے کہ وہ اصرار کے ساتھ خود کو غیر جانبدار ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہر حال کم و بیش لوگوں کی بھاری تعداد نے نتائج کو تسلیم کر لیا۔

قومی اسمبلی کے نئے منتخب ارکان نے یکم جون 2013ء کو حلف اٹھایا الیکشن کمشن نے 6 اگست 2013ء کا دن صدارتی انتخاب کے لئے مقرر کیا لیکن سپریم کورٹ نے وقت میں کمی کرتے ہوئے صدارتی انتخاب 30 جولائی 2013ء کو کرانے کا کہا اور اس روز پاکستان مسلم لیگ (ن) کے نامزد صدارتی امیدوار ممنون حسین صدر مملکت منتخب ہو گئے۔

اگلے ہی روز جسٹس (ریٹائرڈ) فخر الدین جی ابراہیم نے چیف الیکشن کمشنر کے عہدے سے استعفیٰ دیدیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس بے معنی کام سے تنگ آ چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سمجھنے لگے تھے کہ اس وقت کی فضا یا ماحول میں استقامت، راست بازی اور دیانتداری فضول محض ہوں۔ جی ابراہیم کے خالی کردہ عہدے پر کسی دوسرے شخص کی نامزدگی میں حکومتی ناکامی نے چیف جسٹس آف پاکستان کے لئے ضروری بنا دیا کہ وہ ججوں میں سے کسی ایک کا نام اس عہدے کے لئے پیش کریں پہلے اس عہدے پر جسٹس تصدیق حسین جیلانی کا تقرر ہوا اور پھر جب وہ چیف جسٹس مقرر ہوئے تو جسٹس ناصر الملک کو اس عہدے پر تعینات کیا گیا۔ اور یہ عمل سال کے آخری دنوں میں مکمل ہوا۔

2013ء کے عام انتخابات کا آخری ایکٹ 22 اگست 2013ء کو اس وقت کھیلا گیا جب مختلف وجوہ کی بنا پر قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی خالی ہونے والی 41 نشستوں پر انتخابات کروائے گئے۔ ان ضمنی انتخابات میں کچھ ایسے لوگ شکست کھا گئے جو 11 مئی کے انتخابات میں کامیاب قرار دیئے گئے تھے۔ اس صورتحال نے لوگوں کو احساس دلایا کہ سیاست کی ریت کس تیزی کے ساتھ جگہ بدلتی ہے۔

قانون سازی میں خواتین کا حصہ

عورت فاؤنڈیشن کی رپورٹ کے مطابق 2013ء کے انتخابات کے بعد ملک کی اسمبلیوں میں خواتین کی نشستوں کا حصہ 19.5 فیصد رہ گیا (کل 1170 نشستوں میں سے 228 نشستیں) جبکہ اس سے پہلے یہ شرح 19.9 فیصد (2008ء میں کل 1170 نشستوں میں 235 نشستیں) تھیں۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

قومی اسمبلی	کل 342 نشستوں میں 70 نشستیں (60 مخصوص نشستیں) 9 نشستیں بذریہ براہ راست انتخاب یعنی 2013ء میں یہ شرح 20.5 فیصد رہ گئی جبکہ 2008ء میں 76 نشستوں کے ساتھ یہ شرح 22.2 فیصد تھی۔
پنجاب اسمبلی	371 نشستوں میں سے 76 نشستیں (66 مخصوص نشستیں 9 نشستیں بذریعہ براہ راست انتخاب ایک مخصوص نشست غیر مسلم کے لئے یعنی 20.5 فیصد 2008ء میں بھی یہ یہی شرح تھی۔
سندھ اسمبلی	168 میں سے 31 نشستیں (66 مخصوص نشستیں، 9 نشستیں بذریعہ انتخاب ایک غیر مسلم کے لئے مخصوص نشست) یعنی 20.5 فیصد 2008ء میں بھی تناسب یہی تھا۔
خیبر پختونخواہ	124 میں سے 22 نشستیں (خواتین کیلئے تمام مخصوص نشستیں) یعنی 17.7 فیصد حصہ۔ 2008ء میں بھی یہی تناسب تھا۔
بلوچستان اسمبلی	65 میں سے 12 نشستیں (11 مخصوص نشستیں اور ایک نشست عام انتخاب کے ذریعے) یعنی 18.5 فیصد حصہ 2008 میں بھی یہی تناسب تھا۔

2013ء کے انتخاب میں نئی خواتین ارکان اسمبلی کی تعداد 66.8 فیصد تھی (211 میں سے 141) یعنی یہ خواتین پہلی بار اسمبلیوں میں آئی تھیں۔ ان میں سے 37 قومی اسمبلی، پنجاب اسمبلی 60، سندھ اسمبلی میں 20، خیبر پختونخواہ میں 18 اور بلوچستان اسمبلی میں ان کی تعداد 6 تھی۔ 45 خواتین دوسری بار رکن بنیں جبکہ 23 خواتین تیسری بار اسمبلی میں آئیں۔ ہر اسمبلی میں ایک ایک خاتون چوتھی اور پانچویں بار اسمبلی کی رکن بنیں۔

خواتین مخالف تعصّباب

اگرچہ ملک کے تمام حصوں میں اپنے حق رائے دہندگی کو استعمال کرنے میں خواتین کی دلچسپی میں اضافہ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا اور بہت سے دیہی علاقوں میں خواتین ووٹروں کو پہلی بار ووٹ ڈالنے کے لئے پولنگ سٹیشنوں پر جانے کی اجازت دی گئی لیکن بہت سے دیہی علاقوں میں خواتین کو حق رائے دہی کے استعمال سے منظّم طریقے سے روکنے کی مصدقہ اطلاعات بھی موصول ہوئیں۔ ان علاقوں میں امیدواروں/

انتخاب میں حصہ لینے والی سیاسی جماعتوں کے درمیان معاہدے بھی ہوئے جن میں طے پایا گیا کہ پولنگ والے دن خواتین ووٹروں کو گھروں سے ہی نہیں نکلنے دیا جائے گا اور یہ کام پولنگ والے دن سے بہت پہلے کیا گیا۔ اور حکام کے بس میں نہیں تھا کہ وہ خواتین کے خلاف ایسے جرائم کی روک تھام کرسکیں۔ اگرچہ سول سوسائٹی کی تنظیموں نے بہت دباؤ ڈالا تا کہ الیکشن کمشن خواتین کے خلاف ایسے جرائم کی روک تھام کر سکے۔ اگرچہ سول سوسائٹی کی تنظیموں نے بہت دباؤ ڈالا کہ الیکشن کمشن خواتین کو ووٹ ڈالنے سے روکنے کے جرم کے خلاف عملی اقدامات کرے لیکن اس بُرائی کو روکنا ناممکن سا تھا۔

خواتین کے حق رائے دہی کے جمہوری حق میں بدترین رکاوٹ وہ فتویٰ تھا جو سندھ کے مذہبی مدرسے نے جاری کیا (تھرپارکر ضلع) اس فتویٰ میں کہا گیا کہ انتخابات میں خواتین کی شرکت اسلامی احکامات کے خلاف ہے۔

یہ توقعات کہ الیکشن کمشن 'انتخابات میں آزاد اور باشعور شہریوں کے طور پر خواتین کی شرکت کو فروغ دینے کے لئے مثبت' اقدامات کرے گا' 22 اگست کو ہونے والے ضمنی انتخابات تک محض خواب ہی رہیں۔ تاہم 22 اگست کے ضمنی انتخابات کے دوران این اے 27 (لکی مروت) کے انتخابی نتیجے کو ان اطلاعات کی بنیاد پر روک دیا گیا کہ خواتین کو ووٹ ڈالنے سے روک دیا گیا تھا۔ پشاور ہائی کورٹ نے این اے 5 (نوشہرہ) اور این اے 27 (لکی مروت) کے نتائج روکنے کا حکم بھی دیا لیکن سپریم کورٹ نے الیکشن کمشن آف پاکستان کی اس رپورٹ پر ان احکامات کو کالعدم قرار دیدیا جس میں خواتین کو ووٹ کا حق استعمال کرنے سے روکنے کے اقدام کی تردید کی گئی تھی۔ عدالت عظمیٰ نے اپنے حکم میں کہا کہ اگر کسی کو کوئی شکایت ہے تو وہ الیکشن ٹربیونل میں جائے۔

کسی خاتون کو الیکشن کمشن کا رکن نہیں بنایا گیا تھا حالانکہ اس اہم کام کے لئے بہت سی معزز خواتین 'جو جج رہ چکی تھیں' کی خدمات حاصل کی جاسکتی تھیں۔ ویسے بھی اس دلیل کو کافی پذیرائی ملی تھی کہ الیکشن کمشن کی رکنیت کو قانونی ماہرین تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے۔

مذہبی اقلیتوں کے حقوق

2013ء کے عام انتخابات مخلوط انتخابی نظام کے تحت ہونے والے تیسرے انتخابات تھے۔ اسکا مطلب ہے عام نشستوں پر مخلوط ووٹر لسٹ کی بنیاد پر ووٹ ڈالنا۔ لیکن مذہبی اقلیتوں کی طرف سے اس حوالے سے غیر منصفانہ سلوک پر ہونے والے احتجاج کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ احمدیہ کمیونٹی کو مخلوط انتخابی سکیم سے اس بار بھی باہر رکھا گیا۔ انہوں نے الیکشن کمشن آف پاکستان کے ساتھ اس شدید ناانصافی کے خلاف اپنا احتجاج

بھی ریکارڈ کروایا لیکن ان کی کوئی دادرسی نہ ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے انتخابی عمل کے بائیکاٹ کو جاری رکھنے کے فیصلے کا اعلان کر دیا۔

مذہبی اقلیتوں کو اس کے علاوہ اور بہت سی رنجشیں اور ناراضگیاں تھیں۔ ہیومن رائٹس کمشن آف پاکستان نے قومی اسمبلی کے چھ حلقوں میں ہونے والے انتخاب کے حوالے سے تحقیق (سٹڈی) کی تھی۔ ان حلقوں کے غیر مسلم ووٹروں کی بھاری اکثریت نے بتایا تھا کہ غیر مسلم ووٹروں میں شدید مایوسی اور بددلی پائی جاتی تھی اس لئے کہ ان کے برابر کے شہری حقوق کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔

ہیومن رائٹس کمشن آف پاکستان کے مشاہدین نے قومی اسمبلی کے ان چھ حلقوں کے حوالے سے اپنی جانچ پڑتال سے جو نتائج اخذ کئے ان میں بتایا گیا کہ انتخابی عمل کے لئے جو معیار مقرر کئے گئے تھے ان کی بہت سی خلاف ورزیاں کی گئیں حالانکہ مقامی حکام' الیکشن سپر وائزر اور سیاسی جماعتیں دلچسپی لیتیں اور ان کی مدد کرتیں تو مذہبی اقلیتیں آزادانہ طور پر اپنا حق رائے دہی استعمال کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتیں۔

مبصرین نے جو چند حوصلہ افزا علامات دیکھیں ان میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ 2013ء کے انتخابات میں مذہبی اقلیتوں کے گیارہ امیدواروں نے سندھ کے پانچ انتخابی حلقوں میں انتخاب لڑا جبکہ 2008ء میں یہ تعداد پانچ تھی۔ اکثریتی کمیونٹی کے تقریباً سبھی امیدواروں نے اپنی حمایت کیلئے اقلیتی افراد سے رابطے کئے اور اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے ووٹروں نے انتخابی عمل میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔

اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی خواتین بڑی تعداد میں ووٹ ڈالنے کے لئے گھروں سے نکلیں۔ سندھ کے جو انتخابی حلقے زیر مشاہدہ تھے' ان میں اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی خواتین ووٹروں کی تعداد' مسلم خواتین ووٹروں سے کہیں زیادہ تھی جنہوں نے ووٹ کا حق استعمال کیا۔

تشویش والے امور درج ذیل تھے:

مذہبی اقلیتوں کے غریب افراد زمینداروں یا مذہبی پیشواؤں کے احکامات ماننے سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ ان کے روٹی' روزگار کا انحصار انہی لوگوں پر تھا۔ طاقتور امیدوار ہر ایک ووٹر کے پاس نہیں جاتے۔ ان ووٹروں کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح مقامی بااثر افراد طاقتور امیدواروں کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

قانون کی دھجیاں اڑانے کا ایک ڈراونا واقعہ این اے 229 تھرپارکر 1 کے حلقہ میں پیش آیا۔ جہاں ایک پمفلٹ تقسیم کیا گیا جس میں خبردار کیا گیا کہ اگر کسی مسلمان ووٹر نے کسی اقلیتی امیدوار کو ووٹ ڈالا تو اس کے خطرناک نتائج کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ یہ محض انتخابی کوڈ اور ریپریزینٹیشن آف پیپل ایکٹ کی شدید

خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ پاکستان پینل کوڈ کی بھی خلاف ورزی تھی۔لیکن اس حوالے سے متعلقہ افراد کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی گئی۔اس کی وجہ نہ صرف یہ تھی کہ حکام کو اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی بلکہ وہ قانون نافذ کرنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے تھے۔

حلقہ این اے 226 ' میر پور' عمر کوٹ کی اقلیتی برادری کو نہ صرف مذہبی پریشر گروپوں کی طرف سے خطرہ تھا بلکہ وہ خود پر تشدد کرنے والے لوگوں کا نام لیتے ہوئے بھی خوفزدہ تھے۔

تقریباً تمام اقلیتی امیدواروں نے شکایت کی کہ کاغذات نامزدگی کی جانچ پڑتال کے دوران ریٹرننگ افیسروں نے ان سے ایسے سوالات کئے جوان کے عقیدے کی توہین کے مترادف تھے۔

حفاظتی انتظامات کے نہ ہونے کی شکایات عام تھیں۔

2013ء کے انتخابات نے ایک بار پھر ثابت کردیا کہ جب تک سیاسی جماعتیں اقلیتوں کے بارے میں فیصلہ کن اقدامات نہیں کریں گی' مذہبی اقلیتوں کو سیاسی عمل میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

یہ مشاہدہ کیا گیا کہ اقلیتی ووٹروں کو مختلف حربوں سے ووٹ نہ ڈالنے پر مجبور کیا گیا۔ایک حربہ یہ بھی تھا کہ دور دراز علاقوں میں اقلیتی افراد کے ووٹوں کا اندارج ہی نہیں کیا گیا تھا۔اس کے علاوہ ایک ہی اقلیتی خاندان کے ارکان کے ووٹ مختلف پولنگ سٹیشنوں میں درج کئے گئے تھے۔اقلیتی خواتین ووٹروں کو غنڈہ عناصر اور پولنگ سٹاف کی طرف سے ہراساں کیا جاتا رہا۔متعدد غیر متعلقہ افراد کو پولنگ سٹیشنوں کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی جن میں سے بہت سے افراد خود کو پولنگ ایجنٹ کہتے تھے۔ یہ ووٹروں اور پولنگ سٹاف پر اثر انداز ہوتے رہے اور آزاد اور غیر جانبدرانہ انتخابی عمل کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے رہے۔ نچلی ذات کے ووٹروں کو صرف زمینداروں اور پولیس والوں کی طرف سے ہی دباؤ کا سامنا نہیں تھا بلکہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے بھی اپنی طاقت کی بنا پر پولیس سٹیشنوں پر اجارہ داری قائم کررکھی تھی۔

متعدد بااثر غیر مسلم افراد نے انتخابی انتظامات پر عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ایک مسیحی سکالر نے کہا کہ اقلیتوں نے خود کو انتخابی معاملات سے خصوصاً کراچی میں دور رکھا۔اس لئے کہ انہیں الیکشن کمشن آف پاکستان' سیاسی جماعتوں اور میڈیا نے بے حد مایوس کیا۔ہائی کورٹ کے ایک سابق ہندو جج نے کہا کہ بہت سی وجوہ کی بنا پر اقلیتوں نے عام انتخابات میں اپنا کردار ادا نہیں کیا۔انہوں نے کہا کہ'' وہ (اقلیتی افراد) زمینداروں سرداروں اور نوابوں کے دباؤ اور تشدد کا شکار تھے۔بعض مقامات پر انہیں دھمکیاں بھی دی گئیں چنانچہ پنچائیتوں نے ووٹ نہ ڈالنے کا فیصلہ دیا۔لگتا تھا کہ بلوچستان میں زیادہ تر اقلیتوں کے ارکان نے ووٹ نہیں ڈالے۔ ہندو کمیونٹی کے ارکان کی ایک بڑی تعداد اپنے گھر چھوڑ کر ہجرت کرگئی اور وہ ان علاقوں

میں موجود نہیں تھے جہاں ان کے ووٹ رجسٹر کئے گئے تھے۔

مبصرین کی فائنڈنگز

دی فری اینڈ فیئر الیکشن نیٹ ورک (ایف اے ایف ای این) نے جو سول سوسائٹی کی 42 تنظیموں پر مشتمل ہے، انتخابی عمل کی تفصیلی سٹڈی کی جس کی روشنی میں اسنے قومی اسمبلی کے انتخابی نتائج کا تجزیہ کرتے ہوئے درج ذیل آبزرویشنز دیں:۔

اگر چہ ووٹوں کی تعداد میں اضافہ ہوا لیکن 2008ء کے مقابلے میں 100 انتخابی حلقوں میں رجسٹرڈ ووٹروں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی۔

یہ حقیقت سامنے آئی کہ خواتین ووٹروں کی تعداد 2008ء کی نسبت کم ہوئی۔ 2013ء میں خواتین ووٹروں کی تعداد 43.6 فیصد رہی جبکہ 2008ء میں یہ تعداد 44 فیصد تھی۔

خواتین کے خلاف فتویٰ کا عکس

☆ ووٹروں کی حتمی فہرست اور ڈالے گئے تمام ووٹوں کی تعداد میں نمایاں فرق تھا۔

☆ ووٹ ڈالنے کی شرح میں اضافہ حوصلہ افزا تھا۔قومی اسمبلی کے چھ حلقوں میں 2002ء اور 2008ء کے انتخابات میں ووٹ ڈالنے کی شرح 2013ء کے مقابلے میں زیادہ تھی۔یعنی 2013ء میں ووٹ ڈالنے کی شرح کم ہوئی۔

☆ متعدد انتخابی حلقوں میں مسترد کئے جانے والے ووٹوں کی شرح میں غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا۔

☆ پولنگ کے دن مبصرین کے سامنے بہت سی خامیاں سامنے آئیں۔

یورپی یونین مشن

اپنی حتمی رپورٹ میں یورپی یونین الیکشن آبزرویشن مشن نے خامیوں کے حوالے 50 سفارشات پیش کیں۔جن کا تعلق متعدد اداروں سے ہے لیکن بنیادی طور پر پارلیمنٹ اور الیکشن کمشن آف پاکستان اس کے ذمہ دار قرار دیئے گئے۔

بنیادی سفارش کا تعلق انتخابی اصلاحات کے لئے ایک خصوصی پارلیمانی کمیٹی کے قیام سے تھا۔ اسمیں کہا گیا کہ یہ خصوصی پارلیمانی کمیٹی، انٹرنیشنل لاء کمٹمنٹس اور مشاورتی عمل کی بنیاد پر قانون سازی پر بروقت نظر ثانی کرے۔لیگل فریم ورک کو مضبوط کرنے کے لئے کمشن نے تجویز دی کہ انتخابی قانون سازی کو یکجا و مستحکم کیا جائے۔اس کے علاوہ ان تمام متعلقہ افراد اور اداروں کی رسائی اس تک ممکن بنائی جائے اور آر ٹی آئی

بسم الله الرحمن الرحيم

مسلمانو غور ڪريو اسان جي ملڪ پاڪستان جو مطلب ڇا آهي. اسان انهي ملڪ پاڪستان جي لاءِ ڪجهه سوچي قدم کڻو. اڄ اسان مسلمان پنهنجي ملڪ پاڪستان جي حفاظت ڪرڻ جي بدران پاڻ پنهنجي مٿان غير مسلم اسلام جي دشمنن کي ورت ڏيئي پاڻ جي مٿان غالب ڪري رهيا آهيون. اسان کي گهرجي ته اسان پنهنجي پياري نبي صلي الله عليه وسلم جي فرمان کي پنهنجي سيني ۾ جاءِ ڏيئي انهي ڪافرن ۽ اسلام دشمنن جو مقابلو ڪريون جيڪي الله تعاليٰ ۽ ان جي نبي جا دشمن آهن. انهي ڪافرن جو جمي مقابلو ڪريون ته پوءِ اسان ڪامياب ۽ ڪامران آهيون. اڄ اسان پاڻ مسلمان ڪمزور ٿي چڪا آهيون. غير مسلم اسان تي غالب آهن. جو ته اسان ۾ ايمان ۽ غيرت نه آهي ته اڄ اسان ملڪ پاڪستان عورتن ۽ غير مسلمن جي حوالي ڪري ڇڏيو آهي. الله جي نبي جو فرمان آهي. "جنهن ملڪ جي سربراهي ڪنهن عورت وٽ آهي ته اهو ملڪ تباهي جي ڪناري تي آهي" اڄ اسان مسلمان عورتن کي بادشاهي جي ڪرسين تي ويهاري اڄ اسان عورتن کي ٽوپي اجرڪ پهرائي روڊن ۽ رستن تي نچائي رهيا آهيون. اسان کي شرم اچڻ گهرجي؟ اڄ مسلمانن جي غيرت جو جنازو ڪڍجي چڪو آهي. غير مسلم تنظيمون عورتن کي اڳتي آڻي اسان جي غيرت کي للڪاري رهيا آهن.

انشاء الله غير مسلم جي تنظيمن جو جمي مقابلو ڪندا سين. مسلمانو! ڪرليو الله جو ڪلام عورتن جي لاءِ ڪهڙو حڪم آهي. " الله جو فرمان آهي اي نبي پنهنجي گهر وارن مؤمن مردن ۽ عورتن کي چئو ته گهرن جي اندر رهن، سينگار ڪري گهر کان ٻاهر نه نڪرن. جيڪڏهن مجبوري جي ڪري يا عذر يا بيماري جي ڪري گهر کان ٻاهر نڪرن ته پردو ڪري پوءِ نڪرن". الله جي پياري نبي صلي الله عليه وسلم جي پياري نياڻي فاطمہ الزهراہ عنها آخري وقت ۾ وصيت ڪري ٿي ته "منهنجو جنازو رات جو ڪڍجان، منهنجي جنازي جي مٿان ڪنهن ڌاريي مرد جو نظر نه پوي".

اڄ اسان مسلمانن جون عورتون ڌاري مردن سان هٿ ۾ هٿ ڏيئي هلن ٿيون.

العبد۔ محمد رمضان لنڊ
صدر مدرسه دارالقرآن والحديث (رجسٽرڊ)
جمعيت اهلحديث ڳوٺ مبارڪ لنڊ ڪانڌاڙي
رابطي نمبر 0301-8322809

محمد رمضان
مدرسه دارالقرآن والحديث اهل حديث
ڳوٺ مبارڪ لنڊ ڪانڌاڙي

مدرسه دار القرآن والحديث
اهل حديث

The fatwa against women

کے قانون میں اصلاح کر کے اس کو الیکشن کمیشن آف پاکستان پر لاگو کیا جائے۔

سفارشات کا مقصد الیکشن کمشین آف پاکستان کی ورکنگ کو منظّم اور مربوط بنانا تھا۔ اس کے تحت انتخابی حلقوں کو برابر یا ایک جیسا کرنا اور امیدواری کے تقاضوں میں ترامیم کرنا شامل تھا تاکہ مبہم اور اخلاقی شرائط کو ختم کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ اسکا مقصد یہ بھی تھا کہ امیدواروں اور جماعتوں کے مالی معاملات میں

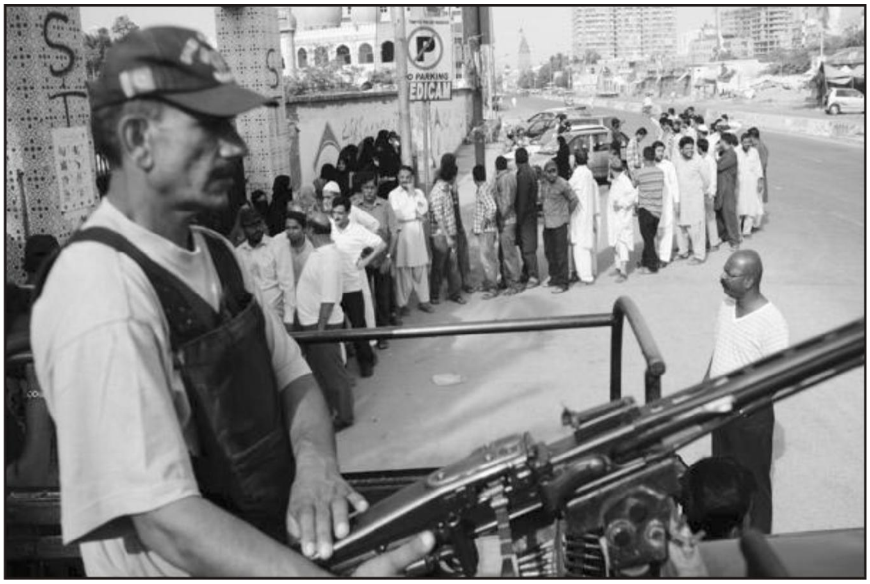

پولنگ سے پہلے ہونے والے تشدد کے واقعات کے باوجود پولنگ والے دن عمومی طور پر امن رہا

شفافیت اور اکاؤنٹیبلٹی کو بڑھاوا مل سکے۔ سات سفارشات کا تعلق میڈیا کی آزادی اور اس کی کارکردگی کو مضبوط کرنے سے تھا۔ مزید پانچ سفارشات کا تعلق پولنگ اور ووٹوں کی گنتی کے عمل کو مزید بہتر کرنے سے تھا۔ پانچ سفارشات ایسی تھیں جن کا مقصد انتخابی تنازعات کو طے کرنے کے نظام کو مضبوط کرنا تھا۔ کم از کم سات سفارشات انتخابات میں خواتین کی شرکت کو فروغ دینے اور مزید چار سفارشات کا مقصد انتخابات میں مذہبی اقلیتوں کی شرکت کو فروغ دینا تھا۔ سیاسی اصلاحات کی ضرورت سے متعلق آخری تین سفارشات کا تعلق عبوری حکومتوں کے فرائض، سیاسی جماعتوں کے اندر جمہوری عمل کو فروغ دینے بنیادی سیاسی آزادیوں کے دائرہ کار کو فاٹا تک توسیع دینے اور فاٹا کے ایم این ایز کو علاقے کی فلاح و بہبود کے لئے گرانٹ مہیا کرنے کے حوالے سے تھیں۔

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان فائنڈنگز

اپنی ابتدائی رپورٹ میں جو انتخابات کے ایک روز بعد جاری کی گئی، ہیومن رائٹس کمشن آف پاکستان نے انتخابی جمہوریت پر ایک بار پھر اعتماد کرنے پر عوام کو مبارکباد دی اور مندرجہ ذیل نکات اٹھائے:

☆ حکومت کے لئے ضروری ہے کہ قومی سطح پر مردم شماری کرانے کے ساتھ ساتھ نئے سرے سے انتخابی حلقہ بندیاں کرائی جائیں اور یہ کام آئندہ عام انتخابات سے بہت پہلے مکمل کر لینا چاہیے۔

☆ امیدواروں کی اہلیت کے معیار پر عمل درآمد اور ضیاالحق کے حکومت کے دوران آئین کے آرٹیکل 62 اور 63 میں امیدواروں کی اہلیت کی بنیاد کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ ان میں سے متعدد شرائط

کی تشریح ذاتی پسند نا پسند کے حوالے سے کی گئی حالانکہ جمہوری انتخابات کے عمل میں اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ایچ آر سی پی نے تجویز کیا کہ آئین کے آرٹیکل 62اور 63 کو1973ء کے مطابق ان کی اصل شکل میں بحال کیا جائے۔پولنگ سے پہلے کی فضا میں بڑے پیمانے پرتشدد درآیا تھااور حکام تمام سیاسی جماعتوں کو یکساں حالات اور ماحول مہیا کرنے میں بری طرح ناکام رہے۔

☆ مشترکہ ووٹرزلسٹوں میں احمدیہ کمیونٹی کے ارکان کو شامل کرنے میں حکام کی ناکامی نے یکساں حالات اور ماحول مہیا کرنے کے اصول کی دھجیاں بکھیرنے میں کردار ادا کیا۔ایچ آر سی پی نے تجویز کیا کہ احمدیہ کمیونٹی کے ارکان کو بھی عام ووٹروں کی فہرست میں شامل کیا جائے۔

☆ 2013ء کے انتخابات پاکستان کی تاریخ میں مہنگے ترین انتخابات تھے اور کم وسائل والے افراد کو انتخاب سے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔ایچ آر سی پی نے تجویز دی کہ بڑھتے ہوئے انتخابی اخراجات پر قابو پانے کے لئے سنجیدہ اقدامات کئے جائیں اور انتخابی مہم کو اخراجات کے حوالے سے قابو میں رکھا جائے۔

☆ لوئر دیر اور اُس جیسی متعدد جگہوں پر خواتین کو ووٹ دینے سے روکا گیا۔اگرچہ کچھ مقامات پر خواتین نے پہلی بار ووٹ ڈالے ایچ آر پی سی نے تجویز کیا کہ اس سلسلے میں مناسب قانون سازی کی جائے اور پالیسی اقدامات پر سختی سے عمل درآمد کرایا جائے تاکہ خواتین کو حق رائے دہی سے روکنے کے عمل کا مکمل تدارک ممکن ہو سکے۔

☆ زیادہ تر مبصرین کی رائے یہ تھی کہ 11 مئی کے انتخابات کے انتظامات نہایت کمزور تھے۔

☆ کراچی میں جس طرح انتخابی عمل میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں وہ کسی سکینڈل سے کم نہیں تھا۔ایک حلقہ میں پولنگ اس لئے شروع نہ ہو سکی تھی کہ پولنگ کے عملہ کو بیلٹ پیپر نہیں پہنچائے جاسکے تھے۔ ایچ آر سی پی نے تجویز کیا کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں الیکشن کمشن آف پاکستان اور اس کے صوبائی دفاتر پولنگ کے عمل کو دیکھ سکیں اور اگر پولنگ سٹاف کو کوئی مشکل یا دشواری پیش آئے تو اس کو فورطور پر دور کیا جاسکے۔

☆ ایچ آر سی پی نے الیکشن آف پاکستان کے ڈھانچے میں تبدیلیوں اور اسے دوبارہ سے منظّم کرنے کی سنجیدہ کوشش کرنے کی تجویز دی۔اسکی ترجیحات میں ردوبدل کرنے سیاسی معاملات میں افسر شاہی کی دخل اندازی کو کم کرنے اور اعلیٰ عہدوں پر خواتین کو مناسب نمائندگی دینے کی تجاویز بھی شامل ہیں۔

قومی اسمبلی کے منتخب 63 حلقوں سے ہیومن رائٹس کمشن آف پاکستان کے مبصرین نے اپنی تفصیلی رپورٹوں میں بتایا ہے کہ ابتدائی رپورٹ میں جن خامیوں اور خرابیوں کی نشاندہی کی گئی تھی وہ ان خامیوں اور خرابیوں سے کہیں کم تھیں جو پول مینجمنٹ (Poll Mangement) میں دیکھی گئیں۔

پارلیمنٹ کی کارکردگی

ملک کی تیرھویں قومی اسمبلی، جو 17 مارچ 2008ء کو وجود میں آئی 16 مارچ 2013ء کو اپنی پانچ سالہ مدت پوری کرنے کے بعد تحلیل ہوگئی تھی۔ اس اسمبلی کی کارکردگی شاندار رہی۔

اس اسمبلی کی نمایاں ترین کارکردگی 18 ویں آئینی ترمیم تھی جس کا مسودہ ایک کمیٹی نے تیار کیا۔ اس کمیٹی میں ایوان میں موجود تمام سیاسی جماعتوں کی بھرپور نمائندگی تھی اور اس ترمیم کی وجہ سے آئین میں دوررس تبدیلیاں آئیں۔ صوبوں نے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں خودمختاری دی جائے اور انتظامیہ میں مناسب حصہ دیا جائے۔ اس ترمیم کے ذریعے صوبوں کے اس مطالبے کو کافی حد تک تسلیم کرلیا گیا۔ قانون سازی کے امور سے متعلق کنکرنٹ لسٹ اس ترمیم کے ذریعے ختم ہوگئی اور اس لسٹ میں سے بہت سے امور صوبوں کو منتقل کردیئے گئے۔

اپنی پانچ سالہ مدت کے دوران قومی اسمبلی نے 15 بل منظور کئے۔ ان میں خواتین کے حقوق کو تحفظ دینے کے اقدامات بھی شامل تھے۔ مثال کے طور پر 2010ء کا کریمنل لأ (تیسری ترمیم) بل، خواتین کو کام کی جگہ پر ہراساں کرنے کے خلاف بل یعنی ہیرسمنٹ آف ویمن ایٹ ورک پلیس بل مجریہ 2010ء، کریمنل لأ (دوسری ترمیم) بل مجریہ 2011ء اور پریونشن آف اینٹی ویمن پریکٹسز بل مجریہ 2011ء چند ایک مثالیں ہیں۔ یہ تمام بل منظوری کے بعد ایکٹ (قانون) بن گئے۔ ایک بل ایسا تھا جس کی منظوری قومی اسمبلی نے دے دی لیکن سینٹ میں اس کی منظوری نہ ہوسکی۔ اس بل کا مقصد گھریلو تشدد کا خاتمہ تھا۔ پارلیمنٹ

کچھ علاقوں میں خواتین کو پہلی بار اپنے ووٹ ڈالنے کا موقع میسر ہوا

قانون ساز اداروں میں اقلیتوں کی نمائندگی بڑھانے میں بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

اس عرصے کے دوران ہونے والی قانون سازی کا ایک خصوصی پہلو حکومت کا یہ فیصلہ تھا کہ پرائیویٹ ممبرز بلز کو پیش کرنے سے نہ روکا جائے۔ 2008ء سے 2013ء کے دوران حکومت نے صرف یہ کہ پرائیویٹ ممبرز بل کو پیش کرنے سے نہ روکا بلکہ ان بلوں کی حمایت کی۔ اس عرصے میں 178 پرائیویٹ بل پیش ہوئے اور ان میں سے 10 کو قانون کی شکل دیدی گئی۔

قومی اسمبلی کے اس پانچ سالہ دور میں جو دوسرے اہم نکات تھے وہ درج ذیل ہیں جن کی نشاندہی فری اینڈ فیئر الیکشن نیٹ ورک (فافین) نے کی ہے:۔

☆ ایوان میں پیش کی جانے والی 336 قراردادوں میں سے 73 منظور کی گئیں۔

☆ اس عرصے میں 15213 سوالات پوچھے گئے جن میں سے صرف 123 سوالات کے جوابات نہیں دیئے گئے۔ یعنی صرف 20 فیصد سوالات کے جوابات نہ دیئے گئے۔

☆ خواتین ارکان اس حوالے سے بہت نمایاں رہیں کہ انہوں بہت زیادہ سوالات کئے' عوامی اہمیت کے مسائل اٹھائے اور متعدد پوائنٹس آف آرڈر اٹھائے۔

2013 کے دوران ہونے والا کام

16 مارچ کو قومی اسمبلی کی تحلیل' 11 مئی کو انتخابات کے انعقاد اور یکم جون کو نئی منتخب قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس کے انعقاد کی وجہ سے قانون سازی کی رفتار خاصی متاثر ہوئی۔ تاہم قومی اسمبلی کی تحلیل سے پہلے 2013ء میں 20 قوانین کو حتمی شکل دی گئی۔ ان قوانین میں ''دی انوسٹی گیشن فار فیئر ٹرائل ایکٹ' دی ٹریڈ آرگنائزیشن ایکٹ' دی ٹریڈ ڈویلپمنٹ اتھارٹی ایکٹ' دی پاکستان اکیڈیمی آف لیٹرز ایکٹ' دی پراونشل موٹر وہیکلز (امینڈمنٹ) ایکٹ' دی پاکستان کوائنیج (امینڈمنٹ) ایکٹ' دی دارالمدینہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد ایکٹ' دی ساوتھ ایشین سٹریٹجک سٹیبلٹی انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی اسلام آباد ایکٹ' دی ایم وائی یونیورسٹی اسلام آباد ایکٹ' دی میری ٹائم سکیورٹی ایجنسی (امینڈمنٹ) ایکٹ' دی فیڈرل اومبڈزمین انسٹی ٹیوشنل ریفارمز ایکٹ' دی ڈیفنس ہاوسنگ اتھارٹی اسلام آباد ایکٹ' دی اسلام آباد کیپٹیل ٹیریٹری پرائیویٹ ایجوکیشن انسٹی ٹیوشنز (رجسٹریشن اینڈ ریگولیشن) ایکٹ' دی اینٹی ٹیررزم (امینڈمنٹ) ایکٹ' دی اینٹی ٹیررزم (سیکنڈ امینڈمنٹ) ایکٹ' دی شہید ذوالفقار علی بھٹو میڈیکل یونیورسٹی (پی آئی ایم ایس) اسلام آباد ایکٹ' دی الیکشن لاز (امینڈمنٹ) ایکٹ' دی نیشنل کاؤنٹر ٹیررزم اتھارٹی ایکٹ' دی سیکورٹیز اینڈ ایکسچینج کمشن آف پاکستان (امینڈمنٹ) ایکٹ اور دی گلوبل چینج امپیکٹ سٹڈیز سینٹر ایکٹ 2013ء کو قوانین کی شکل دے کر ان کا نفاذ

کر دیا گیا۔

یکم جون کے بعد جو ایکٹ منظور کیے گئے ان میں اپالیشن آف دی ڈسکریشنری کوٹاز ان ہاوسنگ سکیمز ایکٹ 2013ء اور فنانس ایکٹ 2013ء شامل ہیں۔ لیکن قانون سازی کے جو دو اہم قوانین جنہیں صدر کے خصوصی اختیارات کے تحت نافذ کیا گیا وہ ہیں اینٹی ٹیررزم (امینڈمنٹ) آرڈی ننس اور دی پروٹیکشن آف پاکستان آرڈیننس

بہرحال جون تا دسمبر 2013ء کے دوران قومی اسمبلی میں جو سرکاری بل پیش کیے گئے وہ درج ذیل ہیں:۔

دی کانسٹی ٹیوشن (23 ویں ترمیم) ایکٹ' دی سروسز ٹریبونلز (امینڈمنٹ) ایکٹ' دی فیڈرل ایمپلائز بینولنٹ فنڈ اور گروپ انشورنس (امینڈمنٹ) ایکٹ' دی لیگل پریکٹشنرز اینڈ بار کونسلز (امینڈمنٹ) ایکٹ' دی فیڈرل کورٹ (ری پیل) ایکٹ' دی نیشنل جیوڈیشنل (پالیسی سازی) کمیٹی (امینڈمنٹ) ایکٹ' دی لاً اینڈ جسٹس کمشن آف پاکستان (امینڈمنٹ) ایکٹ' دی فیڈرل ایمپلائز بینولنٹ فنڈ اینڈ گرپ انشورنس (امینڈومنٹ) بل' دی کنٹونمنٹ لاز (امینڈمنٹ) ایکٹ اور دی اسلام آباد کیپیٹل ٹیریٹری لوکل گورنمنٹ ایکٹ۔

سیاسی جماعتیں

2013ء کے عام انتخابات نے ایک بار پھر پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں موجود متعدد خامیوں کی نشاندہی کی۔ یہ وہ خامیاں ہیں۔ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ملک میں صحیح جمہوری نظام کو فروغ دینے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

ہمارے ہاں کے سیاسی عمل میں صحیح معنوں میں منظّم سیاسی جماعتوں کا تصور ناپید ہے یوں کہہ لیجئے کہ یہ تصور ہی ہمارے لئے اجنبی ہے۔ تقریبا دو سو سیاسی جماعتوں میں سے ایک خاصی بڑی تعداد نے انتخابی دوڑ میں شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا اور ان میں سے 112 جماعتیں اس دوڑ میں شامل بھی ہوئیں۔ ان جماعتوں کی خواہش سے لگتا ہے کہ ان کے سربراہ محض اپنے وجود کو منوانا چاہتے ہیں لیکن وہ سیاسی وجود کے طور پر کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

تنظیمی امور میں ان کی عدم دلچسپی اس حقیقت سے واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے ایک سو کے قریب سیاسی جماعتوں نے پارٹی کے اندر انتخابات کرانے میں خاصی تاخیر کی۔ یہ برائے نام مشق تھی جو انہوں نے الیکشن کمشن کی طرف سے مقرر کردہ تاریخ سے ایک آدھ دن پہلے مکمل کر لی۔ ایک جماعت (تحریک انصاف) نے اس کام کو سنجیدگی سے لیا لیکن اسے بہت سے مسائل کا شکار ہونا پڑا جس سے سیاسی جماعتوں کے

اندر جمہوریت کی شکل وصورت کے بارے میں عام لوگ کافی بدمزہ ہوئے۔ مالی ضروریات بھی بادل نخواستہ پوری کی گئیں۔

یہ تصور کہ سیاسی جماعتوں کو سماج کی اکثریت کی ذہنیت کا عکس ہونا چاہئے تقریباً ناپید ہے۔ صرف چند سیاسی جماعتیں اس معیار کے قریب نظر آتی ہیں۔ اقلیتوں، خواتین اور چھوٹے موٹے کام کرنے والے لوگوں کو جماعتی ڈھانچے میں شامل کرنے کے بہت کم شواہد سامنے آئے۔ عام نشستوں پر انتخاب لڑنے کے لئے غیر مسلموں یا خواتین کو جماعتی ٹکٹیں دینے میں ناگواری کا احساس سامنے آیا۔ اگر کسی جماعت نے کسی غیر مسلم کو ٹکٹ دے بھی دی تو اسے ایسے حلقے سے انتخاب لڑنے کو کہا گیا جہاں سے اس کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے یا ایسے حلقے میں انتخاب لڑنے کے لئے ٹکٹ دی جہاں امیدوار کے عقیدے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی تعداد دوسرے حلقوں کی نسبت زیادہ تھی۔ زیادہ تر سیاسی جماعتوں نے اس بات کو نظر انداز کیا کہ مذہبی جنونی عناصر مسلمانوں کو کسی غیر مسلم یا خاتون امیدوار کو ووٹ دینے سے روکتے رہے۔ ملک کے کچھ حصوں میں ایسا بھی ہوا کہ امیدواروں اور سیاسی جماعتوں نے اتفاق رائے سے خواتین کو ووٹ ڈالنے سے روکا۔

پارٹی ٹکٹ دینے کے وقت پارٹیوں میں آنے جانے کے حوالے سے بہت زیادہ ہلچل دیکھنے میں آئی۔ وہ لوگ جن کے رشتے ناطے اور میل جول کافی لوگوں سے تھا اور ان کے پاس مالی وسائل بھی بہت تھے ان کے لئے پارٹی بدل کر ٹکٹ حاصل کرنا بہت آسان تھا۔ پارٹی ٹکٹ کے حصول کے لئے اہلیت صرف یہ تھی کہ آدمی انتخاب جیت سکتا تھا۔ یہ اہلیت پارٹی کے اصول وضوابط سے کہیں بالاتر تھی۔

اس سب کچھ کے باعث انتخابات میں شور شرابا زیادہ تھا اور یہ انتخابی جنگ بہت ہی مہنگی بن گئی۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ اس سے پاکستان میں مستحکم، ذمہ دارانہ اور جمہوری سیاست کو فروغ دینے کی راہ کافی حد تک نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

سفارشات

1۔ فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ الیکشن کمشن کے وژن اور اس کی ذمہ داریوں کو واضح کیا جائے اور اس کے انتظامی مہارت کو مستحکم کیا جائے تاکہ وہ مختلف سطحوں پر اور خاص طور پر پولنگ والے دن انتخابی عمل کی صحیح اور خاطر خواہ طریقے سے نگرانی کر سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ریٹرننگ افسروں اور پولنگ سٹاف کے حصول کے حوالے سے جوڈیشری اور بیوروکریسی پر انحصار نہ کیا جائے۔

2۔ امیدواروں کی اہلیت یا ڈس کوالیفکیشن کی شرائط جنرل ضیاٗ الحق نے اپنے طور پر تیار کی تھیں اور ان

شرائط کی تشریح اور توضیح ذاتی سطح پر کی جاتی رہی ہے۔تمام مبصرین اس بات پر متفق ہیں کہ ان شرائط کی وجہ سے کافی تکلیف دہ صورت حال پیدا ہوتی رہی ہے اور اگر ان شرائط کو ختم نہ کیا گیا تو اس سے مستقبل میں کافی انتشار پیدا ہوگا۔ان تمام شرائط کو بہر صورت ختم کر دینا چاہیے اور 1973ء کے آئین کے آرٹیکل 62 اور 63 کو ان کی اصل صورت میں نافذ کرنا چاہیے۔

3۔ پاکستان میں اس وقت تک صاف شفاف انتخابات ناممکن رہیں گے جب تک ووٹ ڈالنے کے حقدار تمام ووٹروں کو ایک ہی فہرست میں شامل نہیں کیا جاتا اور جب تک اقلیتوں' خواتین اور دوسرے محروم طبقات کو آزادنہ طورر پر انتخابی عمل میں شامل ہونے کا حق نہیں دیا جاتا۔اسکا واضح مطلب ہے کہ ان لوگوں کو ووٹ ڈالنے کے ساتھ ساتھ انتخاب لڑنے کا حق بھی دیا جائے۔

4۔ پاکستان میں جمہوری حکومت کو اس وقت تک مضبوط بنیادیں مہیا نہیں ہوسکتیں جب تک سیاسی جماعتیں اپنے تنظیمی ڈھانچوں کو جمہوری شکل نہیں دیتیں' شفافیت کو رائج نہیں کرتیں اور خود احتسابی کا عمل اپنے اندر پیدا نہیں کرتیں۔مزید برآں یہ بھی ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے فیصلے کرنے والی کونسلوں میں خواتین' اقلیتوں اور مزدوروں کسانوں کو نمائندگی دیں۔اس کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتوں کو چاہئے کہ نئے' انتخابات تک کے دورانی عرصے میں اپنے انتخابی حلقوں کے لوگوں کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہیں۔

5 - محروم طبقوں کے حقوق

خواتین

تمام شہری قانون کے روبرو، مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں اور مساویانہ قانونی تحفظ کے حق دار ہیں، محض جنس کی بنا پر کسی شہری کے خلاف امتیازی سلوک روانہیں رکھا جائے گا۔

کسی بھی شہری کو، جو پاکستان کی سروسز میں تقرری کی اہلیت رکھتا ہے، محض جنس کی بنا پر اسے تقرری کے سلسلے میں امتیازی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

قومی زندگی کے تمام شعبوں میں، خواتین کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ ریاست، شادی، خاندان اور ماں کو تحفظ فراہم کرے گی۔

ریاست اس بات کو یقینی بنائے گی کہ خواتین کو ان شعبوں میں ملازم نہ رکھا جائے جو ان کی جنس سے مطابقت نہیں رکھتے۔

آئین پاکستان [آرٹیکل نمبر25-27-35-37]

تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور وقار اور حقوق کے سلسلے میں مساویانہ حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔

اس اعلان میں جن آزادیوں اور حقوق کا ذکر ہے، ہر انسان ان پر بغیر کسی قسم کی تفریق کے حق رکھتا ہے۔

تمام انسان قانون کے روبرو مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں اور بغیر کسی تفریق کے، مساویانہ قانونی تحفظ کے مستحق ہیں۔

ہر بالغ مرد اور عورت، شادی کے دوران اور شادی کے خاتمہ کے سلسلے میں مساویانہ حقوق رکھتا ہے۔

شادی مرد و زن کی آزادانہ اور مکمل رضامندی کے مطابق طے پانی چاہیے۔

ہر فرد کو اپنے ملک کی پبلک سروس تک مساویانہ رسائی کا حق حاصل ہے۔

ماں اور بچہ خصوصی سلوک اور مدد کے مستحق ہیں۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل 1-2-7-16`21(2)-25(2)]

تشدد، امتیازی سلوک، عدم مساوات، معاشی حقوق کی نفی اور ان کا اپنے جسم و جاں پر اختیار کا فقدان جیسے متعدد مسائل 2013ء کے دوران بھی خواتین کو درپیش رہے۔ انہیں اکثر اوقات محض گھر سے باہر قدم رکھنے پر تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ 20 فیصد سے بھی کم خواتین کو اعلیٰ یا ثانوی تعلیم کے حصول تک رسائی مل سکی اور صرف 28 فیصد خواتین ایسی تھیں جو ملازمت سے وابستہ قرار دی گئیں۔ 2013ء کے دوران خواتین اور

نوجوان لڑکیوں کے ساتھ جنسی زیادتی اور قتل جیسے تشدد کے متعدد واقعات سامنے آئے اور اکثر اوقات مقتولین کی نعشوں کو ہی جلا دیا گیا۔ تین خواتین کو جنسی زیادتی کے بعد اس لیے قتل کیا گیا کہ ان کے قاتل کو یقین تھا کہ وہ اپنے اس اقدام سے ایڈز جیسے مرض سے صحت یاب ہوسکتا تھا۔ ملک بھر میں ایسے مجرموں کو سزا دینے کی شرح کم رہی۔ سندھ کے سوا کسی اور صوبے نے گھریلو تشدد، بالخصوص خواتین کے خلاف تشدد کے متعلق بل متعارف نہیں کروائے۔

مئی 2013ء کے انتخابات نے روایتی طور پر قدامت پسند قبائل اور جاگیردارانہ معاشرت سے سے تعلق رکھنے والی خواتین کو اپنے سیاسی حقوق منوانے کا موقع فراہم کیا۔ زیریں دیر اور تھرپارکر جیسے قدامت پسند علاقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین نے انتخابات میں حصہ لیا۔ انتخابات میں خواتین کی ووٹنگ کے حوالے سے پاکستان کی تاریخ کا بلند ترین تناسب ریکارڈ کیا گیا۔ ان انتخابات نے پہلی مرتبہ خواجہ سراؤں کو بھی اپنے خدشات کا اظہار کرنے کے لئے پلیٹ فارم مہیا کیا۔

دی ورلڈ اکنامک فورم کے گلوبل جینڈر گیپ 2013ء کی رپورٹ کے مطابق پاکستان صنفی عدم مساوات کے حوالے سے دنیا میں دوسرے نمبر پر تھا۔ تاہم پاکستان نے خواتین کے سیاسی اختیارات کے حوالے سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

معاشی اور سماجی حقوق (چیلنج اور مواقع)

پاکستان جنوبی ایشیاء کا وہ ملک ہے جہاں لیبر فورس اور معمول کی ملازمتوں میں خواتین کی شرکت سب سے کم تھی۔ صنف کی بنیاد پر اُجرت کا تفاوت، برقرار رہا حالانکہ خواتین وہی کام کرتی ہیں جو مرد کرتے ہیں۔ تاہم پاکستان میں ملازمت کرنے والی خواتین کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ عالمی بینک کی تازہ ترین عالمی ترقیاتی رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں 50 فیصد سے کم خواتین اور 80 فیصد کے قریب مرد برسر روزگار تھے۔ اس حوالے سے پاکستان میں خواتین کی شرح 28 فیصد اور مردوں کی 82 فیصد رہی۔ ادارہ شماریات پاکستان کے مطابق ملازمت پیشہ خواتین میں تنخواہ کی بنیاد پر کام کرنے والی خواتین کی تعداد ایک چوتھائی سے بھی کم تھی۔

اقوام متحدہ انسانی ترقی کی رپورٹ برائے 2013ء کے مطابق پاکستان میں 43.1 مردوں کے مقابلے میں صرف 18.3 فیصد خواتین کو ثانوی یا اعلیٰ تعلیمی سطح تک رسائی حاصل تھی۔ معمول کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی سطح تک نہ پہنچنے کے باعث خواتین کو معمول کے شعبوں میں ملازمت تلاش کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

خواتین کی اکثریت دیہی زرعی شعبے سے وابستہ تھیں۔ شہری علاقوں میں زیادہ تر خواتین گھریلو ملازمین کے طور پر غیر رسمی شعبے سے وابستہ تھیں۔ گھریلو ملازمین کے طور پر کام کرنے والی بہت سی کم سن لڑکیاں

خواتین کو ورک فورس میں شمار کیا جائے یا نہ کیا جائے، اُنہوں نے اپنے حصے سے کہیں زیادہ کام کیا

کم سے کم اجرت سے بھی کم پیسے کماتی تھیں۔ انہیں بعض اوقات بغیر کسی وقفے کے کام کرنا پڑتا تھا اور انہیں اُن قوانین کے تحت تحفظ حاصل نہیں تھا، جن کا مقصد مزدوروں کے استحقاق کا تحفظ تھا۔ گزشتہ برسوں کی طرح اس سال بھی گھریلو ملازمین کے خلاف تشدد کے متعدد واقعات پیش آئے۔ اکتوبر میں وزیر اعلیٰ سندھ نے کہا کہ گھروں میں کرنے والے مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے جلد ہی ایک بل پیش کیا جائے گا۔ تاہم سال کے آخر تک گھر پر کام کرنے والے مزدوروں کے لیے کوئی بھی قانون متعارف نہیں کروایا گیا تھا۔

پنجاب ویمنز ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ نے 15 دسمبر کو مزدوروں کی عالمی تنظیم (آئی ایل او) اور آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کے اشتراک سے ایک منصوبے کا آغاز کیا جس کا مقصد ایک ہزار خواتین کو گھریلو ملازمت میں تربیت فراہم کرنا تھا۔

ان خواتین کی استعداد کار کو بہتر بنانے کے بعد ان کا روزگار فراہم کرنے والے اداروں میں اندراج کیا گیا تاکہ انہیں روزگار مل سکے۔

دنیا بھر میں ہونے والی متعدد سٹڈیز کے مطابق زمین پر عورتوں کی ملکیت کے سبب غربت میں کمی ہوئی اور خاندانوں میں خوشحالی آئی۔ بنگلہ دیش میں ہونے والے ایک تحقیق کے مطابق جن خواتین کو خاندان کے مالی امور پر اختیار حاصل تھا وہ مردوں کی نسبت اپنے بچوں کو سکول بھیجنے اور ان کی دیکھ بھال پر زیادہ رقم خرچ کرتی تھیں۔ اگرچہ پاکستان کے قوانین خواتین کے ملکیتی حقوق کے خلاف کوئی امتیاز نہیں برتتے تاہم مسلمان خواتین کو ترکے میں مردوں کے نصف کے برابر حصہ دیا جاتا ہے۔ ادارہ برائے مستحکم معاشی پالیسی کی

جانب سے پاکستان میں خواتین کے حقوق اراضی سے متعلق کی جانے والی تحقیق کے مطابق، خواتین زمین کی مالک تو ہوتی ہیں لیکن عمومی طور پر انہیں اپنی زمینوں پر اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ آکسفوا اور سندھ ایگریکلچر اینڈ فوریسٹری ورکرز کوآرڈی نیٹنگ آرگنائزیشن (ایس۔اے۔ایف۔ڈبلیو۔سی۔او) نے عمرکوٹ میں 7 مارچ کو زمین سے متعلق ایک کیس کی سماعت کی تاکہ ہاری خواتین اپنے مسائل بتا سکیں۔ حکومت سندھ کی طرف سے جن 150 ہاری خواتین کو جنہیں کسانوں میں تقسیم کی جانے والی اراضی کے پروگرام کے تحت، زمینوں کے ملکیتی حقوق دیئے گئے تھے، وہ ان سول مقدمات پر ہی بات کرتی رہیں جو ان کے خلاف زمینداروں نے دائر کر رکھے تھے۔ اس سٹڈی سے جو نتیجہ سامنے آیا وہ یہ تھا کہ دیہی علاقوں میں خصوصاً اور باقی علاقوں میں عمومی طور پر خواتین کی حیثیت کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک ذرائع پیداوار پر ان کا کنٹرول نہ ہو۔

شعبہ قانون اور سیاست میں خواتین کی نمائندگی

سال کا آغاز بلوچستان اسمبلی کی جانب سے پہلی خاتون ڈپٹی سپیکر، بی این پی عوامی کی رکن ڈاکٹر فوزیہ مری کے انتخاب سے ہوا۔ انہیں بلا مقابلہ منتخب کیا گیا۔

پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کوئٹہ سے تعلق رکھنے والی ایک ہزارہ خاتون صغرا چنگیزی نے 14 دسمبر کو فارن سروس آف پاکستان (ایف ایس سی) میں شمولیت اختیار کی جو کہ سفارت کاری میں خواتین کی نمائندگی کے حوالے سے ایک اہم پیش رفت تھی۔ وفاقی شرعی عدالت کی 33 سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک 56 سالہ خاتون اشرف جہاں 31 دسمبر کو جج کے طور پر تعینات ہوئیں۔ اس سے پہلے وہ سندھ ہائی کورٹ میں ایڈیشنل جج کے طور پر کام کر چکی تھیں۔

دوسری طرف، اگرچہ بلوچستان اسمبلی میں 12 خواتین، بطور ارکان موجود تھیں، تاہم صوبے کی اتحادی حکومت نے 14 رکنی کابینہ میں خواتین یا اقلیتی گروہوں کو نمائندگی نہ دی۔ خواتین اراکین پارلیمنٹ نے اسے صنفی امتیاز قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ صوبوں کو اختیارات منتقل کرنے کا مقصد حکومت کو عوام کی ضروریات کے حوالے سے جوابدہ بنانا تھا لیکن خواتین اور اقلیتی گروہوں کو نظرانداز کرنے سے یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

28 اکتوبر کو خیبر پختونخوا حکومت نے ہر مرد قانون ساز کے لیے ایک کروڑ روپے کے ترقیاتی فنڈ جاری کیے اور بعد ازاں ان سب کو مزید 2,2 کروڑ روپے دیے جانے کا اعلان ہونا تھا۔ تاہم خواتین قانون سازوں کے لئے کسی قسم کے ترقیاتی فنڈ جاری نہ کیے گئے۔ حزب اختلاف اور حزب اقتدار سے تعلق رکھنے والی خواتین نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے اسمبلی کے اجلاس سے واک آؤٹ کیا۔ وزیر اعلیٰ نے ہر خاتون قانون ساز کے لیے 10 لاکھ روپے کا اعلان کیا تھا لیکن فنڈ جاری نہیں کیے گئے۔

متحرک قانون سازوں کی فہرست میں خواتین تعداد کے اعتبار سے زیادہ تھیں

پنجاب اور سندھ میں بلدیاتی قوانین اور تجاویز میں خواتین کی نمائندگی میں کمی پر شدید تشویش کا اظہار کیا گیا۔ سندھ میں بلدیاتی انتخابات میں خواتین کے لیے مخصوص نشستوں کا تناسب 33 فیصد سے کم کر کے 11 فیصد کر دیا گیا۔ پنجاب میں یہ شرح 15 فیصد تک کم کر دی گئی۔ خیبر پختونخوا میں ایک مسودہ قانون میں بلدیاتی اداروں میں خواتین کی نمائندگی 33 فیصد تجویز کی گئی۔

اسلامی نظریاتی کونسل خواتین مخالف احکامات جاری کرنے پر پورا سال ہدف تنقید بنی رہی۔ 23 ستمبر کو کونسل نے فرمان جاری کیا کہ ڈی این اے ٹیسٹ جنسی زیادتی کے واقعات کی تحقیقات میں مددگار ثابت تو ہو سکتے ہیں لیکن یہ جنسی زیادتی کا ارتکاب کرنے والوں کی شناخت کے حوالے سے اولین شہادت تصور نہیں کیے جا سکتے۔ اس نے اصرار کیا کہ اولین شہادت چار چشم دید مرد گواہوں کے بیانات ہونے چاہئیں۔ کونسل نے تحفظ نسواں ایکٹ 2006ء کو بھی یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ اس کی دفعات اسلامی احکامات کے خلاف تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ حدود قوانین خواتین کے خلاف ہونے والے تمام جرائم کا احاطہ کرتے ہیں اس لیے ایک علیحدہ قانون کی کوئی ضرورت نہیں۔ سول سوسائٹی کے متعدد کارکنوں اور قانون سازوں نے ان رجعت پسندانہ احکامات جاری کرنے پر اسلامی نظریاتی کونسل کو تحلیل کرنے کا مطالبہ کیا۔

8 جون کو سپریم کورٹ نے ایک مقدمے کی سماعت کے دوران اظہار خیال کیا کہ اگر والدین طلاق کے بعد دوسری شادیاں کر لیتے ہیں تو ایسی صورت میں کوئی بھی کم سن بچی ماں کی نسبت باپ کی تحویل میں زیادہ محفوظ رہ سکتی ہے۔ چیف جسٹس نے کہا کہ دوسری شادی کر لینے کے باوجود صرف باپ ہی کم سن بچی کی کفالت

کر سکتا ہے۔ عدالت نے واضح کیا کہ اگر ماں دوسری شادی کرلے تو سوتیلا باپ بچی کے لیے غیر محرم ہوگا۔ اگرچہ جنوبی ایشیا میں مامتا کو نہایت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے تاہم ایسے فیصلوں سے اس تصور کو تقویت ملتی تھی کہ خواتین اپنے بچوں کا خیال رکھنے کی اہل نہیں۔

قانون کے تحت جسمانی یا نفسیاتی تکلیف پہنچانے کی ممانعت ہے تاہم ضابطہ تعزیرات پاکستان میں ''گھریلو تشدد'' کی اصطلاح کی تشریح نہیں کی گئی۔ 12 ستمبر کو لاہور میں ایک تربیتی ورکشاپ کے دوران وزیر بہبود آبادی نے کہا کہ خواتین کے خلاف ''گھریلو تشدد'' کے حوالے سے قانون سازی کا عمل مکمل ہونے والا ہے اور اسے جلد ہی اسمبلی میں پیش کر دیا جائے گا۔ 2013ء کے آخر تک یہ بل اسمبلی میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔

اگست میں انسانی حقوق کے ایک ہزار سے زائد کارکنان، وکلاء اور شہریوں نے ایک درخواست دائر کی جس میں انہوں نے مطالبہ کیا کہ ذہنی طور پر معذور ایک خاتون کو جسے 1991ء میں قتل کے جرم میں موت کی سزا سنائی گئی تھی پھانسی نہ دی جائے۔

ملتان میں ایک مقامی تاجر نے ایک نامور سیاسی رہنما شیری رحمان کے خلاف سپریم کورٹ میں ایک درخواست دائر کی جس کے بعد پولیس نے ان کے خلاف تضحیک مذہب کا مقدمہ درج کر لیا۔ اس سے پہلے مدعی نے درخواست کی تھی کہ شیری رحمان کے خلاف مقدمہ درج کرنے کی ہدایات جاری کی جائیں، جسے ماتحت عدالتیں مسترد کر چکی تھیں۔ اس مقدمے کے باعث شیری رحمان کی زندگی کو لاحق خطرات میں نمایاں اضافہ ہو گیا۔

16 اگست کو عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) کی رہنما نجمہ حنیف کو پشاور کے علاقے حیات آباد میں ان کے گھر کے باہر گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ ان کے شوہر جو کہ صوابی کے ناظم رہ چکے تھے، اور بیٹا 2011ء میں ایک خودکش حملے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ کسی بھی گروہ نے واقعے کی ذمہ داری قبول نہیں کی لیکن یہ کہا جاتا تھا کہ انہیں اے این پی کی رکن اور سیاسی طور پر سرگرم خاتون ہونے کی بنا پر قتل کیا گیا۔

تیسری جنس کے مسائل

ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں خواجہ سراؤں کی تعداد اندازاً پانچ لاکھ تھی۔ انہیں عموماً تقریبات میں رقص کے ذریعے لوگوں کو محظوظ کرنے والے اداکاروں یا بھکاریوں کے طور پر قبول کیا گیا تھا۔

2011ء میں سپریم کورٹ کے ایک حکم میں انہیں بالآخر مرد یا خاتون کی بجائے تیسری جنس کے طور تسلیم کر لیا گیا۔ اس کی بدولت انہیں تیسری جنس کے طور پر شناختی کارڈ کے حصول کا موقع ملا۔ مئی 2013ء کے انتخابات میں تیسری جنس کو پہلی مرتبہ ووٹر اور امیدوار کے طور پر شرکت کا موقع ملا۔

تیسری جنس سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد نے بطور امیدوار انتخابات میں حصہ لیا

تیسری جنس سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد نے انتخابات میں حصہ لیا۔ ان میں لبنیٰ لال بھی شامل تھیں جن کا تعلق جہلم سے تھا۔ اسی طرح بندیا رانا نے کراچی میں صوبائی اسمبلی کی نشست کے لیے انتخاب لڑا۔ وہ ایک سماجی کارکن تھیں اور جنسی زیادتی کے متاثرین اور بیروزگار افراد کی مدد کرتی تھیں۔ یہ دونوں انتخابات میں کامیابی حاصل تو نہ کر سکیں لیکن انہوں نے دوسروں کے لیے ایک مثال قائم کی۔

جنس کی بنیاد پر علیحدہ کیے گئے ووٹروں کے متعلق الیکشن حکام کے جاری کردہ کوائف تیسری جنس کے بطور ووٹر انتخابات میں شرکت کرنے کے حوالے سے خاموش ہیں۔ سال 2013ء میں خواجہ سراؤں کے خلاف ایذا رسانی، جنسی زیادتی اور تضحیک آمیز سلوک کے کئی واقعات پیش آئے۔

22 جنوری کو تقریباً 50 خواجہ سراؤں نے مبینہ طور پر دو خواجہ سراؤں سے ایک تقریب کے دوران قیمتی اشیا چھینے جانے کے خلاف رحیم یار خان پریس کلب کے باہر مظاہرہ کیا۔

8 مئی کو اسلام آباد کے علاقے ایف 11 میں ایک بیس سالہ خواجہ سرا کو اس کے گھر میں بندوق کی نوک پر جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا لیکن پولیس نے ملزمان کے خلاف مقدمہ درج کرنے سے انکار کر دیا۔

28 مئی کو پشاور کے علاقے امامیہ کالونی میں ہونے والے ایک بم دھماکے میں 2 افراد جاں بحق اور 17 زخمی ہو گئے جس کے بعد وہاں پر مقیم خواجہ سراؤں کو علاقے سے بے دخل کر دیا گیا کیونکہ لوگوں کے خیال میں وہ ان کے لیے بدقسمت ثابت ہوئے تھے۔ ان کے تقریباً چالیس بکنگ آفس بند کر دیے گئے چونکہ مقامی

طالبات کونشانہ بنایا گیا

15 جون کو کوئٹہ میں سردار بہادر خان ویمن یونیورسٹی کی ایک بس میں زوردار دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں 15 لڑکیاں جاں بحق اور 22 زخمی ہوگئیں۔ دھماکے کے بعد بس میں آگ لگ گئی جس کے باعث متعدد لڑکیاں بری طرح جھلس گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حملہ تعلیم کے حصول کی خواہش رکھنے والی لڑکیوں کے لیے ایک انتباہ تھا۔ جب ایچ آر سی پی کے ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے بلوچستان کا دورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ دہشت گردی کی کارروائیوں کے ذریعے انہیں زیر نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سی لڑکیوں نے صحت یاب ہونے کے بعد کالج جانے کی خواہش ظاہر کی۔

لوگوں نے انہیں ''تمام برائیوں کی جڑ'' قرار دیا۔ اکتوبر میں خواجہ سراؤں اور رہائشیوں کے بیچ ہونے والے جھگڑے کے بعد، خواجہ سراؤں نے شکایت درج کروانے کے لیے پولیس سے رابطہ کیا لیکن ان کی درخواست پر کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ خواجہ سراؤں نے جی ٹی روڈ پر رکاوٹیں کھڑی کر کے احتجاج کیا جس پر پولیس نے انہیں مارا پیٹا اور ان کی تنظیم کے صدر کو بُری طرح زخمی کر دیا۔

خواتین اور انتخابی عمل

☆ بادام زری (باجوڑ): بادام زری وہ پہلی خاتون تھیں جنہوں نے پاکستان کے انتہائی قدامت پسند قبائلی علاقے سے عام انتخابات میں حصہ لیا۔ باجوڑ ایجنسی کے حلقہ این اے 44 سے انتخاب لڑنے والی زری کی خواہش تھی کہ لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ دی جائے جس سے وہ خود محروم رہی تھیں۔ ان کے خیال میں مقامی لوگوں کے لیے سڑکیں تعمیر کرنے اور انہیں صحت کی سہولیات فراہم کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ انتخابات میں کامیاب تو نہ ہو سکیں لیکن انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے انتخابات میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں گی۔

☆ نصرت بیگم (دیر زیریں): دیر زیریں سے تعلق رکھنے والی نصرت بیگم نے قومی اسمبلی کے حلقہ این اے 34 سے آزاد امیدوار کے طور پر کاغذات نامزدگی جمع کروائے۔ وہ پاکستان تحریک انصاف کی ضلعی نائب صدر تھیں لیکن انہوں نے آزادانہ طور پر انتخاب لڑا۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں وہ اور ان کا شوہر جو ایک مقامی سکول میں سکیورٹی گارڈ تھا، ایک کمرے کے گھر میں رہتے تھے۔

انہوں نے علاقے کی خواتین کو قائل کیا کہ وہ ان کی پیروی کریں اور انتخابات میں ووٹ ڈالیں۔

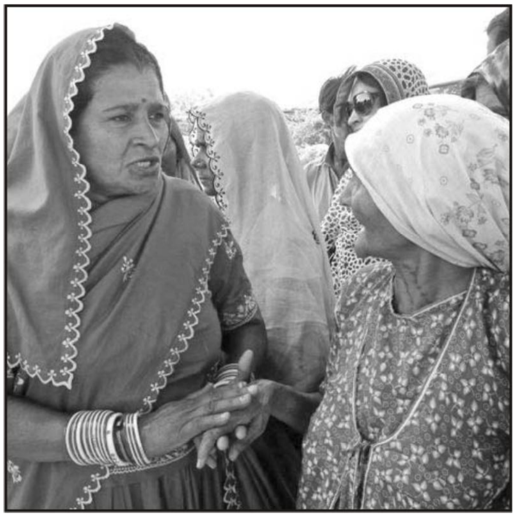

ویروکوہلی انتخاب تو ہار گئیں لیکن اُنہوں نے خواتین کو نیا راستہ دکھا دیا

☆ ویرو کوہلی (حیدر آباد): ویرو کوہلی نے حیدر آباد پی ایس 50 سے آزاد امیدوار کے طور پر انتخابات میں حصہ لیا۔ وہ ایک بے زمین ہاری کے گھر پیدا ہوئی تھی اور اس کی شادی بھی ایک ہاری کے ساتھ ہوئی جس کے بعد اس نے اپنے اہل خانہ کے ساتھ فرار ہونے اور قرضوں کی قید سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ وہ انتخاب تو نہ جیت سکی تاہم اس حقیقت کا ایک اہم پیش رفت کے طور پر خیر مقدم کیا گیا کہ اس کی برادری کی ایک خاتون نے انتخاب میں حصہ لیا تھا۔

☆ حاجیانی لانجو (تھر پارکر): حاجیانی لانجو، ایک سماجی کارکن اور وکیل تھیں، پاکستان کی تاریخ کی وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے تھر پارکر کے حلقہ این اے 229 سے انتخاب لڑا اگرچہ انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن سول سوسائٹی نے طاقتور لوگوں کا مقابلہ کرنے پر انہیں خراج تحسین پیش کیا۔

مئی 2013ء کے عام انتخابات خواتین کی ووٹرں اور امیدواروں کے طور پر شرکت کے حوالے سے ایک مثبت تصویر پیش کرتے ہیں۔ یو این ویمن کے مطابق مئی 2013ء کے عام انتخابات میں خواتین کے ووٹ ڈالنے کا تناسب 40 فیصد رہا جو کہ پاکستان کی تاریخ میں سب سے بلند شرح تھی۔ 2008ء میں 195 جبکہ 2013ء میں 448 خواتین نے انتخابات میں حصہ لیا۔

قومی اسمبلی کے 105 حلقوں سے مجموعی طور پر 147 خواتین نے عام نشستوں پر انتخاب لڑا۔ صوبائی سطح پر 301 خواتین نے 203 عام نشستوں پر انتخاب لڑا۔

سیاسی جماعتوں میں پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) نے عام نشستوں کے لیے خواتین کو سب سے زیادہ ٹکٹ دیئے۔ دیگر جماعتوں میں پاکستان مسلم لیگ (ن) اور متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) شامل تھیں۔

سیاسی جماعت	خواتین کو دی گئیں ٹکٹوں کی تعداد
پاکستان پیپلز پارٹی	11
پاکستان مسلم لیگ (ن)	7
پاکستان تحریک انصاف	4
پاکستان مسلم لیگ (ق)	4
عوامی نیشنل پارٹی	2
متحدہ قومی موومنٹ	7

سیاسی جماعتوں اور امیدواروں کی جانب سے خواتین کو انتخاب میں ووٹ ڈالنے سے روکنے کا سلسلہ مکمل طور پر ختم نہ ہو سکا۔

دیر بالا میں تمام سیاسی جماعتوں کے درمیان طے پانے والا ایک معاہدہ منظر عام پر آیا جس میں خواتین کو عام انتخابات میں ووٹ ڈالنے سے روکا گیا۔ نتیجے کے طور پر دیر میں صرف مردوں نے قومی اسمبلی کے ایک نمائندے اور صوبائی اسمبلی کے تین نمائندوں کے انتخاب کے لیے ووٹ ڈالے۔ اس معاہدے کے باعث 138,905 خواتین ووٹر ووٹ ڈالنے کے حق سے محروم رہیں۔ ایک مذہبی جماعت کے نمائندے کا کہنا تھا کہ یہ پابندی سکیورٹی خدشات کے پیش نظر عائد کی گئی تھی۔ ذرائع کے مطابق انہوں نے کہا کہ ''خواتین کی انتخابات میں بطور ووٹر شرکت سیاسی جماعتوں کے لیے مشکلات پیدا کرنے کا سبب بن سکتی تھی، اور ہم اس سے گریز کرنا چاہتے تھے۔'' بنوں کے حلقہ پی کے 70 میں مقامی عمائدین نے امیدواروں کے ساتھ مل کر 22 اگست کو ہونے والے صوبائی اسمبلی کے ضمنی انتخابات کے موقع پر دو پولنگ سٹیشنوں میں خواتین کو ووٹ ڈالنے سے روک دیا۔ تاہم وزیر اعلیٰ خیبر پختونخوا نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ صوبے میں کہیں بھی خواتین کو ووٹ ڈالنے سے نہیں روکا گیا۔ انتخابات سے توقعات رکھنے والی چند خواتین کو بالواسطہ طور پر دھمکایا گیا تاکہ انہیں سٹیٹس کو کی مزاحمت کرنے سے روکا جا سکے۔ جنوری میں این اے 200 ضلع گھوٹکی سے پی ایم ایل (ن) سے تعلق رکھنے والی خاتون امیدوار کے گھر پر پانچ مسلح افراد نے دھاوا بول دیا اور انہیں دھمکی دی کہ وہ انتخابات سے دستبردار نہ ہوئیں تو انہیں سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے۔ چار خواتین نے پشاور ہائی کورٹ سے رجوع کر کے یہ مطالبہ کیا کہ قومی اسمبلی کے حلقہ این اے 5 (نوشہرہ) جہاں ضمنی انتخابات میں خواتین کو ووٹ ڈالنے سے روکا گیا تھا، میں دوبارہ پولنگ کرائی جائے۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کے پانچ سو پولنگ سٹیشنوں پر

فعال شرکت کے باعث پاکستان میں خواتین کے ووٹ ڈالنے کی شرح بہت زیادہ رہی

خواتین ووٹروں کا ٹرن آؤٹ صفر رہا تھا۔

اگست میں خیبر پختونخوا کی نشست پی ایف 42 ہنگو کے لیے ووٹ ڈالنے والی خواتین کو تحریک طالبان پاکستان نے جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ ٹی ٹی پی نے ایسی ہی ایک دھمکی 11 مئی کے عام انتخابات کے دوران بھی دی تھی۔

11 جون کو لاہور ہائی کورٹ میں دائر کی گئی ایک درخواست میں قانون ساز اسمبلیوں میں خواتین کے لیے مخصوص نشستوں کو ختم کرنے کی درخواست کی گئی۔ درخواست گزار نے دلیل پیش کی کہ یہ نشستیں صرف مراعات یافتہ خواتین کو دی جاتی ہیں اور چونکہ انہیں منتخب کرنے کی بجائے نامزد کیا جاتا ہے اس لیے وہ عوام کی حقیقی نمائندہ نہیں۔

درخواست گزار نے یہ بھی واضح کیا کہ خواتین کے لیے مخصوص نشستیں غیر قانونی، غیر آئینی اور قومی خزانے پر بوجھ ہیں۔ بظاہر 2013ء میں مقدمے کی سماعت نہیں ہوئی۔

سول سوسائٹی کی تنظیموں نے مطالبہ کیا کہ الیکشن کمیشن بلوچستان کے ان علاقوں میں بلدیاتی انتخابات کو کالعدم قرار دے جہاں خواتین کو ووٹ ڈالنے سے روکا گیا۔ ای سی پی کے سربراہ کو دسمبر 2013ء کے بلدیاتی انتخابات کے بعد لکھے گئے ایک خط میں کہا گیا کہ نوشکی، کوئٹہ، مستونگ، چمن اور چاغی میں خواتین کو ووٹ ڈالنے سے روکا گیا۔ خواتین کے متعدد پولنگ سٹیشنوں پر خواتین کا عملہ بھی موجود نہیں تھا، ای سی پی

خواتین کو جبری طور پر ووٹنگ کے عمل سے بے دخل کرنے پر کوئی بھی کارروائی کرنے میں ناکام رہا۔ حالانکہ ایسے اقدامات قانون کے تحت جرائم کے زمرے میں آتے تھے اور الیکشن کمیشن کے پاس ان علاقوں میں انتخابات کے نتائج منسوخ کرنے کا اختیار تھا، جہاں خواتین کو ووٹ ڈالنے سے روکا گیا۔

خواتین اور قانون کا نفاذ

اس بات کے قطع نظر کہ خواتین قانون کے اس طرف تھیں یا اس طرف، انہیں پریشانیوں اور تکالیف کا سامنا رہا۔ پنجاب پولیس کے سرکاری اعداد وشمار کے مطابق صوبے میں خواتین پولیس سپرنٹنڈنٹس کی کل تعداد 9 (146 میں سے) اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹس کی تعداد 35، (474 میں سے) تھی۔ صوبے میں خواتین کے صرف 3 تھانے موجود تھے، جن میں سے ایک لاہور، ایک راولپنڈی اور ایک فیصل آباد میں تھا۔ پولیس میں خواتین افسروں کی ایک معقول تعداد موجود تھی لیکن مجموعی طور پر پاکستان بھر میں ان کی تعداد بہت کم تھی اور انہیں اہم عہدے نہیں دیئے جاتے تھے۔ وہ سڑکوں پر شاذونادر ہی دکھائی دیتیں کیونکہ یہ تصور کرلیا گیا تھا کہ انہیں ہراساں کیا جاسکتا تھا۔ 2013ء کے آخر میں صوبہ خیبر پختونخوا کے 60,000 پولیس اہلکاروں میں صرف 560 خواتین تھیں۔

تھانہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں خواتین ضرورت پڑنے پر بھی جانے سے گریز کرتی ہیں۔ بہت سے علاقوں میں شکایات کے اندراج کی غرض سے تھانوں میں جانے والی خواتین کو ہراساں کرنے میں پولیس ملوث تھی۔

مئی میں پولیس نے بہاولپور کے ایک گاؤں میں ایک گھر پر چھاپہ مار کر ایک خاتون کو شدید زخمی کردیا جبکہ ایک اور خاتون کا بازو توڑ دیا۔ پولیس، جس نے بظاہر شراب برآمد کرنے کے لیے چھاپہ مارا تھا، زبردستی لوگوں کے گھروں میں داخل ہوگئی اور انہیں ہراساں کیا۔ احتجاج کرنے والی خواتین کو لاٹھیوں اور رائفلوں سے زدوکوب کیا گیا۔ ان دونوں خواتین کا تعلق ہندو برادری سے تھا۔ پولیس گھر سے شراب برآمد کرنے میں ناکام رہی۔

8 اپریل کو اقراء یونیورسٹی اسلام آباد کی ایک طالبہ کو اس کے ایک ہم جماعت کے قتل کے مقدمے میں غلط طور پر ملوث کرلیا گیا اور اسے ایک رات کے لیے تھانہ انڈسٹریل ایریا میں بند رکھا گیا تاکہ اس سے اقبال جرم کروایا جاسکے۔ شبہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ لڑکے نے خودکشی کی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ شبہ درست ثابت ہوا۔

خواتین قیدیوں کو تنگ جگہوں میں رکھا جاتا رہا۔ ان کی چارپائیاں ایک دوسرے کے اوپر بچھائی جاتی تھیں اور جیل حکام اکثر اُن کے ساتھ بُری طرح پیش آتے اور ان کے اہل خانہ کبھی کبھار ہی ان سے

ملاقات کے لیے آتے کیونکہ وہ اپنے خاندان کے لیے ذلت کا باعث بنی تھیں۔ ایچ آر سی پی کو دستیاب اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی جیلوں میں ایک ہزار سے زائد خواتین قید تھیں۔ جیلوں میں مستند ڈاکٹروں کا فقدان ان خواتین کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ کم سن لڑکیوں کے لیے علیحدہ سیل موجود نہیں تھے۔

26 مئی کو خیبر پختونخواہ حکومت نے پشاور میں ایک ہنر ایک نگر (اے ایچ اے این) منصوبے کا آغاز کیا۔ اس منصوبے کا مقصد جیلوں میں قید خواتین کو فنی تربیت فراہم کرنا تھا۔ منصوبے کے تحت پشاور اور ہری پور کی سنٹرل جیلوں میں 100 خواتین کو فنی تربیت فراہم کی جاتی تھی۔ جیلوں میں قید خواتین کو معاشرے کے مفید رکن بنانے کے لیے ایسے کئی منصوبوں کی ضرورت تھی۔

خواتین کے خلاف تشدد

سال 2013ء میں 56 خواتین کو محض لڑکی پیدا کرنے پر قتل کر دیا گیا۔ ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق 150 خواتین تیزاب حملوں، گیس کے اخراج اور چولہا پھٹنے کے واقعات میں جھلس گئیں۔ ان میں سے 40 کی موت واقع ہوگئی۔ میڈیا کے مطابق گھریلو تشدد کے تقریباً 389 واقعات پیش آئے۔ ان کے قاتل عام طور پر ان کے خاوند تھے۔ 2013ء میں 800 سے زائد خواتین نے خودکشی کی جس کی اہم وجہ گھریلو تنازعات تھے۔

رُٹجرز ورلڈ پاپولیشن فاؤنڈیشن (ڈبلیو، ایف پی) کی جانب سے ڈیرہ غازی خان، مظفرگڑھ، جیکب آباد، کشمور، جعفرآباد اور نصیرآباد کے اضلاع میں کی گئی تحقیق کے مطابق انٹرویو دینے والی خواتین میں سے 66 فیصد کا کہنا تھا کہ انہیں جنسی تشدد کا سامنا کرنا پڑا، جبکہ 93 فیصد خواتین کا کہنا تھا کہ انہیں ان کے شوہروں نے ان کی مرضی کے خلاف جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا۔ یہ تشدد کی وہ قسم ہے جس کا ضابطہ تعزیرات پاکستان میں کوئی ذکر نہیں۔ سروے میں یہ بھی پتہ چلا کہ 77 فیصد شادیاں مختلف روایات جیسے کہ ونی، وٹہ سٹہ وغیرہ کے تحت طے کی جاتی تھیں۔ انٹرویو دینے والی تین چوتھائی خواتین کا یہ بھی کہنا تھا کہ انہیں جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

پنجاب پولیس کے جرائم سے متعلق اعداد و شمار کے مطابق صرف 2013ء میں خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی کے 2,576 مقدمات درج کیے گئے۔ خیبر پختونخوا حکومت کے جرائم سے متعلق اعداد و شمار کے مطابق جنسی زیادتی کے 127 اور اجتماعی زیادتی کے تین مقدمات درج کیے گئے۔ سندھ میں اجتماعی زیادتی کے 27 واقعات منظر عام پر آئے۔ خواتین کے خلاف جنسی اور دیگر اقسام کے تشدد کے واقعات میں سزایابی

کی شرح انتہائی کم رہی۔ 13 دسمبر کو خواتین اراکین سینٹ نے دارالحکومت میں جنسی تشدد کے واقعات میں سزا یابی کے فقدان کے خلاف سینٹ سے واک آؤٹ کیا۔

سال 2013ء کے دوران خواتین کے خلاف تشدد کے متعدد واقعات منظر عام پر آئے۔ اوکاڑہ کے گاؤں بھوکاں میں ایک خاتون ڈاکٹر کے پاس گئی جہاں ایک شخص نے اسے اسلحے کے زور پر اغوا کر کے چار نامعلوم افراد کے حوالے کر دیا۔ ملزمان اسے رحیم یار خان لے گئے اور اسے دو لاکھ روپے کے عوض ایک اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا جس نے اسے قید کر کے دو ماہ تک زیادتی کا نشانہ بنایا۔ بعدازاں اسے ایک نئے خریدار کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا جس نے اسے مزید دو ماہ تک زیادتی کا نشانہ بنایا۔ اسے مجموعی طور پر چھ مرتبہ فروخت کیا گیا اور اسے خریدنے والے تمام افراد نے اسے بدسلوکی اور جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔ وہ 4 جنوری کو فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی اور میڈیا کو اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی تفصیلات بتائیں۔

فروری میں ایک شخص اور اس کی بیوی نے تین خواتین کے قتل کا اعتراف کر لیا جن میں ایک 11 سالہ بچی بھی شامل تھی۔ تینوں خواتین کو قتل سے پہلے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ذرائع کے مطابق ملزم ایڈز کا مریض تھا اور اسے یقین تھا کہ کنواری لڑکیوں سے جنسی اختلاط کرنے سے وہ صحت یاب ہوسکتا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے 11 سالہ لڑکی کو اغوا کیا جو کہ ان کے پاس ٹیوشن پڑھنے آتی تھی۔ ملزم نے اس کے ساتھ زیادتی کرنے کے بعد جرم کا ثبوت مٹانے کے لیے اسے قتل کر دیا اور نعش کو آگ لگادی۔ جب مجرموں کو گرفتار کیا گیا تو انہوں نے ایک 9 سالہ بچی اور ایک پولیس اہلکار کی 22 سالہ بیٹی کے قتل کا بھی اعتراف کر لیا۔ ایسے واقعات کا سبب نہ صرف ناخواندگی اور توہم پرستی بلکہ مجرموں کا یہ یقین بھی تھا کہ وہ سزا سے بچ جائیں گے۔

ستمبر میں ایک واقعہ اس وقت میڈیا کا زینت بنا جب ایک 13 سالہ لڑکی نے اپنے سوتیلے باپ کے خلاف مقدمہ درج کروایا۔ اس نے اپنے سوتیلے باپ پر الزام عائد کیا کہ اس نے اسے کئی مرتبہ جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا تھا اور اس کی بہن کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔ 3 دسمبر کو ملزم کو اسلام آباد میں اس کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ اسے جنسی زیادتی اور جعلی نکاح کرنے کے الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا۔

6 فروری کو ایف آئی اے کے ایک افسر کو ایک نوجوان خاتون کے ساتھ زیادتی کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ ملزم نے اسے نوکری دلانے کا وعدہ کیا تھا۔

جرگوں اور پنچائتوں کی جانب سے غیرت کے نام پر خواتین کے ساتھ تضحیک آمیز سلوک کے متعدد واقعات منظر عام پر آئے۔ مارچ میں لاہور میں ایک خاتون کو برہنہ رقص کرنے پر مجبور کیا گیا، اس پر تشدد کیا گیا اور گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹا گیا۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو ایک مقامی جرائم پیشہ گروہ کے رکن سے بچانے کی

باشعور شہریوں نے جنسی تشدد کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا

کوشش کر رہی تھی۔ اگرچہ واقعے کا مقدمہ درج کر لیا گیا تاہم مجرم عبوری ضمانت پر رہا ہو گئے۔

28 مئی کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک نوجوان جوڑے کی نعشیں قریبی گاؤں سے برآمد ہوئیں۔ ان دونوں افراد نے چند روز پہلے گھر سے فرار ہو کر پسند کی شادی کر لی تھی۔ یہ شبہ ظاہر کیا گیا کہ لڑکی کے رشتہ داروں نے اُسے اور لڑکے کو قتل کیا تھا۔

مدرسے کے معلم بھی قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے والی نوجوان لڑکیوں کے ساتھ جنسی زیادتی میں ملوث پائے گئے۔ 28 جولائی کو لاہور کے ایک مدرسے کے معلم کے خلاف ایک طالبہ کو اغوا کرنے، اسے دو ماہ تک قید رکھنے، اسے متواتر جنسی درندگی کا نشانہ بنانے اور جعلی نکاح نامہ بنوانے کا مقدمہ درج کیا گیا۔

ملتان میں اگست میں احمد عزیز نامی مذہبی پیشوا نے برقع نہ پہننے اور اپنے تین بچوں کو سکول بھیجنے پر اپنی بیوی کو قتل کر کے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

پاکستان میں ایک عام تصور پایا جاتا ہے کہ عورت کو اپنی سلامتی کے لیے گھر کی چاردیواری میں رہنا چاہیے۔ ایسے عقائد کے حامل مرد گھروں میں خواتین پر ہونے والے تشدد کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ 3 جولائی کو فیصل آباد کی دستگیر کالونی کے رہائشی نے اپنی بہو سے جنسی زیادتی کی کوشش کی جب لڑکی نے مدد کے لئے چیخ و پکار کی تو اس نے چاقو سے اس کی ناک کاٹ دی اور اسے ایک چھڑی سے بُری طرح زدوکوب کیا۔ ہمسائیوں نے مداخلت کی اور لڑکی کو ہسپتال لے گئے جہاں کئی روز تک اس کی حالت نازک رہی۔ ملزم نے اس بات کی بھی پرواہ نہ کی کہ وہ پانچ ماہ کی حاملہ تھی۔

دیگر خواتین کو محض کام کاج اور خریداری کے لیے گھر سے باہر نکلنے پر نشانہ بنایا گیا۔ 25 اکتوبر کو شیخوپورہ میں دو خواتین کو اس وقت گولی مار کر قتل کر دیا گیا جب وہ اپنے مقتول شوہروں کے مقدمات کی پیروی کے لیے عدالت گئیں۔ دونوں بہنوں کو مبینہ طور پر ان افراد نے قتل کیا جن کا تعلق ان کے مخالف گروہ سے تھا اور جنہوں نے تین سال قبل ان کے شوہروں کو قتل کیا۔

اکتوبر میں چیچہ وطنی میں ایک گروہ نے سکول یا خریداری کے لیے جانے والی 25 سے 30 خواتین اور لڑکیوں کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ ملزمان کو گرفتار نہیں کیا جا سکا۔ 19 نومبر کو سیالکوٹ کے علاقے بھید پھلی میں گورنمنٹ نرسنگ سکول کی نرس کی لاش برآمد ہوئی۔ اس کے اہل خانہ کا کہنا تھا کہ اسے نامعلوم افراد نے جنسی زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد گلا گھونٹ کر قتل کیا تھا۔

6 اگست کو ایک خاتون نے لاہور کی عدالت میں اپنے خاوند اور سسرالیوں کے خلاف درخواست دی۔ خاتون کا کہنا تھا کہ اس کے خاوند اور سسرالیوں نے ایک عامل کے حکم پر اس کی بیٹی کو قتل کر دیا تھا۔ ابتداء میں سمن آباد پولیس نے مقدمہ درج کرنے انکار کر دیا اور صرف عدالت کے احکامات جاری ہونے پر کارروائی کی۔ 2 دسمبر کو بہاولپور کے علاقے جناح کالونی میں ایک شخص نے لڑکی پیدا کرنے پر اپنی بیوی پر تیزاب پھینک دیا جس کے نتیجے میں وہ بُری طرح جھلس گئی۔ 22 سال خاتون کا کہنا تھا کہ اس کا خاوند جانتا تھا کہ وہ لڑکی کو جنم دینے والی تھی، وہ اسے سرعام زدوکوب کرتا اور گالیاں دیتا۔ جب اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو وہ نومولود بچی کو اپنے ساتھ لے گیا اور اسے نہر میں پھینک دیا۔ جب وہ خالی ہاتھ گھر آیا اور اس کی بیوی نے احتجاج کیا تو اس نے تیزاب سے بھرا جگ جو کہ وہ اپنے ساتھ لایا تھا، اِس پر انڈیل دیا جس کے نتیجے میں وہ بُری طرح جھلس گئی۔

ستمبر میں سوات کی تحصیل مٹہ کے گاؤں خاریرئی میں ایک خاتون کانسٹیبل کو اس کے سسر نے اس کے باپ کے گھر میں قتل کر دیا۔ وہ اپنے غیر مہذب خاوند سے بچنے کے لیے اپنے باپ کے گھر آ گئی تھی تاہم اس کے سسرال والوں نے اسے اپنی توہین سمجھا اور اسے قتل کر دیا۔

اکتوبر میں فیصل آباد کے ایک رہائشی نے عدالت میں طلاق کی درخواست دینے پر اپنی بیوی کی ناک کاٹ دی اور اسے آگ لگانے کی کوشش کی۔ سندھ اسمبلی نے گھریلو تشدد کے خلاف ''گھریلو تشدد (روک تھام اور تحفظ) بل 2013ء کی منظوری دی۔ بل کے تحت معاشرے کے کمزور لوگوں بالخصوص خواتین کے خلاف تشدد کا ارتکاب کرنے والوں کو ایک سال قید اور بیس ہزار روپے جرمانہ کی سزا دی جائے گی۔ دیگر صوبوں نے خواتین کے خلاف تشدد کی روک تھام کے لیے تاحال کوئی بل متعارف نہیں کرایا۔

5 نومبر کو لاہور میں چار بچیوں کی ماں نے خود کو آگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ 40 سالہ خاتون نے بظاہر خاوند کی مار پیٹ سے تنگ آ کر خودکشی کی۔ مقامی لوگوں نے پولیس کو بتایا کہ مقتولہ کا خاوند بیروزگار اور نشے کا عادی تھا اور وہ اکثر اپنی بیوی کو مارتا پیٹتا رہتا تھا۔

غیرت کے نام پر ہونے والے جرائم

2013ء میں پاکستان میں 869 خواتین کو غیرت کے نام پر قتل کر دیا گیا۔ 359 خواتین کاروکاری کے واقعات میں قتل ہوئیں۔ قاتلوں کو سزا سے حاصل استثنیٰ کے باعث ان جرائم کا سلسلہ جاری رہا۔ دیت کا قانون متاثرہ فرد کے خاندان کو مجرم کو معاف کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ غیرت کے نام پر ہونے والے جرائم میں مجرم کا خاتون کے ساتھ خونی یا ازدواجی رشتہ ہوتا ہے۔ اسی طرح متاثرہ خاتون کے خاندان کا مجرم کے ساتھ بھی رشتہ ہوتا ہے اور وہ اسے آسانی سے معاف کر دیتے ہیں۔ خواتین کے حقوق پر کام کرنے والے اداروں نے مطالبہ کیا ہے کہ غیرت کے نام پر ہونے والے جرائم کے مقدمات کا انصرام ضابطہ حدود آرڈیننس کی بجائے ضابطہ تعزیرات پاکستان کے تحت ہونا چاہیے تاکہ قانونی نظام کے اس شگاف کو پُر کیا جا سکے۔

چنیوٹ کے رہائشی جعفر علی شاہ کو شک تھا کہ اس کی بھتیجیوں کے دونوں جوانوں کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔ 11 جنوری کو اس نے دونوں لڑکیوں کو گولی مار کر قتل کر دیا اور تھانے میں پیش ہو کر اقبال جرم کر لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے ایسا اپنے خاندان کی عزت کے لیے کیا تھا۔

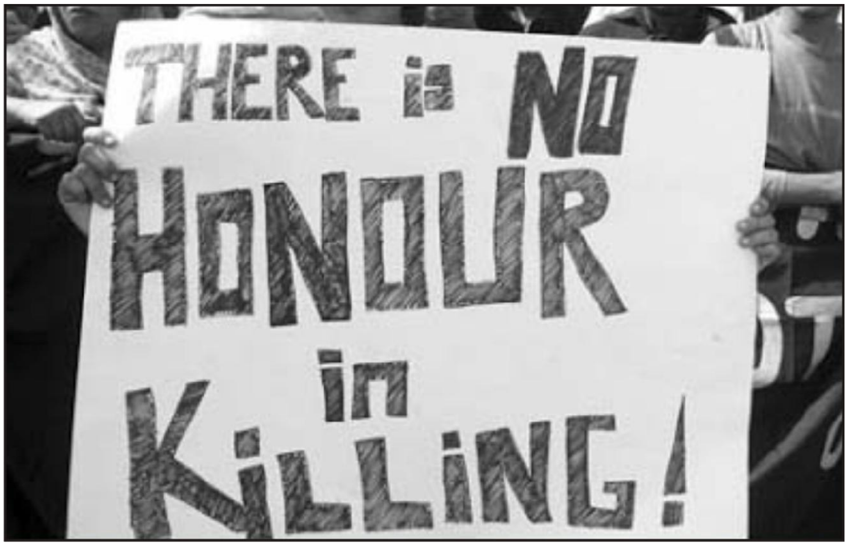

اپنے مرد رشتہ داروں کی غیرت کے نام پر خواتین نے اپنی جانوں کی قربانی دی

جنوری میں سرگودھا میں ایک شخص نے اپنی بیوی کی ناک کاٹ دی کیونکہ اسے شبہ تھا کہ اس کے کسی غیر مرد کے ساتھ تعلقات تھے۔ پانچ بچوں کی ماں کو ہسپتال داخل کروا دیا گیا جہاں اس نے میڈیا کو بتایا کہ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس کا خاوند اس سے پہلے بھی تین مرتبہ گلہ دبا کر اس کو مارنے کی کوشش کر چکا تھا۔ ملزم کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا۔

جنوری میں سکھر میں ایک 18 سالہ لڑکی کو مبینہ طور پر اس کے بھائی نے ''کاری'' قرار دے کر گولی مار کر قتل کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی بہن کے گاؤں کے ایک شخص کے ساتھ مراسم تھے۔ وہ گھر کے کام کاج میں مصروف تھی کہ ملزم نے اسے گولی ماردی۔

جنوری میں شیخوپورہ کے علاقے خانقاہ ڈوگراں میں خاندان کی مرضی کے بغیر شادی کرنے والے جوڑے کو لڑکی کے باپ اور بھائی نے قتل کر دیا۔

22 جنوری کو شکار پور میں جونیجو اور پھولپوٹو قبائل کے دو گروہوں میں کاروکاری کے ایک واقعہ پر جھگڑا ہو گیا۔ ایک جرگے نے فیصلہ دیا کہ پھولپوٹو قبیلے کے ایک رکن کے جونیجو قبیلے کے ایک رکن کی حاملہ بیوی کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔ ملزم کو حکم دیا گیا کہ وہ جونیجو قبیلے کے رکن کو آٹھ لاکھ روپے ادا کر دیئے۔ ملزم نے 2 لاکھ روپے موقع پر ادا کر دیے اور بقیہ رقم دو ماہ بعد ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اطلاعات کے مطابق خاتون کو اس کے خاوند اور رشتہ داروں نے قتل کر دیا۔

کسووال میں ایک شخص نے اپنی بیوی کا گلہ کاٹ دیا کیونکہ اسے شک تھا کہ اس کے کسی غیر مرد کے ساتھ تعلقات تھے۔ اس کے بعد وہ تھانے گیا اور اقبال جرم کر لیا۔

جبری اور کم عمری کی شادیاں

پاکستان میں کم عمری کی شادیوں کا سبب شدید غربت اور یہ اعتقاد تھا کہ وقت پر ہونے والی شادی سے لڑکیوں کا اخلاقی تحفظ ہوتا ہے اور اس کے والدین اپنی ذمہ داریوں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔

کم عمری کی شادیوں کی ممانعت کے ایکٹ مجریہ 1929ء کے تحت 18 سال سے کم عمر مرد اور 16 سال سے کم عمر لڑکیاں بچوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ بچوں کے حقوق کے حامیوں کا یہ کہنا ہے کہ قانون کے تحت انتہائی کم سزا کا مطلب یہ ہے کہ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو روکنے والا کوئی نہیں۔ قانون میں چند ایسی شقیں بھی موجود ہیں جن کے باعث پولیس کے لیے کم عمری کی شادی کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔

آئین کی اٹھارہویں ترمیم کے بعد کم عمری کی شادیوں کی ممانعت کے ایکٹ مجریہ 1929ء کو

کالعدم قرار دے دیا گیا اور صوبوں کی جانب سے ترمیم کے بعد اس کی منظوری ہونا باقی تھی۔ چار سال پہلے صرف پنجاب نے ایک قانون کی منظوری دی۔ کہا جاتا تھا کہ سال کے آخر میں سندھ کا کم عمری کی شادیوں کی ممانعت کا ایکٹ پیش کیا جانے والا تھا۔ خیبر پختونخوا اسمبلی میں لڑکیوں کے لیے شادی کی کم سے کم عمر کو 18 سال تک بڑھانے کی شدید ممانعت کی گئی اور اسے ''مغربی ایجنڈا'' قرار دیا گیا۔

اقوام متحدہ کی بچوں کے حقوق سے متعلق کمیٹی نے اپنے مشاہدات اور تجاویز میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ لڑکیوں کے لیے شادی کی کم سے کم عمر بڑھا کر 18 سال کر دی جائے۔

6 نومبر کو سول سوسائٹی کی 16 تنظیموں نے بچیوں کی شادی کی اوسط عمر میں اضافہ کرنے کے لیے پنجاب میں کم عمری کی شادیوں کے خلاف ایک اتحاد تشکیل دیا۔ مختلف تجزیات کے مطابق پاکستان میں تقریباً 50 فیصد خواتین کی 19 برس کی عمر میں شادی کر دی جاتی ہے اور ان میں سے 50 فیصد خواتین 21 سال کی عمر میں اپنے پہلے بچے کو جنم دے دیتی ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق جیکب آباد اور مٹیاری میں لڑکیوں کی شادی کی اوسط عمر 13 برس تھی۔

جنوری میں منڈی بہاؤالدین میں پولیس نے شادی کی ایک تقریب پر چھاپہ مارا اور ایک 11 سالہ بچی کی 12 سالہ بچے سے شادی کی کوشش ناکام بنا دی۔ دونوں بچوں کے والدین کے علاوہ نکاح خواں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

مئی میں حافظ آباد میں پولیس نے ایک 13 سالہ بچی کی 85 سالہ شخص سے شادی کو روک دیا۔ ان کی شادی کا انعقاد مقامی قبائلی عمائدین کے احکامات پر کیا گیا تھا۔ دولہا اور اس کے رشتہ داروں کو گرفتار کر لیا گیا۔

ستمبر میں ایک بس سٹیشن پر ایک 11 سالہ بچی اس وقت پولیس کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جب ایک مرد اور ایک عورت نے اسے زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہا اور اس نے مدد کے لیے پکارا۔ تفتیش کے دوران پولیس کو پتہ چلا کہ لڑکی کو تین ماہ قبل بہاولنگر کے علاقے ہارون آباد کے 38 سالہ رہائشی کو ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے میں فروخت کر دیا گیا تھا۔ اس نے بعد ازاں اس سے شادی کر لی اور اسے اپنے گھر پر زنجیروں میں جکڑ کر رکھا۔ ایک روز وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی لیکن کچھ ہی دیر بعد اس کے خاوند نے اسے پکڑ لیا۔

لاہور ہائی کورٹ نے اکتوبر میں گوجرانوالہ میں اسلحے کے زور پر ایک 13 سالہ لڑکی کے اغوا اور شادی کا نوٹس لے لیا۔ اس کے چالیس سالہ ہمسائے نے اسے اغوا کیا تھا اور اسلحے کے زور پر زبردستی شادی پر رضامند کیا۔

سفارشات

1۔ خواتین کو ملکیتی حقوق دینے سے غربت کو کم کرنے میں مدد ملتی ہے چونکہ اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم اور اہل خانہ کی نگہداشت کے لیے زیادہ رقم مختص کریں گی۔ زرعی اصلاحات نافذ کی جائیں اور خواتین کو زمین میں ان کا جائز حصہ دیا جائے۔

2۔ ملک بھر میں خواتین کے مزید تھانے قائم کئے جائںن تاکہ ان رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے جو خواتین کو اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی شکایت درج کرانے کے دوران پیش آتی ہیں۔

3۔ تمام صوبوں میں گھریلو تشدد کے خلاف قوانین متعارف کرائے جائیں۔

4۔ لڑکیوں کی شادی کی کم از کم عمر کو 18 سال تک بڑھایا جائے۔ کم عمری کی شادی کے معاملات میں پولیس کو اختیارات دیئے جائیں تاکہ وہ اس کے خلاف اپنے طور پر کارروائی کر سکے۔

5۔ تمام صوبوں میں بلدیاتی اداروں میں خواتین کی نمائندگی کو 33 فیصد تک بڑھایا جائے۔

بچے

چودہ برس سے کم عمر بچے کو کسی فیکٹری یا دکان یا کسی دوسرے خطرناک پیشے میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔

آئین پاکستان [آرٹیکل-11(3)]

ریاست، شادی، خاندان، ماں اور بچے کو تحفظ فراہم کرے گی آئین پاکستان [آرٹیکل - 35]

ریاست اس بات کو یقینی بنانے کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔۔۔ کہ بچوں کو ان پیشوں میں ملازم نہیں رکھا جائے گا جو ان کی عمر سے مطابقت نہیں رکھتے۔۔۔ آئین پاکستان [آرٹیکل 37-(e)]

۔۔۔ بچپن خاص توجہ اور مدد کا مستحق ہے۔ [بچوں کے حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کے کنونشن کا دیباچہ]

بچوں کے متعلق عمل میں لائی گئی تمام کارروائیوں میں، چاہے وہ سرکاری یا نجی سوشل ویلفیئر اداروں کی طرف سے عدالتوں، انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے حکام یا قانون ساز اداروں کی طرف سے عمل میں لائی گئی ہوں، بچوں کے بہترین مفادات کو اولین فوقیت دی جائے گی۔ بچوں کے حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کا کنونشن [آرٹیکل نمبر 3 (1)]

رخصت ہونے والے وزیراعظم کی جانب سے گزشتہ سال کو بچوں کے حقوق کا سال قرار دیئے جانے کے باوجود 2013ء بچوں کے حقوق کے حوالے سے ایک غیر فعال سال ثابت ہوا۔ بچوں کے تحفظ کے نظام کے حوالے سے کوئی اہم پیش رفت نہیں ہوئی اور نہ ہی بچوں کے حقوق کی خلاف ورزیوں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی۔ جون 2013ء میں قائم ہونے والی نئی حکومت کے لیے بھی بچوں کا تحفظ ترجیح کے طور پر سامنے نہیں آیا۔

2013ء کے دوران بچوں کی صحت کے لئے خسرہ اور پولیو کی بیماریاں اسی طرح خطرہ بنی رہیں جس طرح بھوت سکولوں میں جانے والے بچوں کی تعداد میں ہونے والی شدید کمی، خطرہ تھے۔ پہلی بار سکول خودکش بمباروں کا ہدف بنے۔

پرائمری کی سطح پر سکولوں میں بچوں کے 100 فیصد اندراج اور 2015ء تک بچوں کی شرح اموات میں دو تہائی کمی پاکستان کا ہزار سالہ ترقیاتی ہدف تھا لیکن ترقی کی موجودہ شرح کو سامنے رکھتے ہوئے

دیکھا جائے تو یہ ترقی ہدف سے کہیں کم تھی۔ اور اس بات کا اظہار یو این ڈی پی (یونائیٹڈ نیشنز ڈویلپمنٹ پروگرام) نے اپنی پاکستان ایم ڈی جی رپورٹ 2013ء میں کیا۔

پاکستان اپنی میعادی رپورٹ بھیجنے میں ناکام رہا جو دسمبر 2012ء میں بہرصورت جمع کروائی جانی چاہئے تھی۔ اس لئے کہ بچوں کے حقوق سے متعلق یونائیٹڈ نیشنز کنونشن کے تحت اس رپورٹ کو جمع کرانا ضروری تھا۔ پاکستان اس کنونشن کے مطابق اپنے وعدوں کو پورا نہ کرسکا اور اس کا مظاہرہ بچوں کے خلاف بڑھتے ہوئے تشدد، بچوں کی صحت اور تعلیم کے شعبوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں اور تحفظ کے حوالے سے کمزور قانونی فریم ورک سے ہوتا ہے۔

صحت

دو سال کی تاخیر کے بعد پلاننگ کمیشن آف پاکستان نے 17 ستمبر 2013ء کو قومی غذائی سروے 2011 جاری کیا۔ اس سروے کے مطابق 2011ء میں پانچ سال سے کم عمر کے بچوں میں یہ شرح 41.6 فیصد سے بڑھ کر 43.7 فیصد ہوگئی اور ضیاع کی شرح جو 2001ء میں 14.3 فیصد تھی، بڑھ کر 2011ء میں 15.1 فیصد ہوگئی ہے۔ 2001ئسے 2011 تک کے دوران کم وزن والے بچوں کی شرح میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور یہ 31.5 فیصد ہی رہی۔ پلاننگ اور ڈویلپمنٹ کے وفاقی وزیر احسن اقبال کے مطابق سروے کے نتائج گمبھیر ہیں اور ملک میں غذائی ایمرجنسی لگانے کا تقاضہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہا کہ ملک میں غذائی قلت سے نمٹنے کے لیے جلد ہی نیشنل ٹاسک فورس قائم کی جائے گی۔

''دی لانسٹ سیریز آن میٹرنل چائلڈ نیوٹریشن ان پاکستان'' کے عنوان سے ایک رپورٹ سیو دی چلڈرن (Save The Children) نے آغا خان یونیورسٹی کے اشتراک سے تیار کی۔ اس رپورٹ کے مطابق پاکستان میں اس عرصے کے دوران ہر سال مرنے والے بچوں کی تعداد اندازاً 800,000 رہی اور ان میں 35 فیصد اموات کی وجہ غذائی قلت رہی ہے۔ متناسب غذا حاصل کرنے والے بچوں میں ہونے والی اموات کی نسبت غذا کی کمی کے باعث موت کا شکار ہونے والے بچوں کی تعداد نوگنا زیادہ ہے۔ ناکافی غذا کے مسئلہ پر قابو پانے کے لئے یورپین کمشن کے ہیومینٹیرین ایڈ ڈیپارٹمنٹ (ECHO) نے یونائیٹڈ نیشنز چلڈرنز فنڈ (یونیسیف) کو 30 لاکھ یورو کی رقم مہیا کی تاکہ پاکستان میں ناگہانی حالات سے متاثرہ خواتین اور بچوں میں غذائیت کی کمی کے خاتمہ کے لئے کام کیا جاسکے۔ ان فنڈز کا مقصد سندھ اور خیبر پختونخوا کی حکومتوں کے اشتراک سے غذائیت کی کمی کے مسئلہ پر قابو پانا تھا۔ اس پروگرام کے ذریعے 19 لاکھ کی آبادی کی

قوم کے مستقبل کی حالت

زندگیوں کو بچانا اور 2 لاکھ 66 ہزار افراد کو غذائیت کی سہولتیں مہیا کرنا تھا۔ اقوام متحدہ نے ستمبر میں ایک رپورٹ ''بچوں کی بقاء کا عزم: ایک تجدید عہد'' کے عنوان سے شائع کی جس میں یہ بات سامنے آئی کہ پاکستان کا شمار ان پانچ ممالک میں ہوتا ہے جہاں پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی شرح اموات نصف دنیا سے زیادہ ہے اور یہ کہ پاکستان ان تین ممالک میں شامل ہے جہاں پر دس میں سے چار سے زیادہ نوزائیدہ بچوں کی اموات ہوتی ہیں۔ ان اموات کی نمایاں وجوہات نمونیہ اور اسہال ہیں۔ نمونیہ کے عالمی دن (12 نومبر) کے موقع پر شائع کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق نمونیہ سے پاکستان میں سال بھر میں تقریباً 92,000 بچوں کی اموات ہوئیں۔ آغا خان یونیورسٹی سنٹر آف ریسرچ کی ایک رپورٹ کے مطابق صوبوں میں اسہال کے مریضوں کی تعداد اور پانچ سال سے کم عمر بچوں کی اموات کی تعداد کے حوالے سے سندھ دوسرے صوبوں سے آگے ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ سندھ میں پیدا ہونے والے ایک ہزار بچوں میں سے 101 ان امراض کے باعث موت کا شکار ہو گئے۔

یونیسیف کی ایک اور سٹڈی رپورٹ جس کا عنوان تھا:

"Surviving the first day: State of the World's Mothers 2013"

یہ رپورٹ اسلام آباد سے مئی 2013ء میں جاری کی گئی جس میں یہ نشاندہی کی گئی تھی کہ پیدائش

کے پہلے روز ہونے والی اموات کے حوالے سے پاکستان ایشیاء کے باقی ممالک سے آگے ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ پاکستان میں 77 نوزائیدہ بچوں میں سے ایک بچہ پہلے ہی روز فوت ہو جاتا ہے۔ اور یہ شرح پانچ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہونے والے بچوں کا سترہ فیصد ہے۔ اور یوں پیدائش کے حوالے سے پاکستان علاقے کا خطرناک ترین ملک ہے۔

آغا خان یونیورسٹی کے زچہ و بچہ کے سنٹر آف ایکسی لینس کی طرف سے کی گئی ریسرچ کے مطابق ایم ڈی جی 4 کا ہدف حاصل کرنے کے لئے پاکستان کو پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی اموات کی شرح میں پندرہ فیصد کمی کرنی ہوگی۔

پاکستان اس عرصے کے دوران پولیو سے متاثرہ تین ممالک میں شامل رہا ہے۔ 2012ء میں 52 کیسز اور 2013ء میں پولیو کے 85 کیسز سامنے آئے ہیں۔ سال کا آخری پولیو کیس دسمبر 2013ء میں جنوبی وزیرستان، فاٹا میں رپورٹ کیا گیا۔ جہاں پولیو کے خلاف مہم کو جون 2012ء سے تشدد کے ذریعے روکے رکھا گیا۔ پولیو کے کیسز کی بڑھتی ہوئی تعداد کی ایک اہم وجہ والدین کا بچوں کو ویکسین دینے سے انکار ہے۔ ورلڈ بینک کی جانب سے دیئے گئے اعداد و شمار کے مطابق 47,099 بچے ایسے ہیں جن کو پولیو مہم کے دوران والدین کے انکار کی وجہ سے ویکسین نہیں دی گئی۔ والدین کی جانب سے بڑھتے ہوئے انکار کی وجہ سے خیبر پختونخوا میں 24,968، سندھ میں 14,978، بلوچستان میں 50,68، پنجاب میں 910، فاٹا میں 889، آزاد جموں و کشمیر میں 32 اور گلگت بلتستان میں تین ایسے کیسز سامنے آئے جن کے مطابق بچوں کو پولیو ویکسین نہیں دی گئی۔ 2013ء میں متعدد پولیو ورکرز پر حملے ہوئے اور انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ اس کا مقصد مرض کے خلاف مہم کو روکنا تھا۔ وزیر اعظم کے اسپیشل سیل کی جانب سے 24 اکتوبر 2013ء کو عالمی پولیو ڈے کے حوالے سے شائع کی گئی رپورٹ کے مطابق 27 پولیو کارکن اور پولیس کے تین سپاہی پچھلے سال ہلاک ہوئے جن میں سے 16 کا تعلق خیبر پختونخوا سے تھا۔

خسرہ نے جس طرح پچھلے سال ملک کو متاثر کیا اسی قوت سے 2013ء میں بھی اس کا حملہ جاری رہا۔ جون 2013ء کے دوران پاکستان میں خسرہ کے 12951 کیس سامنے آئے جن میں سے 290 بچوں کی اموات ہوئیں جبکہ پچھلے برس 14986 کیس سامنے آئے تھے جن میں 310 اموات ہوئیں۔ صرف لاہور میں خسرہ کے باعث 88 اموات ہوئیں۔ یہ اعداد و شمار پنجاب کے محکمہ داخلہ کی ایک تحقیقاتی کمیٹی نے جاری کئے۔ صحت کی عالمی تنظیم ڈبلیو ایچ او کے مطابق گزشتہ تین سال کے دوران تسلسل کے ساتھ آنے والے سیلاب خسرہ کی بیماری کا بنیادی سبب بنے۔ اور خسرہ کے مریضوں کی تعداد میں بہت اضافہ

ہوا۔ 2012ء میں خسرہ کے 4321 کیس سامنے آئے تھے۔ پاکستان پیڈیاٹرکس ایسوسی ایشن (پی پی اے) کے مطابق ملک میں 6 سے 16 سال کی عمر تک کے سکول جانے والے ایک ہزار سے بارہ سو تک بچے سگریٹ نوشی کرتے ہیں۔ پی پی اے نے بڑھتی ہوئی سگریٹ نوشی کو کم کرنے کے لیے اس کے خلاف سماجی حکمت عملی متعارف کروانے پر زور دیا ہے۔ گلوبل ٹوبیکو کنٹرول کے انسٹی ٹیوٹ اور جان ہوپکنز بلوم برگ سکول آف پبلک ہیلتھ نے ایک سٹڈی اس سال جاری کی جس میں تصدیق کی گئی ہے کہ تمباکو کی تشہیر اور اس کی برانڈنگ کے باعث نوجوانوں میں تمباکو کے بڑھتے ہوئے استعمال کے رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔ اس سٹڈی کے مطابق پاکستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں پانچ سال کی عمر کے بچے بھی تمباکو کی مارکیٹنگ سے آگاہی رکھتے ہیں اور تمباکو کی اشیاء خریدنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

تعلیم

پاکستان کے آئین کی شق 25اے کے باوجود پاکستان میں بچوں کی ایک بڑی تعداد تعلیم سے محروم ہے۔ یونیسکو اور یونیسف نے حکومت کے تعاون سے ستمبر 2013ء میں سکول نہ جانے والے بچوں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق پاکستان میں سکولوں میں پرائمری کی سطح پر 65 لاکھ بچوں کا اندراج نہیں ہوا۔ اور اس کے علاوہ 27 لاکھ بچے ایسے ہیں جن کا نچلی ثانوی سطح پر اندراج نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پرائمری تعلیم کی عمر کے دس بچوں میں سے تین بچے سکول نہیں جا رہے۔ پرائمری سطح پر لڑکوں کی نسبت لڑکیوں کی بڑی تعداد سکول نہیں جاتی اور سکول نہ جانے والے زیادہ تر بچوں کا تعلق غریب گھرانوں سے ہے۔ یہ رپورٹ تعلیم کے بارے میں مستند حقائق کی کمی کی طرف اشارہ کرنے کے علاوہ پالیسی سازوں اور تعلیمی ماہرین کی مدد سے تعلیمی نظام میں موجود چیلنجز سے نمٹنے کے لیے بہتر اعداد و شمار کی ضرورت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ یونیسکو کی ایجوکیشن فار آل گلوبل مانیٹرنگ رپورٹ 14-2013ء کے مطابق پاکستان کا شمار ان چودہ ممالک میں ہوتا ہے جہاں دس لاکھ سے زیادہ بچے سکول نہیں جا رہے۔

تعلیم کے بارے میں قابل اعتماد اور تازہ ترین اعداد و شمار کے حصول کے لیے الف اعلان اور Sustainable Development Policy Institute نے پاکستان کی ضلعی تعلیمی درجہ بندی پر جون 2013ء میں ایک رپورٹ شائع کی تھی۔ اس رپورٹ میں پاکستان بھر میں خصوصی طور پر تیار کیے گئے تعلیمی اور سکول کے انڈیکس شامل کیے گئے اور ان علاقوں کی نشاندہی کی گئی جن میں نظام کو تبدیل کرنے پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ان انڈکسز کے ذریعے سے مختلف علاقوں میں ابتدائی تعلیم کے مختلف قسم کے معیارات کو جانچا گیا ہے۔ 100 سکور میں سے زیادہ سے زیادہ تعلیمی سکور 80 رہا اور وہ بھی صرف 6 اضلاع

سیلاب کے دنوں میں بھی تعلیم کا حصول

میں۔ 90 کے اسکور تک کوئی بھی نہیں پہنچا۔ کشمیر کا ضلع پونچھ 82.94 اسکور حاصل کر کے سرفہرست رہا۔ صوبائی رینکنگ میں پنجاب سب سے آگے رہا۔ بلوچستان سب سے بری کارکردگی والا صوبہ رہا۔ اس رپورٹ کے ساتھ ساتھ لوگوں کی سہولت اور درست تعلیمی اعداد و شمار تک رسائی تعلیم اور بجٹ پر ایک خاکہ بھی تیار کیا گیا تا کہ وہ حلقہ کے منتخب نمائندے پر خط کے ذریعے دباؤ ڈال سکیں کہ وہ اپنے علاقے کے تعلیمی مسائل حل کرنے پر فوری توجہ دیں۔

یو این ڈی پی کی Human Development رپورٹ 2013 کے مطابق صرف 7 ایسے ترقی پذیر ممالک ہیں جو تعلیم پر پاکستان سے بھی کم خرچ کر رہے ہیں۔

ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی کرپشن سے متعلق رپورٹ 2013 کے مطابق پاکستان کے سرکاری شعبہ کے تحت قائم شعبہ کرپشن کا بُری طرح شکار ہے۔ اور یہاں سب سے بڑا مسئلہ بھوت سکولوں کا ہے۔ یہ وہ ادارے ہیں جو صرف کاغذوں میں موجود ہیں اور ان بھوت سکولوں پر اٹھنے والے فرضی اخراجات اور انتظامیہ کی تنخواہیں باقاعدگی سے قومی خزانے سے وصول کی جاتی ہیں۔ یہ ایسی بیماری ہے جو ہزاروں بچوں کو ان کے بنیادی آئینی حقوق سے محروم کرتی ہے بلکہ پہلے ہی سے محدود تعلیمی فنڈ کو بھی ضائع کرتی ہے۔ اس سال کے شروع میں سپریم کورٹ آف پاکستان نے ضلعی ججوں کو ملک بھر میں بھوت سکولوں کے بارے میں سروے کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس سروے کی رپورٹ نومبر 2013ء میں جمع کروائی گئی جس کے مطابق ملک بھر میں

ثانوی تعلیم تک 260930 تعلیمی ادارے موجود ہیں جن میں سے 2.088 بھوت سکول ہیں، 1,008 سکول غیر قانونی قبضہ میں ہیں جبکہ 5,827 سکول غیر فعال ہیں۔ سندھ میں 1,962 بھوت سکول اور 419 سکولوں پر غیر قانونی قبضہ ہے جبکہ 4,285 غیر فعال ہیں۔ ان حقائق کی بنیاد پر سپریم کوٹ نے تمام صوبوں اور اسلام آباد میں Accreditation بورڈ قائم کرنے کی تجویز دی تاکہ سکولوں کی حالت بہتر بنائی جا سکے اور بھوت سکول ختم کئے جا سکیں۔ عدالت عظمیٰ نے ذمہ داران کے خلاف قانونی کارروائی کا حکم بھی دیا۔ سپریم کورٹ نے صوبائی حکومتوں پر بھی ایسے اقدامات کرنے پر زور دیا جن کی مدد سے سکولوں پر سے غیر قانونی قبضہ چھڑایا جا سکے اور عدالتوں پر بھی زور دیا کہ وہ سکولوں پر غیر قانونی قبضہ سے متعلق زیر سماعت مقدمات کا جلدی فیصلہ کریں۔

مفت اور لازمی تعلیم پر بچوں کے حق سے متعلق ایکٹ صرف سندھ کی اسمبلی نے منظور کیا۔ بلوچستان میں بھی اس حوالے سے ایک آرڈیننس نافذ کیا گیا۔

حقوق کی پامالی اور بچوں کا تحفظ

بچوں کے حقوق اور بچوں کے تحفظ کے حوالے سے 2013ء کے دوران پاکستان میں کوئی اہم قانونی پیش رفت نہیں ہوئی۔ گزشتہ دور حکومت میں متعارف کروائے گئے زیادہ تر بل ابھی تک التواء میں ہیں۔ ان میں نیشنل کمیشن آن دی رائٹس آف چلڈرن بل، دی پروہیبیشن آف کارپورل پنشمنٹ بل، دی چائلڈ پروٹیکشن (کریمنل لاء) امینڈمنٹ بل، دی چارٹر آف رائٹس بل اور دی چائلڈ میریجز ریسٹرینٹ (امینڈمنٹ) بل شامل ہیں۔ تاہم سابقہ قومی اسمبلی نے پروہیبیشن آف کارپورل پنشمنٹ بل 2013ء اپنے دور کے آخری روز منظور کیا۔ لیکن یہ اس وجہ سے ناقابل عمل رہا کہ سینٹ نے اس کی منظوری نہیں دی تھی۔ صوبائی سطح پر بلوچستان کا بچوں کی حفاظت اور فلاح و بہبود کا بل، بچوں کے حقوق کے لئے پنجاب کمشن کے قیام کا بل، بلوچستان پنجاب اور خیبر پختونخوا میں بچوں کی مفت اور لازمی تعلیم کے بل اور چاروں صوبوں میں بچوں کی ملازمت پر پابندی کے بل ابھی تک زیر التوا ہیں۔ ان کے علاوہ رولز فار دی سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی ایکٹ 2011ء، دی کے پی چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر ایکٹ 2010ء اور دی کے پی بورسٹل انسٹی ٹیوشنز ایکٹ 2012ء سال کے آخر تک نافذ نہ ہو سکے اس لئے کہ ان کے نوٹیفکیشن جاری نہیں ہو پائے تھے۔ 2013ء میں پاکستان میں بچوں کے تحفظ کے نظام میں جو اہم بہتری دیکھنے میں آئی وہ یہ تھی کہ 2009ء میں وفاقی اور صوبائی محتسبوں کے دفاتر میں بچوں کے حوالے سے شکایات کے شعبے قائم کئے گئے۔ مئی میں وفاقی محتسب نے بچوں کے لئے نیشنل کمشنر مقرر کیا جس کی ذمہ داریوں میں بچوں سے متعلق انفرادی شکایات کا ازالہ

کرنا اور بچوں کے لئے حفاظتی نظام سے متعلق امور کو نمٹانا تھا۔ کمشنر کے لئے یہ یقینی بنانا ضروری تھا کہ بچوں کے حقوق کے حوالے سے ہونے والی عام سرگرمیاں بچوں کے حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کے کنونشن کے مطابق ہوں۔ صوبائی حکومتوں سے توقع کی جارہی تھی کہ وہ وفاق کی تقلید کرتے ہوئے محتسبوں کے دفاتر میں علیحدہ صوبائی کمشنر تعینات کریں گے۔ تاہم سال کے اختتام تک کوئی تعیناتی نہ کی گئی۔

محنت مشقت کرنے والے بچوں کو عموماً مارا پیٹا جاتا ہے

کوئی بھی صوبہ چائلڈ پروٹیکشن پالیسی متعارف کروانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ پنجاب چائلڈ پروٹیکشن پالیسی پر صوبائی سوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ اور یونیسیف مل کر 2011ء سے کام کررہے تھے۔ پالیسی کا مسودہ نومبر 2013ء میں پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ کو بھیجا گیا اور مسودے کی نوک پلک کی درستگی کے بعد اسے لاء ڈیپارٹمنٹ میں بھیجا جانا تھا۔

بچوں پر تشدد

بچوں کے استحصال پر کام کرنے والی ایک غیر سرکاری غیر منافع بخش تنظیم ''ساحل'' نے ستمبر 2013ء میں ایک رپورٹ جاری کی جس کے مطابق جنوری 2013ء سے جون 2013ء تک کے عرصے میں پاکستان میں 1204 بچے جسمانی تشدد کا شکار ہوئے۔ ان میں سے 817 یعنی 67.86 فیصد لڑکیاں جبکہ 387 یعنی 32.14 فیصد لڑکے ہیں۔ پنجاب میں ایسے کیسز کی سب سے زیادہ تعداد یعنی 810 ہے، سندھ میں یہ تعداد 226، بلوچستان میں 44، خیبر پختونخوا میں 37، اسلام آباد میں 71، آزاد جموں وکشمیر میں 14 ہے جبکہ گلگت اور بلتستان میں دو کیس سامنے آئے تھے۔ بچوں کا اغواء، جنسی زیادتی اور تشدد کے ایسے واقعات ہیں جن سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔

ساحل نے اپنی سالانہ پبلی کیشن میں کروئل نمبرز (Cruel Numbers) کے عنوان سے بچوں پر جنسی تشدد کے واقعات پر ایک رپورٹ شائع کی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق 2012ء میں 2788 واقعات ہوئے جو پچھلے سال سے 21 فیصد زیادہ ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ روزانہ اوسطاً آٹھ بچے

بمباری اور دہشت گردانہ حملوں نے بچوں کو خوفزدہ کر دیا

تشدد کا شکار ہوتے ہیں۔ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تشدد کا شکار 71 فیصد لڑکیاں ہیں۔بچوں کے حقوق کے تحفظ سے متعلق سوسائٹی (ایس پی اے آر سی) سپارک نے بھی اس سے ملتے جلتے اعدادوشمار اپنی سالانہ رپورٹ میں شائع کئے۔اس رپورٹ ''پاکستان میں بچوں کی صورتحال 2012ء'' کے مطابق تقریباً 3,861 بچوں پر جنسی تشدد کے کیسز 2012ء میں رپورٹ کئے گئے ۔جن میں سے 68 فیصد کیسز کا تعلق پنجاب سے تھا اور 71 فیصد کیسز لڑکیوں سے متعلق تھے۔ 6 فیصد متاثرین کی عمریں ایک سے پانچ سال کے درمیان تھیں۔ 16 فیصد کی عمریں چھ سے دس تک تھیں جبکہ 22 فیصد کی عمریں 16 سے 18 سال کے درمیان تھیں۔

ساحل کی رپورٹ کے مطابق 221 وکلاء میں سے 34 فیصد ساحل کی سٹڈی میں شریک تھے جو بچوں کے حقوق پر اقوام متحدہ کے کنونشن میں کی گئی بچوں کی تعریف سے ناواقف تھے اور تقریباً نصف وکلاء جنسی تشدد کے مختلف پہلوؤں سے مکمل طور پر ناواقف تھے۔

میڈیا نے 2013ء میں بچوں پر جنسی تشدد کے متعدد کیسز رپورٹ کئے جس پر عوام کی طرف سے کافی غم وغصے کا اظہار کیا گیا۔ایک واقعہ جس نے سب سے زیادہ عوامی توجہ حاصل کی، وہ ستمبر 2013ء میں ہوا۔واقعہ کے مطابق ایک پانچ سالہ بچی کو اغواء کے بعد کئی دفعہ جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور بعد میں ایک ہسپتال کے باہر پھینک دیا گیا۔پولیس سال کے آخر تک مجرموں کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی تاہم تحقیقات کے دوران سی سی ٹی وی فوٹیج کا ایک اہم حصہ سامنے آیا جو ریکارڈ میں موجود نہ تھا جس سے مجرموں کو گرفتار کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔حالات مزید بدتر اس وقت ہوئے جب مندرجہ بالا واقعہ کے صرف تین دن بعد لاہور ہی میں ایک سات سالہ بچی کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔پولیس ابھی تک پتہ لگانے میں ناکام رہی ہے کہ اس بہیمانہ حرکت کا ذمہ دار کون تھا۔ایسے کیسز کا سلسلہ 2013ء کے آخر تک جاری جن میں سرگودھا میں

ایک 13 سالہ بچی کا جنسی تشدد کے بعد قتل، گوجرانوالہ میں دونوعمر لڑکیوں پر جنسی تشدد اور انہیں گولی مار کر قتل کرنے کے واقعات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تین سالہ بچی کو ایک امام مسجد نے اس وقت جنسی تشدد کرنے کے بعد قتل کرنے کی کوشش کی جب وہ قرآن پاک کا سبق لینے مسجد میں موجود تھی۔ اس وحشتناک واقعہ کے خلاف بھی شدید عوامی ردعمل ہوا۔ اخبارات نے ستمبر کے صرف ایک دن میں تین ایسے واقعات شائع کئے۔ فیصل آباد میں سکول پرنسپل نے چار سالہ بچے پر جنسی تشدد کیا۔ مزید ایک چار سالہ رلڑکے پر جنسی تشدد کے علاوہ ایک چودہ سالہ لڑکی کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس بچی کے ساتھ چار افراد دو روز تک بہیمانہ سلوک کرتے رہے۔

2013ء میں جنسی تشدد کے متعدد واقعات سامنے آئے لیکن ان واقعات کی محض مذمت کے علاوہ کوئی ٹھوس اقدامات نہیں کئے گئے البتہ چند معمولی اقدامات ضرور کئے گئے۔ اس شعبے میں کام کرنے والوں کے اندازے کے مطابق پاکستان میں جنسی تشدد کے دس فیصد واقعات سے بھی کم مقدمات میں مجرموں کو سزائیں ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ کامیاب پراسیکیوشن کا زیادہ تر انحصار گواہوں کے بیانات پر ہوتا ہے۔ اس سال کے اوائل میں ملک کی اعلیٰ ترین اسلامی مجلس مشاورت اسلامی نظریاتی کونسل نے ڈی این اے ٹیسٹ کو بنیادی ثبوت قرار دینے کی شدید مخالفت کی ہے۔ اس مخالفت سے معاشرے کے کئی حلقوں کی جانب سے کونسل کو شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وفاقی اور صوبائی قانون نافذ کرنے والے اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی فارنسک سروسز کو بہتر بنائیں تاکہ جنسی واقعات میں ملوث مجرموں کو سخت سے سخت سزا دی جاسکے۔ اس کے علاوہ فارنسک سروسز بہتر نہ ہونے اور عدم گواہی کی بنیاد پر سزا سے بچ جانے والوں کی تعداد میں کمی آئے۔ بچوں کے خلاف تشدد کی دوسری اقسام میں اغواء اور آجروں کی بدسلوکی بھی شامل ہیں۔ سندھ پولیس نے 2013ء میں 113 بچوں کے اغواء کے مقدمات درج کئے جبکہ گزشتہ برس یہ تعداد 121 تھی۔ خیبر پختونخوا پولیس نے 24 بچوں کے اغواء اور 91 بچوں کے اغواء برائے تاوان کے مقدمات درج کئے گئے۔ ادارہ برائے سماجی انصاف (ISJ) کے مطابق 2013ء میں 21 مقدمات درج کئے گئے جن میں گھریلو ملازمت کرنے والے آٹھ بچوں کی اموات کے مقدمات بھی شامل ہیں۔ یہ تمام مقدمات پنجاب میں درج کئے گئے اور جنسی تشدد کا نشانہ بننے والے ان بچوں میں دو لڑکیاں بھی تھیں۔

چائلڈ لیبر

چائلڈ لیبر کے حوالے سے 197 ممالک میں سے پاکستان کا شمار ان دس ممالک میں ہوتا ہے جہاں بچوں سے مشقت لینا عام سی بات ہے۔ یہ اعداد و شمار چائلڈ لیبر انڈکس رپوٹ میں دیئے گئے ہیں جو تحقیق

اور حکمت عملی تیار کرنے والے ایک بین الاقوامی ادارے میپل کروف (Maplecrof) نے اکتوبر میں جاری کی۔ رپورٹ میں صورتِ حال کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ رپورٹ کئے گئے چائلڈ لیبر واقعات کی گمبھیرتا اور ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے حکومتی اقدامات کا تفصیلی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ چائلڈ لیبر سے متعلق پالیسی کی دھجیاں اڑانے والوں کے خلاف کیا اقدامات کئے گئے۔ چائلڈ لیبر کی انتہائی مکروہ شکلوں کے حوالے سے امریکہ کے لیبر ڈیپارٹمنٹ نے 2012ء میں اپنی تحقیقی رپورٹ میں کہا ہے کہ پاکستان نے 2011ء کی نسبت 2012ء کے دوران چائلڈ لیبر کے خاتمے کے لئے کہیں بہتر کوششیں کیں۔

ملکی سطح پر کوئی اعداد و شمار جمع نہیں کئے گئے اور نہ ہی ملک گیر سروے کروایا گیا۔ ہم پاکستان کے مختلف اضلاع میں علمی اساس کو وسعت دینے اور پالیسی و پروگرام پلاننگ کے بارے میں آگاہی دینے کے لئے سروے وغیرہ کروائے گئے۔ بچوں کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے ساحل، سپارک اور آئی ایل او جیسے غیر سرکاری اداروں کے مطابق پاکستان میں ایک کروڑ دس لاکھ سے ایک کروڑ بیس لاکھ تک بچے محنت مزدوری کرتے ہیں اور ان میں سے آدھے بچوں کی تعداد کی عمریں دس سال سے بھی کم ہیں۔

دی سنٹر فار دی امپروومنٹ آف ورکنگ کنڈیشنز اینڈ اینوائرمنٹ پاکستان (CIWCE) نے آئی پی ای سی کے اشتراک سے ایک رپورٹ شائع کی۔ اس کا مقصد معیشت کے دس شعبوں زراعت، اینٹ سازی، کپاس کی پیداوار، کھجوریں اتار کر اکٹھی کرنا، مویشیوں کی پرورش، چٹائیاں بنانا، غالیچہ بافی، ریستورانوں میں کام کرنا، پتھروں کی تراش کا کام اور چھوٹی چھوٹی ورکشاپوں میں کام کرنے والے بچوں کو

معاشی دباؤ نے بچوں سے ان کا بچپن چھین لیا

درپیش صحتی اور حفاظتی خطرات کا جائزہ لینا تھا۔ یہ جائزہ بھی صرف دو اضلاع پنجاب کے ضلع ساہیوال اور سندھ کے ضلع سکھر میں مکمل کیا گیا۔

اس رپورٹ جس کا عنوان تھا ''بچوں کی صحت پر کام کرنے کے اثرات''۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مشقت اور مزدوری کرنے والے بچوں کو صحت کے تشویشناک مسائل کا سامنا رہتا ہے جس کے اثرات ان کے ذہنوں پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ جبکہ انہی علاقوں کے وہ بچے جو سکول جاتے ہیں مشقت مزدوری نہیں کرتے، انہیں ایسے عوارض نہیں ہوتے۔

سال 2013ء کے پہلے نصف میں پنجاب چائلڈ لیبر یونٹ نے انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے Combating Abusive Child Labour پروجیکٹ کے تحت بارہ اضلاع میں سروے کروائے۔ یہ سروے مظفر گڑھ، بہاولپور، خوشاب، سرگودھا، ڈیرہ غازی خان، اوکاڑہ، گوجرانوالہ، وہاڑی، اٹک، ٹوبہ ٹیک سنگھ، میانوالی اور راولپنڈی میں کروائے گئے۔ یہ سروے جامع معلومات مہیا کرتے ہیں جن کی مدد سے چائلڈ لیبر کے خاتمے کے لئے ایسے پالیسی فیصلے کئے جاسکتے ہیں جن پر عملدرآمد ممکن ہو۔

پی سی ایل یو کو پنجاب بھر میں ایسے سروے کروانے تھے۔ اس سروے میں 34 پُرخطر پیشوں کی شناخت کی گئی ہے ان میں زراعت، قالین بافی، اینٹ سازی، ورکشاپس، جراحی کے آلات بنانے والی فیکٹریاں، کوڑا کرکٹ اور ردی چننا، مولڈنگ، پٹرول پمپس، کپاس چننا، کوئلہ کی کان میں کام کرنا، ٹرکوں کی صفائی دھلائی، چائے خانوں میں کام کرنا، ظروف سازی، صابن بنانا، مشینیں تیار کرنا، فولاد بنانے والی فیکٹریاں، توانائی کا شعبہ، تیل صاف کرنے، گیس پروسیسنگ اور چمڑہ سازی کے کارخانے شامل ہیں۔ جہاں بچے مزدوری سے منسلک ہیں۔ آئی ایل او نے ایسے سروے کوئٹہ اور لورالائی میں بھی کروائے۔

سروے سے معلوم ہوتا ہے کہ غربت، والدین کا رویہ اور متبادل ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے بچے مشقت و مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ سحر (ایس ای ایچ آر) کی تحقیق کے مطابق کوئٹہ میں دس ہزار سے زائد بچے مزدوری کررہے ہیں جن میں سے ساٹھ فیصد کوڑا کرکٹ اٹھانے والے ہیں۔ بلوچستان واحد صوبہ ہے جہاں بچوں کو بدترین قسم کی مشقت سے نجات دلانے کے لئے اٹھارویں ترمیم کے بعد سے کوئی قانون سازی نہیں کی۔ 2012ء میں چاروں صوبوں کے لیبر ڈیپارٹمنٹس نے فیصلہ کیا تھا کہ 14 برس سے کم عمر کے بچوں کو ملازمت دینے پر پابندی لگانے کے لئے جامع قانون سازی کی جائے گی لیکن ایسا نہ ہوسکا اور یہ قانون سال کے آخر تک کابینہ کی منظوری کا منتظر رہا۔ بچوں کی ملازمت پر ممانعت کا صوبائی قانون کا مسودہ

خیبر پختونخوا اسمبلی میں پیش نہیں ہو سکا۔ حکومت سندھ نے 2012ءمیں گھریلو ملازمین کے لیے صوبائی پالیسی بنائی۔ اس پالیسی کے تحت سولہ سال سے کم عمر بچوں کی ملازمت پر مکمل ممانعت کر دی گئی لیکن ابھی اس پالیسی پر عملدرآمد ہونا باقی ہے۔ بلوچستان میں بچوں کی ملازمت پر پابندی کا بل ''پراونشل ایمپلائمنٹ آف چلڈرن (امینڈمنٹ) بل'' کا مسودہ تیار کر لیا گیا تھا جس کے مطابق 14 سال سے کم عمر کے بچوں کی ملازمتوں پر پابندی ہوگی۔ یہ بل صوبائی محکمہ قانون کو جانچنے کے لئے بھیجا گیا لیکن وہ جانچ کئے بغیر ہی محکمہ نے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ مسودہ میں بہت سی عدم مطابقتیں ہیں جنہیں ختم کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ 2013ء کے آخر تک یہ بل اسمبلی میں پیش نہ ہو سکا۔

کمسن بچوں کے لئے انصاف کا نظام

ایک اور سال گزر گیا لیکن بچوں کے لئے عدالتیں قائم نہ ہو سکیں یا کریمنل مقدمہ بازی میں بچوں کو باضابطہ مفت قانونی مشاورت کی فراہمی ممکن نہ ہو سکی حالانکہ جووینائل جسٹس سسٹم آرڈیننس (جے جے ایس او) 2000ء میں یہ موجود تھیں۔ بچوں کے حقوق کے فروغ اور تحفظ کے لئے ایک پراجیکٹ جو اے جی ایچ ایس چائلڈ رائٹس کے نام سے موسوم ہے، نے 2013ء میں پنجاب کی آٹھ جیلوں میں قید 80 بچوں کے انٹرویو لئے اور 95 فیصد سے زائد نے پولیس کی تحویل میں مختلف نوعیت کے تشدد کی شکایات کیں اور بہت سے بچوں نے بتایا کہ پولیس نے انہیں ایسے جرائم میں ملوث دکھایا جن کا ان سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ ستر فیصد انٹرویو دینے والے بچوں کی قانونی نمائندگی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ عدالت میں حاضری کے دوران کبھی کبھار ہی ان کی قانونی نمائندگی کی بابت پوچھتے اور زیادہ تر نابالغ بچے جج کے سامنے پیش ہوئے بغیر ہی عدالت سے واپس چلے جاتے تھے۔ چائلڈ رائٹس یونٹ کا مشاہدہ تھا کہ 2013ء کے دوران پنجاب کی جیلوں میں بچوں کے ساتھ ہونے والا سلوک ناقابل بیان تھا۔ بالغ اور نابالغ قیدیوں کے درمیان عدم رابطہ کو یقینی بنانے کے لئے بہت کم کوشش کی گئی اور بالغوں اور نابالغوں کو ایک ہی گاڑی میں ساتھ ساتھ عدالتوں میں لے جایا جاتا رہا۔

2012ء کے دوران بچوں کے حالات پر سپارک کی سالانہ رپورٹ جون 2013ء میں عام کی گئی۔ اس رپورٹ کے مطابق 2012ء کے دوران پاکستان بھر کی جیلوں میں قید نوعمر قیدیوں کی تعداد 1398 تھی۔ ان میں سے 179 کو سزا ہو چکی تھی جبکہ 1219 کے مقدمات کی سماعت جاری تھی۔ نوعمر قیدیوں کی سب سے زیادہ تعداد پنجاب میں تھی جو 814 تھی۔ اس میں 716 بچوں کے مقدمات زیر سماعت تھے جبکہ 98 کو سزائیں ہو چکی تھیں۔

پیدائش کا اندراج

''ہر بچے کا پیدائشی حق ۔ پیدائش کے اندراج میں غیر منصفانہ رجحانات'' کے عنوان سے یونیسیف نے دسمبر 2013ء میں ایک رپورٹ شائع کی جس کے مطابق پاکستان کا شماران دس ممالک میں ہوتا ہے جہاں پیدائش کا اندراج سب سے کم ریکارڈ کیا گیا۔صرف 27 فیصد بچوں کی پیدائش کا اندراج ہوتا ہے۔ پیدائش کے کم اندراج سے بچے کے مستقبل پر سنگین اثرات مرتب ہوتے ہیں۔اس رپورٹ کے مطابق جب بچوں کا ریکارڈ مرتب کیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ ہر سات میں سے ایک بچے کی پیدائش کے اندراج کے ثبوت کے طور پر باقاعدہ سند موجود نہیں۔اس رپورٹ کے مطابق اندراج نہ کروانے کی وجوہات میں اندراج کی زیادہ فیس، ثقافتی رکاوٹیں اور نسلی یا مذہبی امتیاز شامل ہیں۔وسائل میں کمی بھی مسائل میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔لاہور کی چند یونین کونسلوں میں جون 2013ء میں پیدائش اور وفات کے اندراج کے فارم ختم ہوگئے۔اور یونین کونسلوں کے سیکرٹریوں کا کہنا تھا کہ ایسا ہونا ایک عام مسئلہ ہے۔

بالغ افراد کے لئے چپ والے کارڈ متعارف کروانے کے بعد نادرا نے اگست میں ویسا ہی سمارٹ کارڈ اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں کے لیے متعارف کروایا اس کارڈ کو "Entitlement Document" حق داری کی دستاویز کا نام دیا گیا۔بچوں کے لیے اس نئے کارڈ کے بارے میں کہا گیا کہ اس میں بچوں کی صحت، تعلیم اور سوشل سیکٹر مثلاً ویکسی نیشن ریکارڈز، تعلیمی ریکارڈ اور پولیو رجسٹریشن سے متعلق تمام اعداد وشمار درج ہوں گے۔بہر حال یہ کارڈ محض اختیاری ہوگا اور چائلڈ رجسٹریشن سرٹیفکیٹ (بی فارم) بچوں کے لئے بنیادی شناخت کی دستاویز کے طور پر برقرار رہے گا۔

جسمانی سزا

قومی اسمبلی میں متفقہ طور پر مارچ 2013ء میں جسمانی سزاؤں کی ممانعت سے متعلق پروہیبیشن آف کارپورل پنشمنٹ ایکٹ منظور کیا گیا۔تاہم بل کو سینٹ سے منظوری نہ مل سکی۔اس بل کے مطابق بچے کو جسمانی سزا دینے کے مرتکب شخص کو ایک سال تک کی قید یا پچاس ہزار روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکتی تھیں۔تاہم مارچ میں قومی اسمبلی کے تحلیل ہوتے ہی بل خود بخود ختم ہوگیا۔

پاکستان میں جسمانی سزا دینے کی وجہ یہ ہے کہ والدین اور اساتذہ یہ سمجھتے ہیں کہ بچے کی تربیت مار پیٹ سے ہی ہوسکتی ہے۔ایک این جی او' پلان پاکستان' جو جسمانی سزاؤں کے خلاف 2008ء سے مہم چلا رہی تھی، نے ''ڈر کا خاتمہ۔اساتذہ جسمانی سزائیں کیوں دیتے ہیں'' کے عنوان سے ایک تحقیقی رپورٹ

میں انکشاف کیا کہ اس نے 32 سکولوں کے 137 اساتذہ کے انٹرویو کئے۔ ان میں سے 75 فیصد اساتذہ اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ نافرمان یا بدتمیز بچوں کو جسمانی سزا دینا ان کے لئے ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح بچوں کے خاندانوں کے 84 فیصد افراد کا بھی یہی کہنا ہے کہ بدتمیز اور نافرمان بچوں کو جسمانی سزا دینا اساتذہ کے لئے ضروری ہے۔

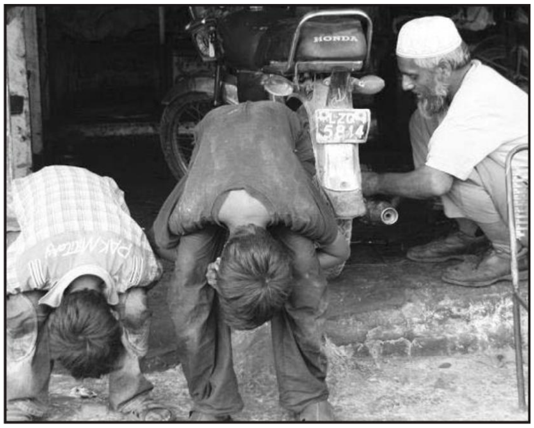

دھیمی رفتار سے سیکھنے والوں کو ملنے والا فوری انصاف

آغا خان یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن ڈویلپمنٹ نے کراچی اور لاڑکانہ کے 20 نجی اور سرکاری سکولوں میں جو ریسرچ کی اس میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ والدین اور اساتذہ بچوں کو اس لیے مارتے ہیں کیونکہ وہ بچوں کی تربیت کے کسی اور طریقے سے ناواقف ہیں۔ اس تحقیق کے مطابق بچوں کو بدتمیزی اور نافرمانی سے دور رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ کلاس رومز میں بچوں کے لئے دوستانہ ماحول پیدا کیا جائے تاکہ سکولوں کے اوقات کے دوران بچوں کو اس قابل بنایا جاسکے کہ وہ اپنے وقت کو تعمیری کاموں میں استعمال کریں۔

میڈیا جسمانی سزاؤں کے واقعات کو نمایاں کررہا ہے لیکن اس کا حکام پر زیادہ اثر نہیں ہوا۔ کچھ سنجیدہ نوعیت کے واقعات اس سال رپورٹ کئے گئے، بہاولپور کے ایک مدرسے میں ایک دس سالہ بچے کو اس کے استاد نے سبق یاد نہ کرنے پر بری طرح زدوکوب کیا جس سے بچہ بے ہوش ہوگیا اور ہسپتال لے جایا گیا۔ ایک اور دس سالہ بچے کا کیس مانسہرہ سے نومبر میں رپورٹ کیا گیا جس میں بچے کے ہاتھ کی ہڈی استاد کی مار پیٹ سے ٹوٹ گئی اور بچہ اس واقعے کے بعد دوبارہ سکول جانے سے ہی خوف زدہ ہوگیا۔ ہری پور میں ایک بچہ استاد کے بری طرح زدوکوب کرنے پر بے ہوش ہوگیا اور اس واقعے کے خوف سے باہر نکلنے کے لئے جہاں بچے کو جسمانی علاج کی ضرورت تھی، وہیں اسے نفسیاتی مشاورت کی بھی اشد ضرورت تھی۔

بے گھر اور معذور بچے

2013ء میں سرکاری طور پر بے گھر بچوں سے متعلق اعدادوشمار اکٹھے نہیں کئے گئے۔ تاہم سول سوسائٹی کی تنظیموں کے جمع کئے گئے اعدادوشمار کے مطابق یہ تعداد پندرہ لاکھ سے تجاوز کرچکی ہے۔ نومبر

چند ادارے ہی ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور بچوں کو تعلیم دیتے ہیں

2013ء میں سندھ حکومت نے صوبے میں بے گھر بچوں کی تعداد کے حوالے سے لائحہ عمل تیار کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ حکومتی منصوبہ کے مطابق سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی کے حصہ کے طور پر سٹریٹ چلڈرن ونگ قائم کیا جانا تھا۔ یہ اتھارٹی 2011ء سے مصروف عمل ہے۔ بچوں کے حقوق کو فروغ دینے کے حوالے سے کام کرنے والی سول سوسائٹی تنظیموں کے کنسورشیم چائلڈ رائٹس موومنٹ نے اس بات پر سخت مایوسی کا اظہار کیا کہ پاکستان میں بے گھر بچوں کے حوالے سے کمیٹی آن دی رائٹس آف دی چائلڈ کی سفارشات پر ریاست نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ان سفارشات میں ایک منظّم انداز میں بے گھر بچوں کے حالات کا جائزہ لینا، انہیں مناسب تحفظ اور امداد کی فراہمی، خوراک اور چھت کی فراہمی کے ساتھ ساتھ انہیں صحت کی سہولتیں، تعلیم کے مواقع اور بے گھر بچوں کے حقوق کا احترام شامل تھے۔

مثبت پہلو یہ ہے کہ 2 نومبر 2013ء کو ہونے والی ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا گیا کہ 2014ء میں ریوڈی جنیرو میں منعقد ہونے والے سٹریٹ چائلد کپ میں پاکستان شرکت کرے گا۔ اس مقابلہ میں شمولیت سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ پاکستان کے بے گھر بچوں کو عالمی طح پر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع میسر آئے گا۔

2013ء کے دوران خصوصی توجہ کے مستحق بچوں کو نظر انداز کیا گیا اور ان کی بہبود اور سہولیات کے لئے کوئی اقدامات نہیں کئے گئے۔ نومبر 2013ء میں اسلام آباد میں حکومت جاپان کے تعاون سے خصوصی بچوں کے لیے سکول کھولا گیا جہاں Computer, Speech Therapy اور کوکنگ کی کلاسز بھی

ہوں گی۔ لاہور میں معذور بچوں کی تعلیمی اصلاح کے لئے کام کرنے والی پاکستانی تنظیم ''الف اعلان'' کے ایک سیمینار میں ایسے بچوں کے لئے خصوصی تعلیم کی ضرورت کو نمایاں کیا گیا۔ اس سیمینار میں یہ بھی کہا گیا کہ صرف چار فیصد بچوں کو سکول تک رسائی حاصل ہے۔ ایک سال کے دوران خصوصی توجہ کے مستحق بچوں سے متعلق صرف دو اقدامات کو میڈیا کے ذریعے مشتہر کیا گیا۔ نومبر میں اسلام آباد میں خصوصی بچوں کے لئے ایک سکول حکومت جاپان کے تعاون سے قائم کیا گیا جس میں ایسے بچوں کو سپیچ تھراپی، کمپیوٹر اور کھانا پکانا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک موبائل ایسیسمنٹ یونٹ لاہور میں قائم کیا گیا تاکہ خصوصی بچوں کی ضروریات کی نشاندہی ممکن ہو سکے۔ اس یونٹ کا مقصد جسمانی، نفسیاتی، بصری، سماعتی اور کلینکل ضرورتوں کی نشاندہی کرنا ہے۔

کم سنی کی شادیاں

2013ء میں ''سوارہ'' کے بہت سے واقعات سامنے آئے۔ ''سوارہ'' ایک ایسی بے ہودہ رسم ہے جس کے مطابق قبائل کے درمیان موجود تنازعات کو طے کرنے کے لئے کم عمر بچیوں کی شادیاں کردی جاتی ہیں۔ یہ رسم 2013ء میں عروج پر رہی۔ خاص طور پر خیبر پختونخوا میں سوات کے خطہ میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو میڈیا میں نمایاں کیا گیا جہاں پانچ سال عمر تک کی لڑکیوں کو تنازعہ کے تصفیہ کے لیے شادی کے لیے پیش کیا جاتا رہا۔ اگرچہ اس رسم کو 2012ء میں غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا لیکن ''سوارہ'' کے واقعات اس کے باوجود ہوتے رہے۔ حکومتی اعداد و شمار کے مطابق 2013ء میں سوارہ کے نو واقعات پر مقدمات کا اندراج کیا گیا جن میں 65 مشکوک افراد کو گرفتار کیا گیا۔ لیکن انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والے کارکنوں کو

کم عمری کی شادیوں پر پابندی کا قانون بھی اس جرم کو نہ روک سکا

یقین ہے کہ سوارہ کے واقعات کی اصل تعداد بہت زیادہ ہے اور ان میں کئی کے بارے میں رپورٹ بھی نہیں کی گئی۔

مددگار نیشنل ہیلپ لائن ڈیٹا بیس کے مطابق 2013ء کے پہلے چھ ماہ کے دوران خواتین اور بچوں کی زبردستی کی شادیوں کے 506 واقعات سامنے آئے۔ کم عمری کی شادیوں میں ملوث متعدد نکاح خواں اور دولہوں کو گرفتار کیا گیا۔ تاہم یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان میں سے کتنے لوگوں کے خلاف مقدمات چلے اور کتنے لوگوں کو سزائیں ہوئیں۔

چھوٹی عمر کی شادیوں کے باعث جلد حاملہ ہونے اور امتناع حمل کے وسائل تک عدم رسائی سنگین نتائج کا باعث بنتی ہے۔ سال 13-2012ء کی تحقیق کے مطابق 15 سے 19 سال کی عمر کی ایک ہزار بچیوں میں سے 44 لڑکیاں ماں بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور ان میں سے صرف سات فیصد بچیوں کو مانع حمل دواؤں یا طریقوں تک رسائی حاصل ہے۔ چھوٹی عمر میں حاملہ ہونے سے صحت کے متعدد مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ''آبادی کے عالمی دن'' کے موقع پر فیملی پلاننگ کے رسالہ ''رہنما'' میں بتایا گیا ہے کہ ہر 89 حاملہ خواتین میں سے ایک خاتون موت کا نوالہ بن جاتی ہے اور اس کی بنیادی وجہ کم عمری کا حمل ہے۔ اس رسالہ کے مطابق ایسی خواتین کی عمریں 18 سال سے کم تھیں۔

چاروں صوبوں میں کم سنی کی شادیوں کی بابت نہ تو کوئی نیا قانون بنایا گیا اور نہ ہی موجودہ قانون میں ترمیم کی گئی۔ سندھ میں اگست کے دوران صوبائی اسمبلی کے آٹھ ارکان پر مشتمل کمیٹی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ متعلقہ افراد کی مشاورت کے ساتھ کم سنی کی شادی سے متعلق قوانین کا مسودہ تیار کریں۔ لیکن ارکان کے درمیان رابطہ نہ ہونے کے باعث صرف دو مسودے سامنے آئے جن میں بہت سے اختلافات کا اظہار کیا گیا تھا۔ ان مسودوں میں ایک بات پر اتفاق رائے تھا اور وہ تھی عمر۔ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے شادی کی عمر 18 برس رکھنے پر اتفاق رائے تھا۔ بل پارلیمانی رقابت کا شکار ہو گیا اور سال کے دوران اس پر کوئی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ خیبر پختونخوا میں جنوری 2013ء کے دوران چائلڈ میرج ریسٹرینٹ (امینڈمنٹ) بل 2013ء اسمبلی میں پیش کیا گیا لیکن اسے ارکان کی اکثریت حاصل نہ ہو سکی۔

سفارشات

1۔ حکومت اور سول سوسائٹی کی طرف سے سنجیدہ کاوشوں اور تشہیری مہم کی ضرورت ہے تا کہ ان ہزاروں بچوں کی زندگیاں بچائی جا سکیں جو قابل علاج بیماریوں سے ہر سال مرتے ہیں۔ ریاست کو صحت کے شعبہ میں، خاص طور پر صحت کی بنیادی سہولتوں پر زیادہ خرچ کرنا چاہئے۔

2۔ بھوت سکولوں کے مسئلہ کو ترجیحی بنیادوں پر حل کیا جائے۔ سرکاری اور نجی شعبوں کی جانب سے منظم

کوششوں کے ذریعے سکولوں میں نہ جانے والے بچوں کی تعداد میں کمی کرنے کی ضرورت ہے۔ اور بچوں کے سکول نہ جانے کی وجوہات، جن میں صنفی تفاوت، غربت اور چائلڈ لیبر کے ساتھ ساتھ سکولوں کی سہولیات، ٹیچنگ میٹریل وغیرہ شامل ہیں، کا جائزہ لے کران کا ازالہ کیا جائے۔ جسمانی سزاؤں پر قانونی پابندیاں لگائی جائیں۔ معمول کے تعلیمی نظام میں جسمانی طور پر معذور بچوں کی تعلیم کو شامل کیا جائے اوراس تعلیم کوصرف خصوصی سکولوں تک محدود نہ کیا جائے۔

3۔ قومی اورصوبائی سطحوں پر بچوں کے تحفظ سے متعلق تمام بل، اسمبلیوں کی تحلیل ہونے کے باعث منظور ہونے سے رہ گئے تھے، دوبارہ اسمبلیوں میں پیش کئے جائیں اور مزید تاخیر کے بغیران پر عملدرآمد کیا جائے۔

4۔ بچوں پر جنسی تشدداس سال گمبھیر مسئلہ کے طور پرابھر کر سامنے آیا۔ بڑھتے ہوئے واقعات کے پیش نظر ریاست کو تفتیشی اورشہادتی طریقوں کو بہتر بنانا چاہئے تا کہ ایسے واقعات میں سزاؤں کی تعداد کو بڑھایا جائے اور تشدد کے ایسے واقعات کو عوام کے سامنے زیادہ سے زیادہ لایا جائے۔

5۔ 2014 میں چائلڈ لیبر کی بابت بہرصورت ملک گیر سروے کروایا جائے تا کہ چائلڈ لیبر کے بڑھتے ہوئے واقعات کو روکنے کے لیے مناسب اقدامات کئے جاسکیں۔ چائلڈ لیبر کو روکنے کے لئے صوبائی چائلڈ لیبر یونٹوں کو اپنا فعال کردارادا کرنا چاہئے۔

6۔ مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث بچوں کے ساتھ برتاؤ جیلوں کے قومی اور بین الاقوامی سطح کے اصولوں کے مطابق ہونا چاہئے۔ جوینائل جسٹس سسٹم آرڈیننس کو مکمل طور پر دوبارہ منظم کرنے کی ضرورت ہے تا کہ جج، پولیس اور جیل کی انتظامیہ اس پر لازمی طور پر عمل کریں۔

7۔ کم عمری کی شادیوں پر پابندی کے قوانین پر سختی سے عمل درآمد کیا جائے۔

لیبر

ریاست ہر قسم کے استحصال کے خاتمے اور اس بنیادی اصول کہ ''ہر ایک سے اس کی قابلیت کے مطابق کام'' اور ''ہر ایک کو اس کے کام کے مطابق معاوضہ'' پر عمل درآمد یقینی بنانے کے لیے مناسب اقدامات بروئے کار لائے گی۔

آئین پاکستان - [آرٹیکل- 3]

غلامی نہ تو موجود ہے اور نہ اس کی اجازت ہے کوئی بھی قانون کسی بھی شکل میں، پاکستان میں اس کی اجازت فراہم نہیں کرے گا اور نہ ہی اسے پاکستان میں متعارف کرانے کی کوشش کرے گا۔ ہر قسم کی جبری مشقت اور انسانوں کی تجارت پر پابندی عائد ہے۔ چودہ سال سے کم عمر کے کسی بھی بچے کو کسی فیکٹری یا کان یا کسی دوسرے خطرناک پیشے میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔ آئین پاکستان[آرٹیکل 11-(3-1)]

ہر شہری کو تنظیم سازی اور یونین سازی کا حق حاصل ہوگا۔ سوائے اس کے کہ، پاکستان کے اقتدار اعلیٰ اور سالمیت کے مفاد میں، یا امن عامہ اور اخلاق کے تحفظ کے لیے قانون کے تحت معقول پابندیاں عائد کی جائیں۔

آئین پاکستان[آرٹیکل 17-(i)]

ریاست منصفانہ اور مشفقانہ شرائط کار متعارف کرانے کی پابند ہوگی۔ آئین پاکستان[آرٹیکل - 37-(c)]

جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر، ریاست، عوام کی فلاح اور بہبود کو یقینی بنائے گی اور دولت کے ارتکاز اور تقسیم اور پیداوار کے ذرائع کو، چند ہاتھوں میں سمٹنے سے روک کر، عوام کا معیار زندگی بہتر بنائے گی۔ ریاست، آجر اور ملازم، جاگیردار اور مزارع کے حقوق کے درمیان منصفانہ توازن قائم کرنے کی کوشش کرے گی اور ملک کے وسائل کے مطابق تمام شہریوں کو کام اور روزگار اور آرام کے مناسب مواقع سے روشناس کرائے گی اور ان کی تفریح کے لیے مواقع کی فراہمی کو بھی یقینی بنائے گی۔ ریاست، حکومت پاکستان کی ملازمت یا دوسرے اداروں میں خدمات سرانجام دینے والے تمام افراد کو لازمی بیمہ یا دیگر ذرائع سے سماجی تحفظ فراہم کرے گی اور جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر، ان تمام افراد کو ضروریات زندگی مثلاً خوراک، لباس، رہائش، تعلیم اور طبی سہولیات فراہم کرے گی جو بے روزگاری، بیماری یا معذوری کی بنا پر مستقل یا عارضی طور پر روزی کمانے کے قابل نہیں۔۔۔ اور افراد کی آمدنیوں کے درمیان پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کی کوشش کرے گی۔ آئین پاکستان[آرٹیکل - 38اے تا ای]

کسی شخص کوغلامی یا محکومی کی زنجیروں میں نہیں جکڑا جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل- 4]

ہر شخص کو، معاشرے کا رکن ہونے کے ناطے، سماجی تحفظ کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل - 22]

ہر شخص کو کام کرنے، پیشے کا انتخاب کرنے، منصفانہ اور مناسب شرائط کار طے کرنے اور بیروزگاری کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔ ہر شخص کو کسی امتیاز کے بغیر، مساویانہ کام کے بدلے مساویانہ معاوضہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہر وہ شخص جو کام کرتا ہے اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے کام کے عوض منصفانہ اور مناسب معاوضہ وصول کرے تاکہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے وجود کو انسانی وقار کا اہل ثابت کر سکے اور اگر ضرورت پڑے تو اسے دیگر سماجی تحفظ کے ذرائع سے مستحکم بھی کر سکے۔ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر ہر شخص کو یونین بنانے اور اس میں شامل ہونے کا حق حاصل ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل23(1تا4)]

ہر شخص کو آرام اور تفریح کا حق حاصل ہے۔ بشمول کام کرنے کی مدت کی مناسب حد اور تنخواہ کے ساتھ بوقت ضرورت چھٹی۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل - 24]

ہر شخص کو ایک ایسا معیار زندگی برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے جو اس کی اور اس کے خاندان کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے کافی ہو۔ بشمول خوراک، لباس، رہائش، طبی سہولیات، ضروری سماجی خدمات اور بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوہ یا بوڑھا ہونے کی صورت میں، ایسے حالات میں جو اس کی دسترس سے باہر ہیں، عدم روزگار کی صورت میں تحفظ کا حق۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل25-(1)]

ریاست معاشی استحصال یا کسی ایسے کام، جو خطرناک ثابت ہوسکتا ہے یا بچے کی تعلیم، صحت یا جسمانی، ذہنی، روحانی، اخلاقی یا سماجی نشوونما میں رکاوٹ بن سکتا ہے، کے خلاف بچے کے تحفظ کے حق کو تسلیم کرتی ہے۔

بچوں کے حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کا کنونشن[آرٹیکل32-(1)]

مدتوں سے مصائب میں گھرے مزدور طبقے کو 2013ء کے دوران بھی سکھ کے لمحات میسر نہیں ہوئے۔ مزدوروں، کسانوں، محنت کش خواتین اور ٹریڈ یونینوں کے مسلسل احتجاج کے باوجود ان کے مسائل کو حل کرنے اور ان کے مطالبات کو پورا کرنے کے لئے نہ کوئی قابل ذکر قانون سازی ہوئی نہ ہی پالیسی میں کوئی تبدیلی کی گئی۔ اختتام سال کے بعد بھی اعداد و شمار بیروزگاری، مہنگائی اور خودکشیوں میں اضافے کی دہائی دے رہے ہیں۔

بار بار کی یقین دہانیوں کے باوجود محنت کشوں کی مردم شماری کرانے کا وعدہ ایفا نہ ہوسکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محکمہ محنت نے جو اعداد و شمار شائع کیے وہ محض اندازے تھے۔ محنت کشوں کے لئے تحفظاتی اقدامات میں تسلسل کے ساتھ کمی آتی رہی۔ پاکستان کے پانچ کروڑ نوے لاکھ محنت کشوں میں سے صرف پندرہ لاکھ ساٹھ ہزار محنت کش سوشل سیکیورٹی کی سہولت سے مستفید ہو سکے۔ محنت کشوں کی ایک بھاری اکثریت اس تحفظاتی ڈھانچے میں سے کسی نہ کسی سبب باہر ہوتی رہی اور یوں یہ قوانین بے معنی ہو کر رہ گئے۔

مزدوروں کے تحفظ پر عدم توجہی کے سبب صنعتی اداروں اور کام کرنے کی دوسری جگہوں پر رونما ہونے والے حادثات کے باعث درجنوں محنت کش جانوں کی بازی ہار گئے۔ بوائلر پھٹنے، چھتیں گرنے اور زہریلی گیسوں کے اخراج سے دم گھٹنے جیسے حادثات میں جاں بحق ہونے والے محنت کشوں کے لواحقین کو معمولی

معاوضہ دے دلا کر معاملات رفع دفع کر دیئے گئے۔ 2012ء میں کراچی کی بلدیہ فیکٹری میں لگنے والی آگ میں 270 سے زیادہ محنت کش جاں بحق ہوئے۔ اس فیکٹری کے مالکان کو قتل عمد کا الزام خارج ہونے کے بعد ضمانتوں پر رہا کر دیا گیا۔ اس حادثے کی تحقیقاتی رپورٹ کو پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق اور سول سوسائٹی کے دوسرے اداروں کی بار بار کی گزارشات کے باوجود منظر عام پر نہیں لایا گیا۔

2013ء میں کم از کم ماہانہ اجرت ایک ہزار روپے کے اضافہ کے ساتھ دس ہزار روپے (تقریباً ایک سو ڈالر) کر دی گئی۔ محنت کش مسلسل واویلا کرتے رہے کہ اجرت میں یہ اضافہ مہنگائی کے تناسب سے بہت کم ہے۔ بہت سے آجروں نے 2012ء کے دوران مقرر کی گئی کم سے کم ماہانہ اجرت نو ہزار روپے بھی ادا نہیں کی۔ محنت کشوں کو شکوہ تھا کہ اضافہ افراط زر کے تناسب سے بہت کم ہے اور پھر اس معمولی اضافے کی ادائیگی بھی مہینوں نہں کی گئی۔

محنت کشوں کے مسائل کے حوالہ سے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ زرعی مزدوروں کے مسائل کو سب سے کم اجاگر کیا گیا۔ اپنے حقوق اور مراعات کے حصول اور احتجاج کیلئے زراعتی محنت کشوں کو خود ہی آگے بڑھ کر صف بندی کرنی پڑی۔ پاکستان کے جنگ زدہ قبائلی علاقہ میں دھماکہ خیز مواد میں کھاد کے استعمال کے باعث لگنے والی پابندیوں کی وجہ سے کھاد کا حصول ایک مصیبت بنا ہوا ہے۔ کھاد کی نقل وحرکت اور اس کی فروخت میں باقاعدگی لانے کی بجائے اس پر یکسر پابندی لگانے سے کسانوں اوران کی آمدنی پر برے اثرات مرتب ہوئے۔

لیبر مارکیٹ

پاکستان کے شماریات کے بیورو کے مطابق پاکستان میں بیروزگار افراد کی تعداد 11-2010ء کے دوران چونتیس لاکھ تھی جو بڑھ کر 2013ء میں سینتیس لاکھ تیس ہزار ہوگئی۔ ایک سالانہ سروے کے مطابق بیروزگاری کی شرح 6.2 فیصد تک پہنچ گئی۔ پنجاب پاکستان کا واحد صوبہ ہے جہاں 2011ء میں بیروزگاروں کی تعداد اکیس لاکھ سے کم ہوکر 2013ء میں چودہ لاکھ ستر ہزار رہ گئی۔

سال 2013ء کے آغاز میں 4 جنوری کو ملک بھر میں موسمِ سرما کے دوران گیس کی فروخت پر پابندی سے پیدا ہونے والی صورت حال پر سی۔ این۔ جی اسٹیشنوں کے ملازمین نے احتجاج کیا کیونکہ خدشہ تھا کہ ہزاروں لوگوں کا روزگار چھن جائیگا اس لئے ملازمین نے وزیر اعظم سے اس مسئلے کا نوٹس لینے کی اپیل کی۔ چونکہ سی۔ این۔ جی اسٹیشنوں کے ملازمین روزانہ اجرت کی بنیاد پر کام کرتے ہیں اسلئے سی۔ این۔ جی اسٹیشنوں کی بندش کے فوراً بعد انہیں ملازمتوں سے برخاست کر دیا گیا۔ اکتوبر 2013ء میں وفاقی حکومت

ملازمت کے حصول میں تعلیمی قابلیت کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی

نے پنجاب بھر کے تمام سی۔این۔جی اسٹیشنوں کو تین ماہ کیلئے یہ کہہ کر بند کر دیا کہ گھریلو صارفین کو گیس کی فراہمی حکومت کی اوّلین ترجیح ہے اور اسطرح ہزاروں محنت کشوں کا روزگار اس فیصلے کی بھینٹ چڑھ گیا۔بجلی اور گیس کی کمی کی وجہ سے بہت سی صنعتیں بند ہوگئیں جس کے باعث بیروزگاری میں اضافہ ہوا۔بجلی اور گیس کی کمی کے باعث نہ صرف یہ کہ صنعتیں بند ہوئیں بلکہ وہ صنعتیں جو بند نہیں ہوئیں ان کی پیداواری صلاحیت کافی حد تک کم ہوگئی۔

زلزلہ زدگان کی تعمیر نو اور بحالی سے متعلق ادارے، ایرا (ERRA) کے دو ہزار ملازمین کا مستقبل اس وقت مخدوش ہوگیا جب 20 اکتوبر کو حکومت نے برخواستگی کے پروانے تھماتے ہوئے ملازمین کو بتایا کہ ایرا کے تعمیر نو اور بحالی کا کام بند کیا جا رہا ہے۔کنٹریکٹ پر رکھے ملازمین کو امید تھی کہ انہیں دوسرے حکومتی محکموں میں کھپا دیا جائے گا لیکن انہیں اس حوالے سے کوئی یقین دہانی نہ کرائی گئی۔

دنیا بھر میں مسیحیوں کے مقدس مہینے دسمبر میں کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (CDA) اسلام آباد نے روزانہ اجرت پر کام کرنے والے 50 خاکروبوں کو نوکری سے نکال دیا۔ان میں سے کئی محنت کش کئی دہائیوں سے کام کر رہے تھے مگر انہیں بغیر نوٹس دیئے نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ برخاست شدہ ورکروں نے شدید سردی کا سامنا کرتے ہوئے اسلام آباد پریس کلب کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حکمرانوں سے انصاف حاصل کرنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز کی نجکاری کے منڈلاتے ہوئے خطرے کے پیش نظر پی آئی اے کی

یونینوں نے پیش بندی کرتے ہوئے بائیکاٹ کی دھمکی کے ساتھ ملازمین نے ایئر لائن کی نجکاری کی بجائے بیل آؤٹ پیکیج کی تجویز دی۔ ستمبر میں حکومت نے پی آئی اے کے انتظامی کنٹرول کے 26 فیصد حصص بمعہ ان کے انتظامی کنٹرول کے فروخت کرنے کے ارادے کا اعلان کیا۔ پی آئی اے کی یونینوں اور ورکروں نے نجکاری کو روکنے کے لئے مل کر ان 26 فیصد حصص کو خریدنے کی پیشکش کر دی۔

اگرچہ بحیثیت مجموعی بیروزگاری کی شرح بڑھ رہی تھی اور نئی ملازمتیں ناپید تھیں پھر بھی پاکستان میں خواتین محنت کشوں کی ملازمتوں کی فراہمی میں مثبت رجحان نظر آیا۔ انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (ILO) کی سٹڈی کے مطابق پنجاب ایمپلائیمنٹ ٹرینڈ 2013ء کے مطابق مردانہ ورک فورس میں 2.5 فیصد اضافہ کے مقابلے میں خواتین کارکنوں کی تعداد میں 8.8 فیصد سالانہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اگرچہ دو کروڑ انچاس لاکھ مرد محنت کشوں کے مقابلے میں خواتین محنت کشوں کی تعداد چورانوے لاکھ ساٹھ ہزار ہے جو مرد محنت کشوں کے مقابلے میں بہت کم ہے اس کے باوجود یہ امر خوش آئند ہے کہ جاب مارکیٹ میں خواتین زیادہ سے زیادہ شامل ہو رہی ہیں۔

حالات کار، خطرات اور تشدد

محنت کشوں کی سلامتی اور ان کے کام کی جگہ کے تحفظ کے معاملات میڈیا اور محکمہ محنت کی عدم توجہی کا شکار رہے۔ پھٹتے ہوئے بوائیلر، گرتی چھتیں اور زہریلی گیسوں کے اخراج کے واقعات بھی نشان دہی کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

صنعتی ادارے سوشل سکیورٹی کے واجبات کی ادائیگی سے گریزاں رہے۔ جنوری میں محکمہ سوشل سکیورٹی نے ایک ہزار سے زائد فیکٹریوں کو ملازمین کے سلسلے میں سوشل سکیورٹی کے واجبات کی بروقت ادائیگی کے نوٹس بھجوائے۔ ان نوٹسوں میں متنبہ کیا گیا کہ عدم ادائیگی کی صورت میں ان صنعتی یونٹوں کو سیل کر دیا جائیگا۔

خطرناک فیکٹریوں کو پنجاب کے صوبائی دارالحکومت لاہور سے مضافات میں منتقل کرنے کے اقدامات کئے گئے۔ لاہور کے رہائشی علاقوں میں قائم 7,850 غیر قانونی صنعتی اداروں کو شہر سے باہر منتقل کرنے کے لئے محکمہ صنعت کے ضلعی افسر نے مارچ میں لاہور ڈویلمنٹ اتھارٹی (LDA) کو تجویز کیا کہ شہر سے باہر چار علاقوں کو صنعتی زون قرار دے دیا جائے۔ ان علاقوں کی صنعتوں کو علاقہ مکینوں کی صحت کے لئے مضر قرار دے کر اور کسی ممکنہ حادثہ سے بچنے کے لئے رہائشی علاقہ سے باہر منتقل کیا جانا تھا۔

فروری میں ملتان روڈ پر ایک فیکٹری میں بوائیلر پھٹنے کے نتیجے میں 26 محنت کشوں کی ہلاکت کے بعد رہائشی علاقوں میں موجود خطرناک صنعتی یونٹوں کے اندراج کے لئے سروے کیا گیا۔ دوسرے صوبے بھی

حالاتِ کار نے محنت کشوں کو صحت کے مسائل سے دوچار کیے رکھا

صنعتی اداروں کے معائنے کا کام جاری رکھنے میں ناکام رہے۔

کام کی جگہوں پر ہونے والے حادثات کے نتیجے میں محنت کشوں کی ہلاکتوں کے واقعات ملک کے دوسرے صوبوں میں بھی رونما ہوتے رہے۔ بہر حال لاہور جہاں خطرناک صنعتی اداروں پر توجہ مرکوز تھی وہاں یہ حادثات وقوع پذیر ہوتے رہے۔

جنوری میں لاہور کے علاقہ باغبانپورہ میں ٹریکٹر کے آلات بنانے والی فیکٹری میں آگ لگنے سے دس مزدور بری طرح جھلس گئے۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے دوران ایک مزدور کے دیا سلائی جلانے سے اس فیکٹری کے گودام میں رکھے تیل کو آگ لگ گئی۔

مارچ میں قائداعظم انڈسٹریل اسٹیٹ کوٹ لکھپت میں پائپ بنانے والی فیکٹری میں آگ لگنے سے آٹھ مزدور جل کر شدید زخمی ہو گئے۔

مئی میں ایجرٹن روڈ لاہور پر واقع ایل.ڈی.اے پلازہ میں آتشزدگی سے آٹھ افراد ہلاک اور بہت سے زخمی ہو گئے۔ اس سانحہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ جو ادارہ شہر بھر کی عمارات میں حفاظتی اقدامات کی موجودگی کو یقینی بنانے کا ذمہ دار ہے اس کے اپنے دفتر میں ان حفاظتی اقدامات کا فقدان تھا۔ حادثے کے دوران جان بچانے کے لئے چھت سے چھلانگ لگانے والوں کی ویڈیو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ خود ایل ڈی اے حفاظتی اور سلامتی قوانین اور ہدایات پر کس حد تک عمل پیرا ہے۔

جنوری میں راولپنڈی کی ایک فیکٹری میں سلنڈر پھٹنے سے تین مزدور جاں بحق اور دو زخمی ہو گئے۔

یہ مزدور ہسپتالوں اور فارمیسیوں میں استعمال کیلئے سلنڈروں میں آکسیجن اور نائٹروجن گیسیں بھر رہے تھے کہ دھماکے سے فیکٹری کی مخدوش چھت بیٹھ گئی جو مزدوروں کی ہلاکت کا باعث بنی۔

جنوری میں جھنگ روڈ فیصل آباد پر واقع ایک فیکٹری میں بوائلر پھٹنے سے فیکٹری کی چھت بیٹھ گئی جس سے ایک مزدور ہلاک اور پانچ زخمی ہو گئے فیکٹری کے مالک اور پنجاب اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر راجہ ریاض نے زخمی اور ہلاک ہونے والے مزدوروں کے لئے معاوضہ کا اعلان بھی کیا۔

چار دن بعد لیّہ میں واقع ایک شوگر مل میں بوائلر پھٹنے سے آٹھ کارکن زخمی ہو گئے جن میں سے دو مزدوروں کے جسم 95% تک جھلس گئے تھے سول سوسائٹی نیٹ ورک ایسوسی ایشن (CDNA) نامی ایک تنظیم نے بوائلر دھماکے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مل کی بندش کا مطالبہ کیا۔

جنوری میں سنگجانی اسلام آباد میں سلنڈروں میں گیس بھرنے والی ایک فیکٹری کے زمین بوس ہونے سے تین مزدور ہلاک اور دو زخمی ہو گئے۔

جنوری میں بادامی باغ لاہور کے ایک گودام میں ہونے والا سلنڈر دھماکہ دو ورکروں کی موت کا باعث بنا۔

اکتوبر میں قصور کی ایک ٹینری میں چمڑے کی تیاری کے دوران لکڑی کا ایک بڑا گھومتا ہوا ڈرم اپنی جگہ سے کھسک کر گر گیا اسے اپنی جگہ واپس رکھنے کی کوشش کے دوران ڈرم سے نکلنے والی زہریلی گیس سے دو کارکن غش کھا کر اس میں گر گئے۔ ساتھیوں کو بچانے کے کے لئے مزدوروں نے ڈرم کو ہتھوڑوں سے توڑنے کی کوشش تو کی مگر ڈرم میں گرے دونوں کارکن جاں بحق ہو گئے دوسرے متاثرہ مزدوروں کو ابتدائی طبی امداد دی گئی یا انہیں ہسپتال لے جایا گیا۔ قصور کی ٹینری کی طرح زہریلی گیس کے حادثات کے دوران غیر تربیت یافتہ مزدور اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لئے خود ہی امدادی کارروائیوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور انہیں بھی ویسی ہی خطرناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دسمبر میں فیصل آباد میں سرگودھا روڈ پر واقع ایک فیکٹری میں بوائلر پھٹنے سے دو مزدور ہلاک اور پندرہ زخمی ہو گئے جس پر فیکٹری کے بوائلر انجینیر اور جنرل مینجر کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا۔

بہت سے ورکروں کو انکے آجروں یا ٹھیکیداروں کے زور دینے پر زیر زمین سیوریج وغیرہ میں زہریلی بدبوؤں میں بغیر حفاظتی آلات کے کام کرنا پڑتا ہے۔ اس سال بھی زہریلی گیسوں میں کام کرنے والے لاتعداد کارکن جاں بحق ہوئے یا غش کھا گئے۔ ان اموات کا وہ لوگ بھی شکار ہوئے جو زیر زمین گڑھوں میں پھنسے اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لئے اترے مگر خود بھی موت کا شکار ہو گئے یا غش کھا گئے۔

جنوری میں پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن کمپنی لمٹیڈ PTCL کے دو ملازم حیدرآباد سائیٹ ایریا میں زیر زمین کیبل پر کام کرتے ہوئے دم گھٹنے سے دم توڑ گئے۔ PTCL یونین لیڈر نے بتایا کہ ان جاں بحق ہونے والے مزدوروں کو زیر زمین خطرناک صورتحال میں کام کرنے پر مجبور کیا گیا تھا حالانکہ یہ کام ان کے فرائض منصبی میں شامل نہیں تھا کیونکہ زیر زمین کیبل بچھانے کی ذمہ داری اس کام کے ماہر اور تربیت یافتہ ٹیکنیکل ونگ کی تھی۔ زہریلی بدبو میں کام کرنے والا ایک اور کارکن غش کھا کر گٹر میں ڈوب کر مر گیا جب اسکا ایک ساتھی ورکر اس کو گڑھے سے نکالنے کے لئے گٹر میں اترا تو وہ بھی ڈوب کر جاں بحق ہو گیا۔

مارچ میں قصور میں دو مزدور اس وقت ہلاک ہو گئے جب وہ زہریلی گیسوں سے بھرے اٹھارہ فٹ گہرے ایک مین ہول میں اترے. ایک ٹھیکیدار نے ان مزدوروں کو شیر پور روڈ پر مین ہولوں کے ڈھکنے تبدیل کرنے کے لئے رکھا ہوا تھا. پولیس اور ریسکیو 1122 کے موقع پر پہنچتے ہی وہ ٹھیکیدار رفو چکر ہو گیا. ریسکیو ٹیم نے انکشاف کیا کہ مین ہول کاربن ڈائی آکسائیڈ اور کاربن مونو آکسائیڈ گیسوں سے بھرا ہوا تھا اور اموات ان گیسوں کے باعث دم گھٹنے کیوجہ سے ہوئیں۔

مئی میں تین مزدور، اللہ دتہ اور اس کے دو بیٹے، زہریلی گیس سے بھرے ایک سیوریج میں دم گھٹنے سے فوت ہو گئے ایک ٹھیکیدار نے بہاولپور کے قریب ممتاز آباد کالونی میں سیوریج لائن کی صفائی کیلئے ان تینوں مزدوروں کو کام پر رکھا ہوا تھا۔

نوکری سے نکالے جانے کا خوف اور ملازمت کے قلیل مواقع ہونے کی وجہ سے کارکن شدید ذہنی دباؤ اور مایوسی کا شکار رہتے ہیں. بیروزگاری کا شکار ہونے والے ایک فیکٹری مزدور قاسم نے مایوسی کے عالم میں اپنی بیوی اور پانچ بچوں کو قتل کرنے کے بعد خود کو بھی ہلاک کر ڈالا۔ پولیس کے بیان کے مطابق اسطرح کے واقعات فیصل آباد میں عام ہیں کیونکہ فیکٹریاں بند ہونے کیوجہ سے تین لاکھ سے چار لاکھ تک مزدور بے روزگار ہو چکے ہیں۔ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان (HRCP) کی چیئر پرسن زہرہ یوسف نے اسے افسوسناک سانحہ قرار دیتے ہوئے انکشاف کیا کہ غربت خود مرنے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

فروری میں دو مزدور اس وقت جاں بحق اور آٹھ زخمی ہو گئے جب فیروز پور روڈ لاہور پر واقع ایک زیرِ تعمیر عمارت کی چھت گر گئی اور ورکر اس کے نیچے دب گئے۔

فروری ہی میں گوجرانوالہ میں ایل پی جی سلنڈر پھٹنے سے فرنس آئل کے ایک گودام کی چھت زمین بوس ہو گئی جس کے نتیجے میں ایک مزدور ہلاک اور تین زخمی ہو گئے. فرنس آئل کو ایک ڈرم میں منتقل کیا جا رہا تھا کہ تیل کو آگ لگ گئی اور قریب رکھے سلنڈر حرارت سے پھٹ گئے۔ تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق اگر حفاظتی

آلات موجود ہوتے تو آگ کے حادثہ کی ہولنا کی سے بچاؤ ممکن تھا۔ حادثہ کے ردعمل کے طور پر قلعہ دیدار سنگھ کی انتظامیہ نے تین غیر قانونی کمرشل عمارات اور ایک فرنس آئل فیکٹری کو سیل کر دیا۔

کارکن دہشت گردی سے بھی محفوظ نہیں

بلوچستان اور قبائلی علاقہ جات ایسے حملوں کا نشانہ ہیں۔ ان حملوں کے باعث کارکن غیر محفوظ حالات کا رکا شکار ہیں۔

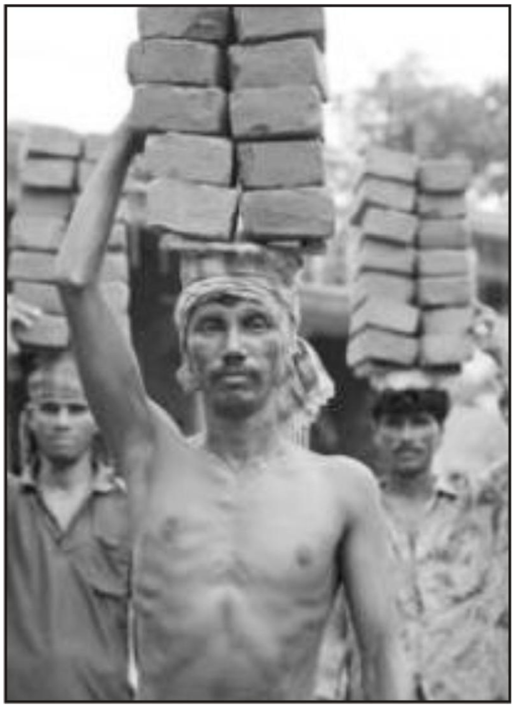

کمر توڑ مشقت کے باوجود انتہائی کم اُجرت

فروری میں بلوچستان میں گوادر کے علاقہ شادی کور میں چھ مزدورں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا. یہ مزدور ایک ہائی وے پر کام کر رہے تھے جب موٹر سائیکل سوار دہشت گردوں نے انہیں قطار میں کھڑا کر کے شناخت کر کے ان پر فائر کھول دیا. یہ واقعہ ایک بارہ سالہ لڑکے نے بیان کیا جسے دہشت گردوں نے بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔

مارچ میں ایک سولر انرجی کمپنی کے چار ملازمین کو نامعلوم حملہ آوروں نے قلات کے قریب سفر کرتے ہوئے کوئٹہ۔ کراچی نیشنل ہائی وے پر گولیوں سے بھون دیا۔

اپریل میں پشاور کے مضافات میں درجنوں مسلح افراد نے پشاور الیکٹرک سپلائی کمپنی (PESCO) کے گرڈ اسٹیشن پر حملہ کر کے سات ورکروں کو ہلاک کر دیا اور بجلی کی سپلائی معطل کر کے ہزاروں صارفین کو بجلی سے محروم کر دیا. چار ملازمین بھی غائب ہیں جن کے بارے میں خدشہ ہے کہ ان کو دہشت گردوں نے اغوا کر لیا ہے۔ حملہ آوروں نے بھاری گولہ بارود اور راکٹ حملوں سے گرڈ اسٹیشن تباہ کر دیا۔

اپریل میں فیصل آباد لیکٹرک سپلائی کمپنی (FESCO) کے ایک لائن مین غلام اکبر کو چک جھمرہ کے ایک مکان میں ہونے والی بجلی چوری کی رپورٹ درج کرانے پر گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ سینکڑوں ملازمین نے FESCO کے ہیڈ کوارٹر کے باہر مظاہرہ کر کے قاتلوں کو فی الفور گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا۔ مظاہرین نے الزام لگایا کہ غلام محمد اور جمیل نامی ملزمان نے غلام اکبر کو بجلی چوری کی رپورٹ حکام بالا کے نوٹس

میں لانے پر سنگین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں مگر اکبر نے بجلی چوری کی رپورٹ درج کرادی اور اس پر وہ قتل کر دیا گیا. اکبر کے خاندان والوں کا موقف ہے کہ ایف آئی آر درج ہونے کے باوجود پولیس نے قاتلوں کی گرفتاری کے لئے کوئی کارروائی نہیں کی۔

اگست میں بلوچستان میں مچھ کے قریب بولان میں پنجاب جانے والی پانچ بسوں کو روک لیا گیا۔ سکیورٹی اہلکاروں کی وردیوں میں ملبوس بلوچستان لبریشن آرمی (BLA) کے دو سو کے قریب جنگجو 21 مسافروں کو پہاڑوں میں لے گئے اور ان میں سے تیرہ افراد کو قطار میں کھڑا کر کے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا اور آٹھ افراد کو چھوڑ دیا۔ مرنے والے زیادہ تر مزدور پنجابی تھے جو عید اپنے گھر والوں کے ساتھ منانے پنجاب جا رہے تھے۔ نومبر میں اسی طرح کے ایک اور واقعہ میں ضلع کیچ کے علاقہ تربت میں تین مزدوروں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ایک زیر تعمیر عمارت میں چھ مزدور کام کر رہے تھے جب مسلح موٹر سائیکل سواروں نے ان پر گولیاں برسا دیں۔ نتیجے میں تین مزدور جاں بحق ہو گئے۔ جاں بحق ہونے والے مزدوروں کا تعلق گلگت اور بونیر سے تھا۔

اکتوبر میں کوہلو میں ایک تعمیراتی کمپنی کے لئے کام کرنے والے چھ مزدوروں کو اغوا کر لیا گیا۔ ان کی بازیابی کے لئے ایک سرچ آپریشن شروع کیا گیا مگر سال کے اختتام تک مغوی برآمد نہیں ہو سکے۔

ہر سال الیکٹریسٹی کمپنیوں کے سو سے زیادہ اہلکار کرنٹ لگنے سے جاں بحق یا مہلک زخموں اور معذوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جولائی میں بختیار لیبر ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقدہ ایک اجلاس میں مزدور رہنماؤں نے مطالبہ کیا کہ کرنٹ لگنے سے زخمی یا ہلاک ہونے والے مزدوروں یا ان کے ورثاء کو بیس لاکھ روپے تک معاوضہ دیا جائے۔ انہوں نے حکومت پر زور دیا کہ ایسے حادثات کا شکار ہونے والے ملازمین کے بچوں کو مفت تعلیم دی جائے۔

حفاظتی اقدامات کی عدم موجودگی نے جہاں تمام صنعتوں میں کام کو پُرخطر بنا دیا ہے، وہیں کچھ صنعتیں ایسی بھی ہیں جو اس حوالے سے بہت زیادہ خطرناک ہیں۔

متعدد حادثات اور حملوں کے باوجود مالکان اپنے محنت کشوں کو بلوچستان کے ان شورش زدہ علاقوں میں موجود کانوں میں بھیجنے سے باز نہیں آتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ مزدوروں کے تحفظ کا بھی کوئی بندوبست نہیں کرتے۔

جنوری میں تحصیل لورالائی کے علاقہ دکی میں کوئلے کی کانوں میں زہریلی گیس بھرنے سے آٹھ کان کن بے ہوش ہو کر جاں بحق ہو گئے. تمام ہلاک شدگان کا تعلق خیبر پختونخواہ کے علاقے شانگلہ سے

تھا۔مئی میں فاٹا کی اورکزئی ایجنسی میں کوئلہ کی کان بیٹھ جانے سے تین کان کن ہلاک ہوئے.ان مرنے والوں کا تعلق بھی شانگلہ سے تھا۔

دسمبر میں ہرنائی بلوچستان میں واقع علاقہ شاہرگ میں کوئلے کی کانوں سے نامعلوم مسلح افراد نے آٹھ مزدوروں کو اغوا کرلیا۔ یہ واقعہ کوئلے کی کان کے ایک مالک کے دفتر میں ڈکیتی کے دوران ایک مقامی ڈاکو کی ہلاکت کے دو دن بعد پیش آیا۔

2010ء میں اٹھارویں آئینی ترمیم کے بعد لیبر قوانین کی منظوری کا معاملہ صوبوں کی تحویل میں چلا گیا تو کان کنوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک آرڈیننس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سول سوسائٹی نے وسیع مشاورت سے صوبوں میں 40,000 کان کنوں کے مسائل کے حل کیلئے صوبائی حکومتوں پر زور دیا کہ کان کنوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے موجود قانونی خلاء کو پر کیا جائے۔

شپ بریکنگ انڈسٹری

کراچی میں گڈانی شپ بریکنگ یارڈ کا شمار دنیا کے بڑے شپ بریکنگ یارڈوں میں شمار ہوتا ہے جس میں تقریباً 15,000 مزدور ملازم ہیں.اس میں کام کرنے والے مزدور تمام صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں مگر مزدوروں کی بھاری تعداد خیبر پختونخواہ سے تعلق رکھتی ہے. یہ مزدور چالیس ہزار ٹن تک کے وزنی جہازوں کو، جنہیں بنانے کے لئے عشرے درکار ہوتے ہیں، بنیادی آلات مثلاً دستانوں، ہیلمٹ اور آگ سے محفوظ

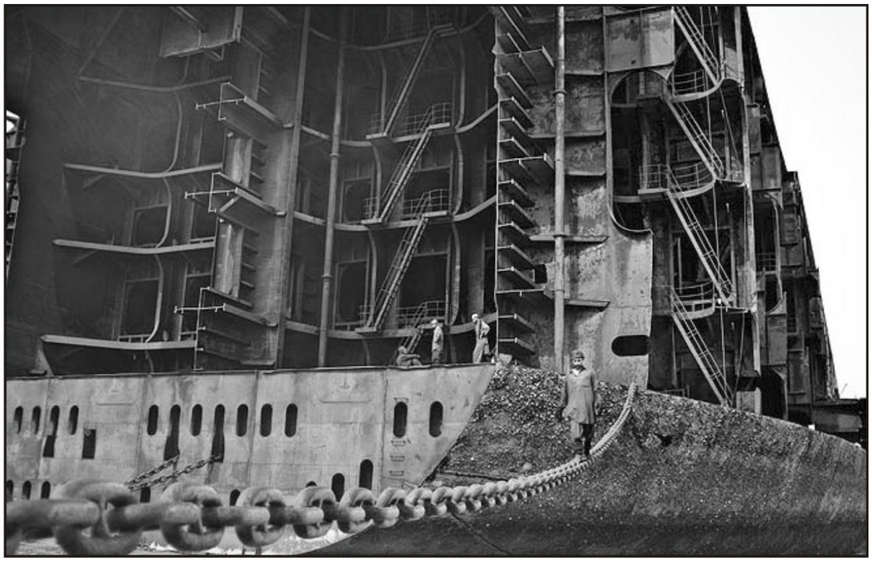

شپ بریکنگ انڈسٹری میں خطرناک حالاتِ کار

رکھنے والے لباس کے بغیر پرزہ پرزہ کرڈالتے ہیں۔

شپ بریکنگ کی صنعت سے منسلک ہزاروں مزدور روزانہ اجرت کی بنیاد پر کام کرتے ہیں جسکی وجہ سے وہ تنخواہ سے منسلک مالی فوائد اور دیگر حقوق سے محروم رہتے ہیں۔

پاکستان میں توڑنے جانے والے اکثر جہاز 1980ء کے عشرے میں بنائے گئے جب جہازوں کی تیاری میں خطرناک مواد کو استعمال کرنے کی ممانعت کے قوانین نافذ العمل نہ تھے۔ پھیپھڑوں کے کینسر کا باعث بننے والے Asbestos جیسے ماڈے جہازوں کے رنگ اور دوسرے میٹریل میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

جولائی کے دوسرے ہفتے میں گڈانی شپ بریکنگ یارڈ میں چھ مزدور حفاظتی آلات نہ ہونے کے سبب ایک حادثہ میں جاں بحق ہوگئے۔ گڈانی کے مزدوروں کا کہنا ہے کہ تمام شپ بریکنگ یارڈز کے لئے صرف ایک پرانی کھٹارہ ایمبولینس دستیاب ہے۔ میڈیکل الاؤنس نہ ہونے کی وجہ سے علاج معالجہ کا خرچہ بھی مزدوروں کو اپنی جیب سے کرنا پڑتا ہے اس وجہ سے پچھلے دس ماہ میں دس مزدوروں کی اموات ہوئیں۔

کسانوں کی جدوجہد

سب سے زیادہ روزگار فراہم کرنے اور مجموعی قومی پیداوار میں سب سے زیادہ حصہ ڈالنے والے شعبہ کو پاکستان کے ذرائع ابلاغ پر کم ہی پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ بڑے شہروں میں قائم ہونے کے سبب شہری آبادیوں کو درپیش مسائل ہی کو سامنے لاتے ہیں۔ زراعت سے وابستہ دیہی علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے گمبھیر مسائل ان کے احتجاجوں اور زمینداروں کی طرف سے ان پر ہونے والے تشدد کی طرف میڈیا توجہ ہی نہیں دیتا۔ دیہی علاقوں زمین کی ناہموار تقسیم کے باعث دیہی علاقوں میں غربت میں ذرّہ برابر کمی نہیں آئی۔ سوسائٹی برائے نگہداشت وتحفظ ماحول (SCOPE) کے مطابق پاکستان کی 5 فیصد آبادی 64 فیصد زرعی کاشت والے رقبے کی مالک ہے جبکہ 50.8 فیصد دیہی گھرانوں کی ملکیت میں کوئی زمین نہیں۔ پاکستان کسان ٹرسٹ (پی کے ٹی) نے غذا کی فراہمی سے متعلق ایک سروے کیا۔ سروے کے لئے انٹرویو کئے جانے والے کسانوں کا تعلق جھنگ، لیہ، خانیوال اور مظفرگڑھ کے اضلاع سے تھا۔ ان میں سے 12.84 فیصد کسان دن میں ایک بار کھانا کھاتے ہیں۔ 80.4 فیصد دن میں دومرتبہ اور صرف 6.76 فیصد کسان دن میں تین مرتبہ کھانا کھاتے ہیں۔ تاہم انٹرویو دینے والے افراد میں سے 99.9 فیصد نے شکایت کی کہ غذا ان کی ضرورت کے مقابلے میں ناکافی ہوتی ہے۔ پی آئی سی ٹی کے ڈائریکٹر نے سروے کے آغاز میں اظہار تاسف کیا کہ ملک میں اناج پیدا کرنے والے شدید غذائی قلت کا شکار ہیں۔

بلدیہ آتشزدگی کے متاثرین کو انصاف کی فراہمی میں تاخیر

جب سائیٹ کراچی کی بدقسمت بلدیہ فیکٹری کی آگ کے ذمہ داروں کی سندھ ہائی کورٹ سے ضمانت کی منظوری کے بعد رہائی ہوگئی تو حادثہ میں ہلاک شدگان کے لواحقین انصاف کے حصول سے ناامید ہو گئے۔ پچھلے سال وزیراعظم نے کراچی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کو یقین دہانی کرائی تھی کہ بزنس کمیونٹی کے ساتھ خلوص کے اظہار کے لئے بلدیہ فیکٹری کے مالکان کے خلاف قتل کے تمام الزامات ختم کردیئے جائیں گے۔ بلدیہ فیکٹری کے سانحہ کی تحقیقات پر مامور کمیٹی نے 14 جنوری کو تمام نامزد ملزموں کے خلاف قتل عمد اور اقدام قتل کی دفعات حذف کردیں۔ پولیس نے ایک ضمنی بھی داخل کرائی جس میں الزامات واپس لیتے ہوئے کہا گیا کہ نامزد ملزمان کے اس حادثہ میں ملوث ہونے کے ثبوت نہیں ملے۔

حکومت کے دوہرے معیار کی قلعی کھولتے ہوئے سینٹ اجلاس میں سینیٹروں نے سوال کیا کہ ایسا کیوں ہے کہ اپنے حقوق کیلئے مظاہرہ کرنے والے KESC کے ورکروں پر اینٹی ٹیررسٹ کورٹ میں مقدمات چلائے جاتے ہیں لیکن بے بس مزدوروں کے قاتلوں کے خلاف الزامات مسترد کردیئے جاتے ہیں۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق اور پاکستان انسٹیٹیوٹ فار لیبر اینڈ ریسرچ (PILER) کے بار بار اصرار پر بھی آگ کے حادثہ کی رپورٹ کو عام نہیں کیا گیا۔

جنوری میں کراچی پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس کے دوران PILER نے انکشاف کیا کہ بلدیہ فیکٹری کی مصنوعات کے ایک بڑے یورپی خریدار نے فیکٹری کے ہلاک شدگان کے لواحقین کو دس لاکھ ڈالر معاوضہ دینے پر اتفاق کیا تھا۔

اس حادثے میں جاں بحق ہونے والے 33 ناقابل شناخت مزدوروں کے پسماندگان کے لئے یہ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ ان نعشوں اور ان کے لواحقین کے خون کے نمونے تین دفعہ لیبارٹری میں بھجوائے گئے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ سال کے آخر تک 17 نعشوں کی شناخت نہ ہوسکی اور فروری میں لواحقین نے ناقابل شناخت نعشوں کو اجتماعی قبر میں دفنانے کی سرکاری تجویز مان لی۔ جل کر کوئلہ ہوئی یہ ناقابل شناخت نعشیں چار ماہ تک ایدھی کے مردہ خانے میں پڑی رہیں ان کے چار مرتبہ لیبارٹری بھجوائے گئے DNA نمونے بھی بے نتیجہ رہے۔ لواحقین کو ایم پی اے حنیف شیخ نے یقین دلایا کہ جاں بحق مزدوروں کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کردیئے جائیں گے تاکہ لواحقین معاوضہ اور پنشن کے حقدار بن سکیں۔

زراعت کے شعبے سے منسلک کارکنوں کے مسائل میں سرفہرست پانی کی کمی، گیس اور بجلی کی لوڈشیڈنگ، کھادوں کی نقل وحمل پر پابندیاں اور آمدورفت پر اٹھنے والے بھاری اخراجات ہیں۔ اپریل 2013ء میں کراچی میں ایم کیوایم، پی ٹی آئی، پی پی پی، پی ایم ایل (ن) اور اے این پی کے زیراہتمام

کسانوں کو احساس ہے کہ اُن کا استحصال اور اُنہیں نظر انداز کیا گیا

مشاورتی پالیسی سے متعلق ہونے والے سیمینار میں تمام پارٹیوں نے عہد کیا کہ 11 مئی کے الیکشن میں کامیاب ہونے والی پارٹی زرعی اصلاحات نافذ کرے گی۔ مگران کے منشوروں میں کئے گئے وعدوں سے پتہ چلتا ہے کہ مزدوروں کے حقوق کو کوئی بھی پارٹی ترجیح نہیں دیتی۔

اپریل کے آخر میں سندھ میں کاشت کی جانے والی اندازاً 30 لاکھ ٹن گندم کی بمپر فصل کھیتوں میں ہی پڑی رہی اس لئے کہ عبوری حکومت کے اہلکار کسانوں سے بروقت گندم نہ خرید سکے۔ کسانوں کو بارش کی وجہ سے فصل کے خراب ہونے کے پیشِ نظر اپنی فصل پرائیوٹ خریداروں کو اونے پونے بیچنی پڑی۔ گندم 1050 روپے فی من کے حساب سے فروخت کی گئی جبکہ سرکاری نرخ 1200 روپ فی من مقرر کیا گیا تھا۔

2008ء میں حکومت نے سندھ بھر میں 212,864 ایکڑ اراضی بے زمین کسانوں بالخصوص خواتین میں تقسیم کرنے کی مہم شروع کی۔ بعد کی سٹڈی سے پتہ چلا کہ 1600 کسانوں میں تقسیم کی جانے والی اراضی پر پانی کی قلت اور ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے کاشتکاری نہ ہوسکی۔ ایک دوسرے سروے کے مطابق 56,187 ایکڑ اراضی جن لوگوں میں تقسیم کی گئی وہ بے زمین کسان نہ تھے۔ 29 اکتوبر کو درجنوں خواتین نے احتجاج کیا کہ ان کو زمین الاٹ تو ہوئی مگر زمین کا قبضہ نہ ملا۔

خیبر پختونخوا میں تخت بھائی کے مقام پر جنوری میں کاٹلنگ سے لنڈ خوڑ جانے والی سڑک پر محکمہ آبپاشی کی طرف سے غیر قانونی زرعی محصول بٹورنے کے خلاف کھیت مزدوروں نے احتجاج کے طور پر ٹریفک

بلاک کر دی۔ انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ آبپاشی حکام پانی کے واجبات مقررہ ریٹ سے زیادہ وصول کر رہے ہیں جس کا حکومت کو نوٹس لینا چاہیے۔ انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ زبردستی وصول کئے جانے والے آبیانہ کی رسیدیں بھی جاری نہیں کی گئیں۔

مارچ میں پنجاب کے متعدد اضلاع کے کسان بڑی تعداد میں اوکاڑہ میں جمع ہوئے اور انہوں نے جی ٹی روڈ اور ریلوے لائنوں کو بلاک کر دیا۔ انہوں نے یہ قدم بجلی کی طویل لوڈشیڈنگ، اوور بلنگ اور سبسڈی دینے سے انکار کے خلاف احتجاج کے طور پر اٹھایا تھا۔ ستمبر میں وفاقی حکومت نے زراعت کے لئے 23 بلین روپے کی سبسڈی کا اعلان کیا۔ سکیم کے تحت کسانوں کو ٹیوب ویلوں کے ذریعے پانی مہیا کرنا تھا جس کے لئے ٹیوب ویلوں کو 30 جون 2014ء تک ساڑھے دس روپے فی یونٹ کی شرح پر بجلی مہیا کی جانی تھی۔ پاکستان کسان بورڈ کے وائس پریذیڈنٹ نے جنوری میں شوگر مل مالکان کی اجارہ داری پر تشویش کا اظہار کیا۔ وہ کسانوں کو گنے کی جس قیمت کی آفر کرتے ہیں اس قیمت پر کسان اپنی پیداوار فروخت کرنے پر راضی نہیں جس کی وجہ سے ہزاروں ایکڑ پر کھڑی گنے کی فصل نہیں بک سکی۔ مل مالکان 170 روپے من میں گنا خریدنا چاہتے ہیں جبکہ زرعی کارکن 300 روپے فی من کے حساب سے گنا فروخت کرنا چاہتے ہیں۔

جنوری میں ایک اجتماع میں پنجاب کے 14 ضلعوں سے تعلق رکھنے والے کسانوں نے مطالبہ کیا کہ بینکوں کی طرف سے زرعی قرضہ جات پر سود کی شرح میں کمی کی جائے اور پانچ ایکڑ سے کم زمین کے مالکان کو ٹیوب ویلوں کے لیے مفت بجلی فراہم کی جائے۔ انہوں نے یہ بھی باور کرایا کہ زراعت کے لیے بیج، کھاد اور کیڑے مار ادویات کی قیمتوں کے کنٹرول کے لیے کوئی اقدامات نہیں اٹھائے گئے۔۔

انتظامیہ نے مارچ میں کرم ایجنسی میں تمام کھادوں کی نقل وحمل پر پابندی لگا دی جس سے زرعی شعبہ بہت متاثر ہوا۔ کھادوں کی ترسیل پر پابندیاں اس بنا پر لگائی گئیں کہ ان کے کیمیائی مادے فاٹا اور بارڈر پر افغانستان میں جدید دھماکہ خیز آلات کی تیاری میں استعمال ہونے کا خدشہ تھا۔

سارا سال پاکستان کے دیہاتی علاقوں میں درجنوں احتجاجی مظاہرے ہوئے جو ان با اثر زمینداروں کے خلاف تھے جنہوں نے نہری پانی کا رخ غیر قانونی طور پر اپنی زمینوں کی طرف پھیر لیا تھا۔ محکمہ آبپاشی کی رپورٹ ک مطابق پانچ ماہ میں پنجاب میں پانی چوری کے 38,338 واقعات رپورٹ کئے گئے۔ پھر بھی پولیس نے ان میں سے پانی چوری کی 12 فیصد وارداتوں پر مقدمات درج کئے۔ رپورٹ میں یہ بھی انکشاف کیا گیا کہ پانی چوری میں محکمہ آبپاشی کے 57 اہلکار، افسر اور با اثر سیاستدان بھی ملوث تھے۔

تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے متعلق شکایات کے ازالے کے لئے مناسب نظام نہ ہونے کی وجہ سے ملازمین پاکستان بھر میں بڑے بڑے احتجاجی مظاہرے کرنے پر مجبور ہوگئے۔ سال 14-2013ء کے مالی بجٹ میں کم از کم اجرت مقرر کرنے کا فیصلہ بھی مزدوروں کو مطمئن نہ کر سکا۔ آل پاکستان کلرکس ایسوسی ایشن (APCA) نے بجٹ کو مسترد کرتے ہوئے دفتروں کی تالہ بندی کر دی اور 14 جون کو احتجاجی مظاہرہ کیا۔ ایسوسی ایشن نے کہا کہ بجٹ میں سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ایک دن سے بھی کم عرصہ میں حکومت اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتے ہوئے سول ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ کے لیے ایک کمیٹی بنانے پر تیار ہوگئی۔ کمیٹی کو ایک ہفتے میں اپنی رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی گئی۔ بڑھتے ہوئے احتجاج اور تنقید کے سبب جون کے مہینے میں وفاقی حکومت نے سول اور فوجی ملازمین کے لئے 10 فیصد عبوری الاؤنس کا اعلان کیا۔ یہ عبوری الاؤنس بنیادی تنخواہ میں ضم نہیں کیا گیا۔

سال 14-2013ء میں پنجاب کے بجٹ میں کم از کم تنخواہ 10,000 روپے مقرر کرنے کا اعلان کیا گیا۔ خیبر پختونخوا کے بجٹ میں تنخواہ اور پنشن میں 15% اضافے کا سالانہ 12 ارب روپے کا خرچہ شامل تھا۔ خیبر پختونخوا صوبائی اسمبلی نے خیبر پختونخوا سول سرونٹس ایکٹ 1973 میں ایک متفقہ ترمیم پاس کی جس کے نتیجے میں 94000 صوبائی ملازمین کے لئے پنشن کی وصولی بحال کر دی گئی۔

محنت کشوں کے احتجاج کے باوجود کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی

2005ء میں پراویڈنٹ فنڈ کنٹری بیوٹری سکیم لاگو ہونے سے ورکر پنشن کے حق سے محروم ہو گئے تھے۔اس سکیم کا مقصد صوبائی حکومت پر پنشن کا بڑھتا ہوا اربوں روپے بوجھ کم کرنا تھا۔2013ء کی ترمیم کے ذریعے اس سکیم کو ختم کر کے پنشن کا حق خیبر پختونخوا کے سول سرونٹس کے لئے بحال کر دیا گیا۔

بلوچستان نے اپنے سالانہ بجٹ میں گریڈ ایک سے گریڈ سولہ تک کے صوبائی ملازمین کی تنخواہوں میں 15 فیصد اضافہ کیا جبکہ گریڈ 17 اور اس سے اوپر کے افسران کے لیے تنخواہ میں 10 فیصد اضافہ کیا گیا۔ بلوچستان کے صوبائی ملازمین کی پنشن میں بھی پندرہ فیصد اضافہ کیا گیا۔

آجروں کی طرف سے مہینے کے آخر میں مزدوروں کی تنخواہیں روک لینے پر کئی احتجاج کئے گئے۔ان میں پاکستان ریلوے کے ملازمین اور پنجاب حکومت کی خواتین ہیلتھ ورکرز شامل تھیں۔محکمہ صحت نے یہ جواز پیش کیا کہ ان ورکروں کی ملازمت ریگولر ہونے کی وجہ سے ان کی تنخواہ نئے پیکج کے مطابق وفاقی حکومت سے جاری نہیں ہوئی جس کی وجہ سے تنخواہوں کی ادائیگی میں کچھ دنوں کی تاخیر ہوگئی۔

پاکستان ٹورازم ڈویلپمنٹ کارپوریشن (PTDC) کے سینکڑوں مستقل، عارضی اور روزانہ اجرت پر کام کرنے والے ملازمین 15 ماہ تک تنخواہوں سے محروم رہے۔ یہ مسئلہ PTDC کو صوبوں کی تحویل میں دینے سے پیدا ہوا۔ PTDC کے ملازمین نے دسمبر میں مینجنگ ڈائریکٹر کے نام ایک خط لکھا تھا کہ انہیں اکتوبر 2012ء سے تنخواہیں نہیں ملیں۔

میونسپل کارپوریشن کے مسیحی ورکروں کی سجن یونین کے صدر نے دسمبر میں سندھ ہائی کورٹ میں کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن اور پانچ ضلعی کارپوریشنوں کے 14000 ملازمین کو تنخواہیں نہ ملنے کی بنا پر چیف سیکرٹری، فنانس سیکرٹری اور دیگر افسران کے خلاف توہین عدالت کا دعویٰ دائر کیا۔ عدالت عالیہ نے 26 نومبر کو حکم دیا تھا کہ 20 دسمبر تک ان ملازمین کو تنخواہیں ادا کر دی جائیں۔

مارچ میں ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹس انسٹیٹیوشن (EOBI) کے ایک افسر نے انکشاف کیا کہ سرکاری ملکیت میں چلنے والا ادارہ پاکستان ٹیلیویژن کارپوریشن اپنے ملازمین کے 2.03 کروڑ روپے EOBI فنڈ کا نادہندہ ہے۔ای او بی آئی نے واجبات کی ادائیگی کے لیے پی ٹی وی کو نوٹس بھیجا جس میں پی ٹی وی کو فوری طور پر واجبات ادا کرنے کا کہا۔ای او بی آئی اہلکار نے بتایا کہ پی ٹی وی مستقل ملازمین کی مد میں فنڈ جمع کراتا ہے مگر کنٹریکٹ ملازمین کا فنڈ جمع نہیں کراتا۔

اپریل میں نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی NADRA نے ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹس کے ادارے EOBI کی معاونت سے ای او بی آئی کے پینشنرز کو چپ والے سمارٹ شناختی کارڈ کے ذریعے پنشن

کی ادائیگی کے منصوبے کا آغاز کیا۔ سمارٹ کارڈ کے ذریعے ہونے والی پنشن کی ادائیگی شفاف ہوگئی اور اس سے پنشنز کے زندہ ہونے کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔ نادرا اور ای او بی آئی نے طے کیا کہ سمارٹ کارڈ مفت مہیا کئے جائیں گے اور لمبی قطاروں اور مشقت سے بچنے کے لیے ادائیگی کے مراکز پنشنروں کی رہائش کے قریب واقع ہوں گے۔

قوانین، پالیسیاں اور مقدمات

اٹھارویں آئینی ترمیم کی منظوری کے تین سال بعد بھی کچھ قوانین کو صوبوں میں لاگو کرنے کے لیے کچھ ترامیم قانون سازی کی منتظر ہیں۔ ماہرین کے مطابق فیکٹریز ایکٹ 1934ء، ایمپلائمنٹ آف چلڈرن ایکٹ 1991ء ورک مین کمپینسیشن ایکٹ 1923ء کم از کم اجرت آرڈیننس 1961ء، بانڈڈ لیبر ایکٹ 1992ء سمیت متعدد لیبر قوانین میں اہم ترامیم کی ضرورت ہے یا انہیں نئے سرے سے متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔

24 مئی کو سول سرونٹس (ترمیمی) آرڈیننس صدر کی منظوری کے بعد نافذ کر دیا گیا جس سے صوبوں کو منتقل شدہ وزارتوں کے تمام ملازمین کو ان اداروں میں مستقل کر دیا گیا جہاں ان کی خدمات منتقل کی گئی تھیں۔

مزدوروں کی فلاح و بہبود کے کئی منصوبوں کی تکمیل میں حائل فنڈز کی کمی کو دور کرنے کی غرض سے وفاقی حکومت نے 14 اکتوبر کو پنجاب ورکرز ویلفیئر بورڈ (PWWB) کو 1.23 ارب روپے فراہم کرنے کا فیصلہ کیا۔ وزیر محنت وانسانی وسائل نے بتایا کہ اس رقم میں سے 107.5 ملین روپے وظیفوں کی مد میں ادا کئے جائیں گے۔ 276 ملین شادیوں کے لئے عطیات۔ 337 ملین روپے فوتگیوں کی گرانٹ 144 ملین روپے ورکرز ویلفیئر سکولوں میں تعلیم کے فروغ اور 300 ملین روپے ترقیاتی سکیمیں مکمل کرنے کے لیے خرچ کئے جائیں گے۔

محنت کشوں کی صفوں میں خواتین ورکروں کی بڑھتی ہوئی تعداد، ان کو درپیش امتیازی رویے اور ناموافق ماحول کے پیش نظر وفاقی محتسب سیکرٹریٹ نے عالمی ادارہ محنت کی معاونت سے خواتین کو دوران کار پریشان کرنے کے اقدامات کے انسداد کے لیے جنسی مساوات کی خاطر ڈیسنٹ ایمپلائمنٹ آن لائن منصوبہ نومبر میں متعارف کرایا۔ منصوبے کے مطابق جنسی سراسیمگی کا شکار ہونے والی ستر فیصد خواتین جو پیچیدہ سسٹم کی وجہ سے افسران بالا تک شکایت نہیں پہنچانا چاہتیں، اپنی شکایت کے ازالے کے لیے اردو اور انگریزی زبان

میں شکایت درج کرنے کے لیے ویب سائٹس کا استعمال کرسکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ایس ایم ایس کرنے والوں کوڈھونڈنے کا نظام بھی وضع کیا گیا ہے۔

ایک کیس جسے محنت کشوں کی فتح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو انصاف کی فراہمی میں تاخیر کی مثال ثابت ہوا وہ سپریم کورٹ کا 18 مئی کا وہ فیصلہ تھا جس میں ایک فرٹیلائزر کمپنی کو عدالت نے 22 سال قبل نکالے جانے والے 112 مزدوروں کو بحال کرنے اور ان کو معاوضے کی ادائیگی کا حکم دیا۔ یہ مقدمہ 1991 میں شروع ہوا جب موجودہ مالکان نے ایک فرٹیلائزر کمپنی کو خریدا اور ان محنت کشوں کو نوکری سے نکال دیا۔ نکالے جانے والے مزدوروں نے اپنی بحالی کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سندھ ہائی کورٹ نے مزدوروں کے حق میں فیصلہ دیا۔ فرٹیلائزر کمپنی نے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کردی۔ سپریم کورٹ نے سندھ ہائی کورٹ سے اتفاق کرتے ہوئے اسکے فیصلے کو بحال رکھا۔

احتجاجی مظاہرے

اپنی محرومیوں کے خلاف احتجاج رجسٹر کرانے کے لیے ورکروں اور محنت کشوں کی بہت بڑی تعداد سڑکوں پر آنے پر مجبور ہوگئی۔ پاکستان بھر کے بڑے شہروں میں جلوس اور ریلیاں نکالیں جن میں محنت کشوں نے بڑھتی ہوئی مہنگائی، قومی اداروں کی نجکاری، محنت کشوں کے خلاف دہشت گرد حملوں اور بڑھتی ہوئی بے روزگاری کے خلاف احتجاج کیا۔

اساتذہ نے اپنی ملازمتیں باقاعدہ بنانے کے مطالبے کے لیے مئی میں کوئٹہ میں احتجاج کیا۔ سابقہ

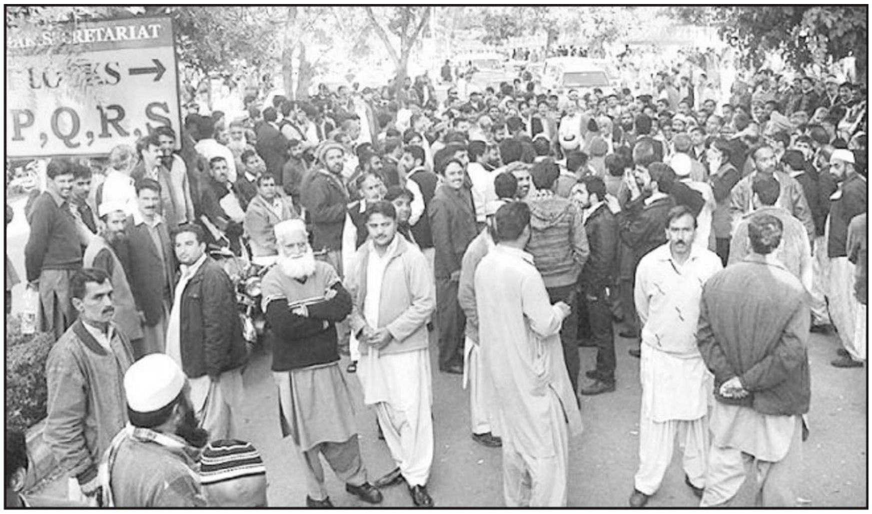

سرکاری ملازمین اپنی تنخواہوں میں معمولی اضافے سے کسی طور خوش نہیں

حکومت کے دوران آغازِ حقوق بلوچستان پیکج کے تحت 5000 اساتذہ کو بلوچستان میں کنٹریکٹ پر بھرتی کیا گیا۔ اساتذہ کا مطالبہ تھا کہ کئی سال اپنی ذمہ داریاں بطریق احسن نبھانے کی وجہ سے حکومت ان کی نوکری پکی کرے۔

مئی میں میٹرو بس سروس کے ڈرائیوروں نے اپنے حالات کار کے خلاف گجومتہ کے مقام پر احتجاج کیا۔ ڈرائیوروں نے کہا کہ رفتار کی اونچ نیچ جیسی معمولی خلاف ورزیوں پر بار بار جرمانے کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے شکایت کی کہ ڈرائیور حضرات کے لیے مناسب آرام گاہیں اور پینے کے پانی کی مناسب سہولتیں میسّر نہیں۔

2013ء کے دوران ہونے والے احتجاجی مظاہروں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ اسکی تفصیل اس چھوٹے سے باب میں نہیں سماسکتی۔ پاکستان ٹورازم کارپوریشن کے ملازمین، آل پاکستان کلرکس ایسوسی ایشن، کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن، ٹیکسٹائل ملز اور لومز، سکولوں اور کالجوں کے اساتذہ، کسان اور ٹریڈ یونینوں کے سرگرم کارکنوں سمیت بہت سے شہری اپنے مطالبات منوانے کے لئے دباؤ ڈالنے والوں میں شامل تھے۔

جبری مشقت

دنیا میں غلامی میں جکڑے انسانوں والے ممالک کی صف میں پاکستان تیسرے نمبر پر ہے۔ آسٹریلوی نژاد واک فری فاؤنڈیشن کے چھپے 2013ء کے گلوبل سروے انڈکس کے مطابق پاکستان میں بیس لاکھ سے بائیس لاکھ تک انسان غلامی کی کسی نہ کسی جدید شکل میں گرفتار ہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں غلامی کی سب سے قبیح شکل جبری مشقت ہے جو مزدوروں کی خوشحالی اور زندگیوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ ٹریڈ یونین اور سوسائٹی کے دوسرے اداروں نے حکومت پر بہت دباؤ ڈالا کہ موجودہ قوانین کو نافذ کیا جائے۔ لیکن مقروض مشقت کا ناجائز کاروبار جاری رہا

2013ء میں حکام نے مزدوروں کو رجسٹر کرنے کی بے دلی کے ساتھ کوشش کی۔ زیادہ تر وہ خوش قسمت لوگ جو مالکان کے فارموں، بھٹوں اور نجی جیلوں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے انہیں شناختی اور سوشل سکیورٹی کارڈ جاری کئے گئے۔ لیکن محنت کشوں کو محض آزاد کرانا ہی کافی نہیں ہوتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں زندگی گزانے کے لئے روزگار فراہم کیا جائے۔ اس کے علاوہ انہیں سابقہ مالکان کی طرف سے درپیش خطرات کا خاتمہ کرنا بھی محکمہ کے فرائض میں شامل ہے۔

حکومت پنجاب نے ضلعی سطح پر نگران کمیٹیاں بنائیں۔ 17 جولائی کو سپریم کورٹ نے انسپکٹر جنرل پولیس کو حکم دیا کہ سپریم کورٹ کا حکم تمام قانون نافذ کرنے والے اداروں بالخصوص ڈسٹرکٹ پولیس آفیسرز

(DPO) کو بھیجا تا کہ وہ اپنے علاقے میں جبری مشقت کے خاتمے کو یقینی بنائیں۔

نومبر میں فیصل آباد ٹیکسٹائل مزدوروں نے بہت بڑی ریلی نکالی جس میں جبری مشقت کرنے والے مزدوروں کی حالت زار کو نمایاں کیا گیا۔ مردوں عورتوں اور بچوں سمیت دس ہزار مزدوروں نے کئی کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے محکمہ محنت کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کیا۔

بچوں کی مشقت

2010ء میں اٹھارویں ترمیم کے بعد وزارتیں صوبوں کو منتقل ہونے کے بعد بھی چاروں صوبے 14 سال سے کم عمر کے بچوں سے مشقت لینے پر پابندی لگانے میں ناکام ہو گئے۔ عالمی ادارہ محنت (ILO) کے مطابق پاکستان میں ایک کروڑ بیس لاکھ بچے مزدوری کر رہے ہیں۔ صوبے پابند تھے کہ پاکستان کی طرف سے توثیق کئے گئے بین الاقوامی ادارہ محنت کے ضوابط پر عمل درآمد کیا جائے۔ فروری 2013ء میں حکومت پنجاب بچوں کی مشقت کے امتناع کے بل برائے 2012ء پر پالیسی کی منظوری کے لیے راضی ہو گئی مگر سال گزرنے کے باوجود یہ ابھی تک زیر التواء ہے۔ خیبر پختونخوا میں بچوں کی مشقت پر پابندی کا بل مجریہ 2012ء اسمبلی میں پیش ہونے کا منتظر رہا۔

اسی طرح سندھ حکومت نے گھروں میں کام کرنے والے ورکروں کے لیے پالیسی وضع کی جس میں سولہ سال سے کم عمر بچوں سے مشقت لینے پر پابندی بھی شامل تھی وہ پالیسی ابھی تک لاگو نہیں ہو سکی۔ بلوچستان میں بچوں کی ملازمت کا ترمیمی بل مجریہ 2012ء ابھی تک قانون سازی کے لیے پیش نہیں ہو سکا۔

بے گھر بچوں کی نگہداشت چند لوگ ہی کرتے ہیں

حکومت پاکستان نے عالمی ادارہ محنت کی سفارشات نمبر 138 اور 182 جس میں بچوں سے مشقت کی تمام اقسام پر 2016ء تک خاتمے کی منظوری دی تھی۔حکومت نے عالمی ادارہ محنت سے بچوں کی مشقت کے خاتمے کے منصوبوں کے لیے مالی اور تکنیکی مدد کی درخواست کی تھی۔ اس کی ایک مثال دسمبر 2009ء میں سکھر میں شروع کیا گیا وہ سروے تھا جس میں کہا گیا تھا کہ صرف سکھر میں 53,000 بچے خطرناک حالات میں مزدوری کررہے ہیں۔سکھر کے محکمہ محنت کے سروے کے مطابق 53 فیصد بچے کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔ 24 فیصد بچے مویشی پالنے میں ہاتھ بٹاتے ہیں اور بقیہ 23 فیصد موٹر ورکشاپوں اور چائے خانوں میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔

حالیہ برسوں میں گھریلو اور کمرشل مزدور بچوں پر ہونے والے تشدد کے کئی واقعات منظر عام پر آئے ہیں۔خواتین کے حالات پر بننے والے نیشنل کمیشن (NCSW) کے مطابق جنوری 2010ء سے دسمبر 2013ء تک گھروں میں کام کرنے والے مزدور بچوں پر تشدد کے 47 واقعات رپورٹ کئے گئے۔سول سوسائٹی کی انجمنوں نے گھریلو کام کرنے والے بچوں کو مزدور کا درجہ دے کر سوشل سکیورٹی سمیت دوسری سہولتوں کا مستحق قرار دینے کے لیے بل کی منظوری پر زور دیا ہے۔

24 مارچ کو ایک 22 سالہ شخص ایک دوست سمیت افغان بارڈر پر چمن کے قریب واقع ایک بیگار کیمپ سے فرار ہو کر تھانے پہنچ گیا۔اس نے بتایا کہ اسے سولہ سال قبل جہانیاں سے اغواء کیا گیا تھا جب وہ صرف چھ برس کا تھا۔اس نے پولیس کو بتایا کہ 10 دوسرے بچے بھی بیگار کیمپ میں محبوس ہیں۔

ایک بارہ سال بچہ پنجاب کے شہر گوجرانوالہ میں اپنے مالکان کے گھر میں مردہ پایا گیا۔مالک کے بیان کے مطابق بچے نے چھت سے لٹک کر خودکشی کی مگر میڈیکل رپورٹ نے تصدیق کی کہ بچے کو قتل کیا گیا تھا۔

جون 2013ء میں گیارہ سالہ بچی ایک گھر سے فرار ہو کر کراچی کے ایک شیلٹر ہاؤس میں پہنچی۔ اس بچی کو اس کے والدین نے دو سال پہلے 2000 روپے ماہانہ تنخواہ پر وہاں گھریلو کام کے لیے بیچ دیا تھا۔اس کا مالک اس پر تشدد کرتا تھا۔

سفارشات

1۔ بجلی کی روز افزوں کمی کا سدباب کیا جائے تا کہ انڈسٹری پوری استعداد سے کام کرے اس سے بڑھتی ہوئی مزدور برادری کو ملازمت کے زیادہ مواقع ملیں گے۔

2۔ مناسب تعداد میں تربیت یافتہ انسپکٹر وں سے فیکٹریوں کے معائنے شروع کرائے جائیں تا کہ

دوران کار حادثات سے بچا جا سکے۔

3۔ کم از کم اجرت پر ہر سال نظر ثانی کی جائے اور افراط زر کی شرح کے مطابق اجرت میں اضافہ کیا جائے۔۔

4۔ گھریلو ملازمین کو مزدوروں میں شامل کر کے انہیں قانونی تحفظ دیا جائے اور لیبر قوانین کے مطابق سوشل سکیورٹی کی سہولت، کم از کم اجرت کے قانون کے مطابق ادائیگی، محفوظ حالات کار اور وقت پر اجرتوں کی ادائیگی کو یقینی بنایا جائے اور وقت پر اجرت نہ دینے والے مالکان کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کی جائے۔

5۔ اٹھارہویں آئینی ترمیم کے بعد محنت کشوں سے متعلق قوانین میں مطلوبہ ترامیم کر کے یا نئے قوانین کو منظور کر کے فوراً نافذ کیا جائے تا کہ مزدوروں کی سلامتی اور تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے۔

6۔ علاقے میں ہونے والے جبری مشقت کے واقعات پر پولیس افسران کو جوابدہ بنایا جائے تا کہ جبری مشقت کی غیر قانونی سرگرمیوں کو روکنے والے اقدامات کو موثر بنایا جا سکے۔

7۔ مردم شماری اور لیبر شماری جلد کی جائے تا کہ آبادی میں اضافہ اور بیروزگاری کی شرح کا تعین ہو سکے اور اسی کے مطابق پالیسیاں وضع کی جا سکیں۔

6 - سماجی اور معاشی حقوق

تعلیم

(1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی مکمل نشوونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 26]

1- اس میثاق میں شریک تمام ملک ہر فرد کے تعلیم حاصل کرنے کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی نشوونما اور انسانی عزت و وقار کی سربلندی ہونا چاہیے اور اس سے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کو تقویت ملنی چاہیے۔ وہ اس بات سے بھی اتفاق کرتے ہیں کہ تعلیم ہر فرد کو اس لائق بنائے کہ وہ آزاد معاشرے میں موثر طور پر اپنا حصہ بٹا سکے اور تمام قوموں، نسلوں، قبیلوں، اور مذہبی گروہوں کے درمیان افہام و تفہیم کو فروغ دے سکے اور قیام امن کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھا سکے۔

2- اس میثاق میں شامل ملک تسلیم کرتے ہیں کہ اس حق کو مکمل طور پر حاصل کرنے کے لیے......

(الف) پرائمری تعلیم لازمی ہوگی اور ہر فرد کو میسر ہوگی۔

(ب) ثانوی تعلیم اپنی مختلف اقسام میں، جن میں فنی اور پیشہ ورانہ ثانوی تعلیم بھی شامل ہے، عمومی طور پر میسر ہوگی اور ہر ممکن ذرائع سے ہر شخص کی دسترس میں ہوگی۔ خاص طور سے بتدریج مفت تعلیم رائج کر کے یہ مقصد حاصل کیا جائے گا۔

(ج) اعلیٰ تعلیم پر ہر شخص کو استعداد کے مطابق، ہر ممکن ذریعہ سے دسترس حاصل ہوگی۔ خاص طور سے مفت تعلیم رائج کر کے یہ مقصد حاصل کیا جائے گا۔

معاشی، معاشرتی و سماجی حقوق کا بین الاقوامی میثاق (دفعہ 13)

ریاست قانون میں متعین شدہ طریقۂ کار کے مطابق پانچ سے سولہ برس کی عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے گا۔ (آئین پاکستان دفعہ 25-A)

تعلیم: ایک بنیادی انسانی حق

انسانی حق کے طور پر تعلیم کی اہمیت کو بیان کرنا مشکل ہے تاہم دیگر حقوق کی تعمیل کے لیے تعلیم اولین شرط ہے۔ اقوام متحدہ کی کمیٹی، جو ''معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے بین الاقوامی میثاق'' (آئی سی ای ایس سی آر) پر عملدرآمد کی ذمہ دار ہے اور جس کی توثیق پاکستان نے 2008ء میں کی تھی، نے تعلیم کو نہ صرف ایک بنیادی حق قرار دیا ہے بلکہ دیگر انسانی حقوق کے حصول کا ناگزیر ذریعہ قرار دیا ہے۔ تعلیم بالخصوص استحصال زدہ گروہوں اور افراد کو بااختیار بناتی ہے اور ان کی زندگیوں کو باوقار اور بہتر بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں لاکھوں بچے اور بالغ افراد تعلیمی مواقع حاصل نہیں کر پاتے۔ یہ لوگ مسلسل محرومی کا شکار ہیں اور اُن کی زیادہ تر تعداد غربت کے باعث تعلیم سے محروم رہتی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی ریاست ملک کے عوام کو ضروری خدمات مہیا کرنے کی بجائے اپنے سکیورٹی انتظامات کو برقرار رکھنے کو ترجیح دیتی ہے۔

پاکستان کے آئین میں مفت پرائمری تعلیم کو بنیادی حق کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے اور اس حق کے حصول کے لیے وفاقی اور صوبائی سطح پر قوانین نافذ کیے گئے ہیں۔ تاہم اس بات کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی جا رہی کہ تعلیم کا مطلب کیا ہے۔ آئی سی ای ایس سی آر کے مطابق، تعلیم کا مقصد ''انسان کی شخصیت کو بنانے اور انسان میں وہ احساس پیدا کرنا ہے جس سے انسانی حقوق اور بنیادی حقوق کے احترام کو تقویت ملے۔ تعلیم افراد کو اختیار دیتی ہے کہ وہ ''مؤثر طور پر ایک آزاد معاشرے میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں اور تمام اقوام اور تمام نسلی، لسانی یا مذہبی گروہوں کے درمیان اتفاق، رواداری اور دوستی کو فروغ دے سکیں۔

اگرچہ پاکستان بچوں کی ایک بڑی تعداد کو تعلیم فراہم کرنے کے ہدف کی طرف بڑھ رہا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ انہیں جو پڑھایا جا رہا ہے کیا وہ انہیں روادار یا ترقی پسند بنا رہا ہے یا پھر یہ انہی تعصّبات، بدگمانیوں اور مذہبی کٹر پن کو برقرار رکھ رہا ہے جس کی وجہ سے ملک کا سماجی ڈھانچہ روبہ زوال ہے۔

گزشتہ سالوں کی طرح 2013ء میں بھی پاکستان کا نظام تعلیم ناقص بنیادوں پر قائم رہا۔ بڑے بڑے وعدوں کے باوجود، تعلیم کے لیے مختص بجٹ میں معمولی سا اضافہ کیا گیا جو کہ جی ڈی پی کے دو فیصد سے بھی کم تھا، نجی اور سرکاری تعلیم کے درمیان موجودہ عدم مساوات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا؛ سکولوں کے نصاب

نے نفرت اور تعصب پھیلانے کا سلسلہ جاری رکھا؛ اور ایک مرتبہ پھر ملک کے متعدد علاقوں میں تعلیمی سرگرمیوں میں خلل پیدا کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر تشدد کا استعمال کیا گیا۔

بین الاقوامی درجہ بندی اور شرح تعلیم

دسمبر 2013ء میں جاری ہونے والی یونیسکو کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کی 79 فیصد آبادی ناخواندہ ہے، اور دنیا کے 221 ممالک کی فہرست میں پاکستان 180ویں نمبر پر ہے۔ 15 سے 24 سال کی عمر کے افراد میں ناخواندگی کی شرح 72 فیصد، 25 سے 44 سال کی عمر کے افراد میں 57 فیصد، 45 سے 54 سال کی عمر کے افراد میں 46 فیصد اور 45 سے 64 سال کی عمر کے افراد میں 38 فیصد بتائی گئی تھی۔ اس کم شرح کے باعث پاکستان شرح تعلیم کے حوالے سے اپنے ہمسایہ ممالک انڈیا، چین، ایران اور نیپال سے پیچھے ہے۔

اقوام متحدہ کی 2013ء کی انسانی ترقی کی رپورٹ ''جنوب کا عروج: مختلف النوع دنیا میں انسانی ترقی'' نے بھی ایسی ہی صورت حال بیان کی ہے۔ اقوام متحدہ کے انسانی ترقی کے گوشوارے جو کہ متوقع عمر، تعلیم اور معیار زندگی سے متعلقہ کوائف سے مرتب کردہ تقابلی گوشوارہ ہے، میں پاکستان کا سکور 0.515 ہے۔ یہ سکور 2012 کے سکور 0.512 سے تھوڑا بہتر تھا۔ تاہم یہ بہتری خوشی کا باعث نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس کم سکور کی وجہ سے پاکستان 186 ممالک میں 146ویں نمبر پر ہے، جو کہ جنوبی ایشیا میں کم ترین درجہ ہے۔ مثال کے طور پر ایچ ڈی آئی کے مطابق پاکستان میں ابتدائی تعلیم 6.8 برسوں پر محیط ہے جبکہ انڈیا میں 10.3 برس

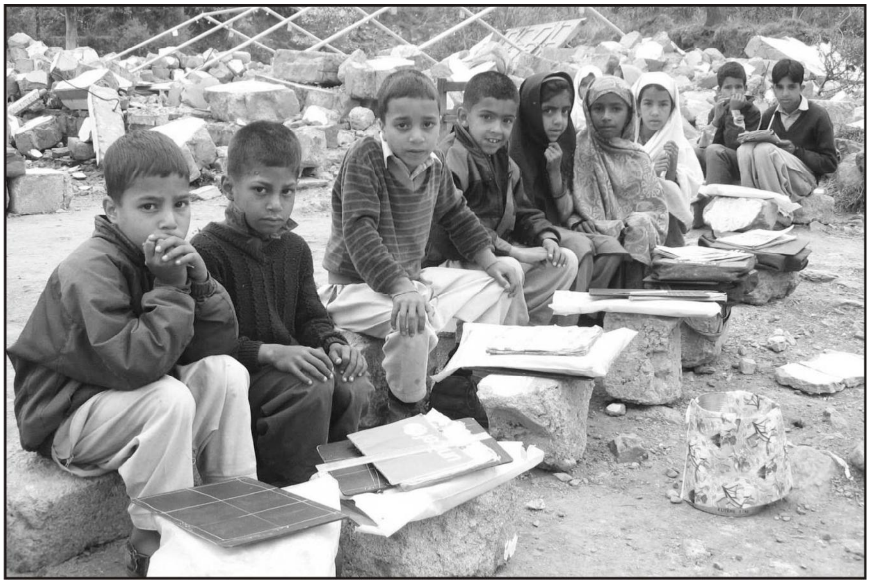

سکول کی عمارتیں ایسی آسائش ہے جو متعدد نو جوان طلبہ کو میسر نہیں

اور بنگلہ دیش میں 8.1، نیپال میں 8.8 اور سری لنکا میں 12 پر محیط ہے۔ ایچ ڈی آئی نے یہ بھی واضح کیا کہ پاکستان ان ممالک میں سے ایک ہے جو تعلیم اور صحت پر قلیل ترین رقم خرچ کرتے ہیں۔ پاکستان صحت پر جی ڈی پی کا صرف 0.8 فیصد اور تعلیم پر 1.8 فیصد خرچ کرتا ہے۔ پاکستان اسی سلسلے کو بار بار دوہراتے ہوئے عالمی، معاشی فورم کے عالمگیر مسابقتی گوشوارے میں 148 ممالک میں 133 ویں نمبر پر آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ پرائمری، ثانوی اور اس کے بعد کے درجے کی تعلیم میں بچوں کی کم تعداد کی وجہ مسابقتی دوڑ میں پاکستان کا پیچھے رہ جانا ہے۔

حکومتی پالیسیاں، ترجیحات اور عمل

2013ء پاکستان میں انتخابات کا سال تھا اور یہ امر حیران کن نہیں ہونا چاہیے کہ تعلیم نمایاں طور پر تمام بڑی جماعتوں کے منشور میں شامل تھی۔ پاکستان مسلم لیگ نواز نے اپنی انتخابی مہم کے دوران تعلیمی بجٹ کو 2018ء تک جی ڈی پی کے 4 فیصد تک بڑھانے کا عہد کیا۔ پاکستان تحریک انصاف نے دعویٰ کیا کہ اگر یہ اقتدار میں آئی تو یہ تعلیمی بجٹ کو جی ڈی پی کے 5 فیصد تک بڑھائے گی۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے ایک انتہائی اقدام کرتے ہوئے پارٹی کے نعرے ''روٹی، کپڑا اور مکان'' کے ساتھ ساتھ ''علم؛ صحت اور سب کو کام'' کو بھی منشور کا حصہ بنا لیا۔

پاکستان مسلم لیگ (ن) ایک آسان انتخابی فتح کے بعد اقتدار میں آئی۔ تعلیم کے لیے مختص کیا جانے والا بجٹ مایوس کن طور پر جی ڈی پی کا 1.9 فیصد تھا، ایک ایسی شرح جو کہ گزشتہ چند سالوں سے جمود کا شکار ہے۔ یو این ڈی پی کی انسانی ترقی کی 2013ء کی رپورٹ کے مطابق دنیا کے صرف 7 ترقی پذیر ممالک تعلیم پر پاکستان سے کم رقم خرچ کرتے ہیں۔ اس شرح کی اہمیت کو تعلیم پر کام کرنے والی ایک پاکستانی تنظیم، ''الف اعلان'' نے مناسب انداز میں بیان کیا، جس کا کہنا تھا کہ ملک کے ہر بچے کو مفت پرائمری تعلیم مہیا کرنے کے لیے پاکستانی فوج کے کل بجٹ کا محض پانچواں حصہ درکار ہوگا۔

پنجاب میں تعلیم کے لیے مختص کردہ بجٹ باقی صوبوں سے زیادہ ہے جو کہ تقریباً 182 ارب روپے ہے جبکہ سندھ 134 ارب روپے کے تعلیمی بجٹ کے ساتھ دوسرے نمبر پر ہے۔ خیبر پختونخوا نے 13-2012ء کی نسبت حالیہ سال میں تعلیم کے بجٹ میں سب سے زیادہ 30 فیصد اضافہ کیا جو لائق تحسین ہے۔ 2015ء تک عالمی معیار کی اور مفت تعلیم اور 2025ء تک دسویں جماعت تک کی تعلیم کے حصول کے لیے 2009ء میں قومی تعلیمی پالیسی کا آغاز کیا گیا جس کا مقصد سرکاری اور نجی اداروں میں پائے جانے والے تفاوت کا نجی شعبے سے متعلق پالیسیوں اور مقاصد سے ربط قائم کرنا تھا۔ چنانچہ دسمبر 2012ء میں منظور ہونے والے ''تعلیم

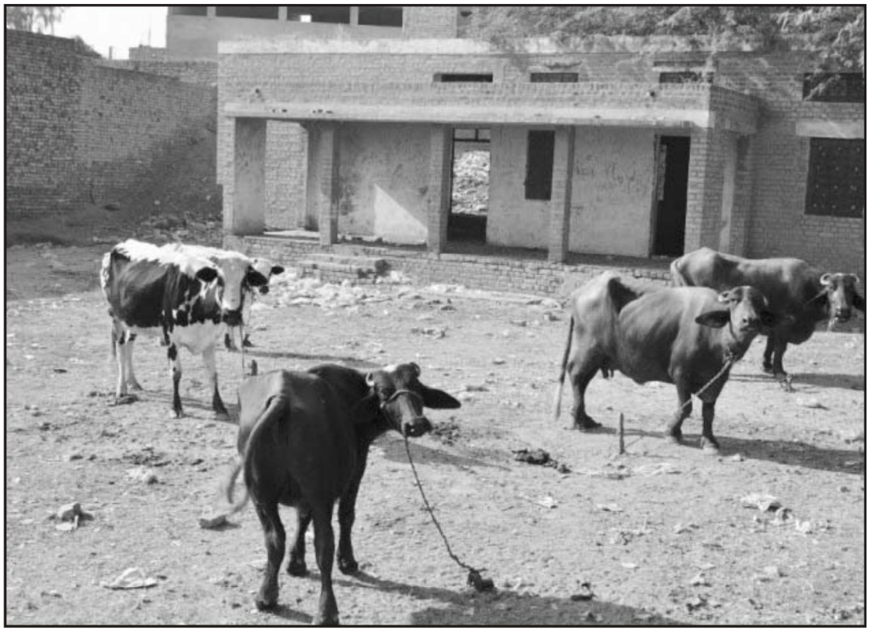

کچھ سکول ایسے ہیں جو جانوروں کے باڑے کے کام آتے ہیں

کا حق ایکٹ (آر ای ٹی) کے ذریعے حکومت پر یہ لازم قرار دیا گیا کہ وہ 5 سے 16 برس کی عمر کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے تاہم 2013ء میں خواندگی کی مایوس کن شرح اور اس سے وابستہ تعلیم کے لیے مختص کردہ کم بجٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے این ای پی اور آر ٹی ای میں مقرر کردہ بلند اہداف کا حصول ناممکن دکھائی دیتا ہے۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں نے 2013ء میں تعلیم کے حوالے سے قانون سازی کی سطح پر چند قابل تحسین اقدامات کیے۔ مارچ 2013ء میں قومی اسمبلی نے ''جسمانی سزا کی ممانعت کا بل 2013ء'' کو متفقہ طور پر منظور کیا۔ یہ قانون، جس کا بل پاکستان مسلم لیگ (ق) کی رکن ڈاکٹر عطیہ عنایت اللہ نے پیش کیا تھا، تعلیمی اداروں میں جسمانی سزا کی ممانعت کرتا ہے۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کسی بچے پر جسمانی سزا کا استعمال کرنے والا کوئی بھی شخص زیادہ سے زیادہ ایک سال قید یا پچاس ہزار روپے تک کے جرمانے یا دونوں سزاؤں کا مستحق ہوگا۔

سندھ 5 سے 16 سال کی عمر کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنے سے متعلق قانون بنانے والا پہلا صوبہ بن گیا۔ ''سندھ کا بچوں کی مفت اور لازمی تعلیم کے حق'' کے ایکٹ کا مقصد آئین کے آرٹیکل 25اے کا نفاذ ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ تعلیم کا حصول بچے کا بنیادی حق ہے۔

اس قانون کے مطابق، وہ تمام بچے جن کے والدین ان کی تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے یا جو دہشت گردی کا شکار ہوئے ہوں، انہیں نجی سکولوں میں مفت تعلیم دینے کے لئے داخل کیا جائے گا۔

اس قانون میں مزید کہا گیا ہے کہ اس پالیسی کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لئے ہر سکول کو بہر صورت حکومتی نمائندوں، اساتذہ اور سکول کے پرنسپل پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دینی ہوگی۔ اس قانون کی پیروی نہ کرنے کی صورت میں سکول انتظامیہ اور تعلیم سے محروم بچوں کے والدین کو جرمانے یا قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔ سندھ میں اس قانون کے نفاذ کے کچھ دن بعد بلوچستان کے گورنر نے ایک آرڈیننس جاری کیا جس میں اعلان کیا گیا کہ صوبے میں پرائمری اور ثانوی تعلیم لازمی اور مفت ہوگی۔

پنجاب حکومت کی اختیار کردہ سب سے متنازعہ تعلیمی پالیسی لیپ ٹاپ کی تقسیم تھی، جو کہ ''منصوبہ برائے ترقی نوجوانان'' کے حصے کے طور پر متعارف کرائی گئی تھی۔ اس سکیم کے تحت 4 ارب روپے کے ایک لاکھ لیپ ٹاپ طالب علموں میں تسلیم کیے جانے تھے۔ اس سکیم کو کڑی تنقید کا سامنا کرنا پڑا کہ کروڑوں پاکستانی بچے تعلیم سے محروم تھے جبکہ حکومت ان کے تعلیم کے بنیادی حق کی انجام دہی پر لیپ ٹاپس کو ترجیح دے رہی تھی۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم

بچوں کے حقوق کے تحفظ کی سوسائٹی ''سپارک'' نے اپنی سالانہ رپورٹ 'پاکستان میں بچوں کی صورت حال 2012ء' میں انکشاف کیا ہے کہ پاکستان میں 5 سے 9 سال کی عمر کے ایک کروڑ ستانوے لاکھ پچاس ہزار بچے تعلیم سے محروم ہیں۔ ان میں سے 3 سے 5 سال کی عمر کے 70 لاکھ بچوں کو پرائمری تعلیم بھی مہیا نہیں کی گئی تھی۔ ان مایوس کن اعداد وشمار کے باعث پاکستان دنیا کے ان ممالک کی فہرست میں دوسرے نمبر پر ہے جہاں بچوں کی ایک بڑی تعداد سکول نہیں جاتی۔

صوبائی سطح پر پنجاب میں سکولوں میں اندراج کی شرح سب سے زیادہ ہے جو کہ 61 فیصد ہے جس کے بعد سندھ، خیبر پختونخوا اور بلوچستان کا نمبر ہے جہاں پر یہ شرح بالترتیب 53 فیصد، 51 فیصد اور 47 فیصد ہے۔

وزارت تعلیم نے یونیسف اور یونیسکو کے تعاون سے 2013ء میں ایک جامع رپورٹ تیار کی جس میں ملک میں تعلیم کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق 65 لاکھ سے زائد بچوں کا پرائمری تعلیم میں اندراج نہیں ہوا اور مزید 27 لاکھ بچوں کا نچلی ثانوی سطح پر اندراج نہیں ہوا۔

اس رپورٹ میں دیئے گئے حقائق کی بنیاد پر وفاقی حکومت نے 2013ء سے لے کر 2016ء تک کے 30 سالہ قومی لائحہ عمل کے تحت 5 سے 9 برس کی عمر کے 51 لاکھ بچوں کے اندراج کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس منصوبے کا دائرہ کار 4 علاقوں مثال کے طور پر آزاد جموں وکشمیر، دارالحکومت اسلام آباد کے علاقے، گلگت بلتستان اور فاٹا پر محیط ہے اور اس پر آنے والی لاگت کا تخمینہ ایک سو اٹھاسی ارب روپے ہے۔

بھوت سکولوں جو فقط دستاویزات پر موجود ہیں اور جہاں سے اساتذہ متواتر تنخواہیں وصول کر رہے

ہیں کا پھیلاؤ ملک میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے ناقص نظام پر ہونے والی بحث کا بنیادی نکتہ بن چکا ہے۔ 2012ء میں ایک مقامی خیراتی تنظیم ''سندھ کی دیہی ترقی کی سوسائٹی' نے سپریم کورٹ میں ایک درخواست دائر کی کہ وہ بھوت سکولوں کے معاملے کی تحقیقات کرے۔ عدالت نے فروری 2013ء میں درخواست کا جائزہ لیا جس کی پیروی کرتے ہوئے اس نے ضلعی اور سیشن ججوں کے ذریعے ملک میں ایک مرحلہ وار سروے کے انعقاد کا حکم دیا تاکہ پرائمری اور ثانوی سرکاری سکولوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا جا سکے۔

سروے کے نتائج نے پاکستان میں تعلیم کی صورت حال کے بارے میں ایک تشویشناک تصویر پیش کی۔ ملک میں ابتدائی اور ثانوی سطح کے 260,903 سکول موجود ہیں جن میں سے 2088 بھوت سکول ہیں۔ 1008 سکولوں پر لوگوں نے ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے اور 5,827 سکول غیر فعال ہیں۔ سب سے زیادہ دہشت انگیز اعداد و شمار سندھ سے موصول ہوئے جہاں 1,962 بھوت سکول موجود ہیں۔ 419 سکولوں پر لوگوں نے ناجائز طور پر قبضہ کیا ہوا ہے اور 4,285 غیر فعال ہیں۔ اگرچہ دارالحکومت اسلام آباد کے علاقوں میں ایک بھی بھوت سکول موجود نہیں تھا تاہم سکولوں کی حالت انتہائی خستہ بتائی گئی تھی جن کے لئے فنڈز انتہائی محدود ہیں اور ان کا حصول بھی بے حد مشکل ہے۔ ڈسٹرکٹ اور سیشن ججوں کی تیار کردہ رپورٹ پر غور کرنے کے بعد سپریم کورٹ کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ بھوت سکولوں کی موجودگی اور اساتذہ کی غیر حاضری دو بنیادی مسائل ہیں جو ملک کے ابتدائی اور ثانوی نظام تعلیم کو درپیش ہیں۔

صوبائی عدم مساوات ایک اور نمایاں مسئلہ ہے جس کا پاکستان کو مسلسل سامنا ہے۔ بلوچستان

دہشت گردوں کی طرف سے سکولوں کو تباہ کرنے کے باعث تعلیم کو بہت نقصان پہنچا

جغرافیائی لحاظ سے سب سے بڑا لیکن پسماندہ ترین صوبہ ہے، تعلیم کی خراب صورت حال سے زیادہ متاثر ہوا۔ صوبے کے کل 36 لاکھ بچوں میں سے محض 13 لاکھ بچوں کا سکولوں میں اندراج تھا۔ یہ اعداد و شمار تناسب کے لحاظ سے دیگر صوبوں میں سکول جانے والے بچوں کی شرح سے کافی کم ہے۔ صوبے بھر میں پرائمری، مڈل اور ہائی سکولوں کی تعداد 12,600 ہے جن میں 56,000 اساتذہ پڑھاتے ہیں تاہم سیکرٹری تعلیم کے مطابق 2,000 سکول غیر فعال تھے اور 3,000 سے زائد اساتذہ ڈیوٹی پر نہیں جاتے تھے۔

اسی طرح خیبر پختونخوا کے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے شعبے کے مطابق کے پی کے میں 28,472 سرکاری سکول ہیں جن میں سے 27,975 سکول فعال ہیں جبکہ 397 غیر فعال ہیں۔ علاوہ ازیں فعال سکولوں میں سے 20 فیصد چار دیواری سے محروم ہیں۔ 30 فیصد میں پانی کی فراہمی کا بندوبست نہیں ہے۔ 42 فیصد میں بجلی نہیں ہے اور 16 فیصد لیٹرین کی سہولیات سے محروم ہیں۔

جب تک ان مشکلات کا حل تلاش نہیں کیا جاتا اس وقت تک صوبوں میں غربت اور پسماندگی کا قابل ملامت سلسلہ جاری رہے گا۔

پاکستان میں سخت قوانین کے باوجود سکولوں میں جسمانی سزا کے استعمال کا سلسلہ جاری رہا۔ ''پلان پاکستان'' نامی این جی او جس نے 2008ء سے جسمانی سزا کے خلاف ایک مہم جاری رکھی ہوئی ہے، نے ایک مطالعاتی رپورٹ ''خوف کا خاتمہ: اساتذہ جسمانی سزا کا استعمال کیوں کرتے ہیں'' کے عنوان سے تیار کی جس سے پتہ چلا کہ زیادہ تر اساتذہ اور والدین بالخصوص کم آمدن والے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے، سکولوں میں بچوں کو جسمانی سزا دینے کے حامی تھے۔ اس تحقیق سے یہ ظاہر ہوا کہ اس سزا کا استعمال نجی، غیر رسمی سکولوں اور مدرسوں کی نسبت سرکاری سکولوں میں زیادہ کیا جاتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم

عالمی معاشی فورم کی عالمگیر مسابقت کی رپورٹ میں پاکستان کی اعلیٰ اور تیسرے درجے کی تعلیم کی کارکردگی میں بہتری آئی ہے۔ 2012ء میں 148 ممالک میں 125ویں درجے کے مقابلے میں پاکستان اب 21ویں درجے پر آ گیا ہے۔

حکومت نے سالانہ بجٹ میں 57ارب 40 کروڑ روپے مختص کرتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کو زیادہ ترجیح دینے کا اشارہ دیا۔ اس بجٹ میں تجویز کردہ پبلک سیکٹر ڈویلپمنٹ پروگرام (جی ایس ڈی پی) کے لیے 18 ارب 40 کروڑ روپے بھی شامل ہیں جو کہ 13-2012ء میں اس پروگرام کے لیے مختص کردہ 15ارب 80 کروڑ روپے سے 23 فیصد زیادہ ہیں۔ بقیہ 39 ارب روپے کی رقم اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے مختص کی گئی

اعلیٰ تعلیم سے متعلق فیصلوں پر عدم اتفاق کا ایک منظر

ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ 14-2013ء کے دوران اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد کو بارہ لاکھ تیس ہزار تک کرنا ہے جبکہ 13-2012ء میں یہ تعداد دس لاکھ آٹھ ہزار تھی۔اس طرح اضافہ چودہ فیصد ہوگا۔

یہ فنڈز ایچ ای سی کے زیرِ انتظام ہیں اور ان کے مطلوبہ استعمال میں وظائف میں اضافہ اور بنیادی ڈھانچے کی ترقی مثال کے طور پر نئے تعلیمی اداروں کا قیام، اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک نئے شعبے کا قیام اور موجود سہولیات میں بہتری شامل ہے۔

تاہم مختص کردہ بجٹ میں اضافے سے محض نصف ہدف حاصل ہوا کیونکہ ماہرینِ تعلیم کا کہنا ہے کہ فنڈز کے اجرا میں تاخیر اعلیٰ تعلیم کے اداروں اور سہولیات کی فعالیت میں مسلسل رکاوٹ بن رہی ہے۔سرکاری شعبے کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں، بالخصوص وہ جو دور دراز کے علاقوں میں فرائض انجام دے رہے تھے، نے اس تشویش کا اظہار کیا کہ فنڈز کے اجرا میں تاخیر کے باعث وہ عملے کو تنخواہیں دینے سے قاصر تھے اور وہ رواں منصوبے روکنے پر مجبور تھے۔ایچ ای سی بھی فنڈز کے اجراء میں تاخیر سے متاثر ہوا اور ملکی اور غیر ملکی 6,000 سکالروں کو فیسوں اور وظائف کی ادائیگی میں تاخیر کا سامنا کرنا پڑا۔ایک اطلاع یہ بھی ملی کہ ایچ ای سی پبلک سیکٹر یونیورسٹیوں کی جانب سے بھرتی کیے جانے والے 110 غیر ملکی پروفیسروں کو تنخواہیں ادا کرنے سے قاصر تھا۔

ہائیر ایجوکیشن کمیشن بھی مختلف تنازعات کا شکار رہا۔ایچ ای سی 20 اگست 2013ء سے جب ڈاکٹر جاوید لغاری کی چار سالہ میعاد اختتام پذیر ہوئی تھی، کسی مستقل چیئرمین کے بغیر کام کر رہا ہے۔ 27 نومبر

2013ءکو سپریم کورٹ نے حکومت کو 15 دن کے اندر ایچ ای سی کے مستقل چیئرمین کی تعیناتی کا حکم دیا۔ حکومت کی جانب سے عدالتی حکم کی پیروی کرنے میں ناکامی پر ہائیر ایجوکیشن کمیشن کے سابق چیئرمین ڈاکٹر عطاالرحمان نے ایچ ای سی کے مستقل اور باقاعدہ چیئرمین کی تقرری کے لیے 30 دسمبر 2013ءکو اسلام آباد ہائی کورٹ میں ایک درخواست دائر کی۔

ایچ ای سی کے تحت چلنے والے غیر ملکی پی ایچ ڈی پروگرام طالب علموں کو وظائف کے اجرا میں تاخیر اور ایچ ای سی اور تعلیمی اداروں میں ہم آہنگی کی کمی کا شکار رہا۔ دوسری طرف یہ اطلاع بھی موصول ہوئی کہ بہت سے طالب علم ایچ ای سی کے وظائف پر ڈاکٹریٹ کی تعلیم وقت پر مکمل کرنے سے قاصر تھے اور دیگر نے اپنی ڈگریاں مکمل کرنے کے بعد پاکستان واپس آنے سے انکار کر دیا جو کہ ایچ ای سی کے چناؤ کے معیار اور جانچ پڑتال کے طریقہ کار پر ایک سوالیہ نشان تھا۔

نجی سکول

سرکاری اور نجی سکولوں کی جانب سے فراہم کی جانے والی تعلیم کے معیار میں بڑھتی ہوئی عدم مساوات کی وجہ سے دو حلقوں سے تعلق رکھنے والے طلبا میں تفاوت مزید وسیع ہوتا رہا۔ ملک کے طلبا کی بڑی اکثریت نجی سکولوں کی بھاری فیسیں ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی اور انہیں یا تو سرکاری سکولوں یا پھر مدرسوں کی تعلیم کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو کہ نسبتاً کم تر معیار کی تعلیم ہے۔

نجی سکول جو اس بات سے آگاہ تھے کہ مہنگی تعلیم کی استطاعت رکھنے والے طبقات کے لیے فراہم کی جانے والی تعلیم پر ان کی اجارہ داری قائم ہے، وہ اپنی مرضی سے فیسوں میں اضافہ کرتے رہے۔ پاکستان بھر میں فیسوں میں اضافہ دیکھنے میں آیا، حتیٰ کہ ان سکولوں میں بھی جو کہ رہائشی علاقوں میں مناسب سہولیات، مثال کے طور پر لیبارٹریوں، لائبریریوں اور کھیل کے میدانوں، سے محروم چھوٹے گھروں میں کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔

پارلیمنٹ نے فروری 2013ء میں نجی سکولوں کو باضابطہ بنانے کی سعی کرتے ہوئے دارالحکومت اسلام آباد کے ''اسلام آباد کیپیٹل ٹیریٹری ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز ایکٹ'' کی منظوری دی۔ اس قانون کا مقصد نجی تعلیمی اداروں کو باضابطہ بنانا ہے تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ وہ تعلیمی نصاب اور تعلیم کے دورانیے، چھٹی کے دن، یا تعطیلات، معمول کی چھٹیوں کی شرح اور اساتذہ کی تعلیمی قابلیت وغیرہ جیسے معاملات کے حوالے سے ایک یکساں پالیسی کی پیروی کریں۔ ''دارالحکومت اسلام آباد کے علاقوں کے نجی تعلیمی اداروں (باضابطگی اور ترقی) کی ریگولیٹری اتھارٹی (پی ای آئی آر اے) 2006ء میں تشکیل دی گئی تھی لیکن اسے

اختیارات نہیں دیے گئے تھے کہ یہ نجی سکولوں کی جانب سے وصول کی جانے والی فیسوں کی جانچ پڑتال کر سکے۔ دارالحکومت میں فیسوں میں اضافے کے پیشِ نظر پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا جس کے تحت اس ادارے کو کچھ اختیارات سونپے گئے۔

پنجاب حکومت نے نجی تعلیمی اداروں کے فیس سٹرکچر کو نظم وضبط میں رکھنے کے لیے تاحال انضباطی ادارہ تشکیل نہیں دیا حالانکہ اس حوالے سے تجاویز پیش کرنے کے لیے کہ نجی سکولوں کو کس طرح سے باضابطہ بنایا جا سکتا ہے، متعدد کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں۔ جنوری 2013ء میں پنجاب حکومت نے ایک تعلیمی کمیشن کے قیام کے لیے شراکت داروں بشمول طالب علموں، ان کے والدین اور اساتذہ کا فیڈ بیک حاصل کرنے کے لیے ایک مہم کا آغاز کیا تاکہ نجی سکولوں کے کام کے طریقہ کار کو باضابطہ بنایا جا سکے۔ یہ انضباطی ادارہ ایک نجی تعلیمی بل کے تحت تشکیل دیا جائے گا جو کہ آج کل تیار کیا جا رہا ہے تاہم اس صوبے کے نجی سکولوں نے اس اقدام کی شدید مخالفت کی ہے جس کے باعث اس بات کے امکانات کم ہیں کہ ایسا ادارہ جلد تشکیل پا سکے گا۔

سندھ میں نجی سکولوں کو "سندھ کے نجی تعلیمی اداروں (باضابطگی اور کنٹرول) کے آرڈیننس 2001ء اور 2005ء کے ضوابط کے علاوہ سندھ کے بچوں کے مفت اور لازمی تعلیم کے ایکٹ؛ جسے فروری 2013ء میں منظور کیا گیا تھا، کے تحت باضابطہ بنایا دیا گیا۔

نجی اداروں کے معائنے اور اندراج کے ڈائریکٹوریٹ جو کہ قانون کے ماتحت کام کرنے والا انضباطی ادارہ ہے، کے مطابق علاقے کے 1,398 سکولوں میں سے 153 یا تو غیر اندراج شدہ ہیں یا پھر انہوں نے اپنے اندراج کی تجدید نہیں کروائی۔ تاہم ڈائریکٹوریٹ میں معائنے اور اس کے اختیارات کے نفاذ کے ذمہ دار عملے اور فنڈز کی کمی ہے۔

ہمہ گیر طور پر پائے جانے والے اس گمان کہ نجی سکول زیادہ ترقی پسند اور روادار ہیں، کی حقیقت اس وقت آشکار ہوئی جب نومبر 2013ء میں آل پاکستان پرائیویٹ سکول مینجمنٹ ایسوسی ایشن نے خود سے وابستہ 40,000 سکولوں کی لائبریریوں میں ملالہ یوسف زئی کی کتاب پر پابندی عائد کر دی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اسے نصاب میں شامل نہ کیا جائے۔ ایسوسی ایشن نے دعویٰ کیا کہ ملالہ "مغربی پراپیگنڈہ" کی نمائندگی کرتی تھی۔ آل پاکستان پرائیویٹ سکولز فیڈریشن نے بھی یہ الزام عائد کرتے ہوئے خود سے وابستہ سکولوں میں ملالہ کی کتاب پر پابندی عائد کر دی کہ اس کتاب نے اسے متنازعہ بنا دیا تھا اور وہ "مغربی طاقتوں کی آلہ کار" بن گئی تھی۔

مدرسے کی تعلیم

اگست 2013ء میں متحدہ امریکہ کے محکمہ خزانہ نے پشاور کے مدرسہ تعلیم القرآن والحدیث جو کہ گنج مدرسہ کے طور پر بھی جانا جاتا ہے، پر معاشی پابندیاں عائد کردیں۔ محکمہ خزانہ کا کہنا تھا کہ مدرسہ گنج کو القاعدہ، لشکر طیبہ اور طالبان کے تربیتی مرکز کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ ان پابندیوں کے تحت نہ صرف اس کے وہ اثاثے منجمد کر دیے گئے جو امریکہ کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں بلکہ ان کے تحت امریکی شہریوں پر مدرسے کے ساتھ کسی بھی قسم کا کاروباری تعلق رکھنے کی ممانعت ہے۔ گنج مدرسے کی انتظامیہ نے ان پابندیوں پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ پابندیاں بلا جواز اور ناجائز ہیں کیونکہ سکول میں طالب علموں کو صرف قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ ستمبر 2013ء میں پولیس اور ایلیٹ فورس کے اہلکاروں نے گوجرانوالہ میں ایک مدرسے میں چھاپا مارا اور 21 غیر ملکی طالب علموں کو گرفتار کر لیا جو وہاں سرکاری اندراج کے بغیر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ پولیس کے مطابق مدرسہ قاضی حمید اللہ کی ملکیت تھا جو کہ طالبان رہنما ملاّ عُمر کا استاد تھا۔ ان خدشات کے باوجود کہ ان کے بچے انتہا پسند مذہبی نظریات سے متاثر ہو سکتے ہیں، نادار والدین کے پاس انہیں مذہبی سکولوں میں بھیجنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ مثال کے طور پر ستمبر 2013ء میں خیبر پختونخوا حکومت نے سکول نہ جانے والے 26 لاکھ بچوں کو تعلیمی نظام میں شامل کرنے کے لیے مفت داخلے کی مہم شروع کی۔ اس وقت سے لے کر اب تک 80,000 بچوں کا پرائمری اور ثانوی سکولوں میں اندراج کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ سرکاری سکولوں میں تقریباً 12,000 بچوں کا اندراج کر دیا گیا تاہم یہ انکشاف ہوا کہ وہ مدرسوں میں تعلیم حاصل کر

مدرسہ کی تعلیم عمومی طور پر بے ضابطہ ہی رہی

رہے تھے کیونکہ ان کے والدین فیسیں ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔

ستمبر 2013ء میں وفاقی حکومت نے ایک جامع حکمت عملی پر عمل درآمد کا آغاز کیا جو کہ مدرسوں اور مذہبی سکولوں کو مرکزی دھارے میں شامل کرنے کے لیے مرتب کی گئی تھی۔ سرکاری عہدیداروں کے مطابق ملک میں کام کرنے والے متعدد مدرسوں کا اب بھی کوئی ریکارڈ نہیں لیکن یہ تعداد دس ہزار سے بیس ہزار ہوسکتی ہے تاہم حکومت نے تمام مدرسوں کے اندراج کے لیے 2009ء سے ایک مرحلہ وار پروگرام شروع کیا ہوا ہے اور سرکاری عہدیداروں کے مطابق یہ عمل تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ جن 10,340 مدرسوں کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں سے اب تک 8,970 وزارت تعلیم کے ساتھ رجسٹر ہو چکے ہیں۔ رپورٹس کے مطابق کم از کم 500 مدرسوں کی انتظامیہ انتہا پسند تصور کی جاتی تھیں جو انتہا پسندی کو فروغ دینے اور غیر ملکی ڈونرز سے بڑی بڑی رقوم وصول کرنے میں ملوث تھیں۔

مذہبی سکولوں سے متعلق حکومت کی نئی پالیسی کے مطابق نیا مدرسہ صرف حکومت سے اجازت لینے کے بعد کھولا جا سکتا ہے۔ مدرسوں کی انتظامیہ سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ اپنے نصاب کا ازسرنو جائزہ لیتے ہوئے اس میں انگریزی، ریاضی، کمپیوٹر کی تعلیم اور سائنس کو بھی شامل کریں۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ایسے سکولوں میں فراہم کی جانے والی تعلیم کے سائز اور سطح کے مطابق منظور شدہ سندیں جاری کرنے کے لیے ان اندراج شدہ مدرسوں کو تعلیمی بورڈ اور یونیورسٹیوں سے بھی منسلک کیا جا رہا ہے۔ بہت سے مدرسوں میں صورت حال افسوس ناک رہی اور جسمانی سزا کا استعمال ایک عام معمول تھا۔ گوجرانوالہ، فیصل آباد، پشاور اور دیگر علاقوں سے موصول ہونے والی رپورٹس میں الزام عائد کیا گیا کہ وہاں بچوں کو باقاعدگی کے ساتھ جسمانی اور جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح اکتوبر 2013ء میں فیصل آباد کی تحصیل تاندلیانوالہ کے ایک مدرسے میں معلّم نے سبق نہ یاد کرنے پر طالب علم پر وحشیانہ تشدد کیا۔

نصاب کی اصلاح

تعلیم کے حصول کا مقصد تمام اقوام اور تمام نسلی، لسانی یا مذہبی گروہوں کے مابین مفاہمت، رواداری اور دوستی کو فروغ دینا ہے۔ تاہم 2013ء میں پاکستان میں ایک مرتبہ پھر نہ صرف یہ دیکھا گیا کہ لاکھوں بچے سکول نہیں جاتے تھے بلکہ یہ بھی کہ ''نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ'' اور زیادہ غیر روادار اور متعصب ہو گیا۔ ماہر تعلیم یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ نظریاتی طور پر چلایا جانے والا نظام تعلیم اس رویے کی ایک بڑی وجہ ہے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ریاست کی امداد سے چلنے والے ٹیکسٹ بک ریویو بورڈ کی جانب سے نصابی کتب میں خواتین، مذہبی اقلیتوں، انڈیا اور ''مغرب'' کے بارے میں کی جانے والی جانبدارانہ تصویر

کشی تعصب اور غیر متغیر عقائد جو کہ ملک میں سماجی ربط کو نقصان پہنچا رہے ہیں، کو برقرار رکھنے کا سبب بن رہی ہے اور یہ تعصب اور عدم رواداری کی بنیادی وجوہات بھی سمجھی جاتی تھیں۔ ان کی اصلاح کے حوالے سے بار بار مطالبات کیے گئے مگر ان کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوئے۔

ڈاکٹر اے ایچ نیئر نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا جس کا عنوان ہے ''ایک کھویا ہوا موقع''۔ اس تحقیقی مقالے میں اصلاحات کے بعد نئے نصاب اور نصابی کتب میں مسلسل نقائص اور جماعت اوّل سے دہم کی اردو کی 27 اور انگریزی کی 30 نصابی کتب کے مندرجات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس مقالے کے مطابق 2006ء کی نصابی اصلاحات سے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔

2006ء کے نئے نصاب پر مبنی درسی کتب، جن کا اطلاق 2012ء میں کیا گیا، میں تین شدید خامیاں یہ تھیں: ان درسی کتب کے ذریعے پاکستان کے غیر مسلم شہریوں کو زبردستی اسلامیات کی تعلیم دیتے ہوئے ان کے لیے دستیاب آئینی تحفظ کی خلاف ورزی؛ ان کتب کے ذریعے ایسی تاریخ کا پڑھایا جانا جو اس مفروضے پر مبنی تھی کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے؛ اور یہ کتب ایسے مواد پر مشتمل تھیں جو حقائق سے بہت دور ہے۔

ڈاکٹر نیئر کا کہنا ہے کہ درسی کتب کے مصنفین نے نئی نصابی پالیسی میں تعصّبات اور غلط بیانی کو شدید تر کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر 2006ء کے تعلیمی نصاب میں یہ کہنا کہ قائداعظم کی اگست 1947ء کی تقریر محض عقیدے کی آزادی پر زور دیتی ہے۔ تاہم ڈاکٹر نیّر یہ بحث کرتے ہیں کہ درسی کتب کے مصنفین نے بجائے یہ واضح کرنے کے کہ قائداعظم پاکستان کو ایک مذہبی ریاست نہیں بنانا چاہتے تھے، قائد کے الفاظ کی وضاحت یہ کی ہے کہ نئی ریاست میں مذہبی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کیا جائے گا، اسی طرح درسی کتب خارجہ پالیسی کو ایک نظریاتی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر مطالعہ پاکستان کی درسی کتاب برائے جماعت دہم میں کہا گیا ہے کہ: ''پاکستان میں نظریہ اور خارجہ پالیسی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے اور اس کی بنیاد اسلامی نظریے پر رکھی گئی ہے۔''

مصنف تاریخ کے حوالے سے بھی مخصوص حقائق کا انتخاب کرتے رہے ہیں۔ 1971ء کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نیّر کہتے ہیں کہ پاکستان کی درسی کتب میں سانحہ مشرقی پاکستان کا ذمہ دار ہندو برادری کو قرار دیا جاتا ہے اور پاکستانی فوج اور اس کے مددگاروں کی جانب سے بنگالیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ذکر بھی نہیں کیا جاتا۔

2013ء میں صوبائی حکومتوں نے چند پریشان کن اقدامات کیے جن کے باعث تعلیم کے معیار کو مزید نقصان پہنچا۔ اگست 2013ء میں خیبر پختونخوا کے وزیر برائے ابتدائی و ثانوی تعلیم نے بیان دیا کہ

سرکاری نصاب کی اصلاح کی بنیاد اسلامی تعلیمات ہوں گی۔ انہوں نے واضح کیا کہ حکومت اسلامی تعلیمات پر پابندیوں اور کسی غیر ملکی این جی او کی ہدایت کو قبول نہیں کرے گی۔ وزیر نے واضح کیا کہ حکومت نصابی اصلاح کے پچھلے مرحلے میں کی گئی غلطیوں کی اصلاح کا ارادہ رکھتی ہے۔

ماہرین تعلیم کے مطابق پی ٹی آئی اے کے ان مثبت نصابی تبدیلیوں کو منسوخ کرنے کا یہ اقدام کے پی کے میں امن اور رواداری کے فروغ کی مہم کے لیے ایک بڑا دھچکا ہوگا۔

پنجاب میں حکومت نے تعلیم سے متعلق اپنے تنگ نظر اور غیر روادارانہ تصور کو نجی سکولوں پر بھی تھوپا۔ ایک نجی سکول میں دی جانے والی ''مذہبی تقابل'' کی تعلیم کے خلاف میڈیا میں مہم کے بعد پنجاب حکومت نے حکام کو نصاب میں سے متعلقہ تمام تحریری مواد کو حذف کرنے اور اسے ضبط کرنے کا حکم دیا۔ صوبائی حکومت نے یہ بیان دیتے ہوئے کہ کسی بھی سکول کو پاکستان کے نظام تعلیم کے بنیادی نظریے میں تبدیلی کی اجازت نہیں دی جائے گی اور یہ کہ ''ایسی سازش میں شامل افراد کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی'' تمام صوبے کے نجی تعلیمی اداروں کے نصاب میں ''قابل اعتراض مواد'' کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی۔

تشدد اور تعلیم کی جستجو

پاکستان میں تعلیم کو ایک بڑا خطرہ تشدد اور ملک کے مختلف علاقوں میں مسلح گروہوں کی جانب سے ہونے والے حملوں سے لاحق تھا۔ اگرچہ گزشتہ چند برسوں کے دوران تشدد کا خطرہ زیادہ تر بلوچستان اور شمال مغربی پاکستان تک محدود رہا ہے تاہم 2013ء میں یہ دیکھنے میں آیا کہ مسلح گروہ ملک کے دیگر حصوں بالخصوص کراچی میں تعلیم تک رسائی میں رکاوٹ بنتے رہے۔

ملک میں تعلیمی سال کا آغاز خوفناک انداز سے ہوا کہ جب یکم جنوری 2013ء کو صوابی میں ایک این جی او کے تحت چلائے جانے والے سکول میں فرائض انجام دینے والے سات اساتذہ، جن میں 6 خواتین اور ایک مرد شامل تھا، کو نامعلوم افراد نے اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جب وہ سکول سے باہر نکلے ہی تھے۔ وہ جس تنظیم کے ساتھ کام کرتے تھے اس کا نام ''سپورٹ وِد ورکنگ سولوشن'' (support with working solution) ہے، جو صحت اور تعلیم کے متعدد پروگراموں بشمول خیبر پختونخوا میں پولیو ویکسی نیشن پروگرام چلاتی ہے۔

ماہرین تعلیم اور تعلیمی اداروں پر حملے عروج پر رہے۔ مارچ 2013ء میں خیبر ایجنسی کے علاقے جمرود کے قریبی علاقے میں گرلز سکول کی ایک معلّمہ، شہناز نازلی کو سکول جہاں وہ پڑھاتی تھی، جاتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔

خواتین اساتذہ کو تعلیم عام کرنے پر نشانہ بنایا گیا

ملک کے مختلف حصوں میں الیکشن سے پہلے تشدد کی کارروائیوں میں سکولوں پر حملے بھی شامل ہیں۔ مئی 2013ء میں بلوچستان کے ضلع نصیر آباد میں لڑکوں کے پرائمری سکول اور ایک مڈل سکول پر حملے کیے گئے۔سکول کی عمارتیں انتخابات کے لیے مخصوص کی گئی تھیں اور اطلاعات کے مطابق صوبے میں انتخابی عمل میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے ان کو نشانہ بنایا گیا۔ جون 2013ء میں کوئٹہ میں تعلیمی ادارے پر ایک ہولناک حملہ کیا گیا۔لشکر جھنگوی کی جانب سے کیے گئے دوہرے حملوں میں 25 افراد جاں بحق ہوئے جن میں زیادہ تعداد طالبات کی تھی۔ پولیس کے مطابق ایک خاتون خودکش بمبار جو کہ برقع پہنے ہوئے تھی، خود کو طالب علم ظاہر کرتے ہوئے یونیورسٹی کی بس میں سوار ہوئی اور اپنے جسم کے ساتھ بندھے ہوئے دھماکہ خیز مواد سے خود کو اڑا لیا جس کے نتیجے میں سردار بہادر خان یونیورسٹی برائے خواتین کی 14 طالبات جاں بحق اور 22 زخمی ہوگئیں۔ اس کے بعد مسلح افراد نے بولان میڈیکل کمپلیکس، جہاں زخمی افراد کا علاج کیا جا رہا تھا پر حملہ کیا جہاں مزید 11 افراد کو ہلاک کردیا۔

شیعہ فرقے کے زیر ملکیت مذہبی سکولوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ جون 2013ء میں پشاور میں شیعہ برادری کے ایک مذہبی سکول پر نماز جمعہ سے محض کچھ دیر پہلے ہونے والے خودکش حملے کے نتیجے میں 14 افراد جاں بحق اور 28 زخمی ہوگئے۔

تشدد کے واقعات کا ایک اور سبب امریکی ڈرون حملے بھی تھے جس کے باعث تعلیم کے حصول پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔نومبر 2013ء میں پاکستان میں ڈرون حملے نہ کرنے کے وعدے کے چند گھنٹوں

بعد ہی ایک امریکی ڈرون طیارے نے ہنگو میں ایک مدرسے کو نشانہ بنایا جس کے نتیجے میں 8 افراد بشمول تین اساتذہ اور پانچ طالب علم جاں بحق ہو گئے۔

کراچی کے علاقے بلدیہ ٹاؤن کے ایک نجی سکول پر گرینیڈ اور بندوقوں کی مدد سے حملہ کیا گیا جس کے نتیجے میں سکول کے پرنسپل عبدالرشید جاں بحق اور دیگر آٹھ افراد جن میں بچے بھی شامل تھے، زخمی ہو گئے۔

تشدد کے واقعات کا ایک اور پہلو یونیورسٹیوں میں جنگجو طالب علموں کی موجودگی اور ان کی کارروائیاں تھا۔ ستمبر 2013ء میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر مجاہد کامران نے کہا کہ جماعت اسلامی کا سٹوڈنٹ ونگ، اسلامی جمعیت طلبہ (آئی جے ٹی) یونیورسٹی کے ہوسٹل میں جنگجوؤں کو پناہ دے رہا ہے۔ سکیورٹی فورسز نے پنجاب یونیورسٹی کے ہوسٹل سے ایک مشتبہ شخص کو گرفتار بھی کیا جو کہ القاعدہ کا رکن سمجھا جاتا تھا۔

یونیورسٹی میں طلبا جن میں سے زیادہ تر کا تعلق آئی جے ٹی سے تھا، کی جانب سے اساتذہ اور دیگر طالب علموں کو ہراساں کرنے اور دھمکانے کی متعدد اطلاعات بھی موصول ہوئیں۔ مثال کے طور پر دسمبر 2013ء میں اسلامی جمعیت طلبہ سے تعلق رکھنے والے 21 طلبا کو اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب انہوں نے شعبہ قانون کے ایک استاد کو تشدد کا نشانہ بنایا اور اسے اغوا کر لیا۔

صنفی عدم مساوات

ستمبر 2013ء میں ملالہ یوسف زئی نے اقوام متحدہ کی ''معاشرتی فلاح کانفرنس'' کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''میرا خواب یہ ہے کہ ہر ملک کی ہر لڑکی تعلیم حاصل کرے''، تاہم ایسا لگتا ہے کہ اس کا خواب پورا ہونے کے امکانات مستقبل قریب میں بہت کم ہیں۔

پاکستان میں خواتین کے حصولِ تعلیم میں درپیش مسائل کا لب لباب اقوام متحدہ کی خواتین کے خلاف امتیازی سلوک کے خاتمے سے متعلق کمیٹی نے مارچ 2013ء میں اپنے اختتامی مشاہدے کے دوران بیان کیا۔ کمیٹی نے تعلیم کے میدان، جس میں خواتین کی شرح ناخواندگی کافی زیادہ ہے، لڑکیوں کے سکول میں اندراج کی کم شرح بالخصوص ثانوی سطح پر اور ان کی تعلیم کو ترک کرنے کی انتہائی بلند شرح پر، جو کہ بالخصوص دیہاتوں میں زیادہ تھی، تشویش کا اظہار کیا۔ کمیٹی نے لڑکیوں پر لڑکوں کی تعلیم کو ترجیح دینے کی وجہ سے لڑکیوں پر پڑنے والے صنفی اثرات قابل خواتین اساتذہ اور سکول کے بنیادی ڈھانچے کے فقدان اور طویل فاصلوں پر واقع سکولوں کا بھی نوٹس لیا کیونکہ خواتین کی تعلیم پر ان سب چیزوں کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ آخر میں کمیٹی نے حاملہ ہونے کے بعد لڑکیوں کو سکول میں دوبارہ داخل کرانے کے حوالے سے خاطر خواہ اقدامات نہ کرنے، کم عمری میں شادیوں کی ایک بڑی تعداد، متعدد غیر ریاستی عناصر کی جانب سے طالبات، اساتذہ اور

کوئٹہ میں خواتین کی یونیورسٹی بس پر ہونے والی بمباری کا منظر

پروفیسروں پر ہونے والے پرتشدد حملوں کے علاوہ تعلیمی اداروں بالخصوص خواتین کے لیے مخصوص سکولوں پر بڑھتے ہوئے حملوں جنہوں نے کمیٹی کے مطابق، لڑکیوں اور خواتین کی تعلیم تک رسائی کو بُری طرح متاثر کیا ہے، پرتشویش کا اظہار کیا۔

دیگر رپورٹیں اور گوشوارے کمیٹی کے اخذ کردہ نتائج کی تصدیق کرتے ہیں۔ مردوں اور خواتین میں وسائل اور مواقع کی مساوی تقسیم کے متعلق عالمی صنفی عدم مساوات کی رپورٹ، جو کہ عالمی فورم کے ہارورڈ یونیورسٹی، اور یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، برکلے، کے تعاون سے شائع کی تھی دنیا کی 93 فیصد سے زائد آبادی کی نمائندگی کرنے والے 136 ممالک کی کارکردگی کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کے مطابق پاکستان 135 ویں نمبر پر تھا اور محض یمن اس سے پیچھے تھا اور گزشتہ سال اس سٹڈی کے انعقاد سے اب تک پاکستان تین درجے نیچے چلا گیا تھا۔ اس علاقے میں بنگلہ دیش 75 ویں جبکہ انڈیا 101 ویں نمبر پر تھا۔ گوشوارے کے مطابق معاشی شراکت اور مواقع کے حوالے سے پاکستان دوسرا، اور تعلیم تک مساوی رسائی کے حوالے سے آٹھواں بدترین ملک تھا۔ اس وقت پاکستان میں مردوں کی شرح خواندگی 69 فیصد اور خواتین کی شرح 45 فیصد ہے جبکہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے 73 فیصد لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی شرح صرف 59 فیصد ہے۔

یونیسکو کے صنفی مساوات کے گوشوارے کے مطابق پاکستان کے پرائمری سکولوں میں 100 لڑکوں کے مقابلے میں 82 لڑکیاں ہیں۔ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان میں غریب ترین لڑکیوں کی تعداد دوگنا زیادہ ہے۔ یہ تعداد نیپال کی غریب ترین لڑکیوں کے مقابلے میں سہ گنا اور بنگلہ دیش کی غریب ترین لڑکیوں کے مقابلے میں چھ گنا ہے۔

یہ اعداد و شمار پاکستانی ریاست کو جو کہ زیادہ دیر تک معاشی اسباب کو خواتین کی تعلیم کی خراب صورت حال کا ذمہ دار قرار نہیں دے سکتی، مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں خواتین کی تعلیم ایک بڑے مسئلے کے طور پر برقرار کیوں ہے؟ پاکستان پاپولیشن کونسل جو کہ ایک تحقیقی اور صلاحیت میں اضافے کا کام کرنے والا ادارہ ہے، کے مطابق غربت کا عنصر واضح طور پر لڑکیوں کی تعلیم میں حارج ہے۔ جہاں بڑے کنبے محض اپنے چند بچوں کی تعلیم کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں وہاں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں تعلیم کے حصول سے اکثر محروم رہتی ہیں۔ دیگر اسباب جو لڑکیوں کی تعلیم میں رکاوٹ تھے، ان میں طویل فاصلوں پر واقع سکول اور ان تک رسائی (اور انہیں جنسی تشدد کے خطرات بھی درپیش تھے) ثقافتی پابندیاں، کم عمر میں شادی اور حمل; اور سکولوں میں پانی اور نکاسی آب کا فقدان شامل تھے۔

خواتین کی تعلیم جنگجوؤں کے حملوں کا نشانہ بھی بنتی رہی ہے۔ 19 جنوری کو پشاور پولیس سٹیشن کے قریب بڈھ بیر کی حدود میں ہونے والے تین الگ الگ بم دھماکوں میں لڑکیوں کے دو پرائمری سکولوں اور ایک گھر کو نقصان پہنچا۔ مارچ میں کراچی کے علاقے اتحاد ٹاؤن کے ایک سکول پر سالانہ انعامات کی تقریب کے دوران حملہ کرنے والے ایک شخص نے عبدالرشید جو کہ ایک معلم اور شہر کے پشتون آبادی والے علاقوں میں خواتین کی تعلیم کے حامی تھے، کے علاوہ ایک دس سالہ لڑکی کو ہلاک کر دیا اور گرنیڈ اور بندوق کی مدد سے کیے جانے والے اس حملے میں متعدد بچے زخمی ہوئے جن میں رشید کی بیٹی بھی شامل تھی۔

9 جنوری کو جنگجوؤں کی جانب سے چارسدہ کے علاقے رسالدار میں لڑکیوں کے پرائمری سکول کی عمارت کے قریب نصب کردہ بم پھٹنے سے عمارت مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔

18 جولائی کو بنوں کے علاقے ماما خیل میں نامعلوم جنگجوؤں کی جانب سے گورنمنٹ گرلز مڈل سکول کی چاردیواری کے قریب نصب کردہ بم پھٹنے کے نتیجے میں سکول کی عمارت کو جزوی طور پر نقصان پہنچا۔

سفارشات

1- حقِ تعلیم جس کا ذکر آئین میں کیا گیا ہے کا دائرہ کار وسیع کیا جائے تاکہ بین الاقوامی انسانی حقوق کے حوالے سے پاکستان کی ذمہ داریوں کی عکاسی ہو اور آئین میں یہ بات شامل کی جائے کہ تعلیم کا مقصد تمام اقوام اور تمام نسلی، لسانی یا مذہبی گروہوں کے مابین مفاہمت، رواداری اور دوستی کا فروغ ہونا چاہیے۔

2- تعلیم کے لیے مختص بجٹ میں ملک کے جی ڈی پی کے کم از کم چار فیصد تک کا اضافہ کیا جانا چاہیے۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے حکومت کی ترجیحات پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے اور بجٹ میں حکومت

کے اس دعوے کی عکاسی ہونی چاہیے کہ تعلیم ترقی، امن اور ہم آہنگی کی بنیاد ہے۔

3- نصابی اصلاح کے متعلق ایک معقول بحث کا آغاز کیا جائے؛ بالخصوص مطالعہ پاکستان کے نصاب کو نظریاتی آلے کے طور پر استعمال نہ کیا جائے بلکہ اس کے ذریعے ملک کی حقیقت پر مبنی تاریخ کی عکاسی ہونی چاہیے۔ نصاب میں سے تمام تاریخی اور دیگر نقائص اور اکتاہٹ کا سبب بننے والے مواد کو نکال دیا جائے۔

4- سکولوں اور مدرسوں میں جسمانی سزا کی سختی سے روک تھام کے لیے قانون وضع کیا جائے جس کا اطلاق سب پر ہو اور اس قانون کے نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔

5- ملک بھر کے سکولوں کی خوفناک صورت حال میں بہتری لائی جائے اور تمام سکولوں میں آرام اور حفاظت کے کم سے کم معیار لاگو کیے جائیں۔ بھوت سکولوں اور غیر فعال سکولوں کے متعلق سپریم کورٹ کے احکامات پر ترجیحی بنیادوں پر عملدرآمد کیا جائے۔

6- لڑکیوں کو پڑھنے کے لیے ایک محفوظ اور آرام دہ ماحول کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

7- صنف کے حوالے سے حساس کیسے بنایا جائے اس کے حوالے سے تمام اساتذہ کو تربیت فراہم کی جائے اور نصاب کا ازسرنو جائزہ لیا جائے تا کہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ یہ صنف کے حوالے سے حساس ہے۔

8- حکومت کو تعلیمی اداروں کے خلاف حملوں اور دھمکیوں کے واقعات کی روک تھام کرنی چاہیے اور ان تعلیمی اداروں کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے جو لڑکیوں کے ''تعلیم کے بنیادی حق'' میں رخنے ڈالتے ہیں اور اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ ایسی پرتشدد کارروائیوں کا ارتکاب کرنے والے مجرموں سے بلا تاخیر تفتیش کی جائے، ان پر مقدمہ چلایا جائے اور انہیں سزا دی جائے۔

9- تشدد کا نشانہ بننے والے تعلیمی اداروں کی فوری طور پر مرمت کی جائے اور ان کی ازسرنو تعمیر کی جائے، تشدد سے متاثر ہونے والے طالب علموں کو جتنا جلدی ممکن ہو سکے، دیگر سکولوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ دیا جائے۔

10- کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پُرتشدد واقعات کو کسی صورت میں برداشت نہ کیا جائے اور مجرموں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے، تاہم منتخب سٹوڈنٹس یونینوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے اور جائز طلبہ سیاست کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کی جانی چاہئیں۔

صحت

جنس، ذات، رنگ اور نسل کے امتیاز سے بالاتر، ریاست عوام کی فلاح اور بہبود کو یقینی بنائے گی اور جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر ایسے تمام افراد کو بنیادی ضروریات زندگی۔۔۔مثلاً طبی سہولیات۔۔۔فراہم کرے گی جو بے روزگاری، بیماری یا معذوری کی بنا پر مستقلاً یا عارضی طور پر روزی کمانے کے قابل نہیں۔

آئین پاکستان [آرٹیکل-38(اے) اور (ڈی)]

ہر شخص ایک معقول معیار زندگی پر حق رکھتا ہے جو اس کی اور اس کے خاندان کی صحت اور فلاح و بہبود کی ضمانت فراہم کر سکے۔ جس میں خوراک، لباس، رہائش، صحت برقرار رکھنے کی سہولیات، ضروری سماجی خدمات [بجلی، پانی، گیس وغیرہ] اور بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپے یا ایسے حالات کے تحت جو اس کے بس سے باہر ہوں اور عدم روزگار کی کسی بھی صورت کے خلاف ضمانتیں بھی شامل ہیں۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 25(1)]

طبی سہولیات کوئی بنیادی حق نہیں ہے جس کی ضمانت پاکستان کے آئین میں دی گئی ہو۔ اگرچہ آئین کی شق 9 'جو زندگی کا حق مہیا کرتی ہے' کی تشریح اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ طبّی سہولت کسی بھی شہری کا حق ہے۔ لیکن آئین کے پالیسی سیکشن کے اصولوں میں جن مناسب طبّی سہولتوں کی بات کی گئی ہے' وہ ایسی ہیں کہ جو لاگو ہی نہیں کی جاسکتیں۔ چنانچہ شہریوں کو مناسب طبّی سہولتیں فراہم نہ ہوں تو وہ ان سہولتوں کے حصول کے لئے عدالت سے رجوع نہیں کر سکتے۔

آبادی کے لحاظ سے پاکستان دنیا کا چھٹا بڑا ملک ہے جس کی آبادی 18 کروڑ نفوس پر مشتمل ہے اور یہ ان 22 ممالک میں چھٹے نمبر پر ہے جہاں آج بھی چھوت کی بیماریاں ہزاروں افراد کو لقمۂ اجل بنا دیتی ہیں۔ اکنامک سروے آف پاکستان میں دیئے گئے اعداد و شمار کے مطابق 13-2012ء کے دوران پاکستان میں صحت پر گراس ڈومیسٹک پروڈکٹ (جی ڈی پی) کا صرف 0.35 فیصد خرچ کیا گیا۔ جبکہ اس سے پچھلے مالی

سال کے دوران صحت کی مد میں جی ڈی پی کا صرف 0.27 فیصد خرچ کیا گیا۔ اخراجات میں اضافے کے باوجود صحت سے متعلق عوام کی ضروریات پوری نہ ہوسکیں جس کے باعث یہ خدشہ پیدا ہوا کہ آبادی کی شرح میں بے پناہ اضافے، تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی شہری آبادیاں، خوراک کی کمی، ماحولیاتی خطرات اور پینے کے صاف پانی کا نہ ملنا جیسے مسائل کے باعث حالات بدتر ہوجائیں گے۔

2013ء کے دوران پاکستان کے نظام صحت کو بہت سے چیلنجوں کا سامنا رہا۔ ملک میں نیشنل ہیلتھ انشورنس سسٹم موجود نہ ہونے کے سبب لوگوں کو طبّی سہولیات کے اخراجات اپنی جیب سے ادا کرنے پڑے۔ غریب عوام کو طبی سہولیات کے اس نظام پر انحصار کرنا پڑا جو پہلے ہی سخت دباؤ کا شکار تھا اور اس دباؤ کی وجہ حکومت کی طرف سے اس مد کیلئے مخصوص فنڈز تھے جو بہت ہی معمولی تھے۔ حکومتی نظام کے مقابلے میں نجی ہیلتھ کیئر کا نظام اگرچہ بہت مہنگا تھا لیکن یہ نظام حکومتی نظام سے بدرجہا بہتر تھا لیکن اس سہولت سے صرف امیر لوگ ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ بڑے شہری مراکز سے باہر طبی سہولیات کا انحصار نجی کلینکوں پر تھا جن کی ساکھ مشکوک تھی۔ اٹھارہویں آئینی ترمیم کے تحت صحت کا شعبہ صوبوں کے حوالے کردیا گیا۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ فنڈز کی فراہمی میں رکاوٹوں کی وجہ سے اس شعبہ کو خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ اس شعبہ کو صوبائی سطح پر اپنانے میں ہچکچاہٹ، کمزور مانیٹرنگ اور صحتی نظام کو چلانے کے ارادے میں کمی نے رہی سہی کسر پوری کردی۔

2015ء کے لئے میلینئیم ڈویلپمنٹ گولز (اہداف) (ایم ڈی جی) (4 اور 5) کی روشنی میں بچوں کی شرح اموات کو 59 فی ہزار سے 40 فی ہزار تک لانا تھا۔ پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی شرح اموات کو 72 فی ہزار سے 52 فی ہزار اور زچہ کی اموات کی شرح کو 260 فی لاکھ سے 140 فی لاکھ تک لانا قرار پایا تھا۔ لیکن میڈیکل جرنل ''دی لانسٹ (The Lancet) میں شائع ہونے والے اعداد وشمار کے مطابق پاکستان میں زچہ و بچہ کی شرح اموات کو ایم ڈی جی کے مقرر کردہ اہداف کے مطابق حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پاکستان میں نوازئیدہ بچوں، رحم مادر میں فوت ہونے والے بچوں اور زچاؤں کی اموات کی شرح صرف دو ملکوں کے سوا باقی تمام ملکوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ہر سال پانچ سال سے کم عمر کے 423000 (چار لاکھ تئیس ہزار) بچوں کی اموات کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ ان میں سے آدھی تعداد نومولود بچوں کی تھی۔ خاندانی منصوبہ بندی کا حق انتخاب محدود تھا اور یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ ہر سال اسقاط حمل کے غیر محفوظ طریقے اختیار کئے گئے۔ اس رپورٹ کے مطابق مزید نرسوں اور دائیوں کو تربیت دینے جیسے آسان اقدامات کر کے 2015ء میں دو لاکھ بچوں اور خواتین کو موت سے بچایا جاسکتا ہے۔ اب تو نرسوں اور دائیوں کی تعداد ڈاکٹروں

نومولود بچوں کی شرح اموات ایم ڈی جی کے ہدف سے کہیں زیادہ رہی

کی نسبت دوگنا ہو چکی ہے۔ تاہم بچوں اور ماؤں کی شرح اموات میں مناسب خوراک کی عدم فراہمی نے بھی بڑا کردار ادا کیا۔ پانچ سال سے کم عمر کے بچوں میں 40 فیصد کا وزن معمول سے کم تھا جبکہ آدھے سے زیادہ بچے چوٹوں سے متاثرہ تھے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ خوراک میں کمی جہاں جسم کے قدرتی دفاعی میکنا نزم کو کمزور کرتی ہے وہیں اس سے ہر سال ملک کے جی ڈی پی کو تین فیصد تک نقصان بھی پہنچتا ہے۔ محفوظ اور ہموار راستوں کا نہ ہونا، تمباکو کی اشیاء کا استعمال اور بہت زیادہ موٹاپا موت کی طرف دھکیلتے ہیں حالانکہ اس قسم کی اموات کی روک تھام بآسانی ممکن ہے۔ رپورٹ کے مطابق پچھلی صدی کی آٹھویں دہائی کے آخر میں پبلک ہیلتھ پر اٹھنے والے اخراجات میں کمی آئی۔ جی ڈی پی کا صرف ایک فیصد حصہ خرچ کیا گیا جبکہ اس سے پہلے یہ خرچ جی ڈی پی کا 1.5 فیصد تھا۔ اور یہ شرح حکومتی بجٹ کے چار فیصد سے بھی کم ہے۔

گزشتہ برس رجسٹرڈ ڈاکٹروں کی تعداد 152188 سے بڑھ کر 160289 ہو گئی۔ دانتوں کے معالجوں اور نرسوں کی تعداد بالترتیب 11584 سے بڑھ کر 12544 اور 77683 سے بڑھ کر 82119 تک پہنچ چکی ہے۔

آبادی کے پھیلاؤ کے مقابلے میں صحت کی سہولیات کا تناسب یہ تھا۔ 1127 افراد کے لئے ایک ڈاکٹر، 14406 افراد کے لئے دانتوں کا ایک معالج اور ہسپتالوں میں 1786 افراد کے لئے ایک بستر۔ اگرچہ بچوں اور زچاؤں کی اموات کی شرح میں کمی آئی اور اس کے لئے کمیونٹی کی بنیاد پر جاری کردہ لیڈی ہیلتھ

ورکس پروگرام قابلِ تحسین ہے لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ پاکستان جیسے دوسرے ممالک کی نسبت ہمارے ہاں بہتری کی رفتار بہت کم رہی۔

یو ایس اے۔آئی۔ڈی کے اعداد و شمار کے مطابق دائیوں (مڈوائف) کی تعداد اس عرصے میں صرف چھ ہزار تھی جبکہ ساٹھ ہزار کی ضرورت تھی۔اس عرصے میں صحت کے شعبے میں 22 ڈالر (دو ہزار دو سو روپے) فی فرد سالانہ خرچ کیئے گئے۔اس رقم میں سے 14 ڈالر (ایک ہزار چار سو روپے) ہر فرد نے اپنی جیب سے خرچ کیئے جبکہ حکومت نے اس مد میں صرف 8 ڈالر (8 آٹھ سو روپے) ادا کیئے۔متعدی امراض سے بچاؤ کے پروگرام کے تحت پانچ سال سے کم عمر کے صرف 47 فیصد بچوں کو فائدہ پہنچا۔

اس طرح 2013 ء میں پاکستان ان تین ممالک میں سے ایک تھا جہاں معذور کر دینے والی خوفناک بیماری پولیو نے ملک کو متعدی مرض کی طرح اپنی لپیٹ میں لئے رکھا۔ہر تین ماہ کے بعد پولیو کے ٹیکے لگانے کی مہم کو خصوصی مہم کے طور پر شروع کیا جاتا رہا' اس کے باوجود پولیو سے متاثرہ بچوں کی تعداد کافی رہی۔ جن بچوں کو پولیو کے ٹیکے لگائے جاتے ان میں سے بھی بہت سے اس مرض کا شکار ہو جاتے اور اس کی وجہ دوسرے وائرس ہیں جن کا بچے شکار ہو جاتے۔

ہر دسواں پاکستانی ہیپاٹائٹس (یرقان) کا مریض تھا۔خسرہ جیسی متعدی بیماری نے بھی 2012ء میں ملک کو اپنی لپیٹ میں لئے رکھا۔2013ء میں اس مرض نے 300 پاکستانیوں کی جانیں لیں۔

پولیو کے ٹیکے لگانے والوں اور ان کے محافظوں کو درپیش خطرات

2013ء میں شدت پسند عناصر کی طرف سے پولیو ویکسی نیشن ٹیموں کو دی جانے والی دھمکیوں اور ان ٹیموں پر کیئے جانے والے حملوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ ان ٹیموں کے ساتھ پولیس دستے تعینات کیئے گئے لیکن ویکسی نیٹروں اور ان کی محافظ پولیس ٹیموں پر بھی حملے ہوتے رہے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ان حملوں میں متعدد ویکسی نیٹر اور ان کی محافظ پولیس کی ٹیموں کے ارکان جاں بحق ہو گئے۔اس کے نتیجے میں پولیو کے خاتمے کی مہم کو سال بھر میں کئی بار روکنا پڑا۔2013ء کے دوران پولیو ویکسی نیشن مہم کے دوران شدت پسندوں کے حملوں کے نتیجے میں 20 پولیو ویکسی نیٹر اور پولیس کے 9 جوان جاں بحق ہوئے۔ زیادہ تر حملے وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں (فاٹا)' خیبر پختونخواہ اور کراچی میں ہوئے۔ویکسی نیشن مہم کے مخالف شدت پسند اس مہم کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ ایک جاسوسی کی مہم ہے یا یہ مہم مغرب کی سازش ہے جس کا مقصد مسلم ملکوں کی آبادی کو بچے پیدا کرنے کے ناقابل بنانا ہے۔

2013-14ء کے مالی سال میں حکومت نے صحت کے لئے 35ارب 60 کروڑ روپے کا بجٹ مختص کیا اس میں سے 9ارب نوے کروڑ روپے کی رقم صحت سے متعلق اموراور خدمات کے لئے رکھی گئی جبکہ 25ارب ستر کروڑ روپے کی رقم پبلک سیکٹر ڈویلپمنٹ پروگرام کے لئے مختص کی گئی۔ مالی سال 2012-13ء میں 22ارب روپے کی رقم 17 جاری منصوبوں اور ایک نئے منصوبے کے لئے مختص کی گئی تھی۔ پی ایس ڈی پی (پبلک سیکٹر ڈویلپمنٹ پروگرام) کے تحت 2 ارب 80 کروڑ روپے کی رقم امیونائزیشن کے توسیعی پروگرام (ای پی آئی) کے ساتھ ساتھ اسہال کی بیماری پر قابو پانے اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ (این آئی ایچ) اسلام آباد کیلئے مخصوص کی گئی تھی۔ صوبہ پنجاب نے صحت کے لئے 97ارب 37 کروڑ روپے کی رقم مختص کی جو گزشتہ بجٹ کی نسبت 25 فیصد زیادہ تھی۔ خیبر پختونخواہ کی حکومت نے 2013-14 میں صحت کے لئے 22ارب روپے کی رقم مختص کی جبکہ 2012-13ء میں یہ رقم 10 ارب روپے تھی ۔ سندھ حکومت نے 2013-14ء میں صحت کے لئے شعبہ کے لئے 17 ارب روپے جبکہ بلوچستان نے 15 ارب 23 کروڑ روپے کی رقم مختص کی۔

ماں کی صحت اورنوزائیدہ بچوں کی اموات

ماں کی صحت اورنوزائیدہ بچوں کی اموات کا مسئلہ 2013ء کے دوران تشویشناک رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے 2015ء تک کے لئے مقرر کردہ ایم ڈی جی کے اہداف کا حصول بالکل ناممکن نظر آتا تھا۔ ایک ہزار نوزائیدہ بچوں میں سے 59.35 کی اموات حکام کی فوری توجہ کی متقاضی تھیں ان اموات میں لڑکوں کی تعداد ہزار میں 62.65 تھی اور یہ شرح تشویش ناک تھی۔ اس کے مقابلے میں نوزائیدہ بچیوں کی اموات کی تعداد ہزار میں 55.97 تھی۔ اس عرصے میں میٹرنل مورٹیلیٹی ریٹ (ایم ایم آر) یعنی زچاؤں کی اموات کی شرح زیادہ رہی اور لگتا نہیں ہے کہ 2015ء تک ایم ڈی جی کے اہداف کے مطابق یہ شرح کم ہوکر 140 فی لاکھ رہ جائے گی۔

پاکستان ڈیموگرافک اینڈ ہیلتھ سروے کے مطابق 2003ء سے اب تک کے دوران کنٹراسیپٹو پریوالینس ریٹ (سی سی آر) میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی اور یہ 30 فیصد ہی رہا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ جوڑوں کو نہ صرف یہ کہ مانع حمل طریقوں سے روشناس کرایا جاتا بلکہ انہیں بچوں کے درمیان مناسب وقفہ رکھنے کے بارے میں بھی آگاہی دی جاتی جس سے آبادی میں اضافے کی شرح پر کافی حد تک قابو پانے کے ساتھ ساتھ ماؤں اور بچوں کی صحت کا بھی تحفظ ہوسکتا ہے۔

بڑے شہروں کے سرکاری ہسپتالوں میں غریبوں کو فوری امداد ملنے کی ایک تصویر

عالمی غیر سرکاری تنظیم پاپولیشن کونسل کے کنٹری ڈائریکٹر کا اندازہ ہے کہ ہر سال دس لاکھ حمل گرائے جاتے ہیں اور ان میں سے اکثر غیر صحت مند طریقوں سے گرائے جاتے ہیں پاکستان میں حمل گرائے جانے کے بعد ماؤں کی دیکھ بھال کے حوالے سے پاپولیشن کونسل نے جو سٹڈی کی ہے' اس سے انکشاف ہوتا ہے کہ ایک برس کے دوران سات لاکھ خواتین مراکز صحت میں آئیں۔ یہ وہ خواتین تھیں جن کے حمل غیر صحت مندانہ طریقے سے ضائع کئے گئے یا غیر مستند دائیوں کی ناتجربہ کاری سے ضائع ہوئے اور جن کے نتیجے میں پیچیدگیاں پیدا ہوئیں چنانچہ ان مراکز میں ایسی ہی خواتین میں پیدا ہونے والی جسمانی پیچیدگیوں کا علاج کیا گیا۔

2013ء میں سندھ حکومت نے سندھ پروٹیکشن آف بریسٹ فیڈنگ اینڈ نیوٹریشن ایکٹ مجریہ 2013ء منظور کیا۔ اس قانون کے ذریعے مینوفیکچررز یا ڈسٹری بیوٹروں کی طرف سے بچوں کو بوتل کے ذریعے دودھ پلانے کی ترغیب دینے اور ماؤں کی چھاتیوں سے دودھ نہ پلانے کے پراپیگنڈے کو جرم قرار دیا گیا جس کی دو سال قید اور پچاس ہزار سے 5 لاکھ روپے تک جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی۔ اس قانون کے تحت مینوفیکچررز کیلئے لازمی قرار دے دیا گیا کہ وہ بوتلوں پر بڑے بڑے لفظوں میں یہ لکھوائیں گے کہ ''ماں کا دودھ آپ کے بچے کے لئے بہترین ہے اور بچوں کو اسہال اور دوسری بیماریوں سے تحفظ دیتا ہے''۔

ناقص غذا/غذا میں کمی

پاکستان شدید غذائی عدم تحفظ کا شکار ہے خاص طور پر صوبہ سندھ میں تو ناقص غذا کا معاملہ خاصا

غربت اور ناقص غذائیت میں چولی دامن کا رشتہ

گمبھیر ہے۔ سندھ پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ کے مطابق صوبہ کے 23 میں سے 8 اضلاع میں خوراک تک رسائی انتہائی ناقص ہے۔ اسلام آباد کا پالیسی تجزیاتی ادارہ سسٹینیبل ڈویلپمنٹ پالیسی انسٹی ٹیوٹ (ایس ڈی پی آئی) کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کی 48 فیصد آبادی کو مناسب خوراک تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ اور وہ غذائی کمی کا شکار ہے۔ دنیا کے 107 ممالک میں سے پاکستان 75 ویں درجے پر ہے جہاں مناسب خوراک کا حصول کافی مشکل ہے۔ یہ جائزہ 2013ء کے اس انڈیکس میں دیا گیا ہے جو اکانومسٹ انٹیلی جنس یونٹ کے گلوبل فوڈ سکیورٹی نے جاری کیا ہے۔ پاکستان بیورو آف سٹیٹیٹکس کے مطابق پاکستان میں خوراک کی قیمتوں میں 34.09 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ جولائی میں حکومت سندھ کی رپورٹ کے مطابق 71 فیصد آبادی کو خوراک کے حصول میں مشکلات درپیش ہیں۔ وہ خاندان جن کو خوراک تک رسائی حاصل نہیں، ان میں سے 34 فیصد کو واجبی خوراک ملتی ہے جبکہ 17 فیصد آبادی کو شدید بھوک کا سامنا ہے۔ ایس ڈی پی آئی کا کہنا ہے کہ سندھ میں بڑے پیمانے پر خوراک کی کمی کی وجہ وہی ہے جس کا سامنا ملک کے دوسرے صوبوں کو ہے اور وہ ہے غربت، ناقص حکمرانی اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم۔ علاوہ ازیں موسمیاتی تغیرات، زرعی پیداوار پر کم توجہ، شہروں کی ترقی، بڑھتی ہوئی آبادی، تیل وگیس کی قیمتوں میں مسلسل اتار چڑھاؤ، افراط زر اور خشک سالی، سیلاب جیسی قدرتی آفات کے نتیجے میں لوگوں کا بے گھر ہونا بھی اس کی وجوہات ہیں۔

ادویات کی قیمت

پاکستان کے ادویہ ساز سیکٹر میں حکومت پاکستان نے سختی کے ساتھ نظم وضبط قائم کیا ہے۔ پاکستان

کچھ ضروری خام مال غیر ملکی فارماسوٹیکل مینوفیکچررز سے درآمد کرتا تھا۔ پاکستان کی ادویہ ساز کمپنیوں نے شکایت کی کہ حالیہ برسوں کے دوران ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر میں اضافہ کی وجہ سے ان کے درآمدی اخراجات میں کافی اضافہ ہو جس کے باعث ان کے لئے کم قیمت پر ادویہ مہیا کرنا بے حد مشکل تھا۔ 28 نومبر کو ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی پاکستان (ڈی آر اے پی) نے جان بچانے والی ادویات کے سوا باقی تمام ادویات کی قیمتوں میں 15 فیصد اضافہ کر دیا۔ تاہم وزیر اعظم نے اگلے ہی روز اضافہ سے متعلق نوٹیفکیشن واپس لینے کا حکم جاری کر دیا۔ ادویہ ساز کمپنیوں نے سندھ ہائی کورٹ سے رجوع کیا اور اس نوٹیفکیشن کی واپسی کے خلاف حکم امتناعی حاصل کر لیا۔

5 دسمبر کو ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی بل اور پاکستان فارمیسی کونسل بل صحت کی سینٹ سٹینڈنگ کمیٹی میں پیش کئے گئے۔ کمیٹی کے چیئرمین نے ادویات کی قیمتوں میں اضافے پر سخت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ دوکاندار (ری ٹیلرز) حکومت کی طرف سے غیر منظور شدہ قیمتوں پر ادویات بیچتے ہیں اور یہ وہ قیمتیں ہیں جو ادویات ساز اداروں نے بھی مقرر نہیں کیں۔

نیشنل ہیلتھ سروسز، ریگولیشنز اینڈ کوارڈی نیشن (این ایچ ایس آر سی) کے سیکرٹری نے کہا کہ ڈرگ پالیسی تیار کی جا رہی ہے اور اسے جلد ہی اسمبلی میں پیش کر دیا جائے گا۔

پاکستان ڈیموگرافک اینڈ ہیلتھ سروے 13-2012ء

پاکستان ڈیموگرافک اینڈ ہیلتھ سروے (پی ڈی ایس ایچ) 13-2012ء وزارت نیشنل ہیلتھ سروسز، ریگولیشنز اینڈ کوارڈی نیشن نے کروایا اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پاپولیشن سٹڈیز (این آئی پی ایس) نے اس کو نافذ کیا۔ اس سروے کا مقصد پیدائش اور خاندانی منصوبہ بندی، زچہ اور بچہ کی صحت، خواتین اور بچوں کو ملنے والی خوراک کی صورتحال، خواتین کے اختیارات، گھریلو تشدد اور ایچ آئی وی/ایڈز کے متعلق معلومات کی فراہمی ہے تاکہ پروگرام مینجرز اور پالیسی ساز معاملات کو جان سکیں اور اس کی روشنی میں جاری پروگراموں کو بہتر بنا سکیں۔ پی ڈی ایچ ایس کے مطابق پاکستان میں خواتین کے لئے شرح پیدائش (فی خاتون بچوں کی تعداد) 3.8 تھی۔ حاملہ خواتین میں سے 73 فیصد کو ماہرین کے ذریعے طبی امداد ملتی ہے۔ نوازئیدہ بچوں کی اموات کی شرح 74 فی ہزار بچے تھی۔ جبکہ پانچ سال سے کم عمر کے بچوں میں شرح اموات 89 فی ہزار تھی۔

ذہنی صحت

18 ویں ترمیم کے تحت فیڈرل مینٹل ہیلتھ اتھارٹی ختم ہو چکی ہے، اس لئے کہ دماغی صحت کے

حوالے سے مہیا ہونے والی سہولیات صوبوں کو منتقل ہوگئی تھیں۔مینٹل ہیلتھ آرڈی ننس مجریہ 2001ء ختم ہوگیا اور یوں دماغی صحت سے متعلق کوئی بھی قانون نہ رہا۔ 2013ء میں سندھ واحد صوبہ تھا جس میں سندھ مینٹل ہیلتھ ایکٹ 2013ء منظور ہوا جس کے نتیجے میں دماغی صحت سے متعلق قوانین کا نفاذ ہوا۔ پاکستان ایسوسی ایشن فار مینٹل ہیلتھ (پی اے ایم ایچ) کے صدر نے اس قانون کی منظوری کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی کمیونٹی یا قوم کی ترقی میں دماغی صحت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ دماغی بیماری ان پانچ بڑے امراض میں سے ہے جو متعدی نہیں ہوتے اور پاکستان کے ہر پانچویں گھرانے میں نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔ عالمی ادارۂ صحت (ڈبلیو ایچ او) کے اندازے کے مطابق یونی پولر بدنظمی (10 فیصد) شیزوفرینیا (2 فیصد)' مرگی (1 فیصد) اور دوسرے اعصابی اور ذہنی امراض (5 فیصد) وہ بڑے ذہنی امراض ہیں جو پاکستان میں عام ہیں۔

امراض متعدی' چوہوں اور دوسرے جانوروں کے کاٹنے سے ہونے والے امراض

پولیو

2012ء میں پولیو کے 58 واقعات سامنے آئے جبکہ 2013ء میں یہ تعداد 85 تک پہنچ گئی اور اس بیماری میں یہ اضافہ 40 فیصد تھا۔ یہ مرض ان علاقوں میں زیادہ دیکھنے میں آیا جہاں پولیو کے قطرے پلانے کی مہم میں شدت نسبتاً کم تھی۔ 2013ء کے دوران پولیو کے زیادہ تر مریض وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں (فاٹا) میں تھے جہاں پولیو کے 60 مریض سامنے آئے۔ان میں 31 مریض شمالی وزیرستان سے تھے جہاں پولیو کے قطرے پلانے کی مہم کو دہشت گردی کے ذریعے روک دیا گیا تھا اور وہاں قطرے پلانا ممنوع تھا۔خیبر پختونخواہ میں پولیو کے تصدیق شدہ 10 بچے' سندھ میں آٹھ اور پنجاب میں سات بچوں پر پولیو کے حملے کی تصدیق ہوئی۔

حکام کا کہنا تھا کہ خیبر پختونخواہ صوبہ اور اس کے ملحقہ قبائلی علاقوں میں پولیو ویکسی نیشن کی مہم کی ناکامی کی وجہ دہشت گردوں کی طرف سے مخالفت تھی۔ دہشت گردوں کا کہنا تھا کہ غیر ملکیوں کی طرف سے پولیو ویکسی نیشن مہم چلانے کا مقصد بچوں کو بڑے ہوکر بچے پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم کرنا تھا۔ چنانچہ ہزاروں افراد نے اپنے بچوں کو پولیو کے قطرے پلوانے سے انکار کردیا۔اس مہم کو روکنے کے بعد ویکسی نیشن ٹیموں اور ان کی حفاظت کرنے والے پولیس کے کارندوں پر حملے کیے گئے اور انہیں قتل کردیا گیا جس کی وجہ سے یہ مہم کامیاب نہ ہوسکی۔

پاکستان پولیو جیسی بیماری کا گڑھ بن گیا۔ 2013ء میں پولیو سے متاثرہ بچوں کی تعداد پچھلے برس

کی نسبت زیادہ تھی۔ 2013ء میں پاکستان کے علاوہ دو اور ایسے ملک تھے جہاں پولیو کے کیس سامنے آئے ایک نائیجریا جہاں 50 کیس سامنے آئے اور دوسرا افغانستان جہاں 11 کیس سامنے آئے۔ عالمی اعداد و شمار کے مطابق 2012ء میں نائیجریا میں 110 اور افغانستان میں پولیو کے 31 کیس سامنے آئے تھے۔

پاکستان میں عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) کے ترجمان نے کہا کہ 2013ء کے دوران پاکستان میں تین کروڑ تیس لاکھ بچوں کو پولیو کے قطرے پلائے گئے جبکہ 23 لاکھ بچوں کو یہ قطرے نہیں پلائے جا سکے تھے۔ 47 ہزار سے زائد بچوں کے والدین نے بچوں کو قطرے پلوانے سے انکار کر دیا تھا۔ اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے عالمی ادارہ صحت کے ایک افسر نے کہا کہ پاکستان میں جو پولیو وائرس پایا جاتا ہے، حال ہی میں وہی وائرس غزہ پٹی کے علاقے اور مصر میں بھی پایا گیا ہے۔

بھارتی حکومت نے بھارت آنے والے پاکستانیوں کے لئے پولیو ویکسینیشن کو لازمی قرار دیدیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ اگر صورتحال بہتر نہ ہوئی تو دوسرے ملک بھی ایسا ہی فیصلہ کریں گے۔

ڈینگی

عالمی ادارہ صحت کے مطابق ڈینگی دنیا کا انتہائی تیزی سے پھیلنے والا استوائی مرض ہے جو عالمگیر خطرہ بن چکا ہے۔ خیال ہے کہ دنیا بھر میں پانچ کروڑ افراد اس کا شکار ہیں۔ یہ بیماری مادہ مچھر سے انسان کے اندر منتقل ہوتی ہے اور اس کے پھیلنے کی وجہ ایک سے دوسری جگہ لوگوں کی آمد و رفت، بانس کے پودوں اور استعمال شدہ ٹائروں کے ساتھ ساتھ موسموں کی تبدیلی ہے۔ 2013ء میں سندھ میں ڈینگی مرض شدت اختیار کر گیا تھا۔ ڈینگی مریضوں کی تعداد 5500 تک پہنچ گئی تھی۔ حکومت کے ڈینگی سرویلنس سیل کی سالانہ رپورٹ کے مطابق ڈینگی سے تقریباً 32 افراد جاں بحق ہوئے تھے۔ خون کی بیماریوں کے نیشنل انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر کا کہنا تھا کہ 2013ء میں ڈینگی سے متاثرہ افراد کی تعداد 15 ہزار سے زائد تھی۔ کراچی میں دھونی کی مہم متوقع کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے ایک کارندے کا کہنا تھا کہ دھونی کی مہم اس لئے ناکام ہوئی کہ غیر معیاری کیمیکل استعمال کئے گئے تھے۔

پنجاب کے محکمہ صحت کے مطابق صوبہ میں 2013ء کے دوران ڈینگی کے 2349 مریض سامنے آئے۔ دھونی اور ڈینگی سے متعلق آگاہی مہم کے باوجود وائرس کو پھیلنے سے روکنے میں ناکامی ہوئی۔

صوبہ خیبر پختونخواہ بھی ڈینگی وائرس سے بری طرح متاثر ہوا۔ کوارڈی نیشن آف ہیومینٹرین افیئرز سے متعلق اقوام متحدہ کے آفس کے مطابق صرف ضلع سوات میں ڈینگی ٹیسٹ کے نتیجے میں سات ہزار افراد ڈینگی زدہ نکلے۔ عالمی ادارہ صحت نے بتایا کہ 2013ء میں ضلع سوات میں ڈینگی کے مریضوں کی تعداد

8546 تھی جن میں سے 33 افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ عالمی ادارہ صحت نے یہ مشاہدہ بھی کیا کہ اسکا حیرت انگیز پہلو خیبر پختونخواہ کے علاقوں میں اس بیماری کا پھیلاؤ تھا حالانکہ یہ روائتی متعدی امراض کا شکار ہونے والا علاقہ نہیں ہے۔

ہیپاٹائٹس

تقریباً ایک کروڑ 80 لاکھ پاکستانی ہیپاٹائٹس بی اور سی کا شکار ہیں جبکہ ایک کروڑ دس لاکھ ایچ وی سی اور ستر لاکھ افراد ایچ بی وی وائرس کا شکار ہیں۔ آغا خان یونیورسٹی کے شعبہ میڈیسن کے چیئرمین کے مطابق اس وقت ملک میں ایک کروڑ تیس لاکھ افراد ہیپاٹائٹس کے مریض ہیں۔ جن میں نوے لاکھ ہیپاٹائٹس سی اور پنتالیس لاکھ افراد ہیپاٹائٹس بی کا شکار ہیں۔

انہوں نے کہا کہ شرح اموات بہت زیادہ ہونے کے باوجود پرانے مریضوں کو اسکا اندازہ نہیں کہ ان میں ہیپاٹائٹس کے وائرس موجود ہیں۔ جس کے باعث وہ جگر کی خطرناک بیماری کا شکار ہو سکتے ہیں اور غیر ارادی طور پر وہ ہیپاٹائٹس کے جراثیم دوسرے لوگوں کو منتقل کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جگر کو نقصان پہنچنے کی روک تھام کیلئے ضروری ہے کہ بیماری کی فوری تشخیص ہو اور اسکا مناسب علاج فوری طور پر شروع ہو سکے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ پاکستان دنیا کا دوسرا ملک ہے جہاں ہیپاٹائٹس سی کا غلبہ بہت زیادہ ہے۔ ڈاکٹروں کے نزدیک اس کی وجہ ویکسین کا میسر نہ ہونا، جانچ پڑتال کئے گئے خون کی منتقلی، شعبہ صحت کے کارکنوں اور منشیات کا استعمال کرنے والوں کی طرف سے ایک سرنج کو بار بار استعمال کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ناقص سرجیکل اور ڈینٹل انسٹرومنٹس کو جراثیم سے پاک نہ کرنا، سڑکوں پر بیٹھے دانتوں کے معالج، حجام، غیر ضروری ٹیکوں کا لگوانا، ناقص طبی پریکٹس اور نیم حکیم بھی اس بیماری کے پھیلاؤ کا سبب ہیں۔

ٹیکوں کے ذریعے منشیات لینے والے، طبی سہولتیں فراہم کرنے والے کارکن اور نوازئیدہ بچے اور زچہ ہیپاٹائٹس کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔

خسرہ

2011ء میں خسرہ سے مرنے والے بچوں کی تعداد 64 تھی حالانکہ اس بیماری کی روک تھام ویکسین کے ذریعے ممکن ہے۔ اگلے برس متعدی مرض نے ملک کو اپنی گرفت میں لے لیا جس کی وجہ سے 306 بچے فوت ہوئے ان میں سے 210 کا تعلق صوبہ سندھ سے تھا۔

سال 2013ء کے دوران پنجاب میں خسرہ پھیلا۔ ایکسٹینڈڈ پروگرام فار امیونائزیشن کی مہیا کی گئی معلومات کے مطابق 2013ء کے دوران پنجاب میں خسرے کے 23477 مریض سامنے آئے جن

خسرہ نے متعدد بچوں کی جانیں لے لیں

میں سے 192 اللہ کو پیارے ہوگئے۔ عالمی ادارہ صحت کے مطابق 2013ء کے دوران پورے پاکستان میں خسرہ کی متعدی بیماری کی صورت حال بڑی گمبھیر تھی جو چھ ماہ تک جاری رہی۔ اس حوالے سے جو اعداد شمار سامنے آئے ان کے مطابق 2013ء کے دوران پاکستان میں خسرہ کے کم از کم تین سو مریض جاں بحق ہوئے۔

عالمی ادارہ صحت کا کہنا ہے کہ پاکستان میں صحت کا نظام شدید دباؤ کا شکار رہا اور اس کی وجہ تین برسوں کے دوران تسلسل کے ساتھ آنے والے سیلاب تھے۔ اس صورتحال کے باوجود بچوں کی پیدائش کے وقت خسرہ کی روک تھام کے لئے ویکسی نیشن کی مہم جاری رہی۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ناکافی غذائیت نے بھی بچوں میں خسرہ کی بیماری کو بڑھاوا دیا۔

غفلت اور عطائی

ہومیوپیتھی کی پریکٹس کرنیوالے 'حکیم' پہلوان، میڈیکل اسسٹنٹس اور دوسرے متعدد عطائی بغیر تشخیص کے مریضوں کا اپنے اپنے طریقے سے علاج کرتے رہے۔ اسی طرح میڈیکل اسسٹنٹس اور سڑکوں پر بیٹھے ہوئے دانتوں کے نام نہاد معالجین اس تشویشناک صورت حال میں بھی اپنی ''صلاحیتوں'' کے ذریعے لوگوں کی جیبوں پر ڈاکے ڈالتے رہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے کسی قسم کی باقاعدہ طبی تعلیم حاصل نہیں کر رکھی تھی۔ یہ لوگ عام طور پر ایسے سٹیرائڈز کا استعمال کراتے جو جان لیوا تھے۔ حکومت کی طرف سے مناسب اور سستی طبی سہولتیں مہیا نہ کئے جانے کے سبب ان عطائیوں کا کاروبار خوب چمکا۔

مارچ میں لاہور کے علاقہ کوٹ لکھپت میں تین ماہ کے ایک معصوم بچے کو عطائی نے ٹیکہ لگایا جس نے معصوم بچے کی جان لے لی۔ بچے کا باپ اپنے بچے کے ختنے کرانے کیلئے اس عطائی کے پاس لے کر گیا تھا ۔غلط ٹیکے نے فوری طور پر بچے کی جان لے لی جس کے بعد عطائی موقع سے فرار ہوگیا۔لواحقین کے شدید احتجاج کے باوجود عطائی کو 2013ء کے آخر تک گرفتار نہ کیا جاسکا۔

رجسٹرڈ ہسپتالوں میں مستند ڈاکٹروں کی غفلت کی بھی طویل فہرست سامنے آئی ہے۔ 29 مئی کو سرگودھا ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹرز ہسپتال میں مستند ڈاکٹروں کی غفلت نے ایک چار سالہ بچے کی جان لے لی۔ بچے کی ناک میں املی کی گٹھلی پھنس گئی تھی جس کو نکلوانے کیلئے بچے کو ہسپتال لایا گیا تھا اور ڈاکٹروں نے آپریشن کے ذریعے گٹھلی نکالنے کی تجویز دی۔اگلے روز ایک نرس نے بچے کو ٹیکہ لگایا۔ٹیکہ لگنے کے ایک گھنٹے بعد بچے کی موت واقع ہوگئی۔ بچے کے لواحقین نے نرس کے خلاف احتجاج کیا اور اس کے خلاف کاروائی کرنے کا مطالبہ کیا۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ 24 جون کو ہوا۔اس روز ایک تین سالہ بچے کی ماں کو راولپنڈی ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹرز ہسپتال (ڈی ایچ کیو) کے ایمرجنسی وارڈ میں لایا گیا۔اس کو سانس لینے میں سخت دشواری ہورہی تھی ۔وہاں اس خاتون کو ٹیکہ لگایا گیا اور چند ہی منٹوں میں اس کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔عورت کے لواحقین نے احتجاج کیا اور ڈاکٹروں کے ساتھ گتھم گتھا بھی ہوئے۔

ادویات کی دوکانوں پر نسخے کے بغیر ادویات کی فروخت ایک گمبھیر مسئلہ ہے۔ادویات کے اس آسانی سے مل جانے کی وجہ سے لوگ اپنا علاج خود کرنے لگتے ہیں حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ ان کی بیماری کیا ہے اور اس بیماری کی وجوہات کیا ہیں۔

ملک بھر میں غیر رجسٹرڈ میڈیکل کالجوں کی بھرمار ہوگئی ہے۔ اگست میں پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹیل کونسل نے طلبہ کو انتباہ کیا کہ وہ ایسے کالجوں میں داخلہ نہ لیں۔ان کا کہنا تھا کہ داخلے سے پہلے طلبا یہ جانچ پڑتال ضرور کریں کہ آیا وہ کالج پی ایم ڈی سی کے پاس رجسٹرڈ بھی ہے یا نہیں۔انہوں نے کہا کہ فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی ان کالجوں کا اعلان کرے گی جو پی ایم ڈی سی کی مقرر کردہ کسوٹی پر پورا نہیں اترتے۔

اعضا کی پیوندکاری کا قانون، غربت اور استحصال

گزشتہ ساڑھے دس برسوں کے دوران پاکستان نے اعضاء کے بازار کی شہرت حاصل کی ہے۔ غیر ملکی، غریب لوگوں سے دلالوں اور اخلاق سے گرے ہوئے طبّی پیشہ وروں کے ذریعے اعضا خریدتے ہیں۔ خصوصاً گردوں کی خرید و فروخت کے واقعات سامنے آئے ہیں۔اعضاء اور ٹشوز کی ٹرانسپلانٹیشن سے متعلق وفاقی حکومت کا نافذ کردہ قانون آئین میں اٹھارویں ترمیم کے باعث 2010ء میں ختم ہوگیا۔اس ترمیم کے

مہنگے علاج معالجے نے لوگوں کو عطائیوں سے رجوع کرنے پر مجبور کردیا

نتیجے میں صحت کا شعبہ صوبوں کے حوالے کردیا گیا۔

فروری میں سندھ اسمبلی نے سندھ ٹرانسپلانٹیشن آف ہیومن آرگنز اینڈ ٹشوز ایکٹ منظور کیا جس کے تحت اعضا کی پیوندکاری کی خرید وفروخت پر پابندی عائد ہوئی۔ البتہ اس قانون کا اطلاق ان لوگوں پر نہیں ہوتا جو اپنی موت کے بعد اعضاء دوسروں کو عطیہ کرنے کی وصیت کردیتے ہیں۔ ایسے حالات جن میں اگر کسی فرد کو دماغی طور پر مردہ قرار دے دیا گیا ہو تو اُس کے والدین یا گھر کا کوئی بالغ رکن اجازت دے سکتا ہے کہ مرنے والے کا کوئی عضو منظور شدہ ہسپتال میں کسی ضرورت مند مریض کو لگا دیا جائے بہرحال استحصال سے بچنے اور اعضا کی فروخت کو روکنے کے لئے یہ قانون بھی بنادیا گیا جس کے تحت کسی پاکستانی شہری کے عطیہ کردہ اعضا دوسرے ملکوں کے باشندوں کو نہیں لگائے جاسکتے۔

جولائی میں پنجاب ہیومن آرگنز اینڈ ٹشوٹرانسپلانٹیشن ایکٹ مجریہ 2012 کے تحت پراونشل مانٹیرنگ اتھارٹی نے ان ہسپتالوں اور طبی اداروں کو رجسٹر کرنے کا فیصلہ کیا جو صوبے میں انسانی اعضا کی پیوندکاری اور اعضا کی تبدیلی کا کام کررہے ہیں۔ اتھارٹی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ 2012ء کے اس ایکٹ کی کسی شق کی خلاف ورزی کے الزامات کی تفتیش کرے۔ صوبائی وزیر صحت نے کہا کہ اتھارٹی کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ انسانی اعضاً کی غیر قانونی تجارت کو روکا جاسکے۔

میڈیا رپورٹس کے مطابق قانون کے نفاذ کے باوجود اعضا کی غیر قانونی پیوندکاری کا سلسلہ پہلے کی طرح جاری رہا۔ ستمبر میں لاہور کی پولیس نے ایک ایسے گروہ کے تین ارکان کو گرفتار کیا جو گردوں کی غیر قانونی

تجارت میں ملوث تھا۔ یہ لوگ راولپنڈی شہر کے ایک میڈیکل سنٹر پر چھاپہ مارنے کے دوران گرفتار کئے گئے تھے۔

یہ گروہ لاہور میں اپنے گردہ کے سربراہ کو مریض اور گردے دونوں فراہم کرتا تھا۔ یہ لوگ اس وقت گرفتار کئے گئے جب گردہ بیچنے والے ایک شخص نے پولیس کے پاس شکایت کی کہ اسے گردہ فروخت کرنے کی مقررہ قیمت ادا نہیں کی گئی تھی۔ پولیس نے پانچ ایسے افراد کو بھی گرفتار کیا جنہیں اپنے گردے فروخت کرنے کے لئے رضامند کرلیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اس مقدمے میں گواہ بننے پر رضامندی کا اظہار کیا۔

تفتیش کنندہ نے بتایا کہ گردہ کے ارکان غربت زدہ علاقوں میں جا کر لوگوں کو گردے فروحت کرنے پر رضامند کرتے تھے۔ یہ گردہ عطیہ کرنے والے اور خریداروں سے معاملات طے کرتے اور غیر قانونی طور پر اعضاء کی پیوندکاری پر عائد پابندیوں سے بچنے کیلئے عطیہ کنندگان اور خریداروں کے درمیان رشتوں کے جعلی سٹرفکیٹ بھی حاصل کر لیتے۔

ڈاکٹروں کی ہڑتالیں

2012ء میں نوجوان ڈاکٹروں کی شروع ہونے والی ہڑتالیں 2013ء میں بھی جاری رہیں۔ وہ یہ ہڑتالیں ملازمت کے بہتر ڈھانچے، بہتر تنخواہوں اور دوسری سہولیات کے ساتھ ساتھ اپنے گرفتار ساتھی ڈاکٹروں کی رہائی کا بھی مطالبہ کررہے تھے۔ جنوری میں یہ ہڑتالیں، خصوصاً پنجاب میں جاری رہیں۔ ڈاکٹروں نے آؤٹ ڈور پیشنٹ ڈیپارٹمنٹس (او۔ پی۔ ڈیز) کا بائیکاٹ کئے رکھا۔ ان ہڑتالوں کے باعث غریب مریضوں کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس معاملے کو سلجھانے کے حوالے سے حکومتی تدابیر بارآور ثابت نہ ہوسکیں بلکہ حکومتی ناکامی سے صورت حال مزید گمبھیر ہوگئی۔

اسلام آباد میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (PMS) میں نوجوان ڈاکٹروں نے ایمرجنسی کو بند کردیا اور مریضوں کے لواحقین کی طرف سے دو ڈاکٹروں کی پٹائی کے بعد انہوں نے ہڑتال پر جانے کی دھمکی دیدی۔ ڈاکٹروں کا مطالبہ تھا کہ ڈاکٹروں اور پیرا میڈیکل سٹاف کے تحفظ کیلئے ہسپتال میں مستقل پولیس چوکی قائم کرنے کے علاوہ الارم سسٹم لگایا جائے۔ الارم سسٹم لگانے کی یقین دہانی کے بعد ڈاکٹروں نے ہڑتال ختم کی۔

پشاور میں اپنے مطالبات منوانے کے لئے نوجوان ڈاکٹروں نے بھوک ہڑتال کردی۔ ینگ ڈاکٹرز ایسوسی ایشن (وائی۔ ڈی۔ اے) کے صدر نے بھوک ہڑتالی کیمپ میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹروں کے لئے سروس سٹرکچر تیار کیا جائے اور میڈیکل آفیسر ایکٹ کو ختم کیا جائے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹروں کو تحفظ دینے کے ساتھ ساتھ پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کونسل سے رجسٹرڈ شدہ ڈاکٹروں کی ملازمتوں کو

ڈاکٹروں کی ہڑتال کے دوران مریضوں کی پریشان حالی

ریگولرائز کیا جائے۔ اس کے علاوہ ہاؤس آفیسرز اور زیر تربیت میڈیکل افسروں کے مسائل کو مستقل طور پر حل کئیجانے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ صوبہ خیبر پختونخواہ کے تمام سرکاری ہسپتالوں میں مریضوں کو مفت ادویات' لیبارٹری انویسٹی گیشنز' ایکس رے' سی ٹی سکین' ایم آر آئی اور مفت کھانا مہیا کیا جائے۔

بلوچستان اور سندھ میں عسکریت پسندوں نے ڈاکٹروں کو منظّم طریقے سے اپنا ہدف بنایا۔ کچھ کو نسلی بنیاد پر اور کچھ کو عقیدے کے حوالے سے نشانہ بنایا گیا جبکہ باقی کو ترقی پسندی اور روشن خیالی کے ایجنٹ قرار دے کر نشانہ بنایا گیا۔ 8 اکتوبر کو اورنگی ٹاون کراچی میں ایک ڈاکٹر کو اس کے کلینک میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ دو مسلح افراد کلینک پر آئے ایک کلینک کے اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر کو قتل کیا اور اپنے ساتھی کے ہمراہ فرار ہو گیا۔ اس قتل کے محرکات کا علم نہ ہو سکا تاہم پولیس کا کہنا تھا قتل کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر نے سندھ گورنمنٹ قطر ہسپتال میں میڈیکولیگل افسر کے طور پر خدمات نجام دی تھیں۔ ڈاکٹر کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ مرحوم ڈاکٹر کو بھتہ دینے کے لئے ٹیلی فون نہیں آیا تھا۔ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن (پی ایم اے) نے ڈاکٹر کے قتل کی شدید مذمت کرتے ہوئے مطالبہ کیا تھا کہ حکومت ڈاکٹروں کو تحفظ مہیا کرے۔

ستمبر میں ماہر امراض قلب' ڈاکٹر مناف ترین کو کوئٹہ کے پشین سٹاپ پر ان کے ہسپتال کے باہر سے مسلح افراد نے اغوا کر لیا۔ ڈاکٹر کو اغوا کرنے والوں نے پانچ کروڑ روپے کا تاوان طلب کیا۔ پاکستان میڈیکل

ایسوسی ایشن کی بلوچستان شاخ نے کہا کہ ترین 26 ویں ڈاکٹر تھے جنہیں بلوچستان سے اغوا کیا گیا تھا۔ پی ایم اے نے دھمکی دی کہ اگر ماہر امراض قلب کو حکومت نے بازیاب نہ کرایا تو بلوچستان کے تمام ہسپتالوں میں ہڑتال کردی جائے گی۔ حکومت کی طرف سے ٹھوس اقدامات نہ کرنے کے باعث 17 نومبر کو پورے بلوچستان میں ڈاکٹروں نے ہڑتال کردی اور ہسپتالوں کے آوٹ ڈور پیشنٹس ڈیپارٹمنٹ بند کردیئے۔ ڈاکٹر پہلے ہی 49 روز سے ہڑتال پر تھے لیکن پی ایم اے نے انہیں ہدایت کی کہ وہ ہڑتال کو مزید موثر بنائیں اور صرف ایمرجنسی میں آنے والے مریضوں کو دیکھیں۔ اغوا کئے جانے والے ماہر امراض قلب کو یکم دسمبر کو رہا کردیا گیا اور وہ بھی اس وقت جب ڈاکٹر کے خاندان نے تاوان کی بھاری رقم ادا کی۔ اغوا کنندگان کو گرفتار نہیں کیا گیا۔

سفارشات

1۔ صحت کے شعبہ کی بہتری کے لئے تمام صوبوں میں صحت کیلئے مختص بجٹ میں اضافہ کرنا ضروری ہے۔ بنیادی طبی سہولت کے حوالے سے پینے کے صاف پانی کی فراہمی کے علاوہ سیوریج کے نظام اور متعدی بیماریوں کی روک تھام کے پروگرام پر خصوصی توجہ دی جائے۔ ہیلتھ ورکرز اور ویکسی نیشن ٹیموں کو یقینی تحفظ مہیا کیا جائے۔ لوگوں کو وائرس کے ذریعے پھیلنے والی بیماریوں سے آگاہی دینے کے لئے میڈیا پر تشہیری مہم شروع کی جائے تا کہ لوگ خود حفاظتی تدابیر اختیار کرسکیں۔

2۔ صحت کی سہولتیں فراہم کرنے والے افراد کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کی جائیں تا کہ وہ لوگوں کو تسلسل کے ساتھ طبی سہولتیں فراہم کرسکیں۔ پبلک ہیلتھ کیئر سسٹم کو مضبوط بنایا جاے تا کہ ہر شہری کو طبی سہولتوں کی فراہمی کی ضمانت مل سکے۔ شہری سے مراد صرف بڑے شہروں کے لوگ نہیں بلکہ چھوٹے شہروں اور دیہی علاقوں میں رہنے والے لوگ بھی ان میں شامل ہیں ایسے اقدامات کئے جائیں جن سے یہ یقینی ہو سکے کہ طبی سہولتیں صرف ان لوگوں کے لئے ہی نہیں ہیں جو اپنی دولت یا طاقت کے بل بوتے پر حاصل کرسکتے ہیں۔

3۔ ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی کو غیر رجسٹرڈ ادویات فروخت کرنے والوں کے خلاف سخت ترین کاروائی کرنی چاہئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت نیم حکیموں کے خلاف سخت کاروائی کرے اور اس مقصد کے لئے متبادل / جڑی بوٹیوں کے ذریعے علاج کرنیوالوں کی رجسٹریشن اور انہیں لائیسنس جاری

کرنے کا واضح طریقہ اختیار کیا جائے۔

4۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایم ڈی جی کے اہداف حاصل کرنے کے لئے موثر حکمت عملی تیار کر کے اس پر سختی سے عمل درآمد کیا جائے تا کہ 2015ء کے بعد کے اہداف بھی حاصل کئے جا سکیں۔

5۔ ایسے اقدامات کئے جائیں جن کے ذریعے پاکستان کو پولیو فری بنایا جا سکے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے صرف ویکسی نیشن ٹیموں کو تحفظ دینا ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عوام کا اعتماد حاصل کیا جائے۔ ویکسین کے ذریعے جن بیماریوں مثلاً خسرہ وغیرہ پر قابو پایا جاتا ہے، ان بیماریوں کے خاتمے کے لئے وقتاً فوقتاً ٹیکے لگانے کے عمل کو روزمرہ زندگی کا معمول بنانا ضروری ہے۔

ہاؤسنگ

ریاست، جنس، ذات، رنگ اورنسل سے بالاتر ہوکر معیار زندگی بہتر کر کے، عوام کی فلاح و بہبود کو یقینی بنائے گی۔۔۔

آ ئین پاکستان[آ رٹیکل نمبر- (a) 38]

ہر شخص ایک معقول معیار زندگی کا حق رکھتا ہے۔ جو اس کے خاندان کی صحت اور فلاح اور بہبود کی ضمانت فراہم کر سکے۔۔۔جس میں رہائش کی سہولتیں بھی شامل ہیں۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور[آ رٹیکل نمبر-(1)25]

موجودہ میثاق کی توثیق کرنے والے تمام رکن ممالک ہر شہری کے اپنے اور اپنے خاندان کے لئے معقول معیار زندگی......بشمول مناسب خوراک، لباس اور ہاؤسنگ کے حق کوتسلیم کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی حالات زندگی میں مسلسل بہتری لانے کے اس کے حق کو بھی تسلیم کرتے ہیں......

معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے بارے میں بین الاقوامی [میثاق آ رٹیکل (1) 11]

پانچ سال قبل عالمی بنک کی طرف سے جاری کی جانے والی تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں 75 لاکھ گھروں کی کمی تھی۔ تخمینے کے مطابق اس کمی میں ہر سال مزید 3 لاکھ تک کے اضافے کا امکان تھا۔ نتیجتاً 2013ء کے اختتام پر پاکستان کو 90 لاکھ گھروں کی کمی کا سامنا تھا۔سیلابوں، زلزلوں اور اندرونی مسلح تصادمات کے نتیجے میں ہونے والی گھروں کی تباہی نے صورت حال کو مزید ابتر بنادیا۔گھرانہ وار سروے کی عدم موجودگی میں درست اعداد و شمار دستیاب نہیں تھے تاہم یہ بات واضح تھی کہ ملک میں گھروں کی شدید کمی تھی جبکہ نصف سے زائد شہری آبادی غیر قانونی آبادیوں میں مقیم تھی۔صوبائی حکومتوں نے کچی آبادیوں کو باضابطہ بنانے کی بات تو کی لیکن رہائشیوں کو بنیادی ضروریات مہیا کرنے کے لیے کوئی اقدامات نہ کیے۔

ہاؤسنگ سوسائٹیوں نے کسی جانچ یا ضابطے کے بغیر زرخیز زرعی اراضی پر قبضہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ دیہی علاقوں میں بنیادی سہولیات کے فقدان نے بھاری تعداد میں لوگوں کو شہروں کی جانب نقل

مکانی پر مجبور کر دیا جس کے باعث سہولتیں مہیا کرنے والے نظام پر بوجھ بڑھ گیا۔ رہائشی علاقوں کے اڑوس پڑوس میں جاری کاروباری سرگرمیاں بھی انفراسٹرکچر پر اضافی بوجھ کا سبب بنیں۔

مکانوں کی کمی کا بوجھ اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے دس لاکھ افراد کی نقل مکانی کے باعث مزید بڑھ گیا۔ اس نقل مکانی کا سبب فاٹا میں جاری مسلح تصادمات تھے۔

حادثات، آتش زدگیاں اور مکانوں کا انہدام

شہری ترقی کے ادارے تعمیراتی ضوابط کی خلاف ورزی کو نہ روک سکے۔ کثیر المنزلہ عمارتیں تعمیر کی گئیں لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ایمرجنسی میں آگ بجھانے والے رضا کاروں کے پاس اوپر والی منزلوں تک پہنچنے کے لئے مناسب سامان اور آلات موجود نہیں تھے۔ خستہ حال گھروں اور عمارتوں کو جاری کئے جانے والے نوٹسوں کی پیروی نہ کی گئی۔ عمارتوں کے ناقص معیار یا احتیاطی تدابیر کے فقدان کے باعث سال بھر کے دوران متعدد حادثات پیش آئے۔

جنوری میں دیر میں شدید بارش کے باعث ایک گھر کی چھت گر گئی جس کے نتیجے میں ایک شخص اور اس کے دو بچے جاں بحق ہو گئے جبکہ اس کی بیوی شدید زخمی ہو گئی۔ بنیادی طور پر یہ گھر مٹی سے تعمیر کیا گیا تھا۔

اسی ماہ کراچی میں زیر تعمیر عمارت ایک دکان کے اوپر گر گئی۔ جس کے نتیجے میں 7 افراد زخمی ہو گئے۔

ایل۔ڈی۔اے پلازہ میں لگنے والی آگ نے حفاظتی اقدامات کا پول کھول دیا

اس کی وجہ یہ تھی کہ عمارت کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی لیکن گراؤنڈ فلور پر دکان چلانے کی اجازت دے دی گئی تھی جس کے باعث کئی افراد زخمی ہوگئے۔

سرکاری عمارتیں بھی حفاظتی معیار پر پورا نہیں اترتی تھیں۔ جنوری میں سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے دفتر کی عمارت منہدم ہوگئی جس کے نتیجے میں ایک خاتون جاں بحق اور 9 خواتین زخمی ہوگئیں۔ اطلاعات کے مطابق عمارت خستہ حالی کا شکار تھی جس کے باعث یہ واقعہ رونما ہوا۔

چند روز بعد اندرون لاہور میں ایک بوسیدہ عمارت منہدم ہوگئی جس کے نتیجے میں ایک ہی خاندان کے پانچ افراد جاں بحق ہوگئے۔ امدادی کارکنان کا کہنا تھا کہ خستہ حال گھر کو بارشوں کی وجہ سے مزید نقصان پہنچا۔

مارچ میں کراچی کے علاقے نارتھ ناظم آباد کی ایک کچی آبادی میں گھر کی عمارت گر گئی جس کے نتیجے میں 3 بچے ہلاک اور 4 زخمی ہوگئے۔

گھروں، چھتوں اور دیواروں کے گرنے کی ایک اہم وجہ بارش تھی تاہم آفات سے نبٹنے والے مختلف اداروں نے ضروری اقدامات نہ کیے۔

مارچ میں خیبر پختونخوا کے علاقے کرک میں بارش کے باعث ایک گھر منہدم ہوگیا جس کے نتیجے میں 5 افراد بشمول تین بچے جاں بحق اور پانچ زخمی ہوگئے۔

جون میں لاہور میں شدید بارشوں کے باعث گھروں کی چھتیں گرنے کے مختلف واقعات میں چار بچوں سمیت چھ افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوگئے۔

جولائی میں پنجاب کے ضلع گوجرانوالہ میں شدید بارش کے باعث ایک گھر منہدم ہوگیا جس کے نتیجے میں تین بچوں سمیت ایک ہی گھر کے پانچ افراد ہلاک اور 12 زخمی ہوگئے۔

اسی ماہ کے آخر میں ضلع راجن پور کے ایک گاؤں میں دو روز تک جاری رہنے والی شدید بارش کے باعث ایک گھر منہدم ہوگیا جس کے نتیجے میں سات افراد ہلاک ہوگئے۔

اگست میں بلوچستان کے علاقے حب میں ایک کچی آبادی پر ملحقہ فیکٹری کی دیوار گر گئی جس کے نتیجے میں پانچ بچے ہلاک اور چار خواتین زخمی ہوگئیں۔

نومبر میں سوات میں ایک گھر کی چھت گرنے سے ایک ہی خاندان کے سات افراد ہلاک ہوگئے۔

زمینوں پر ناجائز قبضہ

اراضی کے حوالے سے دھوکہ دہی کے متعدد واقعات منظر عام پر آئے لیکن مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں نہیں لایا گیا۔

جنوری میں قبضہ گروپوں کے ساتھ ساز باز کرنے اور تین رہائشی پلاٹوں پر غیر قانونی قبضہ کرنے میں مدد فراہم کرنے پر لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ایل ڈی اے) کے دو اہلکاروں کو برطرف کر دیا گیا۔

مارچ میں اسلام آباد کے ایک جج نے سپریم کورٹ کے ایک تین رکنی بینچ کو ایک رپورٹ پیش کی جس کے مطابق رہائشی گھروں کی الاٹمنٹ اور قبضے کے تنازعات سے متعلق 720 مقدمات زیر التواء تھے۔

لوگ قبضہ گروپوں کے خلاف کارروائی سے اجتناب کرتے ہوئے اکثر ان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتے تھے کیونکہ عدالتوں میں مقدمات کا فیصلہ ہونے میں کئی سال لگ جاتے تھے۔

مارچ میں غریبوں اور بے گھر افراد کے لیے شروع کی گئی مہم کو اس وقت دھچکا لگا جب کراچی میں اورنگی پائلٹ پراجیکٹ (او پی پی) نامی این جی او کی ڈائریکٹر پروین رحمان کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ پروین رحمان کچی آبادی کے مکینوں کے لئے کم لاگت نکاسئ آب، مکانات اور تعلیم کی فراہمی پر کام کر رہی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ کراچی کے گردونواح میں زمینوں پر قبضے کی تفصیلات منظر عام پر لانے کے باعث انہیں قبضہ گروپوں کی طرف سے مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں۔

اپریل میں سپریم کورٹ نے کراچی میں اراضی کے حوالے سے دھوکہ دہی کے ایک بڑے سکینڈل کا از خود نوٹس لے لیا جس میں کراچی پورٹ ٹرسٹ (پی کیو ٹی) اور پورٹ قاسم اتھارٹی کے افسروں نے ساحلی علاقے سے ملحقہ 88 ارب روپے مالیت کی 1600 ایکڑ اراضی غیر قانونی طور پر ڈھائی روپے فی مربع میٹر کے حساب سے ڈیڑھ کروڑ روپے میں ایک نجی رہائشی منصوبے کے مالکان کو فروخت کر دی۔ سپریم کورٹ نے کے پی ٹی اور پی کیو اے کے افسروں سے استفسار کیا کہ وہ وضاحت کریں کہ انہوں نے کس قانون کے تحت سرکاری زمین فروخت کی۔

جون میں فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی (ایف آئی اے) نے متروکہ وقف املاک بورڈ کے سابق چیئرمین کے خلاف تحقیقات کیں۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے ساتھ 843 کینال اراضی کا معاہدہ کرتے ہوئے بورڈ کو ایک ارب نوے کروڑ روپے کا نقصان پہنچایا تھا۔ ای ٹی پی بی نے یہ معاہدہ سہولیات سے آراستہ 33 فیصد پلاٹوں کے بدلے میں طے کیا تھا۔ سابق چیئرمین، جن کے خلاف تفتیش جاری تھی، نے 25 فیصد پلاٹ وصول کرنے پر رضامندی ظاہر کرتے ہوئے معاہدے کی تجدید کر دی جبکہ یہ پلاٹ سہولیات سے بھی آراستہ نہیں تھے۔ اس ماہ ایف آئی اے سابقہ چیئرمین کی جانب سے کئے گئے ایک اور مشکوک معاہدے کو منظر عام پر لائی جس کا تعلق لاہور کے علاقے ڈی ایچ اے میں اُنسٹھ کروڑ روپے مالیت کی زمین کی فروخت سے تھا۔ اکتوبر میں سپریم کورٹ نے اس معاہدے کو کالعدم قرار دے دیا۔ سپریم

لینڈ مافیا کی طرف سے زمینوں پر قبضوں سے مالکان کو مشکلات کا سامنا رہا

کورٹ کے تین رکنی بینچ نے سابق چیئر مین کے خلاف فوجداری کارروائی کا حکم دیا۔

فیصل آباد میں لوگوں نے فیصل آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ایف ڈی اے) کی جانب سے تیار کردہ رہائشی سکیم میں ترقیاتی کاموں کے فقدان کی شکایت کی۔ یہ سکیم 1800 ایکڑ پر محیط تھی اور اس کی انتظامیہ نے 2005ء میں پلاٹوں کی فروخت سے لوگوں سے 10 ارب روپے سے زائد رقم وصول کی تھی۔ 2005ء میں شروع کی گئی اس سکیم میں ہزاروں لوگوں نے پلاٹ خریدے تھے۔ ان لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ سوسائٹی میں 2007ء تک ایک ایکسپو سنٹر، ایک سٹیڈیم، ایک ہسپتال اور ایک سکول تعمیر کیا جائے گا تاہم 2013 کے آخر تک سوسائٹی میں معمولی سا ترقیاتی کام کیا گیا تھا۔

زرخیز زرعی اراضی پر بڑی تعداد میں رہائشی سکیمیں تعمیر کرنے کا سلسلہ جاری رہا اور متعدد دیہاتوں کو رہائشی سکیموں میں تبدیل کر دیا گیا، نومبر میں خیبر پختونخوا کے علاقے نوشہرہ کے پانچ دیہہ کے مکینوں نے اپنی زمینوں پر رہائشی سکیم تعمیر کرنے سے متعلق حکومتی فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی زمین پر رہائشی سکیم تعمیر کرنا ان کے معاشی قتل کے مترادف ہوگا۔

لاہور کے علاقے رائیونڈ کے متعدد دیہات سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے دعویٰ کیا کہ انہیں ہراساں اور مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی زمین ایک بڑی رہائشی سکیم کو فروخت کر دیں۔ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ مذکورہ ہاؤسنگ اتھارٹی پولیس کی ملی بھگت سے انہیں اپنی زمین انتہائی کم قیمت پر فروخت کرنے پر مجبور کر رہی تھی،

حالانکہ اس علاقے میں رہائشی سکیموں کی تعمیر کے باعث زمین کے نرخوں میں نمایاں اضافہ ہو چکا تھا۔

مکانات کی تعمیر کے لئے سرمایہ اور کرائے

حکومتی سرپرستی کے تحت چلنے والا ادارہ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن (ایچ بی ایف سی) ملک میں گھروں کی تعمیر کے لیے سرمایہ فراہم کرنے والا یہ واحد فعال بینک تھا۔ ایچ بی ایف سی نے 2006ء، 2007ء اور 2008ء میں بالترتیب 5,716، 6,812 اور 6,130 گھروں کی تعمیر یا خرید میں قرضے فراہم کئے۔ تاہم اگلے برسوں کے دوران بین الاقوامی معاشی بحران کے باعث یہ تعداد نمایاں طور پر کم ہوگئی۔ 2013ء میں گھروں کی تعمیر میں مدد فراہم کرنے والا یہ ادارہ صرف 1,614 گھروں کی تعمیر یا خرید میں مدد فراہم کر سکا۔ پاکستان میں ہر سال 3 لاکھ گھروں کی کمی پوری کرنے کے حوالے سے یہ اقدامات انتہائی ناکافی تھے۔

شہری علاقوں میں گھروں کے زیادہ کرایوں کے باعث ان لوگوں کی زندگی مشکل ہوگئی جو کہ اپنا گھر خریدنے کی سکت نہیں رکھتے اور انہیں نسبتاً غیر ترقی یافتہ علاقوں میں بھی گھروں کے کرایوں پر اپنی آمدن کا بڑا حصہ خرچ کرنا پڑا۔ گھروں کے کرایوں میں اضافہ خاص طور پر ان علاقوں میں دیکھا گیا جہاں اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے افراد کو سر چھپانے کی جگہ مہیا ہوئی تھی۔

غیر قانونی تعمیر اور نکاسئ آب کا نظام

نکاسئ آب کے متعلق ساؤتھ ایشین کانفرنس میں پیش کردہ سینی ٹیشن کنٹری پیپر آن پاکستان میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں 33 فیصد لوگوں کو نکاسئ آب کی سہولیات میسر نہیں تھیں۔ تقریباً 23 فیصد لوگ رفع حاجت کے لئے کھلے میں جاتے ہیں۔ صرف 47 فیصد آبادی کو نکاسئ آب کی بہتر سہولیات میسر تھیں۔ دیہی اور شہری علاقوں میں ایک وسیع تفاوت موجود رہا اور 72 فیصد شہریوں جبکہ صرف 34 فیصد دیہاتیوں کو نکاسئ آب کی مناسب سہولیات میسر تھیں۔

پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس (پی ٹی آئی ڈی ای) کی جانب سے شائع کیے گئے پاکستان کے ترقیاتی جائزے کے مطابق شدید بارشیں بڑے پیمانے پر سیلابوں کا باعث بنیں، جس کے باعث متعدد علاقوں، بالخصوص زیریں علاقوں میں سیلاب کا پانی گٹر کے پانی میں شامل ہوگیا جو آلودگی اور بیماریوں کے پھیلاؤ کا باعث بنا۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ نکاسئ آب کا مناسب نظام نہ ہونے کے باعث گزشتہ برسوں کے دوران نکاسئ آب کی صورت حال بدتر ہو چکی تھی۔

جولائی میں نکاسئ آب کے حوالے سے ایک ہزار سالہ ترقیاتی اہداف سے متعلق بحث کرنے کے

لیے عالمی بینک اور یونائیٹڈ نیشنز چلڈرن فنڈ کی جانب سے ایک ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ ورکشاپ میں انکشاف ہوا کہ نکاسیٔ آب کی ناکافی سہولیات کے باعث پاکستان کو سالانہ پانچ ارب ستر کروڑ ڈالر یعنی 34 ارب تیس کروڑ روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ جولائی میں شدید بارشوں کے نتیجے میں نکاسیٔ آب کے ناقص نظام کے باعث وفاقی دارالحکومت اسلام آباد مفلوج ہو کر رہ گیا۔ محض ایک دن کی بارش کے باعث نکاسیٔ آب کا نظام درہم برہم ہو گیا اور بارش کا پانی سرکاری عمارتوں کے علاوہ پرائم منسٹر سٹاف کالونی میں بھی داخل ہو گیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شہروں، بالخصوص ملک کے دارالحکومت میں کس قسم کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔

دسمبر میں پنجاب کے ہنگامی امداد کے ادارے ریسکیو 1122 نے ایک رپورٹ تیار کی جس میں کہا گیا کہ ضلع فیصل آباد میں 737 دکانیں، فیکٹریاں اور گھر اپنی خستہ حالی کی وجہ سے انسانی زندگیوں کے لئے خطرہ ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق چند فیکٹریوں اور دو کانوں میں بجلی کی ناقص وائرنگ کسی بھی وقت جانی اور مالی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔

ثقافتی ورثے کا تحفظ

جنوری میں پنجاب کے شعبہ آرکیالوجیکل نے لاہور میں 16 تاریخی عمارتوں کی نشاندہی کی جنہیں Punjab Special Premises Preservation Ordinance مجریہ 1985ء کے

تاریخی عمارات اپنے اندر بااثر پراپرٹی مافیا کے لیے کشش رکھتی ہیں

تحت تحفظ شدہ مقامات کی فہرست میں شامل کیا جانا چاہیے تھا۔

جنوری میں ضلع ٹھٹھ کے علاقے میراں پیر میں چند افراد نے بظاہر خزانے کی تلاش میں مغل دور کے ایک قبرستان کو کھود ڈالا۔ سندھ کے شعبہ آرکیالوجی اور ثقافت کی ایک مشترکہ ٹیم نے نقصان کا اندازہ لگانے کے لیے جگہ کا دورہ کیا۔ ایرانی فن خطاطی سے آراستہ پتھروں کو جزوی طور پر نقصان پہنچا تھا۔ پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ کمیشن کے چیئرمین نے پنجاب کے شعبہ آرکائیو سے وعدہ کیا کہ تاریخی ریکارڈ کو معیار کے مطابق برقرار رکھنے کے لیے ایک جدید کمپلیکس کی تعمیر کے لیے مطلوبہ فنڈ مہیا کیے جائیں گے۔ سیکرٹری آرکائیوز کا کہنا تھا کہ عمارتوں میں ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے حسب ضرورت گنجائش اور سہولیات میسر نہیں تھیں۔ یہ ضروری تھا کہ آرکائیوز کے شعبوں میں مغل دور کے ریکارڈ سمیت دیگر دستاویزات کو محفوظ کیا جائے۔

کچی آبادیاں

کچی آبادیوں کے مکین اور بلا اجازت سرکاری زمینوں پر رہائش رکھنے والے افراد نا اُمیدی کی زندگی گزارتے رہے۔ چونکہ ان آبادیوں کو باضابطہ بنانے سے متعلق وعدوں کو پورا نہ کیا گیا۔ ان علاقوں کے رہائشی پانی خریدنے، گیس سیلنڈر استعمال کرنے اور پاور گرڈ سے بجلی چوری کرنے پر مجبور تھے چونکہ حکومت نے انہیں یہ تمام سہولیات مہیا نہیں کی تھیں۔ ملک کے بڑے شہروں میں مصارفِ زندگی میں بے پناہ اضافہ کے باعث ملک کی نصف سے زائد آبادی غیر قانونی آبادیوں میں رہنے پر مجبور تھی۔

کچی آبادیوں سے متعلق حکومتی پالیسی ابہام کا شکار رہی۔ ایک طرف رہائشیوں کو ملکیتی حقوق کی فراہمی کا وعدہ کیا گیا جبکہ دوسری طرف انہیں کئی مرتبہ بغیر کسی پیشگی اطلاع کے بے دخل کر دیا۔

حکومت پنجاب نے مارچ میں صوبے بھر میں 3,460 کچی آبادیوں کے مکینوں کو ملکیتی حقوق فراہم کیے۔ اس سے تقریباً 17 لاکھ افراد مستفید ہوئے اور 180,725 کنال زمین کا انتقال کیا گیا۔

دسمبر میں پنجاب حکومت نے کچی آبادیوں کے 326,516 یونٹوں کے 22 لاکھ مکینوں کو ملکیتی حقوق دینے کا اعلان کیا۔ گورنر پنجاب کا کہنا تھا کہ کچی آبادیز ریگولرائزیشن سکیم مجریہ 2012ء کے تحت شوہر اور بیوی کو مشترکہ طور پر ملکیتی حقوق دیے جائیں گے۔ کچی آبادیوں کو باضابطہ بنانے کا عمومی طور پر یہ مطلب نہیں سمجھا گیا کہ انہیں نکاسیٔ آب، مناسب رہائش اور تفریحی سہولیات بھی فراہم کی جائیں گی۔

جنوری میں اسلام آباد کے آئی II سیکٹر کی ایک کچی آبادی کے رہائشیوں نے کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) کی جانب سے علاقہ خالی کرنے کے نوٹس جاری کیے جانے کے خلاف احتجاج کیا۔ ان لوگوں میں سے زیادہ تر کا تعلق فاٹا کی مہمند ایجنسی سے تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ وہاں سے نقل مکانی کی صورت

آدھی شہری آبادی غیر قانونی آبادیوں میں زندگی گزار رہی ہے

میں انہیں معاوضہ ادا کیا جائے۔ سی ڈی اے کے اہلکاروں نے جواب دیا کہ چونکہ انہوں نے اس علاقے پر غیر قانونی طور پر قبضہ کر رکھا تھا اس لیے وہ معاوضے کے مستحق نہیں تھے۔ رہائشیوں نے کہا کہ اس علاقے میں تقریباً 15,000 لوگ 40 سال سے زائد عرصہ سے رہائش پذیر تھے لیکن انہیں ان کے حقوق فراہم نہیں کیے جا رہے۔ سی ڈی اے نے دعویٰ کیا کہ یہ علاقہ دہشت گردوں کی تربیت گاہ تھا۔ رہائشیوں نے اس کی تردید کی اور کہا کہ یہ لوگ پھلوں اور سبزیوں کی تجارت کرتے تھے۔

فروری میں پنجاب حکومت نے فیروز پور روڈ سے ملتان روڈ تک سڑک کی تعمیر کے لیے ایک کچی آبادی کے پانچ سو گھروں کو مسمار کرنے کا نوٹس جاری کیا جس کے خلاف سینکڑوں رہائشیوں نے احتجاج کیا اور ایک اہم شاہراہ بلاک کر دی۔ کچی آبادی فیڈریشن کے صدر کا کہنا تھا کہ 1985ء میں تقریباً 500 خاندانوں کو ملکیتی حقوق دیے گئے تھے کیونکہ وہ 1960ء سے اس علاقے میں رہائش پذیر تھے۔

قبرستان

پاکستان بھر میں قبروں کی قیمت میں اضافہ ہوتا رہا۔ تدفین پر اٹھنے والے اخراجات کا انحصار مرحوم/مرحومہ کے مذہب پر تھا۔ پنجاب میں کسی مسلمان کی سنگ مرمر کی قبر کی قیمت 20,000 سے 25,000 روپے (250 ڈالر) کے درمیان تھی۔ پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے لیے مردوں کو جلانے پر تقریباً 10,000 سے 15,000 روپے کے اخراجات اٹھتے ہیں۔ سندھ میں قبر کی قیمت 25,000 سے 30,000 کے درمیان تھی۔ قبرستانوں کے لیے مختص زمین پر قبضہ کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔

جنوری میں وزیر اعلیٰ پنجاب نے پنجاب میں قبرستانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے سالانہ ترقیاتی پروگرام 13-2012ء کے تحت ایک ارب روپے کی رقم کی منظوری دی۔ وزیر اعلیٰ نے ہر ضلع میں آبادی کے تناسب کے حوالے سے قبرستانوں کے سروے کا حکم دیا۔ اکتوبر میں جاری کردہ فنڈز چار دیواریوں کی تعمیر، پینے اور وضو کے لیے پانی اور روشنی کے انتظام پر خرچ ہونے تھے۔

جنوری میں سوات کے علاقے دھیرائی بابا میں مقامی انتظامیہ نے 333 کنال پر مشتمل علاقے کے ہزاروں مکینوں کو علاقہ خالی کرنے سے متعلق ایک ہفتے کے پیشگی نوٹس جاری کیے۔ انتظامیہ کا کہنا تھا کہ یہ زمین قبرستان کے لیے مختص تھی۔ 117 دکانداروں اور تقریباً 545 گھروں کے مالکان کے نوٹس کے خلاف احتجاج کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے یہ زمین قانونی طریقے سے حاصل کی تھی۔

نومبر میں منڈی بہاؤالدین کے گاؤں اجووال کے رہائشیوں نے ایک قبضہ گروہ کی جانب سے ایک قبرستان پر غیر قانونی قبضے کے خلاف احتجاج کیا۔ انہوں نے شکایت کی کہ پولیس نے زمین خالی کرانے میں ان کی مدد نہیں کی اور مقامی لوگوں نے اپنے طور پر زمین واپس لینے کی کوشش کی جو متعدد جھگڑوں کا باعث بنی جن میں کئی افراد زخمی ہوئے۔ کہا جاتا تھا کہ قبضہ گروہ قبرستان کے لیے مختص کردہ زمین پر ایک فارم ہاؤس تعمیر کرنا چاہتا تھا۔

قدرتی آفات اور اندرونی مسلح تصادمات

راولپنڈی میں نالہ لئی اپنے دونوں اطراف میں موجود غیر قانونی آبادیوں کے لئے ہمیشہ تشویش کا باعث رہا ہے۔ یکم جولائی کو نالہ لئی کے کنارے مٹی کا تودہ گرنے سے 20 گھروں کے منہدم ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا چونکہ پانی کے ریلے کے باعث اس کے کنارے ٹوٹ گئے تھے۔ بارش کے باعث متعدد گھروں کی بنیادیں دکھائی دینے لگیں اور یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ مون سون کے دوران مزید بارشوں کی صورت میں گھر پانی میں بہہ جائیں گے۔ یہ علاقہ جولائی 2001ء کے سیلاب سے بُری طرح متاثر ہوا تھا جس کے باعث درجنوں افراد جاں بحق اور متعدد گھر تباہ ہوئے تھے۔

ڈزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی (Disaster Management Authority) کے اہلکاروں کے مطابق 2013ء میں مون سون کی بارشوں کے باعث پاکستان بھر میں 1,503,492 (پندرہ لاکھ تین ہزار چار سو بانوے) افراد متاثر ہوئے۔ سیلاب کے باعث 5,615 دیہات متاثر ہوئے اور 20,312 مکانات تباہ ہوئے۔ پاکستان میں مون سون کے دوران آنے والے سیلاب ایک معمول بن چکے ہیں اور پاکستان کو مسلسل چوتھے سال سیلاب کا سامنا کرنا پڑا۔

سیلابوں اور مسلح تصادمات سے ہونے والی تباہی نے رہائش گاہوں کی کمی میں اضافہ کر دیا

ستمبر میں بلوچستان کے علاقے آواران میں زلزلے کے باعث یہ کم گنجان آباد علاقہ شدید متاثر ہوا اور متعدد دیہات مکمل طور پر صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ بلوچستان اسمبلی کے سپیکر کے مطابق ضلع کے شہری علاقوں میں 50 فیصد اور دیہی علاقوں میں 90 فیصد عمارتیں منہدم ہو گئیں۔

جولائی کے آخر تک ملک میں اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے افراد کی تعداد 10 لاکھ تھی۔ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے مہاجرین کے اعداد وشمار کے مطابق بے گھر افراد کی اکثریت نوشہرہ کے جلوزئی کیمپ میں قیام پذیر تھی، جبکہ بے گھر افراد کی دوسری بڑی تعداد کرم ایجنسی کے نیو درانی کیمپ اور تیسری بڑی تعداد ہنگو کے توغ سرائے کیمپ میں قیام پذیر تھی۔ بے گھر ہونے والے خاندانوں کی اکثریت اورکزئی ایجنسی اور جنوبی وزیرستان سے نقل مکانی کر کے آئی تھی۔ شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن کی باتیں ہو رہی تھیں اس لئے یہ خوف تھا کہ کیمپوں میں جو پہلے ہی لوگوں سے بھرے پڑے تھے، لوگوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے افراد جو کہ پہے ہی تنگ اور پر ہجوم کیمپوں میں رہ رہے ہیں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

سفارشات

1- ہنگامی سروسز کو مقامی ترقیاتی ادارے کے اشتراک سے اپنے علاقے میں موجود خستہ حال اور غیر محفوظ عمارتوں کا سروے کرنا چاہیے۔ اگر خطرناک عمارتوں کے مالکان خستہ حال عمارتوں کی حالت بہتر بنانے یا انہیں خالی کرنے میں ناکام رہیں تو انہیں نوٹس جاری کیے جائیں اور سزا دی جائے۔

2- عدالتوں کو زمینوں پر قبضے اور فراڈ کے مقدمات کا فوراً فیصلہ کرنا چاہئے اِن فیصلوں پر عملدرآمد بھی ہو۔

3- ملک میں کچی آبادیوں اور غیر قانونی آبادیوں کو باضابطہ بنایا جائے اور وہاں کے مکینوں کو بنیادی سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔

4- ایک سخت ضابطہء اخلاق بنایا جائے جس میں رہائشی سکیموں کی تعمیر یا توسیع کے لیے گاؤں کے لوگوں کو جبری طور پر علاقے سے بے دخل کرنے اور انہیں اپنی زرعی زمینیں فروخت کرنے پر مجبور کرنے کو جرم قرار دیا جائے۔

5- مقامی ترقیاتی اداروں کو قبرستانوں کے لیے زمین مختص کرنی چاہیے اور اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ اس زمین پر قبضہ کوئی قبضہ نہ کر سکے۔ تدفین پر اٹھنے والے اخراجات کو کم کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

ماحولیات

تمام انسان، ایسے ماحول کا بنیادی حق رکھتے ہیں، جو ان کی صحت اور فلاح و بہبود کے تمام تقاضوں کو پورا کرے۔
تمام ممالک، ماحول کا تحفظ کریں گے اور قدرتی وسائل کو، موجودہ اور آنے والی نسلوں کی بہتری کے لیے استعمال کریں گے۔
تمام ممالک، ماحول کے تحفظ کے سلسلے میں مناسب اور موزوں معیار قائم کریں گے اور ماحولیاتی معیار اور قدرتی وسائل کے استعمال میں آنے والی تبدیلی کو مانیٹر اور متعلقہ اعداد وشمار کو منظر عام پر لائیں گے

ماحولیاتی تحفظ اور قابل توثیق ترقی کے لیے مجوزہ قانونی اصول [آرٹیکل 1-2 اور 4]

صاف اور صحت مند ماحول اب عالمی طور پر بنیادی انسانی حقوق کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ اگرچہ یہ بین الاقوامی انسانی حقوق کے معاہدوں اور میثاقوں میں شامل نہیں تاہم اقوام متحدہ اور اس کے معاہدوں پر نظر رکھنے والے اداروں نے بار بار کہا ہے کہ جینے کے حق اور صحت مند رہنے کے حق کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک صاف ستھرا اور دوستانہ ماحول میسر نہ ہو۔

1972ء میں انسانی ماحول پر اقوام متحدہ کی ایک کانفرنس میں یہ اعلان کیا گیا کہ قدرت یا انسان کا تخلیق کردہ ماحول انسانی زندگی کے لئے بے حد ضروری ہے تا کہ جینے کے حق سمیت تمام بنیادی حقوق سے لطف اندوز ہوا جا سکے۔ اس میثاق کو انسانی حقوق کے اعلانِ سٹاک ہوم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس اعلان کے بعد 1964ء میں انسانی حقوق اور ماحولیات کے تحفظ کے ماہرین پر مشتمل ایک بین الاقوامی گروپ کی طرف سے انسانی حقوق اور ماحولیات کے اصولوں سے متعلق تیار کردہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔ اس اعلامیہ کا یہ مسودہ وہ پہلی بین الاقوامی دستاویز ہے جو مکمل طور پر انسانی حقوق اور ماحولیات کا احاطہ کرتا

ہے۔ یہ دستاویز واضح کرتی ہے کہ انسانی حقوق کے اصول عوام کو میسر صاف، صحت منداور بہترین جغرافیائی ماحول سے مشروط ہیں۔ سیاسی، ثقافتی، شہری، معاشی اور معاشرتی حقوق کے ساتھ ساتھ یہ حقوق بھی انسانی حقوق کی طرح آفاقی، مربوط اور ناقابل تقسیم ہیں۔

اقوام متحدہ کی معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کی کمیٹی (ECSR) نے بھی صحت مند ماحول کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ صحت کے بلند ترین معیار کے حصول کے حوالے سے اپنے جنرل کمنٹ 14 میں کمیٹی نے اس کی توثیق یوں کی ہے کہ:

''صحت کا حق ان وسیع معاشی اور معاشرتی عوامل سے جڑا ہوا ہے جو انسانی صحت کی بہتری کے لئے سازگار ماحول فراہم کرتے ہیں۔ انسانی صحت کے لازمی اجزاء میں خوراک، غذائیت، رہائش، پینے کے صاف پانی تک رسائی، مناسب صفائی، کام کے لئے محفوظ اور صحت مند ماحول شامل ہیں''۔

2011ء میں اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کونسل نے انسانی حقوق اور ماحول کے درمیان تعلق کے حوالے سے ایک مطالعاتی جائزے کا آغاز کیا۔ اس کے نتیجے میں مارچ 2012ء میں ایک ماہر کا تقرر کیا گیا جس نے محفوظ، صاف اور خوش گوار ماحول سے جڑے انسانی حقوق پر مشتمل سفارشات مرتب کرنی تھیں۔

1973ء کے آئین میں پاکستان میں صاف اور صحت بخش ماحول کو بطور حق تسلیم نہیں کیا گیا۔ تاہم سپریم کورٹ کے مختلف بنچوں نے زندگی اور عزت اور وقار کے حق کو آئین کے آرٹیکل 9 کے مطابق قرار دیا ہے جو قانون کے مطابق زندگی گزارنے اور آزادی کی ضمانت دیتا ہے اور انسانی زندگی کو محدود نہیں کرتا بلکہ زندگی کے وسیع تر معنوں میں اس کو گزارنے کی بات کرتا ہے۔ اور اس میں خوشگوار زندگی کرنے اور مناسب اور متوازن معیار زندگی کو برقرار رکھنے کی بات کرتا ہے۔

1994ء کا شہلا ضیاء کا مقدمہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس میں آئین کے آرٹیکل 9 کے تحت زندہ رہنے کے حق کو آرٹیکل 14 کے ساتھ جوڑ کر عزت اور وقار کے حق کی وضاحت کرتے ہوئے طے کیا گیا کہ باوقار زندگی کے حق کا تقاضہ ہے کہ شہریوں کو صاف اور غیر آلودہ ماحول تک رسائی حاصل ہو۔ اس لئے ماحولیات کے معاملات کو پبلک پالیسی بناتے وقت پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا کیونکہ دوسرے شہری، سیاسی اور سماجی حقوق کی طرح صاف ماحول کی فراہمی بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

اعداد و شمار

عالمی بینک کے مطابق زوال پذیر ماحولیات کی وجہ سے ہر سال پاکستان کے GDP میں 6 فیصد کمی واقع ہوتی ہے۔ بینک کی رپورٹ کے مطابق ماحولیات کی زوال پذیری کی وجہ سے پاکستان کو سالانہ

365ارب روپے کا نقصان ہوتا ہے جس کا بوجھ کسی نہ کسی صورت میں غریبوں پر پڑتا ہے۔ عالمی بنک کی رپورٹ کے مطابق ماحولیاتی نقصان کے اہم اسباب درج ہیں۔ (1) ہوا میں پائی جانے والی آلودگی (گھروں کے اندر اور باہر) سے پیدا ہونے والی بیماری کے باعث کم عمری میں بچوں کی اموات ہیں جو کل نقصان کا 50 فیصد ہے۔ (2) ناکافی اور آلودہ پانی اور صفائی ستھرائی نہ ہونے کی بدولت اسہال اور تپ محرقہ کے امراض سے ہونے والا نقصان کا 30 فیصد ہے۔ (3) مٹی میں زرخیزی کی کمی کی وجہ سے زرعی پیداوار میں کمی کل نقصان کا 20 فیصد بنتی ہے۔ فضائی آلودگی کے نقصان پر جاری کی گئی جرمن واچ کے تھنک ٹینک کی نومبر 2013ء کی رپورٹ کے مطابق پاکستان ان تین ممالک میں شامل ہے جہاں 2012ء میں شدید موسموں کی وجہ سے حادثات وقوع پذیر ہوئے۔ تھنک ٹینک نے پولینڈ میں اقوام متحدہ کی موسمی کانفرنس میں The Global Climate Risk Index 2014 جاری کیا جس کے مطابق 2012ء میں ہیٹی، فلپائن اور پاکستان میں شدید موسم قدرتی آفات کا باعث بنے۔

ماحولیاتی انحطاط اور انتخابی منشور

پاکستان میں ماحولیاتی نقصان کی شدت ظاہر کرنے والے ناقابل یقین اعداد و شمار کے باوجود مئی 2013ء کے انتخابات کے موقع پر سیاسی پارٹیوں کے جاری کردہ منشوروں میں اس مسئلہ کو قطعی نظر انداز کیا گیا۔

اپریل میں قدرتی ماحول کے تحفظ کے لئے کام کرنے والے گروپ انٹرنیشنل یونین آف کنزرویشن آف نیچر (آئی یو سی این) نے پاکستان میں الیکشن کے ایجنڈا میں ماحولیات کی اہمیت کو اجاگر کرنے کیلئے ایک مباحثے کا انعقاد کیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی (PPP) اور متحدہ قومی موومنٹ (MQM) نے اس مباحثے میں شرکت ہی نہیں کی۔ جبکہ پاکستان مسلم لیگ نواز (N-PML) نے کہا کہ پارٹی نے صنعتکاروں اور کاروباری شخصیات کا تعاون حاصل کر کے ایک مضبوط اور شاندار منصوبہ تیار کیا ہے کیونکہ ماحول سے متعلق پالیسیوں کی مزاحمت صنعتوں ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ جماعت اسلامی نے دعویٰ کیا کہ مدینہ منورہ کی ماحول دوست مثال کی پیروی کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے مطابق قدرتی ماحول کے تحفظ اور مویشیوں کے حقوق کا پاس کریں گے۔ پاکستان تحریک انصاف (PTI) واحد جماعت تھی جس نے ماحولیات سے متعلق مفصل پالیسی پیش کی جس میں یونین کونسل کی سطح تک موثر پالیسی کے ذریعے پانی کی فراہمی، چھوٹے پیمانے پر ماڈل فارمنگ اور معاشی ٹورازم کے ساتھ ساتھ گرین اکانومی کا نقشہ پیش کیا۔ پی۔ ٹی۔ آئی نے جنگلات کو محفوظ کرنے اور

جنگلات پر مبنی علاقہ 3% سے 6% تک بڑھانے کا عزم بھی کیا۔

بہرحال پی۔ٹی۔آئی کی پالیسی میں کچھ تضادات نظر آئے۔مثال کے طور پر زرعی پالیسی میں پارٹی نے تجارتی حجم کے بڑے بڑے زرعی فارموں کے قیام کی وکالت کی جبکہ ماحولیاتی پالیسی میں چھوٹے پیمانے کے قابل انتظام فارموں کے قیام کا عندیہ دیا۔پی ٹی آئی نے ان انتظامات کا اظہار بھی نہیں کیا جن کے ذریعے وہ جرآت مندانہ ماحولیاتی پالیسی کا نفاذ کرے گی۔اس بات کی صراحت بھی موجود نہیں کہ صنعتکاروں، ٹمبر مافیا اور بین الاقوامی زرعی کمپنیوں جیسے اُن عفریتوں سے پی ٹی آئی کیسے نبٹے گی جو ماحول دوست پالیسیوں کی مزاحمت کرتے رہے ہیں۔

سیاسی پارٹیوں کی ترجیحات میں ماحولیات نچلی سطح پر ہونے کی وجہ سے حکومتی اداروں کی جانب سے فوری اہمیت کے ماحولیاتی مسائل اٹھانے کی کوششوں پر نیم دلانہ رویہ حیران کُن نہیں تھا۔

حکومتی پالیسیاں

بجٹ

نئی حکومت کے لئے ماحولیات کوئی ترجیحی مسئلہ نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے دور کا آغاز ہی ماحولیاتی تبدیلی کے منصوبوں کے بجٹ میں کٹوتیوں سے کیا۔Climate Change Division کے بجٹ میں 13-2012ء کے لئے تیرہ کروڑ پچاس لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی لیکن 14-2013ء کے بجٹ میں اس میں کمی کر کے پانچ کروڑ نوے لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی۔

ماحولیات کے سرگرم کارکنوں نے اس بجٹ کٹوتی کو مسترد کر دیا اور متنبّہ کیا کہ اس سے زراعت، پانی کی فراہمی اور جنگلات پر برے اثرات مرتب ہوں گے۔انہوں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ پاکستان بیرون ملک ماحولیات کی انجمنوں کی حمایت کھودے گا اور ان سے ملنے والے فنڈز سے محروم ہوسکتا ہے۔ماحولیات کے گروپوں کے اندازوں کے مطابق پاکستان کے ادارہ تحفظ ماحولیات (PEPA) کے چالو منصوبہ جات کو مکمل کرنے کیلئے بیس کروڑ روپے کی رقم درکار ہوگی۔

موسمی تغیّر کی قومی پالیسی

فروری میں موسمی تغیّر کی وزارت نے موسمی تغیّر کی تفصیلی قومی پالیسی جاری کی جس میں پاکستان کو درپیش یا آئندہ پیش آنے والے ماحولیاتی مسائل کا لائحہ عمل پیش کیا گیا۔UNDP کی مدد اور پاکستان پلاننگ کمیشن کی تبدیلیِ ماحول ٹاسک فورس،صوبائی اور وفاقی اداروں اور سول سوسایٹی کی انجمنوں سے وسیع

بکھرا ہوا زہر آلود کچرہ، انسانی زندگیوں کے لیے خطرہ

مشاورت کے بعد یہ پالیسی مرتب کی گئی۔ پالیسی کا مقصود یہ بتایا گیا کہ تبدیلیٔ ماحول کو معاشی اور سماجی طور کمزور طبقوں کو مضبوط کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس لئے کہ موسمی تغیر کو سمجھ کر زراعت اور دوسرے شعبوں کو ترقی دی جاسکتی ہے۔

پالیسی میں عالمی سطح پر درجہ حرارت میں ہونے والے اضافے کے اثرات کو کم کرنے اور توانائی، نقل وحمل اور زراعت کو ماحول دوست بنانے کے لئے 120 اقدامات تجویز کئے جو پاکستان کو کرنے چاہئیں تھے۔ ان میں سیلاب سے قبل از وقت خبردار کرنے والے سسٹم کی تنصیب، بارش کے پانی سے فائدہ اٹھانے کے طریقے، متبادل فصلوں کی نئی اقسام، توانائی کو دوبارہ استعمال میں لانے کے طریقے اور کم خرچ پبلک ٹرانسپورٹ کی تجاویز شامل ہیں۔

ماحولیات کے کارکنوں اور ماہرین نے پالیسی کو سند قبولیت بخشنے پر خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ طریقہ کار اور بروقت نفاذ کے پروگرام کی عدم دستیابی پر تحفظات کا اظہار بھی کیا۔ پالیسی کے نفاذ کے لئے مطلوبہ فنڈز کے نہ ہونے اور صوبوں میں اہلیت اور مہارت کی عدم موجودگی پر بھی خدشات کا اظہار کیا گیا۔

بیرونی امداد سے چلنے والے ناکام منصوبے

حکومتی بے دلی کے سبب موسمی تغیر کی پالیسی کا نفاذ ممکن نہیں تھا اور اس کا اظہار غیر ملکی فنڈز سے چلنے والے ماحولیاتی تحفظ کے منصوبوں کی ناکامی سے ہوا یہ نا اہلی Climate Change Division کی

تھی۔ 2008ء میں 21 لاکھ ڈالر کا نیشنل اینوائرمنٹل انفارمیشن مینجمنٹ سسٹم یو این ڈی پی کے تعاون سے شروع کیا گیا۔ اس پانچ سالہ منصوبے کے لئے رقم ہالینڈ کی حکومت نے مہیا کی تھی اور اس کا مقصد پاکستان میں ماحولیات سے متعلق ڈیٹا اکٹھا کرنا تھا جسے بعد میں پالیسی سازی کے لئے استعمال کیا جانا تھا۔ بہرحال یہ منصوبہ شروع ہوتے ہی ٹھپ ہو گیا اور اس میں استعمال ہونے والی مشینری پانچ برسوں تک گوداموں میں ہی پڑی رہی۔ چونکہ اس منصوبے کے لئے موجود ٹیکنیکل عملہ کو مطلوبہ معیار کے مطابق تربیت نہ دی جا سکی اس لئے آخر کار نومبر 2013ء میں یہ منصوبہ ہی ختم کر دیا گیا۔

اسی طرح حکومت جاپان کے تعاون سے چلنے والا ایک ارب بیس کروڑ روپے کا Environment Monitoring سسٹم (EMS) فنڈز کی کمی کے سبب بند کر دیا گیا۔ یہ منصوبہ پاکستان اینوائرمنٹ پروٹیکشن ایجنسی کی طرف سے شروع کیا گیا تھا جس کو متعدد رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ اس کے تربیت یافتہ ماہرین کو سال بھر تک تنخواہیں بھی نہ مل سکیں۔

قوانین میں اصلاح کی ضرورت

متعدد رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک ماحولیات کے ماہرین اور معاونین کو یقین ہے کہ نہ صرف پاکستان میں ماحولیات سے متعلق نافذ قانون بلکہ اس کی ذیلی شقیں بھی اسکے جواز کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام آباد کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے اسلام آباد وائلڈ لائف آرڈیننس مجریہ 1979ء میں کہا گیا ہے کہ نباتات اور حیوانات کے اصلی حالت میں تحفظ کے لئے وفاقی حکومت سرکاری گزٹ کے ذریعے کوئی بھی علاقہ نیشنل پارک قرار دے سکتی ہے۔ اس میں مزید کہا گیا کہ تعلیم، تحقیق اور تفریح کے لئے نیشنل پارک تک عوام کی رسائی ہونی چاہئے۔ آرڈیننس میں نیشنل پارک میں سڑکوں کی فراہمی، ریسٹ ہاؤس کی تعمیر اور دیگر ضروریات زندگی کی فراہمی کا کہا گیا ہے۔

Pak-EPA کے حکام نے اعتراض کیا کہ نیشنل پارک کا مقصد تو ماحولیات کا تحفظ اور تحقیق تک محدود ہے تو پھر اس میں تفریح کو ترجیح کیوں دی گئی۔ انہوں تشویش کا اظہار کیا کہ قانونی طور پر نیشنل پارک میں کی گئی تعمیر سے نیشنل پارک کو نقصان ہوگا اور اس سے نہ صرف یہ کہ اس مقصد کو نقصان پہنچے گا بلکہ تحفظ کے لئے کی جانے والی کوشش بھی بیکار محض ثابت ہوگی۔

اس آرڈیننس کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ماحولیات کے ماہرین نے ماحولیات سے متعلق قوانین میں اشد ضروری ترامیم کی ضرورت کو اجاگر کیا اور کہا کہ جنگلی حیات، جانوروں کی قدرتی پناہ گاہوں کے تحفظ اور بچاؤ کے لئے سخت قانون سازی کی ضرورت ہے۔

پنجاب کی تحفظ ماحول کونسل

صوبائی سطح پر اینوائرمنٹ پروٹیکشن ایکٹ مجریہ 1997ء کے نفاذ کے لئے کچھ کوششیں کی گئیں۔ ماحول کے تحفظ کے لئے پنجاب میں چیف منسٹر کی چیئر مین شپ اور صوبائی وزیر ماحولیات کی وائس چیئر مین شپ میں EPA کی مقرر کردہ Enviornment Protection Council قائم کی گئی۔ 35 ارکان پر مشتمل کونسل کا کام ماحولیات سے متعلق پالیسیوں کو مربوط کرنا اوران کے نفاذ کو یقینی بنانا ہے۔

سندھ میں ماحولیات کا ٹریبونل

سندھ میں ماحولیات سے متعلق شکایات سننے والا سندھ ماحولیات ٹریبونل سال بھر بیکار رہا۔ ماحولیات کے تحفظ، بچاؤ، بحالی اور بہتری کے لئے آلودگی کے خاتمے اور مستقل طور پر اس کی بہتری کی غرض سے پاکستان اینوائرمنٹ ایکٹ مجریہ 1997ء کے مطابق اینوائرمنٹ پروٹیکشن ٹریبونلز کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ٹریبونل ایک چیئر پرسن اور دو ارکان پر مشتمل تھا۔ چیئر پرسن کی اسامی تو جیسے تیسے تاخیر کے بعد پر کر دی گئی مگر ممبران کی اسامیاں ہنوز خالی ہیں۔

EPA خیبر پختونخوا

سب سے مایوس کن منظر خیبر پختونخواہ میں دیکھنے کو ملا جہاں ایجنسی برائے تحفظ ماحول (EPA) کو دوسرے صوبوں کے مقابلے میں سٹاف اور دیگر ذرائع کی شدید کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ خیبر پختونخواہ میں 73 افراد پر مشتمل عملہ ہے جو ڈیرہ اسمٰعیل خان، ہزارہ اور مالاکنڈ ڈویژنوں میں بٹا ہوا ہے۔ EPA صرف 55 لوگوں کے ساتھ کام کر رہی ہے جبکہ 18 اسامیاں خالی پڑی ہیں۔ اس کے مقابلے میں پنجاب میں EPA کا سٹاف 700 اراکین پر مشتمل ہے جو صوبے بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح سندھ EPA بھی 106 لوگوں کے عملہ پر مشتمل ہے جس کا مین آفس کراچی میں اور ڈویژنل آفس سکھر اور حیدر آباد میں ہیں جبکہ ضلعی سطح پر پھیلاؤ جاری ہے۔ بلوچستان میں EPA سٹاف کی تعداد 509 ہے اور اس کے 21 اضلاع میں دفاتر قائم کئے گئے ہیں۔

خیبر پختونخوا کی EPA کو نگرانی، آگاہی اور عمل درآمد کے لئے بھی وسائل کی کمی کا سامنا ہے۔ خیبر پختونخوا کی EPA کا بجٹ دو کروڑ چوبیس لاکھ پچاس ہزار روپے ہے جبکہ سالانہ ترقیاتی پروگرام کے لئے پانچ کروڑ اناسی لاکھ نوے ہزار روپے مختص کئے گئے دوسرے صوبوں کے بجٹوں کے مقابلے میں یہ رقم بہت کم ہے۔

اطلاعات کے مطابق پنجاب EPA کا بجٹ 59.20 ملین روپے تھا جبکہ سالانہ ترقیاتی پروگرام کے لئے 350 ملین روپے رکھے گئے تھے۔ سندھ کی EPA کے لئے 109 ملین روپے رکھے گئے اور سالانہ

ترقیاتی پروگرام کے لئے 199.5 ملین روپے مختص کئے گئے۔ اسی طرح بلوچستان کی EPA کا معمول کا بجٹ 131.7 ملین روپے تھا۔

خیبر پختونخوا کی چراگاہ پالیسی

2013ء میں خیبر پختونخوا EPA کے لئے سٹاف اور وسائل کی کمی کے باوجود خوشی کا ایک پہلو ضرور تھا وہ یہ کہ جنوری میں خیبر پختونخوا حکومت نے صوبے کی اولین چراگاہ پالیسی کی نقاب کشائی کی جو پاکستان فاریسٹ انسٹیٹیوٹ نے تیار کی۔ اس پالیسی کا مقصد خیبر پختونخوا کی چراگاہوں کی پیداواری صلاحیتوں کو بڑھانا اور اجڑی ہوئی چراگاہوں کو آباد کرنا ہے۔ یہ پالیسی حیاتی تنوع کو بہتر بنانے، موسمی تغیر، عالمی حرارت میں اضافہ اور زمین کو صحرا میں تبدیل ہونے سے روکنے کے لئے اہم کردار ادا کرنے کی کوشش ہے۔

فضائی آلودگی

دل کی بیماریوں اور فضائی آلودگی کا باہمی تعلق معلوم ہو جانے کے بعد سائنس دانوں کا خیال ہے کہ گھر کے باہر فضائی آلودگی سے ان لوگوں کے پاگل پن میں اضافہ ہوسکتا ہے جن کی گھٹی میں یہ عارضہ چلا آ رہا ہو۔

اطلاعات کے مطابق ہر سال عالمی سطح پر 20 لاکھ اموات انسانی سرگرمیوں سے پیدا ہونے والی فضائی آلودگی کے نتیجے میں براہ راست واقع ہوتی ہیں۔ پاکستان میں دھول اور دھوئیں کے ذرات کی خوفناک حد تک موجودگی عالمی اوسط سے دگنی اور ترقی یافتہ ممالک کی اوسط سے پانچ گنا زیادہ ہے۔

پاکستان میں فضائی آلودگی کی سب سے بڑی وجوہات میں پاور پلانٹوں میں جلایا جانے والا قدرتی ایندھن اور گاڑیوں سے نکلنے والا دھواں ہیں جو ملک میں 90 فیصد آلودگی پھیلاتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ زمین کی وسیع بربادی، ماحولیاتی تحفظ کی پالیسیوں کی کمی، صنعتی آلودگی میں بے مہار اضافہ اور توانائی پیدا کرنے کے لئے کوئلے کی استعمال سے یہ مسئلہ زیادہ سنگینہو گیا ہے۔

ٹو سٹروک رکشے

ٹو سٹروک رکشا خاص طور پر لاہور میں درد سر بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان تحفظ ماحول کی ایجنسی (EPA-Pak) کی تحقیق کے مطابق ایک ٹو سٹروک رکشا فور سٹروک رکشا کے مقابلے میں دوگنا زیادہ کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتا ہے اور 37 گنا زیادہ ہائیڈروکاربن خارج کرتا ہے اور اس طرح فضائی آلودگی کا بڑا سبب بنتا ہے۔ صرف لاہور میں ہزاروں ٹو سٹروک رکشے غیر قانونی طور پر سڑکوں پر دندنا رہے ہیں۔ 2005ء میں لاہور ہائی کورٹ نے حکومت کو تمام ٹو سٹروک رکشے 2007ء تک لاہور کی سڑکوں سے

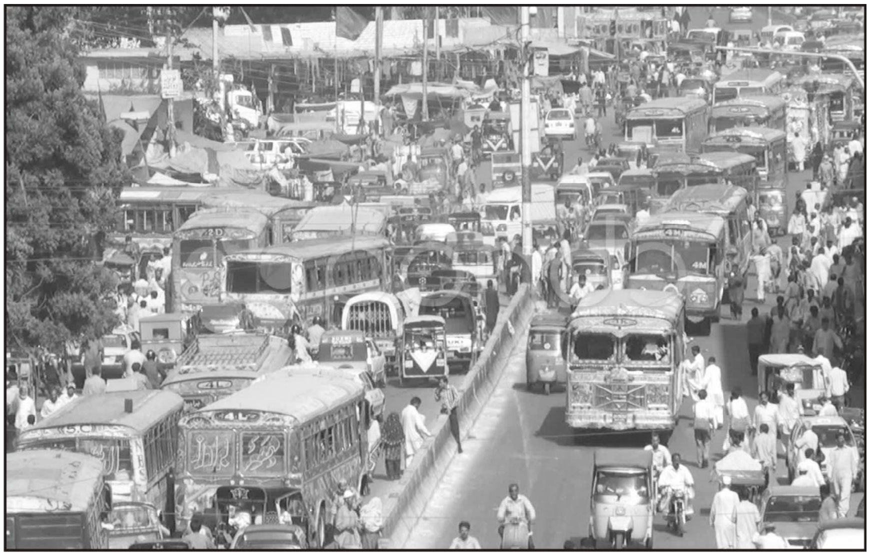

گاڑیوں کے دھوئیں نے آلودگی میں بہت زیادہ اضافہ کیا

ہٹانے کا حکم صادر کیا تھا۔ اسی سال حکومت نے چیف منسٹر کی گرین پنجاب سکیم کا آغاز کر کے فور سٹروک سی۔این۔جی رکشاؤں کی خریداری کے لئے سبسڈی دینے کا آغاز کیا۔

ٹو سٹروک رکشاؤں کو فور سٹروک رکشاؤں میں تبدیل کرنے کی غیر مستقل کوششیں زیادہ تر بے ثمر رہیں۔ اپریل 2013ء میں پنجاب EPA نے لاہور ٹرانسپورٹ کمپنی (LTC) اور شہری ٹریفک پولیس کی مدد سے ٹو سٹروک رکشاؤں کے خلاف ایک اور مہم چلائی مگر LTC ممبران کے باہمی اختلافات، انسپکٹروں اور متبادل ذرائع کی کمی اور ٹو سٹروک رکشاؤں پر بندش کے نفاذ میں سست روی کی وجہ سے یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا۔ ٹو سٹروک رکشا ڈرائیوروں کو متبادل روزگار کی عدم فراہمی بھی اس کی ایک وجہ بنی۔

لاہور میں فضائی آلودگی کی ایک اور بڑی وجہ شہر کی 200 سے زائد فیکٹریاں بالخصوص کپڑے اور کاغذ کے کارخانوں کی بھٹیوں میں توانائی کے حصول کے لئے گیس اور فرنس آئل کی جگہ چاول کی بھوسی، مکئی کے تکے اور سرسوں کے ڈنٹھلوں کا جلایا جانا ہے۔ اس ایندھن کے جلانے سے فضا میں راکھ اور دھول کے ذرات کا اخراج بڑھ جاتا ہے جو ان کارخانوں کے محنت کشوں اور قرب و جوار کے رہائشیوں میں سانس کی بیماریوں کا باعث بنتا ہے۔

اسلام آباد میں گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ فضائی آلودگی کی سب سے بڑی وجہ بنی۔ اسلام آباد کی شہری انتظامیہ کے مطابق 2008ء سے 2013ء تک رجسٹرشدہ گاڑیوں کی تعداد میں 100 فیصد اضافہ ہوا۔ نجی گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ کا سبب آبادی میں اضافہ، کاروں کے لئے قرض کی فراہمی اور ناکافی پبلک ٹرانسپورٹ ہیں۔

صاف ایندھن کا حصول ایک انتہائی مشکل مرحلہ

اسلام آباد کے صنعتی علاقوں میں واقع سٹیل اور ماربل کے کارخانوں سے خارج ہونے والا دھواں فضا میں آلودگی اور دھندلاہٹ کی بڑی وجہ ہے۔ دونوں جڑواں شہروں میں اس طرح کے کارخانے لگائے گئے جو ہوا میں زہریلے مرغولے چھوڑتے رہتے ہیں جس سے علاقے میں عمومی طور پر آلودگی بڑھ جاتی ہے۔ صنعتی علاقوں کے قرب و جوار میں رہنے والے سینے کی جکڑن اور دمہ کی بسا اوقات شکائت کرتے رہتے ہیں جو ان علاقوں میں فضائی آلودگی سے منسلک ہے۔ جڑواں شہروں میں سٹیل ملوں کے گیس کی بجائے کوئلے کے ذریعے توانائی کے حصول کی وجہ سے آلودگی کی سطح میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

آلودگی کی بلند ہوتی ہوئی سطح کا مقابلہ کرنے اور ماحول کے تحفظ کے لئے سندھ ہائی کورٹ نے صوبہ سندھ کے محکمہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کے گاڑیاں رجسٹر کرنے والے ونگ اور پولیس حکام کو دھواں چھوڑنے والی پبلک ٹرانسپورٹ کی گاڑیوں کے خلاف ایکشن لینے کی ہدایت کی۔ اس حکم کے لئے غیر منفعت پر مبنی ایک انجمن نے دھواں چھوڑنے والے رکشاؤں اور ٹیکسیوں کے فٹنس سٹرفکیٹ منسوخ کرنے کے لئے متعلقہ محکموں کو ہدایت کرنے کے لئے عدالت میں رٹ دائر کی۔

پاکستان کے دیگر بڑے شہر بھی فضائی آلودگی سے بری طرح متاثر ہوئے۔ عالمی ادارہ صحت کے جمع کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق کوئٹہ، پشاور اور لاہور کا شمار دنیا بھر میں آلودگی سے شدید طور پر متاثرہ دس شہروں میں ہوتا ہے۔

ردی (Disposable) پلاسٹک

ردی (Disposable) پلاسٹک بالخصوص پلاسٹک کے لفافے دنیا بھر میں ماحولیاتی آلودگی کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ یہ پلاسٹک بالعموم مکمل طور پر تلف نہیں ہوتا اور جب جلایا جائے تو اس سے خارج

رڈی پلاسٹک آلودگی کا ایک بڑا ذریعہ

ہونے والا زہریلا دھواں جنگلی حیات کے لئے خطرناک ہوتا ہے اور آلودگی پھیلانے کا سبب بنتا ہے۔

پاکستان میں 8000 ادارے پلاسٹک کے لفافے بنا رہے ہیں۔ صرف اسلام آباد میں سالانہ 35 کروڑ پلاسٹک کے لفافے استعمال ہوتے ہیں۔ قومی سطح پر یہ تعداد 55 ارب لفافے بنتی ہے۔

فروری میں موسمی تغّیر کی وزارت نے تلف نہ ہو سکنے والے پلاسٹک کی درآمد، تیاری، ذخیرہ اندوزی، تجارت، تقسیم کاری، اور فروخت پر پابندی کے لئے قوانین متعارف کرائے۔ The Prohibition on Non-degradable Plastic Products (Manfacture, Sale and usage) نامی قانون نے پولیتھین، پولی پروپلین یا پولی سٹائرین سے مکمل یا جزوی طور پر بننے والے پلاسٹک کے تمام لفافوں/تھیلوں کی تیاری کو غیر قانونی قرار دیا جب تک وہ قابل تلفی نہیں ہو جاتے۔ اس قانون پر اپریل 2013ء سے عمل درآمد شروع ہونا تھا۔

ماضی میں بھی اس طرح کے قوانین صوبائی اور وفاقی سطح پر روشناس کروائے گئے۔ حکومت پنجاب نے پولیتھین کے لفافوں کی تیاری 2002ء سے بند کرا دی تھی۔ پنجاب کے Punjab Prohibition on Manufacture, Sale, Use and Import of Polythene Bags (Black or any other polythene Bag Below Fifteen Micron Thickness) کی خلاف ورزی کرنے والے کے لئے 50,000 روپے جرمانہ اور تین ماہ قید کی سزا تجویز کی۔

کسی وجہ سے یہ آرڈیننس لاگو نہ ہو سکا اور 2005ء میں لاہور ہائی کورٹ نے پنجاب حکومت کو حکم دیا کہ صوبے میں پلاسٹک تھیلوں کا استعمال روکنے کے لئے قانون نافذ کرے۔

پلاسٹک کا کباڑ

جنوری سے اگست تک پاکستان میں 18200ٹن پلاسٹک کچرا درآمد کیا گیا جس میں سے 95 فیصد کچرا لاہور ڈرائی پورٹ سے چھڑایا گیا۔ پچھلے دو سالوں میں 92,000 ٹن پلاسٹک کباڑ یورپ اور مشرق وسطیٰ سے لا کر پاکستان میں پھینکا گیا۔ محکمہ کسٹمز کے اعداد و شمار کے مطابق 49 فیصد کباڑ اگست 2013ء میں یو کے، جرمنی اور ہالینڈ سمیت یورپی یونین کے ممالک سے درآمد کیا گیا۔ ان ممالک نے Basel Convention کے مطابق The Control of Transboundary Movements of Hazardous Wastes and Their Disposal پر عمل درآمد کے لیے Basel Convention کی توثیق کی تھی جس میں انہیں پابند کیا گیا تھا کہ وہ خطرناک مواد پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک کو برآمد نہیں کریں گے کیونکہ ان ممالک میں اس پلاسٹک کے کچرے جیسے ماحول دشمن موادکوری سائیکل کرنے کی سہولیات اور سسٹم دستیاب نہیں۔

پانی کی قلت اور آبی آلودگی

پانی کی قلت اور آلودگی عالمی ماحولیات کے لئے دو اہم مسئلے ہیں۔ پاکستان میں بدقسمتی سے یہ دونوں مسائل خطرناک حد تک پہنچ چکے ہیں۔

اپریل 2010ء میں جاری ہونے والی ایشین ڈویلپمنٹ بینک کی رپورٹ کے مطابق پاکستان دنیا میں پانی کی قلت کے شکار ممالک میں سے ایک ہے۔ وہ دن دور نہیں جب پاکستان پانی کی نایابی والے ممالک کی صف میں کھڑا ہوگا جہاں ایک فرد کے لئے سال بھر میں 1000 کیوبک میٹر سے بھی کم پانی دستیاب ہوتا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ ملک میں 30 دن کا پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش رہ گئی ہے جبکہ اس طرح کی آب و ہوا والے ممالک میں 1000 دن کے لئے درکار پانی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت موجود ہونی چاہئے۔ وائلڈ لائف فنڈ (WWF) پاکستان کے مطابق 2025ء میں پاکستان کو اپنی ضروریات سے 33 فیصد کم پانی دستیاب ہوگا۔ وائلڈ لائف فنڈ نے توجہ دلائی کہ کس طرح آبادی میں اضافے، منصوبہ بندی کے بغیر شہری آبادی میں اضافے، حکومت کی نافذ کردہ غیر دانشمندانہ پالیسیاں، قانون کی عملداری میں سستی اور ڈھلمل طرز حکومت نے زیر زمین پانی کی مقدار اور معیار کو بھاری نقصان پہنچایا۔ یہ اعداد و شمار اس لئے زیادہ پریشان کن ہیں کیونکہ پاکستان میں پانی کے وسائل بہت زیادہ ہیں اور مون سون بارشوں کی بہتات ہے۔

سالہا سال سے لوگ سیلابوں کے باعث مرتے چلے آرہے ہیں پھر بھی ہر سال سمندر میں گرنے

صاف پانی کا حصول بہت سے لوگوں کے لیے محض ایک خواب ہی رہا

والے پانی کو ذخیرہ کرنے کے لئے صرف چند آبی ذخائر موجود ہیں۔ ماحولیات کے ماہرین کی رو سے آبی ذخائر نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان سالانہ 40 ملین ایکڑ فٹ پانی سمندر میں بہا دیتا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو پینے کے صاف پانی تک رسائی نہیں اور کسانوں کو آبپاشی کے لئے بھی پانی کی قلت کا سامنا رہتا ہے۔

بہت سا دستیاب پانی آلودہ ہے اور انسانی استعمال کے لئے مناسب نہیں۔ 60 فیصد بچوں کی اموات پانی کے سبب پیدا ہونے والی بیماریوں کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق ملک میں ہونے والی 40 فیصد اموات پانی سے منسلک بیماریوں کے سبب واقع ہوتی ہیں۔

اگست میں حکومت نے قومی اسمبلی کو مطلع کیا کہ ملک بھر سے اکٹھے کئے گئے پانی کے نمونوں میں سے 80 فیصد کا پانی پینے کے لئے مضر ہے۔ صوبائی حکومتوں سے کہا گیا کہ پانی کی بڑھتی ہوئی آلودگی روکنے کے لئے اقدامات کریں۔

2013ء میں پانی کی آلودگی کا خطرناک مسئلہ بڑی حد تک نظر انداز کیا گیا۔ سندھ میں صاف پانی کی کینجھر جھیل میں کوٹڑی اور نوری آباد کے صنعتی زونوں کا فضلہ ٹریٹمنٹ کے بغیر جھیل کے پانی میں شامل ہو کر آلودگی پھیلاتا رہا۔ یہ جھیل کراچی، ٹھٹھہ، حیدرآباد اور کوٹڑی کے ڈھائی کروڑ لوگوں کو پینے کا پانی فراہم کرتی ہے۔

حکومت سندھ نے سندھ ہائی کورٹ کے حکم پر چھیاسٹھ کروڑ ستر لاکھ روپے کی لاگت سے کوٹڑی سائٹ پر فضلے کی ٹریٹمنٹ کا پلانٹ لگایا۔ یہ پلانٹ دسمبر 2012ء میں چالو ہو جانا تھا مگر سندھ ہائی کورٹ کے

حکم کے بعد تین سال گذرنے کے باوجود مختلف وجوہات کی بنا پر یہ پلانٹ 2013ء کے اختتام تک مکمل نہیں ہو سکا۔

دوسرے صوبوں میں بھی پانی کی آلودگی کی صورت حال مایوس کن رہی۔ تحفظ ماحولیات ڈویژن (EPD) کے سروے کے مطابق لاہور کے 392 میں سے 253 ٹیوب ویلوں سے نکلنے والے پانی میں زہریلے مادوں کی آمیزش پائی گئی۔ EPD نے مزید مطلع کیا کہ شہر میں رہنے والے 65 فیصد لوگ یہ آلودہ پانی استعمال کر رہے ہیں۔

آبی آلودگی کی ایک بڑی وجہ لاہور کے نواح میں محمود بوٹی کی وہ زمینیں ہیں جہاں کچرا پھینکا جاتا ہے۔ یہ زمینیں سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کی ملکیت ہیں جہاں کچرے میں بارشی پانی کو جذب ہونے سے بچانے کے لئے مٹی کی تہہ اچھی طرح نہیں جمائی جاتی۔ جس کے نتیجے میں کچرے پر پڑنے والا بارشی پانی زیرزمین پانی میں شامل ہو کر اسے بھی آلودہ کر دیتا ہے۔

دریائے راوی میں بڑھتی ہوئی آلودگی پنجاب میں ماحولیات کا ایک بڑا مسئلہ بن کر ابھری۔ حکومت نے ہڈیارہ ڈرین سمیت راوی میں گرنے والے تمام نالوں پر واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ لگانے کا منصوبہ بنایا۔ تحفظ ماحولیات کے صوبائی وزیر نے تسلیم کیا کہ دریائے راوی کو گندے پانی کا ذخیرہ بنا دیا گیا تھا اس منصوبے سے راوی ماحولیاتی آلودگی سے پاک ہو جائے گا۔

اسلام آباد میں کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (CDA) کے واٹر سپلائی ڈائریکٹوریٹ کی سنٹرل انجینئرنگ لیبارٹری کے کوالٹی کنٹرول سیل کے اشتراک سے کئے گئے سروے کے مطابق 37 میں سے 25 فلٹریشن پلانٹوں پر مہیا کیا جانے والا پانی مضرِ صحت تھا، نو پلانٹ ناکارہ پائے گئے اور صرف ایک پلانٹ صاف پانی مہیا کر رہا تھا۔

وہ لوگ جو مہنگے منرل واٹر کی عیاشی کے متحمل ہو سکتے ہیں وہ بھی آلودہ پانی کی لعنت سے بچ نہیں پا رہے۔ پاکستان کونسل فار ریسرچ برائے واٹر ریسورسز (PCRWR) کی جاری کردہ سہ ماہی رپورٹ کے مطابق ملک میں دستیاب منرل واٹر کے 27 مشہور برانڈوں کا پانی زہریلے مادوں سے آلودہ پایا گیا۔

جنگلات کی تیزی سے ہوتی بربادی

سرکاری تخمینوں کے مطابق پاکستان میں کل زمین کا 4.5 فیصد حصہ جنگلات کے لئے مختص ہے۔ اقوام متحدہ کے فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن (FAO) کے مطابق پاکستان کا 2.1 فیصد علاقہ جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے جو کم ترین شرح ہے۔ یہ شرح نہ صرف علاقے بلکہ دنیا بھر میں کم ترین شرح ہے۔ مثال کے طور پر انڈیا کا 23.1 فیصد علاقہ جنگلات سے اٹا ہوا ہے اور بنگلہ دیش میں جنگلات کل زمین کے 11.1 فیصد حصے پر

پابندی کے باوجود جنگلات کی کٹائی جاری رہی

ہیں۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس کے اندازے کے مطابق پاکستان میں بچ جانے والے زیادہ تر جنگلات اگلی تین چار دہائیوں میں معدوم ہو جائیں گے۔

اس امر کے باوجود کہ جنگلات حیاتی تنوع کو محفوظ رکھنے میں مدد کرتے ہیں اور موسمی تغیرات کا مقابلہ کرتے ہیں اور لوگوں کی معاشی معاونت کرتے ہیں، آزادی سے آج تک پاکستان اپنے جنگلات کو محفوظ رکھنے کے معاملے میں لاپرواہی برتتا چلا آرہا ہے۔ اس طرح خطرناک شرح سے پاکستان کے جنگلات گھٹتے رہے۔ جنگلات کے زیر تسلط علاقہ میں کمی کی وجوہات میں ذاتی اغراض کے لئے جنگلات کی بے دریغ کٹائی، آگاہی کی کمی، مقامی شاملات کا حق ملکیت، طاقتور افراد کا ٹمبر مافیا کی سرپرستی کرنا اور جنگلات کی جامع پالیسی کا نہ ہونا شامل ہیں۔ 2013ء میں بااثر گروپوں اور ٹمبر مافیا کے خلاف ماحولیات کے حامیوں کی چند اہم کامیابیوں کے علاوہ گزشتہ سالوں کی بھیڑ چال جاری رہی۔ 1952ء میں ہونے والے حکومت پاکستان کے معاہدے کے مطابق مقامی آبادیوں کو دیامیر کے جنگلات کی شاملات میں حق ملکیت دیا گیا۔ بہرحال جنگلات کا نظم ونسق وزیراعظم کی سربراہی میں گلگت بلتستان کونسل چلاتی ہے۔ 15 مارچ 2013ء کو اپنی میعاد پوری ہونے سے صرف ایک دن قبل رخصت ہونے والے وزیراعظم نے ایک پالیسی جاری کر کے گلگت بلتستان کے علاقے دیامیر سے قانونی اور غیر قانونی طور پر کٹنے والی لکڑی کو علاقے سے نکالنے کی اجازت دے دی۔ 20 لاکھ کیوبک فٹ قانونی طور پر کاٹی گئی اور 19 لاکھ کیوبک فٹ غیر قانونی طور پر کاٹی گئی لکڑی مقامی لوگوں کے مطابق سڑ رہی تھی اس لیے حکومت نے جرمانہ کی ادائیگی کے بعد تمام کی تمام لکڑی کے سودے کر دیئے۔

1993ء سے جاری جنگلات کی کٹائی کو روکنے اور لکڑی کو گلگت بلتستان سے باہر لے جانے پر عائد پابندی کو ختم کرنے کی پالیسی کی ماحولیات کے حامیوں اور مقامی لوگوں نے بہت مذمت کی۔ ماحولیات کے سرگرم کارکنوں کا دعوی ہے کہ اس پالیسی نے ٹمبر مافیا کو چھوٹے درخت غیر قانونی طور پر کاٹنے کی کھلی چھٹی دے دی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ٹمبر مافیا چھوٹے درخت غیر قانونی طور پر کاٹ کر پرانے درختوں کی آڑ میں ملک کے زیریں علاقوں میں لے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دیامیر میں جنگلات کی وسیع کٹائی سے یہ علاقہ درختوں سے محروم ہو جائے گا۔ مقامی کارکنوں نے دعویٰ کیا کہ فروری سے جولائی 2013ء تک دیامیر کی تھور اور ٹیو گہ کی وادیوں میں کم از کم دو لاکھ درخت کاٹے گئے۔

وفاقی حکومت نے عام انتخابات کے بعد انتظام سنبھالا اور 5 جولائی کا متنازعہ حکم واپس لے لیا۔ یہ جنگلات کے تحفظ کے حامیوں کی ٹمبر مافیا کے خلاف بڑی نادر فتح تھی۔

درختوں کی کٹائی کو پھر بھی روکا نہ جا سکا۔ خیبر پختونخوا کی حکومت نے ہزارہ کے جنگلات کو کٹائی سے بچانے کے لیے درخت کاٹنے پر پابندی لگا دی۔ آرا مشینوں کو ممنوع قرار دے دیا اور لکڑی کی نقل و حرکت کے پرمٹ جاری کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ اس کے باوجود علاقے میں درختوں کی کٹائی جاری رہی اور مقامی حکومت اور پولیس افسران کی پشت پناہی پر ٹمبر مافیا پابندیوں کا منہ چڑاتا رہا۔

طاقتور مفاد پرستوں کی ساز باز کے علاوہ اس حکم پر موثر طور پر درآمد کی راہ میں رکاوٹ بجٹ میں مہیا کئے گئے ناکافی مالی وسائل بھی تھے۔ خیبر پختونخوا کے 14-2013ء کے بجٹ میں 32 جاری اور 14 نئی (کل 46) سکیموں کے لیے چھپن کروڑ چورانوے لاکھ انسٹھ ہزار روپے مختص کئے گئے۔ ان سکیموں میں جنگلی ذخیروں کی نگرانی، وسیع پیمانے پر درخت لگانے، پانی کے بہتر ذرائع، چراگاہوں کی ترقی اور غربت میں کمی کے لیے گردشی گلہ بانی شامل ہے۔ ماہرین کے مطابق بجٹ کی رقم جنگلات کی کمی کا موثر طور پر مقابلہ کرنے کے لیے نہایت کم ہے۔

بلوچستان میں زیارت کے مقام پر 247000 ایکڑ پر پھیلا دنیا کا سب سے بڑا قدیم جونیپر جنگل بھی ٹمبر مافیا کے ہاتھوں سے نہ بچ سکا۔ ماس کے علاوہ مقامی لوگوں کا گھریلو استعمال کے لئے لکڑی کاٹنے کا عمل بھی جاری رہا۔ یونیسکو کی بین الاقوامی رابطہ کونسل برائے انسان اور حیاتی کرۂ زمین (انٹرنیشنل کوآرڈی نیشن کونسل فار دی مین اینڈ دی بائیوسفیئر (International Coordinating Council (ICC) of the Man and the Biosphere (MAB) نے زیارت کے جھاڑیوں کے جنگل کو حیاتی کرۂ زمین قرار دیا۔ ابھی حکومت نے اس کی حفاظت کے لیے موثر اقدامات اٹھانے ہیں۔

مارگلہ پہاڑیوں پر واقع نیشنل پارک میں سے سرنگ کے ذریعے اسلام آباد اور خیبر پختونخوا کے ضلع ہری پور کو ملا کر پاک چین تجارت کے لیے راہداری کا حصہ بنانا حکومت کے پیش نظر ہے۔ ماحولیات کے سرگرم کارکنوں اور سیاسی جماعتوں کے دباؤ پر 25 اکتوبر کو چیف جسٹس نے ازخود نوٹس لے کر مارگلہ پہاڑیوں کے نیشنل پارک کو اصلی حالت میں برقرار رکھنے کے لیے سرنگ کی تعمیر روک دی۔ عدالت کے اس اقدام کا ماحولیات کے متوالوں نے تو خیر مقدم کیا مگر کچھ تاجروں اور کاروباری برادری کے ارکان نے جو علاقے میں تجارتی بہتری کے دعویدار تھے، اس اقدام کو قومی مفاد کے خلاف قرار دیا۔ ایک اور خوش خبری یہ تھی کہ سندھ میں کھاروچن میں جون میں بارہ گھنٹوں میں سندھ کے صوبائی محکمہ جنگلات نے 750,000 درختوں کی قلمیں لگا کر عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ دنیا بھر میں ایک دن میں سب سے زیادہ قلمیں لگانے کا ریکارڈ تھا۔ اس بات کو بھی اجاگر کیا گیا کہ اصل کارنامہ ان قلموں کا پھوٹنا اور ان کی حفاظت کرنا ہوگا۔

پاکستان میں جنگلات کے ضایع شدہ علاقے کو واپس اصلی حالت میں لانے کے بڑے مقابلے میں ان چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کی کچھ خاص وقعت نہیں۔ حکومت اور سول سوسائٹی اور کاروباری برادری کی حمایت یافتہ جامع پالیسی کے بغیر جنگلوں کی روز افزوں کٹائی کے مسائل حل طلب ہی رہیں گے۔

جنگلی حیات کو درپیش خطرات

1970ء کے بعد سے پاکستان میں مہاشیر مچھلی کی ہونے والی تیز تر افزائش اب رک گئی ہے۔ مچھلی کی یہ نسل پنجاب کے دریاؤں میں ناپید ہو چکی ہے۔ پانی سے متعلق اداروں کی اکھاڑ بچھاڑ اور رکاوٹیں، آلودگی، پانی کے رخ کی تبدیلی، قدرتی ٹھکانوں کی تباہی اور بے دریغ شکار ان مچھلیوں کی نسلوں کے بسرعت خاتمے کی بڑی وجوہات ہیں۔ قدرت کے تحفظ کی بین الاقوامی یونین (آئی یو سی این) نے مچھلیوں کی نسلوں کے تحفظ کے حوالے سے معدوم ہوتی ہوئی مچھلی کی اس نسل کو غیر محفوظ قرار دیا تو پاکستان میوزیم آف نیچرل سٹڈی نے آزاد جموں کشمیر میں بہنے والے دریائے پونچھ کو مہاشیر مچھلی کا نیشنل پارک قرار دے دیا۔ یہ عالمی طور پر خطرے میں گھری مچھلیوں کی اس نسل کی پہلی آبی تحفظ گاہ تھی۔

جیسا کہ آبی آلودگی کے باب میں بتایا گیا کہ کینجھر جھیل کی آلودگی ماحولیات کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ سپارکو کے دی انوائرمینٹل مانیٹرنگ اینڈ ماڈلنگ ڈویژن نے کینجھر جھیل میں مون سون کے دوران ہرلو نالے کا پانی جھیل میں گرنے کے بعد اس میں زہریلے مواد کے درجہ بندی کی غرض سے پانی کے معیار کا جائزہ لیا۔ ان کی تحقیق سے پتہ چلا کہ جھیل کا پانی صرف آلودہ ہی نہیں بلکہ پانی میں موجود آبی حیات کے لیے بھی خطرناک ہے۔

اگست میں کراچی کے سمندر میں 100 ٹن کے قریب مچھلیاں جن میں زیادہ تعداد Mullet مچھلی

گوادر کے ساحل پر چمڑے جیسی سخت پشت والا کچھوا جو ہمارے ساحلی علاقوں میں نایاب ہے

کی تھی، مردہ تیرتی پائی گئیں۔ یہ واقع اس وقت پیش آیا جب کراچی کے علاقہ سائیٹ کا انتہائی زہریلا پانی لیاری دریا سے بہتا ہوا سمندر میں گرنے لگا۔

پانی کی آلودگی ملک کے بالائی علاقوں میں بھی مچھلیوں اور آبی حیات کے لیے خطرہ ہے۔ منچھر جھیل جو کبھی مچھیلوں اور پرندوں کی آبادی میں بیش بہا اضافہ کا سبب ہوا کرتی تھی سکڑتے سکڑتے ایک پر چھائیں بن کر رہ گئی ہے۔ جھیل میں گرنے والے زرعی اور صنعتی فضلے سے نہ صرف جنگلی حیات کو خطرہ لاحق ہے بلکہ ہزاروں مچھیروں کو نقل مکانی پر مجبور ہونا پڑا ہے۔

2013ء میں وفاقی حکومت نے پانچ خلیجی ممالک کی اعلیٰ شخصیات کو بین الاقوامی طور پر تحفظ یافتہ پرندے تلور کے شکار کے لئے 33 پرمٹ جاری کیے۔ تلور قومی اور بین الاقوامی طور پر تحفظ یافتہ ہے مگر حکومت کے مطابق پرمٹ خلیج کے شاہی افراد اور شیوخ کو متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، قطر، بحرین اور کویت سے بہتر تعلقات قائم رکھنے کے لیے دیئے گئے۔ بہت سے لوگوں کے مطابق تلور کا گوشت قوت باہ میں اضافہ کرتا ہے۔

تلور کے شکار کے لیے حکومت کی طرف سے پرمٹ جاری کرنا اس بات کا مظہر ہے کہ حکومت اپنی ترجیحات میں جنگلی تحفظ میں کس قدر غیر سنجیدہ ہے۔ طاقت ور اور دولت مند طبقے کو ماحولیات کے تحفظ کی یاد دہانی ہر بار پس پشت ڈال دی جاتی ہے۔

2013ء میں جنگلی حیات کا ایک روشن پہلو اپریل میں گوادر کے گاؤں سر بندر کے قریب دریافت ہونے والا چمڑے جیسی سخت پشت والا زندہ کچھوے کا ملنا تھا۔ ڈبلیو ڈبلیو ایف پاکستان کے مطابق سخت پشت والے کچھوے پاکستان کے ساحلی علاقوں میں بہت نایاب ہیں۔ ماضی میں چند بار یہ مردہ حالت میں پائے گئے تھے۔

موسمی تغیر اور متاثرہ طبقے

آج پاکستان کو موسمی تغیر اور ماحولیاتی تنزل جیسے دو خوفناک مسائل درپیش ہیں۔ یہ موسمی خطرات معاشرے میں سب کے لیے برابر تقسیم نہیں کیے جاسکتے نہ یہ ہر فرد کے لیے ایک جیسے ہیں۔ کم آمدنی والا طبقہ تو بے معنی ہو چکا ہے۔ اس کی ایک مثال پاکستان کی خواتین ہیں جن کو ماحولیاتی شدت کا حد سے زیادہ سامنا رہتا ہے۔

نومبر میں لاہور میں خواتین کے ایک ادارے شرکت گاہ نے موسمی تغیرات اور خواتین کے حوالے سے ایک رپورٹ جاری کی۔ رپورٹ کے مطابق موسمی تغیرات کی بدولت ہونے والی ماحولیاتی تبدیلیوں کا سامنا کرنے کی وجہ سے خواتین پر کام کا بوجھ بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی صحت بھی متاثر ہوئی ہے۔ اب خواتین کو پانی کی تلاش اور ایندھن کے لیے لکڑیاں تلاش کرنے کے لئے زیادہ مسافت طے کرنا پڑتی ہے نتیجتاً کام بڑھنے سے اس کو بال بچوں کی دیکھ بھال اور فرصت کے لمحات کے لیے کم وقت دستیاب ہے۔

یہ معاشرے کے کمزور طبقات ہوتے ہیں جو قحط زدہ علاقوں، خشک سالی، سیلاب اور موسمی تغیر سے شدید متاثرہ علاقوں میں رہنے پر مجبور ہیں جنکا ان پر غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔ شہروں اور دیہاتوں کے غرباء بشمول خواتین اور مقامی گروہ جن کا دارومدار قدرتی ذرائع پر ہوتا ہے، موسمی تغیرات کی زد پر رہتے ہیں۔ انہیں موسمی تغیرات کے برے اثرات بڑی حد تک برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ جب کسی علاقے میں مچھلیوں کی تعداد کم ہوتی ہے تو اس سے مچھیرے نہ صرف متاثر ہوتے ہیں بلکہ انہیں نقل مکانی بھی کرنا پڑتی ہے۔ جب کینجھر جھیل کا پانی زہر آلود ہوا تو یہ غریب لوگ ہی تھے جن کے پاس پانی کا متبادل انتظام نہ ہونے کی وجہ سے

کراچی جہاں پینے کا صاف پانی حاصل کرنے کے لیے سخت مشقت کرنی پڑتی ہے

اذیت جھیلنا پڑی۔

پاکستان میں سماجی فلاحی منصوبوں کی کمی، نقصان کی تلافی کے ڈھانچے کی عدم موجودگی اور عوام کے لیے حکومتی سہارے کا نظام نہ ہونے کی وجہ سے موسمی تغیرات کے برے اثرات کمزور سماجی طبقوں کے لیے دو چند ہو جاتے ہیں۔ صاف ماحول کا حق بنیادی طور پر زندہ رہنے کے حق اور صحت کے حق کے علاوہ دوسرے حقوق سے منسلک ہے جس کا ذکر اس باب کے آغاز میں بھی کیا گیا۔

سفارشات

1۔ سیاستدانوں کو زیادہ سیاسی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پارٹی کے منشوروں میں ماحولیاتی مسائل کے حل کے لیے جامع حکمت عملی کی عکاسی کرنی چاہیے۔ رائے دہندگان کو ماحولیاتی مسئلوں کی طرف زیادہ توجہ مبذول کرنی چاہیے اور مطالبہ کرنا چاہیے کہ سیاستدان اور سیاسی پارٹیاں اپنے وعدے سے ایفاء کریں۔

2۔ ماحولیات کے حوالے سے کام کرنے والے اداروں کو سیاستدانوں اور فیصلہ سازوں سے مل کر تندہی کے ساتھ ماحولیات کے تحفظ اور بچاؤ کے اقدامات اٹھانے پر زور دینا چاہئے تا کہ ماحولیات کی پالیسی کی روشنی میں ان مسائل کا خاتمہ ممکن ہو سکے۔

3۔ ماحولیات سے متعلق محکموں کے صوبائی افسروں کی قابلیت اور اہلیت جانچنے کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں تا کہ ماحولیات کے قانون کا موثر اطلاق ہو اور ماحولیات کے منصوبوں کا جائزہ لیا جا سکے۔

4۔ ماحولیات کو ایک مشترکہ مسئلہ سمجھ کر اسے ترقیاتی اور منصوبہ بندی کے عمل کے ساتھ مربوط کرنا چاہئے اور اسے الگ سے ایک مسئلہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ ماحولیات کے مسائل کے بارے میں آگاہی کے لیے ٹھوس اقدامات کیے جانے چاہئیں بالخصوص نوجوانوں کی آگاہی کے لیے دوسرے مسائل کے ساتھ اسے نصاب میں شامل کرنے کے اقدامات کرنے چاہئیں۔

5۔ غریبوں، خواتین اور دیگر کمزور طبقات پر موسمی تغیر کے غیر معمولی اثرات کا احساس کر کے ان کے بوجھ کو کم کرنے کے اقدامات کرنے چاہئیں۔ موسمی تغیر کے اثرات کے خلاف بنیادی صنفی تفاوت کو دور کرنے کی موثر حکمت عملی اپنانے کی سخت ضرورت ہے۔

مہاجرین

تمام بنی نوع انسان عظمت اور حقوق کے حوالے سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں عقل اور ضمیر ودیعت ہوا ہے اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کے جذبے کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔

[اقوام متحدہ کا عالمی منشور۔ آرٹیکل نمبر 1]

پاکستان لاکھوں بے گھر افراد کا مسکن ہے۔ ان میں مہاجرین اور اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے افراد شامل ہیں۔ اول الذکر میں افغان شہریوں کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہے جو 1979ء سے جاری مختلف تنازعات کے باعث اپنے ملک سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے۔ موخرالذکر گروہ میں زیادہ تر وہ افراد شامل ہیں جو فاٹا میں دہشت گردوں کے خلاف جاری فوجی آپریشنوں اور لاقانونیت کے باعث بے گھر ہوئے۔ 2013ء میں بلوچستان کے ضلع آواران میں آنے والے زلزلے کے باعث متعدد افراد بے گھر ہوئے جبکہ گلگت بلتستان کے علاقے ہنزہ میں عطاء آباد میں لینڈ سلائیڈ کے باعث بے گھر ہونے والے افراد کو چوتھے سال بھی آباد نہ کیا جا سکا۔ بلوچستان کے ضلع ڈیرہ بگٹی اور کوہلو کے رہائشیوں کو اپنے علاقوں میں واپس لوٹنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کراچی کے کچھ علاقوں میں جرائم اور تشدد کے واقعات کے باعث کئی افراد بے گھر ہوئے۔

2013ء کے دوران پاکستان میں مہاجرین کو گزشتہ برسوں کی طرح اس سال بھی چیلنجوں کا سامنا رہا۔ پاکستان اس سال بھی مہاجرین کی میزبانی کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک تھا۔ پاکستان نے 2013ء میں بھی اقوام متحدہ کے 1951ء کے مہاجرین سے متعلق میثاق اور اس میثاق کے 1967ء کے

مسودے پر دستخط نہیں کئے۔ اس کے باوجود پاکستان بین الاقوامی قانون کے تحت مہاجرین کی مدد کرنے کی ایک عام ذمہ داری کو پورا کررہا ہے۔ اور اس اصول پر کاربند ہے جس کے تحت مہاجرین کی ایسے علاقوں میں واپسی پر پابندی ہے جہاں ان کی زندگی یا آزادی کو خطرات لاحق ہوں۔

پاکستان، افغانستان اور اقوام متحدہ کا کمیشن برائے مہاجرین ایک سہ فریقی معاہدے کے فریق تھے جس میں پاکستان میں اندراج شدہ افغان شہریوں کی موجودگی کو باضابطہ بنایا گیا اور ان کی رضا کارانہ طور پر اپنے وطن واپسی کے لیے ایک پروگرام ترتیب دیا گیا۔ اس معاہدے کے تحت افغان مہاجرین کی مکمل واپسی کے لئے کئی مرتبہ حتمی تاریخیں دی گئیں۔ تازہ ترین ڈیڈ لائن جو کہ جون 2013ء میں ختم ہو چکی تھی، میں ایک مرتبہ پھر آخری لمحے میں دسمبر 2015ء تک توسیع کردی گئی۔ مہاجرین کے قیام میں تیس مہینوں تک کی توسیع کو سراہا گیا اور کہا گیا کہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پاکستان کی نئی منتخب حکومت مہاجرین کے ساتھ رحمدلانہ سلوک کرنے کے حوالے سے کتنی پرعزم تھی۔

انسانی حقوق کی تنظیموں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ مہاجرین کے لیے پاکستان کے مجوزہ قانونی ڈھانچے کے تحت قانونی تحفظات تشکیل دینے چاہئیں جو انسانی حقوق کے بین الاقوامی قانون سے مطابقت رکھتے ہوں۔ افغانستان کے حالات میں معمولی سی تبدیلی آئی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ افغان مہاجرین کی مکمل واپسی کا عمل توسیع کردہ حتمی تاریخ تک ممکن نہیں ہوگا۔

2013ء کے دوران مختلف وجوہات کی بنا پر دس لاکھ سے زائد افراد بے گھر ہوئے۔ پاکستان نے انٹرنل ڈسپلیسمنٹ سے متعلق اقوام متحدہ کے راہنما اصولوں کو ملکی قوانین کا نہ تو حصہ بنانے کے لیے اقدامات کئے اور نہ ہی کسی طور ان سے استفادہ کیا۔ اندرونی جبری منتقلی کے مختلف مراحل کے دوران تنازعات کی وجہ سے بے گھر ہونے والے افراد کے مسائل برقرار رہے۔

11 مئی 2013ء کے عام انتخابات میں بے گھر ہونے والے افراد کے ووٹ ڈالنے کے حقوق متاثر ہوئے۔

2013ء میں پاکستان نے بنگلہ دیش سے ان لاکھوں پاکستانیوں کو واپس لانے کے لئے کوئی اقدامات نہ کئے جو 1971ء سے وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔

مہاجرین

پاکستان میں مہاجرین کی تقریباً پوری آبادی ہی افغان شہریوں پر مشتمل ہے۔ ان میں وہ لوگ شامل تھے جو افغانستان میں ایذا رسانی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے تنگ آ کر یہاں آئے تھے، لیکن

پاکستان میں بہت سے ایسے افغان شہری بھی موجود ہیں جنھوں نے معاشی وجوہات کی بنا پر نقل مکانی کی۔

2013ء کے اواخر تک پاکستان میں کم از کم 32 لاکھ افغان مہاجرین موجود تھے جو دنیا بھر میں مہاجرین کی سب سے بڑی اور ایک طویل عرصے سے مقیم تعداد تھی۔

2006-07ء کے دوران پاکستان میں موجود ہر افغانی کی رجسٹریشن کی مشق کی گئی۔ وہ تمام افغانی جنھوں نے نادرا میں اپنا اندراج کروایا، انھیں اسی وقت اندراج کے ثبوت سے متعلق کارڈ فراہم کردیئے گئے۔ ایسے کارڈ رکھنے والے افراد کو اقوام متحدہ کمیشن برائے مہاجرین کی جانب سے سہولیات اور بے دخلی کے خلاف تحفظ فراہم کیا جاتا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک افغان شہریوں کے ہاں پیدا ہونے والے بچوں کے سوا کوئی بھی نیا اندراج نہیں کیا گیا۔ ان کارڈز کی میعاد 2009ء میں ختم ہوگئی تھی جس میں بعدازاں توسیع کردی گئی۔ وفاقی کابینہ نے اندراج شدہ افغان مہاجرین کی واپسی کی ڈیڈ لائن میں دسمبر 2015ء تک توسیع کرنے کا فیصلہ کیا۔ توقع تھی کہ نادرا 2014ء کے اوائل میں تجدید شدہ پی او آر کارڈ جاری کردے گا۔

2013ء کے اختتام پر پاکستان میں اندراج شدہ افغان مہاجرین کی تعداد سولہ لاکھ دس ہزار سے زیادہ تھی۔ تقریباً 37 فیصد افغان شہری پاکستان بھر میں کل 76 کیمپوں میں مقیم تھے جبکہ باقی ماندہ 63 فیصد کیمپوں سے باہر مقیم تھے۔ 2013ء میں قومی اسمبلی میں پیش کردہ اعداد وشمار کے مطابق 16 لاکھ غیر رجسٹرڈ شدہ افغان تارکین وطن بھی پاکستان میں مقیم تھے۔ بہت سے افغان شہری 1979ء میں یہاں اس وقت آئے تھے جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تھا۔ غیر اندراج شدہ افغان شہری نہ تو پاکستان میں قیام کے دوران اور

افغان مہاجرین: گھروں کو واپس لوٹنے کے لیے تیار

نہ ہی وطن واپسی کے دوران کسی امداد کے حق دار تھے۔ انہیں بے دخلی کے خلاف بھی کسی قسم کا تحفظ حاصل نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت پاکستان نقل مکانی کی عالمی تنظیم کے ساتھ مل کر ایک منصوبے پر غور کر رہی تھی تا کہ غیر اندراج شدہ افغان شہریوں کے لیے ان کی وطن واپسی میں آسانیاں پیدا ہو سکیں۔

تمام ترسنجیدگی کے پیش نظر یہی بہترین راستہ سمجھا گیا کہ پاکستان میں موجود بے گھر افغان شہری افغانستان واپس چلے جائیں۔ لیکن یہ لوگ واپس جانے سے ہچکچا رہے تھے اور ان کی اس ہچکچاہٹ کا سبب افغانستان میں جاری تشدد، عدم تحفظ کی صورتحال اور معاشی مواقع کے فقدان کے علاوہ یہ حقیقت بھی تھی کہ متعدد افغان شہری عملی طور پر ساری زندگی پاکستان میں مقیم رہے تھے۔ 2013ء کے دوران افغانستان واپس جانے والے افغان باشندوں کی تعداد میں شدید کمی کا باعث افغانستان سے غیر ملکی فوجوں کی ناگزیر واپسی اور رضا کارانہ طور پر وطن واپس جانے کی ڈیڈ لائن میں توسیع تھی۔

2012ء میں اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے مہاجرین کے رضا کارانہ وطن واپسی پروگرام کے تحت 83,423 رجسٹرڈ افغان مہاجرین افغانستان واپس چلے گئے جبکہ اس کے مقابلے میں 2013ء میں اس پروگرام کے تحت افغانستان واپس جانے والے افغان شہریوں کی تعداد صرف 31,800 تھی۔ اقوام متحدہ کمیشن برائے مہاجرین کے پروگرام کے تحت افغانستان واپس لوٹنے والے مہاجرین کی یہ تعداد ایک دہائی کے دوران سب سے کم تھی۔ 2009ء کے دوران 51,290 افغان مہاجرین اپنے وطن واپس گئے تھے۔ خیبر پختونخوا میں مقیم 10 لاکھ افغان شہری 2013ء میں اپنے وطن واپس گئے جو کہ گزشتہ چند سالوں کی سب سے کم تعداد تھی۔

تعداد میں کمی کی ایک وجہ وہ مشکلات تھیں جن کا افغان شہریوں کو افغانستان واپسی کے بعد سامنا کرنا پڑتا تھا۔ میڈیا میں اقوام متحدہ کمیشن برائے مہاجرین کے اہلکاروں کی بابت کہا گیا کہ واپس لوٹنے والے جن چار لاکھ افغان شہریوں نے افغانستان میں زمین کی الاٹمنٹ کے لئے درخواستیں جمع کرائی تھیں، ان میں سے صرف 20,000 کی درخواستیں منظور کی گئیں اور افغانستان میں افغان حکومت کی جانب سے خاتم کردہ انٹیگریشن سنٹرز میں سے 80 فیصد ناکام ہو چکے تھے۔ تاہم افغانستان میں اب بھی ایسے بہت سے علاقے تھے جہاں مہاجرین کی واپسی کے لئے ماحول سازگار تھا۔

نیٹو افواج کی طے شدہ واپسی اور افغانستان میں پائی جانے والی غیر یقینی کیفیت کے پیش نظر 2014ء میں وطن واپس لوٹنے والے مہاجرین میں مزید کمی کے خدشات تھے۔

اقوام متحدہ کمیشن برائے مہاجرین کی مدد سے افغان شہریوں کی وطن واپسی

سال	وطن واپس لوٹنے والے افراد کی تعداد
2004ء	383,598
2005ء	449,520
2006ء	133,015
2007ء	364,476
2008ء	282,496
2009ء	51,290
2010ء	109,383
2011ء	52,096
2012ء	83,423
2013ء	31,800
کل تعداد	**1,941,097**

ماخذ: یو این ایچ سی آر

اطلاعات کے مطابق یو این ایچ سی آر وطن واپس لوٹنے والے ہر افغان مہاجر کو دی جانے والی امداد کو 150 ڈالر سے بڑھا کر 200 ڈالر کرنے پر غور کر رہا تھا۔ یہ رقوم افغانستان میں ادا کی جاتی تھیں۔

سکیورٹی خدشات

افغان مہاجرین کے قیام میں توسیع اس وقت کی گئی جب متعدد حلقوں کی طرف سے انہیں جلد واپس بھیجنے کے مطالبات میں تیزی آئی۔ اکثر اوقات یہ شبہ بھی ظاہر کیا گیا کہ ملک میں عام جرائم اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں فاٹا اور ان علاقوں میں بھاری تعداد میں مقیم افغان مہاجرین ملوث تھے۔ ان پر پاکستانی شہریوں سے کاروبار اور معاشی مواقع چھیننے کا الزام بھی عائد کیا جاتا تھا۔ پاکستان کی معیشت میں ان کے کردار کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا تھا۔

نومبر میں پشاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ خیبر پختونخوا میں 90 فیصد افغان مہاجرین کی موجودگی صوبے کے لیے ''تباہی کا سبب'' بن رہی تھی۔ اطلاعات کے مطابق چیف

جسٹس کا کہنا تھا کہ وفاقی حکومت کو مہاجرین کو چاروں صوبوں میں برابر تقسیم کرنا چاہیئے تا کہ خیبر پختونخوا پر بوجھ کم کیا جاسکے۔ان کا کہنا تھا کہ ملک میں موجود افغان مہاجرین دشمنوں کے ہاتھوں استعمال ہورہے تھے۔ ہائی کورٹ نے 2012ء میں وفاقی حکومت کو افغان مہاجرین کو وطن واپس بھیجنے کا حکم دیا تھا۔حکومت نے اس حکم کو سپریم کورٹ میں چیلنج کردیا تھا اور 2012ء کے آخر تک یہ معاملہ زیرالتوا تھا۔

2013ء میں کئی مرتبہ سکیورٹی وجوہات کی بناپر ملک کے کچھ شہروں یا علاقوں میں افغان شہریوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا، ایسا خاص طور پر محرم کے مہینے کے دوران یا پھر اس کے بعد مئی میں ہونے والے عام انتخابات کے دوران کیا گیا۔

2013ء میں میڈیا کے مطابق پاکستان میں غیر قانونی قیام کرنے پر 2000 سے زائد افغان شہریوں کو غیر ملکی شہریوں کے ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا،بعض اوقات انہیں حراست میں رکھنے کی بجائے افغان سرحد کے حکام کے حوالے کیا گیا لیکن پاکستان سے اخراج کے بعد انہیں عموماً کچھ عرصہ جیل میں گزارنا پڑتا۔

خوف، استحصال اور زائد المیعاد ریفوجی کارڈز

جولائی میں پاکستان نے اس عہد کی تجدید کی کہ 16 لاکھ سے زائد افغان مہاجرین کو تحفظ فراہم کیا جائے گا۔جس کا اقوام متحدہ کمیشن برائے مہاجرین نے خیر مقدم کیا۔کمیشن برائے مہاجرین نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو جاری کردہ ان ہدایات کا بھی خیر مقدم کیا، جن میں کہا گیا تھا کہ جب تک کابینہ افغان مہاجرین سے متعلق نئی قومی پالیسی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرتی، موجودہ مہاجر کارڈز کا احترام کیا جائے۔اس نئی قومی پالیسی میں پی او آر کارڈز کی میعاد میں توسیع بھی شامل تھی پی او آر کارڈز کی تجدید کے حوالے سے درپیش مسائل میں سے ایک یہ بھی تھا کہ چند افغان شہریوں کو 2010ء میں جن علاقوں میں کارڈ جاری کئے گئے تھے وہ اب وہاں کی بجائے کسی اور علاقے میں رہائش پذیر تھے۔

اکتوبر میں کمیشن برائے مہاجرین نے اس امر پر تشویش کا اظہار کیا کہ پاکستان میں افغان مہاجرین کو استحصال، غیر قانونی حراست اور دوسری ذہنی پریشانیوں کا نشانہ بنایا جارہا تھا، یو این ایچ سی آر کا کہنا تھا کہ حال ہی میں پاکستانی حکام نے فوجی آپریشن کے دوران سینکڑوں اندراج شدہ افغان مہاجرین کو غیر قانونی طور پر ہراساں کیا اور انہیں مختصر عرصے کے لئے گرفتار کرلیا۔

یو این ایچ سی آر پاکستان کے نمائندے کا کہنا تھا کہ زیادہ تر گرفتاریاں بلوچستان اور کراچی میں آپریشن کے دوران عمل میں آئیں۔یو این ایچ سی آر کے نمائندے نے کہا کہ: ’’عام طور پر ہر ماہ کم تعداد میں گرفتاریاں اور رہائیاں عمل میں آتی رہیں۔تاہم گزشتہ دو یا تین ماہ میں دو آپریشنوں کے دوران (کراچی اور

پی اوآر کارڈز نے رجسٹر شدہ افغانوں کو پاکستان بدری سے تحفظ مہیا کیا

بلوچستان میں) ہر ہفتے یا ہر ماہ میں یہ تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی اور یوں اس تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا''۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ ان مہاجرین کو فوری طور پر رہا کر دیا گیا، لیکن انہوں نے قانون نافذ کرنے والے اداروں پر زور دیا کہ وہ مہاجرین کے حقوق کا احترام کریں اور گرفتاریوں کی تعداد کم کرنے کی کوشش کریں۔ اقوام متحدہ کے نمائندے نے اس بات پر زور دیا کہ گرفتاریاں اور حراست میں لینا حکومت یا کسی اور سرکاری ادارے کی پالیسی کا حصہ نہیں بلکہ بھتہ خوری کا نتیجہ تھا جس میں چند افراد نے ذاتی فائدے کے لئے یہ حرکات کیں اور رشوت وصول کر کے مہاجرین کو رہا کر دیا۔ اسی روز ریاست و سرحدی علاقہ جات کے وزیر نے یو این ایچ سی آر کے خدشات کی تائید کی اور صوبائی حکومتوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سے کہا کہ وہ نئے کارڈ جاری ہونے تک موجودہ کارڈز ہی کو کارآمد تسلیم کرتے ہوئے افغان مہاجرین کو ہراساں کرنے سے اجتناب کریں۔ یو این ایچ سی آر اور حکومت نے ان مہاجرین کی مدد کے لیے شکایتی مراکز اور ایک ہاٹ لائن قائم کی۔

فراخدلی کی حدود

افغان مہاجرین کی جلد از جلد وطن واپسی کے مطالبات کے حوالے سے ریاستوں اور سرحدی علاقوں کے وزیر کا کہنا تھا کہ معاہدے کے تحت پاکستان افغان شہریوں کو زبردستی واپس نہیں بھیج سکتا۔ ستمبر میں حکومت نے قومی اسمبلی کو مطلع کیا کہ اس نے 2015ء تک افغان مہاجرین کی مکمل واپسی کا منصوبہ بنایا تھا۔ تاہم متعلقہ وزیر نے واضح کیا کہ چونکہ مہاجرین کی وطن واپسی رضاکارانہ بنیادوں پر ہونا تھی اس لیے یہ یقین

سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ عمل نئی ڈیڈ لائن تک مکمل کرلیا جائے گا۔

اکتوبر میں اسی وزیر نے کہا کہ 2014ء میں غیر ملکی فوجوں کی واپسی کے بعد اگر افغانستان میں حالات خراب ہوئے تو پاکستان افغانستان سے نقل مکانی کر کے پاکستان آنے والے افغانوں کو خوش آمدید نہیں کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان افغان شہریوں کے داخلے کو روکنے کے لئے سرحد پر بین الاقوامی برادری کے تعاون سے تمام قانونی ذرائع استعمال کرے گا۔

وزیر کا کہنا تھا کہ افغان شہریوں کی موجودگی کے باعث خیبر پختونخوا کو نا قابل برداشت بوجھ سہنا پڑا اور افغانوں کی آمد سے اس کی معیشت کو کافی نقصان پہنچا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ لوگ مہاجرین کو زیادہ برداشت نہ کریں اور اگر دسمبر 2015ء کی ڈیڈ لائن تک ان کی وطن واپسی کا عمل مکمل نہ ہوا تو امکان ہے کہ خیبر پختونخوا کے لوگ افغانوں کی جبری بے دخلی کے لئے سڑکوں پر نکل آئیں۔ بلوچستان کی قوم پرست سیاسی جماعتوں اور ایک مقامی قبیلے کے عمائدین نے حکومت پر زور دیا کہ کوئٹہ میں رہنے والے افغان مہاجرین کو افغانستان واپس بھیجا جائے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد نے ایسی دستاویزات حاصل کر لی تھیں جن کے ذریعے وہ خود کو پاکستانی شہری ظاہر کرتے تھے اور یہ کہ وہ کوئٹہ میں جائیدادیں خرید رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر افغان مہاجرین کو کوئٹہ میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرنے کی اجازت دی گئی تو مقامی لوگوں کے مفادات کو نقصان پہنچے گا۔

سیاسی جماعتوں نے کئی بار یہ مطالبہ کیا کہ افغان شہریوں کو واپس بھیجا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ افغان شہریوں کو صوبے میں رہنے کی اجازت دینا نہ تو بلوچستان کے بلوچ مکینوں کے مفاد میں ہے اور نہ ہی پشتونوں کے۔ نومبر میں قوم پرست جماعتوں کے قائدین نے کوئٹہ پریس کلب کے باہر ایک ریلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ افغانستان میں حالات تقریباً معمول پر آچکے تھے اور بلوچستان میں رہنے والے افغان مہاجرین کو وطن واپس بھیج دینا چاہیے۔

لیگل فریم ورک کی طرف سفر

افغان شہریوں کی وطن واپسی کی ڈیڈ لائن میں توسیع کا اعلان اس وقت سامنے آیا جب اطلاعات کے مطابق حکومت افغان شہریوں کے لیے ایک نئی قومی پالیسی کو حتمی شکل دینے میں مصروف تھی۔ حکومت نے افغان مہاجرین کے حوالے سے سلوشنز سٹریٹیجی پر عمل درآمد کے لیے کابینہ کی ایک کمیٹی تشکیل دی جو افغانستان، ایران اور یو این ایچ سی آر کے اشتراک سے علاقائی پالیسی تیار کرے۔ اس پالیسی کی تیاری کا مقصد پاکستان میں طول پکڑتے ہوئے افغانی مہاجرین کے قیام کو بہتر بنانے اور مختصر کرنے کے لیے حکمت عملی تیار کرنا تھا۔

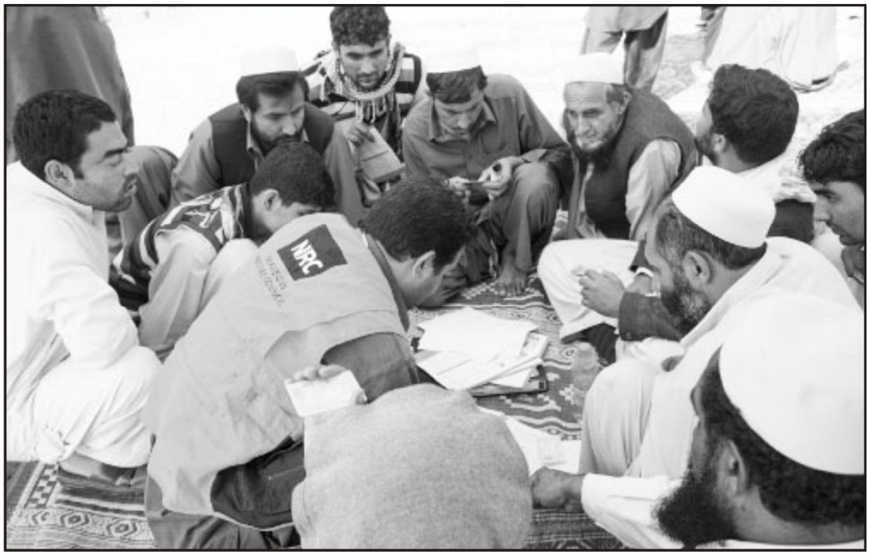

رجسٹر شدہ مہاجرین کو متعدد اداروں کی طرف سے حمایت کے ساتھ ساتھ مشاورت بھی میسر ہوئی

نومبر میں ہیومن رائٹس واچ نے کہا کہ پاکستان نے نہ تو اپنے مجوزہ نیشنل ریفیوجی لاء کی تفصیلات جاری کیں اور نہ ہی اس نے اقوام متحدہ کے مہاجرین سے متعلق میثاق کی توثیق کی تھی۔ اس میثاق نے مہاجرین کے ساتھ سلوک کا معیار مقرر کر دیا تھا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ حکومت اس امر کو یقینی بنائے کہ مہاجرین اور سیاسی پناہ طلب کرنے والے افراد کے تحفظ کے لیے مجوزہ قومی قانون بین الاقوامی معیار کے مطابق ہوگا۔

یو این ایچ سی آر نے پاکستان میں افغانوں کے علاوہ دوسری قوموں کے 631 پناہ گیروں اور مہاجروں کے ساتھ بھی کام کیا۔ ان میں صومالی، عراقی، ایرانی، الجزائری اور شامی پناہ گیر اور مہاجر شامل تھے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

غیر افغانی پناہ گیر اور مہاجرین جنہیں یو این ایچ سی آر نے سہولتیں مہیا کیں

نمبر شمار	قومیت	کیسز	افراد کی تعداد
1	الجزائر	4	17
2	ایتھوپیا	1	4
3	گھانا	1	1
4	ایران	26	46
5	عراق	20	54

6	میانمیر	7	14
7	فلسطین	4	4
8	روس	1	7
9	روانڈا	1	1
10	صومالیہ	243	456
11	سوڈان	1	1
12	شام	8	13
13	ترکی	1	6
14	یوگنڈا	1	1
15	ازبکستان	1	6
مجموعی تعداد		**320**	**631**

بنگلہ دیش میں قومیت سے محروم پاکستانی

2013ء میں بھی بنگلہ دیش میں مقیم اڑھائی لاکھ سے زائد بے یار و مددگار پاکستانیوں کو واپس لانے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے۔ یہ افراد 1971ء کی جنگ جس کے نتیجے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا تھا کے بعد سے وہاں محصور تھے۔ ان لوگوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کی مخالفت کی تھی۔ یہ لوگ پاکستان

بنگلہ دیش میں محصور پاکستانی بدحال کچی آبادیوں میں موجود کیمپوں میں زندگی گزار رہے ہیں

جانا چاہتے تھے مگر واپسی کے عمل میں حائل پیچیدگیوں کے باعث ایسا ممکن نہیں تھا۔ بنگلہ دیش نے انہیں بطور شہری تسلیم نہیں کیا تھا اور نہ ہی پاکستان نے انہیں واپس لانے کے لیے کسی قسم کے اقدامات کیے تھے۔ وہ بنگلہ دیش کے مختلف علاقوں میں موجود 66 کیمپوں میں انتہائی پست اور غربت کی زندگی گزار رہے تھے۔ گزشتہ برسوں میں ان کی آبادی میں اضافے کے باعث ان علاقوں کی صورت حال کچی آبادیوں سے بھی بدتر ہو چکی تھی۔ گنجائش سے زیادہ آبادی کے علاوہ ان علاقوں میں نکاسیٔ آب اور بنیادی سہولیات کا بھی فقدان تھا۔ ان لوگوں کو امتیازی سلوک کا بھی سامنا تھا۔ 2013ء میں اس حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں کی گئی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ان لوگوں کی 40 سالہ بے گھری کا خاتمہ مستقبل قریب میں ممکن نہیں۔

اندرونی بے گھری

فاٹا میں آبادی کی منتقلی جاری رہی۔ علاقے میں دہشت گردوں بالخصوص پاکستانی طالبان کی کارروائیوں اور ان کے خلاف فوجی آپریشن کے باعث مقامی رہائشی نقل مکانی پر مجبور ہو گئے تھے۔ فاٹا میں آبادی کی منتقلی کا نیا عمل اس وقت شروع ہوا جب سات میں سے چند قبائلی اضلاع کے رہائشی گھروں کو واپس لوٹے۔

یو این او سی ایچ اے کے مطابق فاٹا کے تقریباً 77,448 بے گھر افراد ستمبر تک اپنے آبائی علاقوں میں واپس لوٹ آئے تھے۔ ان میں کرم کے 61,578، جنوبی وزیرستان کے 11,400 باجوڑ کے 3,354 اور مہمند ایجنسی کے 1,116 افراد شامل تھے۔ اس دوران فاٹا اور خیبر پختونخوا سے بے گھر ہونے والے مزید 10 لاکھ دو ہزار افراد کا اندراج کیا گیا۔

ناقص میڈیا کوریج اور علاقے کے صحافیوں کو لاحق خطرات کے باعث واپس لوٹنے والے افراد کی مشکلات کو مناسب طور پر اجاگر نہ کیا جا سکا۔

ستمبر میں ذرائع ابلاغ کے ذریعے معلوم ہوا کہ خیبر پختونخوا کے علاقے باڑہ سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر بے گھر افراد تباہ حال انفراسٹرکچر، عدم تحفظ اور ریاست کی رٹ کی بحالی کے متعلق پائے جانے والے ابہام کے باعث واپس لوٹنے پر رضامند نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے گھروں کی تباہی کے علاوہ سڑکیں اور پل بھی خستہ حالی کا شکار تھے۔

ستمبر کے آخر میں اطلاع ملی کہ خیبر پختونخوا کی وادیٔ تیراہ میں بے گھر افراد کی واپسی کا عمل روک دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک قبیلے نے عسکریت پسندوں کو علاقے میں دوبارہ داخل ہونے سے روکنے کو یقینی بنانے کے لیے امن لشکر تشکیل دینے پر رضامندی ظاہر نہیں کی تھی۔ تقریباً 17,140 خاندان اس وقت علاقے سے نقل مکانی کر گئے تھے جب دو جنگجو گروہوں میں تصادم کے بعد ان کے خلاف فوجی آپریشن شروع کیا گیا۔

مسلح تصادم نے شہریوں کو فاٹا سے بھاگنے پر مجبور کر دیا

یکم دسمبر کو فاٹا ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی (ایف ڈی ایم اے) کے سربراہ نے کہا کہ حکومت وادیٔ تیراہ کے بقیہ بے گھر خاندانوں کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے اقدامات کر رہی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ باجوڑ کے قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے 72,000 بے گھر خاندان واپس لوٹ چکے تھے جبکہ مہمند ایجنسی کے 36,000 خاندانوں کی واپسی کے لیے اقدامات کیے جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ سکیورٹی فورسز نے نہایت اہم کردار ادا کرتے ہوئے وادیٔ تیراہ کو دہشت گردوں سے پاک کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ بقیہ 72,000 خاندان بھی بہت جلد اپنے علاقوں میں واپس لوٹ جائیں گے۔

انہوں نے وعدہ کیا کہ اورکزئی، جنوبی وزیرستان اور کُرم ایجنسی کے بے گھر افراد کو بہت جلد اپنے علاقوں میں واپس لایا جائے گا۔

سال کے آخر میں اورکزئی کے پولیٹیکل ایجنٹ نے ہنگو میں بے گھر افراد کے کیمپ کا دورہ کیا اور اورکزئی کے بے گھر افراد کو مطلع کیا کہ اورکزئی میں غیر یقینی صورت حال کے باعث ان کی جلد واپسی کا امکان نہیں تھا۔

دسمبر میں کرم ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ نے کہا کہ کرم سے بے گھر ہونے والے 5,000 افراد کی واپسی کے انتظامات مکمل کر لیے گئے تھے اور یہ عمل جنوری 2014 میں شروع ہوگا۔ قبائلی لوگوں نے عسکریت پسندی اور افواج کی کارروائیوں کے باعث اپنے گھروں کو چھوڑا تھا۔ باغیوں کے حملوں کے باعث گھروں اور سرکاری تنصیبات کو پہنچنے والے نقصان کا اندازہ لگانے کے لیے جلد ہی ایک سروے شروع کیا جانا تھا۔ کرم میں پانچ سالہ شورش کے باعث 18,000 خاندان محفوظ علاقوں کی طرف نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔

متعدد رپورٹوں میں بے گھر افراد کے کیمپوں میں سکیورٹی کے مسائل کی نشاندہی کی گئی۔ مارچ میں جلوزئی میں بے گھر افراد کے لیے قائم کیمپ میں پیش آنے والا حادثہ ان سکیورٹی مسائل کے حوالے سے بدترین واقعہ تھا۔ تفصیلات کے مطابق لوگ راشن حاصل کرنے کے لیے قطار میں کھڑے تھے کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوگیا جس کے نتیجے میں 17 افراد ہلاک اور 28 زخمی ہوگئے۔ اطلاعات کے مطابق کیمپ انتظامیہ کو تین روز پہلے دھمکیاں موصول ہوئی تھیں لیکن اس کے باوجود کسی قسم کے حفاظتی اقدامات نہیں کیے گئے تھے۔

بے گھر افراد نے کیمپوں میں بنیادی سہولتوں کے فقدان اور ناقص منصوبہ بندی کی بھی شکایت کی تھی۔ پشاور الیکٹرک سپلائی کمپنی کی جانب سے جلوزئی کیمپ کو بجلی کی فراہمی بند کرنے کے خلاف بھی کئی مرتبہ احتجاج کیا گیا۔ نومبر میں جلوزئی کیمپ میں مقیم بے گھر افراد نے اپنے بچوں کو پولیو کے قطرے پلوانے سے انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک بجلی کی بحالی اور خوراک کی فراہمی سے متعلق ان کے مطالبات پورے نہیں کیے جاتے وہ اپنے بچوں کو پولیو کے قطرے نہیں پلوائیں گے۔

پریشان حال اور بے گھر لوگ:

بلوچستان کے اضلاع ڈیرہ بگٹی اور کوہلو میں قبائلی جھگڑوں اور مسلح تنازعات کے باعث متعدد افراد بے گھر ہوئے۔ یہ تعداد 1,75,000 بتائی جاتی تھی۔ لیکن میڈیا نے ان کی بے دخلی اور حالت زار کی اس طرح رپورٹنگ نہیں کی جیسا کہ فاٹا کے بے گھر افراد کی ہوئی تھی۔ یہ صورت حال جولائی میں اس وقت تبدیل ہوئی جب ڈیرہ بگٹی کے 150 بے گھر افراد اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں ایک نوجوان کی ہلاکت کے خلاف ہسپتال کے باہر خیمہ زن ہوگئے کیونکہ اسلام آباد کی انتظامیہ نے ہسپتال کو نوجوان کی نعش متاثرہ خاندان کے حوالے کرنے سے روک دیا تھا۔ دراصل اپنے اس اقدام سے انتظامیہ بے گھر افراد کو اسلام آباد میں احتجاج کرنے سے روکنا چاہتی تھی۔

بے گھر افراد نعش کو تدفین کے لیے اپنے آبائی علاقے ڈیرہ بگٹی لے جانا چاہتے تھے۔ ان کا یہ بھی مطالبہ تھا کہ انہیں بتایا جائے کہ ان کے علاقے میں امن کب قائم ہوگا تاکہ وہ وہاں مستقل طور پر واپس لوٹ سکیں۔ بعدازاں اسلام آباد ہائی کورٹ نے متعلقہ حکام کو لاش متاثرہ خاندان کے حوالے کرنے کا حکم دیا اور انتظامیہ کو ہدایت کی کہ ڈیرہ بگٹی میں نعش کی تدفین کے انتظامات حکومت کی طرف سے کیے جائیں، جس کے بعد نعش کو ورثا کے حوالے کردیا گیا۔

ستمبر اور پھر اوائل اکتوبر میں زلزلے کے متعدد جھٹکوں نے بلوچستان کے کئی علاقوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

آواران میں آنے والے زلزلے نے بلوچستان میں لوگوں کو نقل مکانی پر مجبور کر دیا

ریکٹر سکیل پر زلزلے کی شدت 7.7 ریکارڈ کی گئی تھی۔ضلع آواران میں شدید تباہی اور متعدد ہلاکتوں کے علاوہ سینکڑوں افراد بے گھر ہوئے۔ علاقے میں بڑے پیمانے پر گھر تباہ ہوئے جس کے بعد ہزاروں افراد محفوظ علاقوں کی جانب نقل مکانی کر گئے۔ آواران کے مختلف علاقوں میں زندہ بچ جانے والے زیادہ تر افراد لسبیلہ، حب، اُتھل اور وِنڈر کی جانب نقل مکانی کر گئے جبکہ کچھ افراد نے کراچی کے علاقے لیاری اور منگھو پیر میں پناہ لی۔متعدد متاثرہ افراد خیموں میں رہ رہے تھے اور حکومت یا کسی این جی او کی جانب سے انہیں کسی قسم کی امداد فراہم نہیں کی گئی تھی۔اطلاعات کے مطابق صرف ایدھی فاؤنڈیشن نے بے گھر خاندانوں کے لیے پانی کے ٹینکوں، نکاسئ آب کی سہولیات اور دستی پمپوں کا بندوبست کرنے کے علاوہ بچوں میں کپڑے بھی تقسیم کیے۔

کراچی میں بے گھری

کراچی میں لاقانونیت کے باعث ہزاروں افراد نقل مکانی کر گئے۔موسم گرما میں لیاری میں تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات کے باعث ہزاروں افراد پُرتشدد واقعات سے متاثرہ علاقے سے نقل مکانی کر گئے اور انہیں سندھ کے اضلاع بدین اور ٹھٹھہ کی خانقاہوں، مزاروں میں پناہ لینا پڑی۔زیادہ تر بے گھر خاندانوں کا تعلق کچھی برادری سے تھا۔صوبائی حکومت نے انہیں واپس آنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور کچھ نے ایسا کیا بھی۔ بے گھر افراد کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل تھا کیونکہ بہت سے خاندانوں نے کراچی واپس آنے اور چند دن بعد پھر سے نقل مکانی کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ایک برادری کے قائد کا کہنا تھا کہ 3,700 سے زائد خاندان لیاری سے بدین، ٹھٹھہ، حیدرآباد، میرپور خاص اور تھرپارکر منتقل ہوئے تھے۔

اگست میں یہ خبر سامنے آئی کہ کراچی میں لیاری کے ایک علاقے سلاٹر ہاؤس کالونی کے تقریباً چھ سو مسیحی اور ہندو خاندانوں کو جرائم میں ملوث گروہوں کی جانب سے ہراساں کرنے اور تشدد کے واقعات کے باعث مجبوراً نقل مکانی کرنا پڑی۔ چند متاثرہ خاندان دسمبر میں واپس لوٹ آئے لیکن لاقانونیت اور تشدد کا خطرہ برقرار رہا۔

سیلاب

گزشتہ برسوں کی طرح اس سال بھی موسم گرما میں سیلاب کے باعث 80,000 سے زائد افراد بے گھر ہوئے۔ نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی (این ڈی ایم اے) کے مطابق 84,000 افراد متاثر ہوئے تھے اور حکومت نے 21 امدادی کیمپوں میں متاثرہ لوگوں کو رہائش کی سہولت فراہم کی تھی۔

عطا آباد کے بے گھر افراد

گلگت بلتستان کے علاقے ہنزہ سے بے گھر ہونے والے افراد کو 2013ء میں بھی آباد نہ کیا جا سکا۔ 2010ء میں اس علاقے میں ایک لینڈ سلائیڈ نے دریا کا راستہ روک کر اسے بہت بڑی جھیل میں تبدیل کر دیا تھا۔

چار دیہات براہ راست متاثر ہوئے جن میں گلمت، غل گین، ششکت، (جو کہ آئین آباد کے طور پر بھی جانا جاتا ہے) اور عطا آباد شامل تھے۔ ان دیہات کی مجموعی آبادی 7400 افراد سے زیادہ تھی۔ تقریباً 3,000 بے گھر افراد تین عارضی کیمپوں (ہنزہ میں التیت اور علی آباد کیمپ اور گوجل میں ششکٹ کیمپ) میں

ہنزہ: عطا آباد کے علی آباد کیمپ میں بے دخل افراد کے کیمپ میں ایچ آر سی پی کی فیکٹ فائنڈنگ ٹیم

مقیم رہے جو ان کے لیے 2010ء میں قائم کیے گئے تھے۔ یہ لوگ 2013ء کے اختتام تک یہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں کتنے عرصے تک کیمپوں میں رہنا ہو گا۔

سفارشات

1- حکومت کو قدرتی آفات اور انسان کی پیدا کردہ مشکلات سے نبٹنے کے لیے ایک بہتر حکمت عملی تشکیل دینے اور منصوبہ بندی پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس وقت پاکستان میں بے گھر افراد کو جن مسائل کا سامنا ہے ان کو حل کرنے کے حوالے سے حکام کی ناکامی ہے۔ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

2- حکومت کو فاٹا پر دوبارہ کنٹرول حاصل کرنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھانے کی ضرورت ہے تاکہ نقل مکانی کے عمل کو روکا جا سکے اور انتہا پسندی کا مکمل خاتمہ کیا جائے تاکہ فوجی آپریشن کی ضرورت نہ پڑے۔ متاثرہ لوگوں کو مجبور نہ کیا جائے کہ وہ دہشت گردی سے پاک سمجھے جانے والے علاقوں میں عسکریت پسندوں کو دوبارہ قدم جمانے سے روکنے کے لیے نجی فوج تشکیل دیں۔

3- ڈیرہ بگٹی اور کوہلو کے مکینوں کی جاری نقل مکانی کا ترجیحی بنیادوں پر خاتمہ کیا جائے۔ اپنے علاقوں سے طویل عرصہ تک بے دخل رہنے کے بعد واپس آنے والوں کو ایک بار پھر سے زندگی کا آغاز کرنے میں ان کی مدد کی جائے۔

4- پاکستان کو مہاجرین کے لیے ایک ایسا اندرونی لیگل فریم ورک تیار کرنا چاہیے جو انسانی حقوق کے بین الاقوامی قانون کی روشنی میں قانونی تحفظات سے مطابقت رکھتا ہو۔ اور انہیں مہاجرین کے حقوق سے انکار کرنے کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔

5- پاکستان کو ملکی قوانین اور پالیسیوں سے متعلق اقوام متحدہ کا انٹرنل ڈسپلیسمنٹ کے رہنما اصولوں کی روشنی میں ملکی قوانین اور پالیسیاں بنانے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں تاکہ اندرونی منتقلی کے مختلف مراحل کے دوران بے گھر افراد کے مسائل کا خاتمہ کیا جا سکے۔

6- 1971ء سے بنگلہ دیش میں بے یار و مددگار پڑے ہوئے نام نہاد بہاریوں کو پاکستان واپس نہ لانے کا کوئی جواز نہیں۔ پاکستان کو مزید کسی تاخیر کے بغیر انہیں واپس لانے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔

ضمیمے

ضمیمہ - 1

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سرگرمیاں

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے 2013 کے دوران انسانی حقوق کے تمام معاملات سے متعلقہ وسیع تر سرگرمیوں کا اہتمام کیا تاکہ شہریوں میں بنیادی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے متعلق شعور پیدا کیا جائے۔ متعدد سرگرمیوں کا مقصد ملک میں انسانی حقوق کی صورت حال کا مشاہدہ کرنا اور انسانی حقوق کے بہتر ادراک اور تحفظ کے لیے ایڈووکیسی کرنا تھا۔ ایچ آر سی پی کے چیپٹر اور ٹاسک فورس دفاتر نے ملک بھر میں انسانی حقوق کے معاملات پر ورکشاپس، فیکٹ فائنڈنگ مشنوں، سیمینارز، تحقیق اور ریلیوں کا اہتمام کیا۔ اپنے عقائد کے باعث غیر محفوظ کمیونٹیوں پر ایچ آر سی پی کے ماہرین کے گروپ نے مذہبی اقلیتوں کے معاملات اور خدشات کو اجاگر کرنے کے لیے میٹنگوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایچ آر سی پی کی اکانومی واچ نے وفاقی وصوبائی بجٹ میں انسانی حقوق کے بنیادی امور کے لیے مالیاتی وسائل کی تخصیص کی مانیٹرنگ کی۔ ملک بھر کے اضلاع میں عوامی اجلاسوں کا انعقاد کیا گیا تاکہ لوگوں کی توجہ تحفظات پر دلائی جائے اور اُن تحفظات کے ازالے کے لیے منتخب نمائندوں سے اُنہیں رابطہ سازی میں مشغول کیا جائے۔

سزائے موت کے خلاف عالمی دن پر، ایچ آر سی پی نے اسلام آباد میں ایک سیمینار منعقد کیا جہاں آکسفورڈ یونیورسٹی میں علم جرائم، کے پروفیسر راجر ہوڈ خصوصی مقرر تھے۔ سزائے موت کے قیدیوں کے اہل خانہ نے اپنے مصائب کا اظہار کیا۔ ملک بھر میں ایچ آر سی پی کے دفاتر نے ریلیوں اور اجلاسوں کا انعقاد کیا جن میں ملک میں سزائے موت کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا۔

ایچ آر سی پی نے لاہور میں مصنفین، شعراء اور فنکاروں کا قومی کنونشن منعقد کیا تا کہ معاشرے میں انسانی حقوق اور امن کے فروغ میں اُن کے کردار کو زیر بحث لایا جائے۔ قومی کنونشن اُن کنونشنز کا ایک تسلسل تھا جو ایچ آر سی پی نے اسی موضوع پر 2012 میں چاروں صوبائی دارالخلافوں میں منعقد کیے تھے۔

ملک میں کسانوں کی جدوجہد کو اُجاگر کرنے کے لیے کسانوں کے حقوق پر ایک قومی کنونشن کا انعقاد کیا گیا تھا۔ یہ کنونشن 2012 میں کسانوں کے حقوق پر ہونے والی سرگرمیوں کا فالواپ تھا۔ گروی مشقت کے خلاف اپنے دیرینہ مؤقف کی پیروی کرتے ہوئے، ایچ آر سی پی نے صورت حال کا مشاہدہ کرنے اور تبدیلی کے لیے مؤثر اقدامات کا مطالبہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا، بالخصوص اندرون سندھ میں جہاں زرعی شعبہ میں مزدوروں اور اُن کے اہل خانہ کی ایک بڑی تعداد قرض کے عوض گروی مشقت کا شکار ہیں۔

نومبر میں لاہور میں 'بھوک کے خاتمے کے لیے مارچ' کا اہتمام کیا گیا جس کا مقصد خوراک کی قیمتوں میں شدید اضافے اور خوراک کی غیر مؤثر تقسیم کے معاملے کو اُجاگر کرنا تھا اور اس امر پر زور دینا تھا کہ حکومت تمام افراد کو خوراک کی دستیابی کو یقینی بنائے اور اُن کی قوت خرید میں لائے۔

ستمبر میں سرکاری تعلیمی نظام پر ایک دو روزہ سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس میں نصاب میں زبان، جنسی مساوات، تعلیمی معیار اور رسائی، اور تعلیمی شعبہ کو درپیش بحرانوں کو گفتگو کا مرکز بنایا گیا۔

ایچ آر سی پی نے زیر نظر سال کے دوران متعدد فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیجے۔ 2013 کے دوران

لاہور: بھوک کے خاتمے کے لیے مارچ

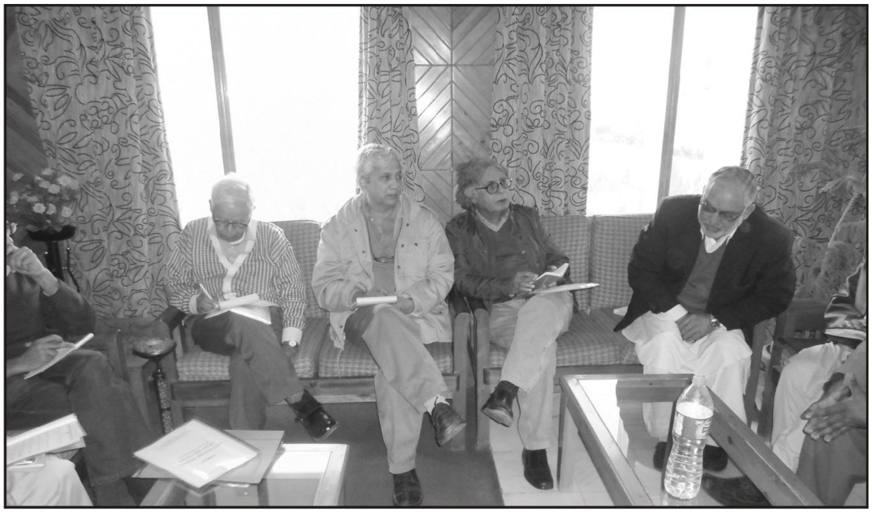

گلگت: ایچ آر سی پی کی فیکٹ فائنڈنگ مشن کے ارکان ایک اجلاس میں

ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے جون میں صوبہ بلوچستان جبکہ دوسرے نے اکتوبر میں گلگت.....بلتستان کا دورہ کیا۔ یہ مشن بھیجنے کا مقصد دونوں علاقوں میں انسانی حقوق کی صورت حال اور اہم چیلنجز اور اُن پر قابو پانے کے حوالے سے حکومت کی استعداد اور دلچسپی کا جائزہ لینا تھا۔ دونوں فیکٹ فائنڈنگ مشنوں کے اراکین نے فریقین کے ساتھ طویل نشستیں کیں۔ اُن کے مشاہدات اور سفارشات کو رپورٹس کی شکل میں شائع کیا گیا۔

ایچ آر سی پی کے عملے اور رضا کار کارکنان نے ملک بھر کے 57 حساس انتخابی حلقوں میں 11 مئی کے عام انتخابات کا مشاہدہ کیا۔ مشاہدہ کاروں نے قبل از انتخاب، انتخاب کے دن اور بعد از انتخاب کی صورت حال کا جائزہ لیا۔

ایچ آر سی پی نے بین الاقوامی کمیشن ماہرین قانون کے تعاون سے اقوام متحدہ کے ساتھ پاکستان کی مشغولیت پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا۔ وکلاء، انسانی حقوق کے مدافعین اور سول سوسائٹی کے کارکنوں نے تقریب میں شرکت کی اور اقوام متحدہ میں پاکستان کی مشغولیت کو مزید مثبت بنانے کے لیے انسانی حقوق کے گروہوں کے کردار کو مستحکم کرنے کے مختلف طرائق کار زیر بحث لائے گئے۔ مزید برآں اپنے فرائض کی ادائیگی میں حکومتی ریکارڈ کا متبادل جائزہ لینے کے طریقوں پر بھی گفتگو کی گئی تاکہ انسانی حقوق کا فروغ اور تحفظ ہو سکے۔

تمام دفاتر میں منعقد کردہ ماہانہ اجلاسوں میں ایچ آر سی پی کے اراکین قومی اور علاقائی سطحوں پر انسانی حقوق کے امور زیر بحث لائے۔ ایچ آر سی پی کی ویب سائٹ اور بلاگ پر کمیشن کے مؤقف اور

اقدامات اور عمومی طور پر انسانی حقوق کے معاملات پر بہت زیادہ تبصرے کیے گئے۔

پاکستان اور بیرون ممالک سے تقریباً 216 تحقیق کاروں نے ایچ آر سی پی کی کاغذ پر مشتمل دستاویزات کا دورہ کیا جو کہ انسانی حقوق کے تقریباً 100 موضوعات پر 16 اخبارات کے جائزے کا نتیجہ تھیں۔ ایچ آر سی پی نے کاغدی دستاویزات کو کمپیوٹرائزڈ کرنے کا کام جاری رکھا اور 2013ء کے اختتام پر www.hrcparchive پر آن لائن آرکائیوز نے 2013-2012 تک کے برسوں کا احاطہ کر لیا تھا۔ 2013ء کی نصف دستاویزات کو بھی سال کے اختتام تک کمپیوٹرائزڈ کر لیا گیا تھا۔

دنیا کے 51 ممالک سے تقریباً 1,664 افراد نے 2013 میں آن لائن دستاویزات تک رسائی کی تھی۔ 2013ء کے دوران ایچ آر سی پی کی بنیادی سرگرمیوں کا مختصر احوال درج ذیل ہے:

ورکشاپس/ سیمینارز/ اجلاس

جنوری **1** حیدرآباد: سندھ میں خسرے کی وبا پھیلنے پر صحت کے موضوع پر مذاکرے کا اہتمام کیا۔

فروری **1**، ملتان: شاہ رکن عالم کالونی میں کمیونٹی کے افراد کے ساتھ پانی کے حق پر گفتگو کرنے کے لیے اجلاس کا انعقاد کیا۔

فروری **2**، اسلام آباد: ایچ آر سی پی نے اسلام آباد کلچرل فورم کے تعاون سے ''مابعد جدیدیت: ایک تنقیدی جائزہ'' کے عنوان پر لیکچر کا اہتمام کیا۔

فروری **3-5**، چارسدہ: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ۔

فروری **5**، حیدرآباد: ایچ آر سی پی کے دفتر میں، ووٹ اور انسانی حقوق پر لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔

فروری **6**، ملتان: نکاسی و فراہمی آب اتھارٹی، ملتان کے ڈائریکٹر کے ساتھ نشست کا اہتمام کیا جس کا مقصد اُن کے ساتھ پانی کی فراہمی اور پانی کے حصول کے لیے عوامی مطالبے پر تبادلہ خیال کرنا تھا۔

فروری **7**، حیدرآباد: گاؤں سخی جام داتار پر گروی مزدور کے طور پر کام کرنے والی ہاریوں نے ایچ آر سی دفتر کا دورہ کیا۔ ان ہاریوں کو سندھ ہائی کورٹ کے حکم پر رہا کیا گیا تھا۔

فروری **7-8**، نوشہرہ: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

انتہا پسندی کا مقابلہ کرنے کے لیے انسانی اقدار اور حقوق کے فروغ پر منعقدہ ایک ورکشاپ

فروری 14 اسلام آباد: میڈیا کے نمائندگان کو کوہستان ویڈیو والے وقوعے پر میٹنگ کرنے کی دعوت دی گئی۔

فروری 16-17، چنیوٹ: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ۔

فروری 17، حیدر آباد: جبری تبدیلی مذہب کے معاملے پر گفت وشنید کے لیے ایک اجلاس منعقد کیا گیا۔

فروری 19، ملتان: واسا، ملتان کے ڈائریکٹر کے ساتھ میٹنگ کی گئی جس میں پانی اور آب نکاسی کے متعلق مقامی کمیونٹی کی شکایات کو زیر بحث لانا تھا۔

فروری 20، اسلام آباد: ایچ آر سی پی اور اسلام آباد کلچرل فورم نے مشترکہ طور پر 'جنگ اور تاریخ' پر ایک لیکچر کا اہتمام کیا۔

فروری 22، حیدر آباد: عورت فاؤنڈیشن کے تعاون سے 'عام انتخاب میں خواتین کی شمولیت' پر ایک مشاورتی تقریب منعقد کی گئی۔

فروری 23، حیدر آباد: لیبر کے حقوق کے لیے کسانوں پر مشتمل نیٹ ورک، سندھ لینڈ ریفارم موومنٹ (ایس ایل آر ایم) کے رکن کے طور پر ایچ آر سی پی نے غریب اور بے زمین کسانوں کے حقوق کے لیے حیدر آباد میں دستخطی مہم کا آغاز کیا۔

اسلام آباد: احتساب سے متعلق قوانین اور پالیسیوں پر مشاورت

فروری 26، کراچی: ''یوڈی ایچ آر کا ادراک' کے موضوع پر سی پی ایل سی پبلک سکول میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔

فروری 28، حیدر آباد: رہائی پانے والے یا قرضے کی غلامی سے بچ کر نکلنے والے گروی مزدوروں کے کوائف اکٹھا کرنے اور ان کے حالات کو زیر بحث لانے کے لیے ایک اجلاس منعقد کیا۔

مارچ 1، کراچی: 'کراچی کی مزدور تحریکیں' پر ایک نشست کا اہتمام: سول سوسائٹی کے نمائندگان نے تقریب میں شرکت کی اور ایچ آر سی پی کے اراکین نے یونین کی سرگرمیوں پر گفت وشنید کی۔

مارچ 4، حیدر آباد: مذہبی انتہا پسندی کے بنیادی اسباب جاننے کے لیے سول سوسائٹی کے نمائندوں کے ساتھ ایک مشاورتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔

مارچ 5، کراچی: امن وامان کی صورت حال، انتخابات اور غیر محفوظ گروہوں کی حالت کا جائزہ لینے کے لیے فریڈرک نومن سٹفٹنگ کے ساتھ ایک میٹنگ کی گئی۔

مارچ 6-7، جعفر آباد: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

مارچ 8، ملتان: بستی خداداد، شیر شاہ، ملتان میں ایک کمیونٹی میٹنگ جس کا مقصد صاف پانی اور آب نکاسی کے معاملے کو زیر بحث لانا۔

مارچ 8-9، جھل مگسی: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

مارچ 10، کراچی: سپریم کورٹ، سندھ ہائی کورٹ، کراچی اور ملیر بار ایسوسی ایشن کے ہمراہ ایچ آر سی پی کی ایک ٹیم نے عباس ٹاؤن میں بم دھماکے کے متاثرین کے اہل خانہ کے ساتھ ملاقات کی۔

مارچ 12-13 لورالائی: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ کا اہتمام

مارچ 13، ملتان: نصیر آباد/ممتاز آباد ملتان میں پانی کے حق کے لیے ایک کمیونٹی میٹنگ

مارچ 15، ملتان: نور سلطان کالونی، ملتان میں پانی کے حق کے لیے ایک کمیونٹی میٹنگ

مارچ 19، کراچی: امن پبلک سکول کے مقام پر یوڈی ایچ آر کا ادراک کے موضوع پر ایک سیمینار کا اہتمام

مارچ 21، کراچی: ایچ آر سی پی نے کراچی یونیورسٹی کے تعاون سے 'پاکستان میں جمہوریت کا مستقبل' پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا۔

مارچ 23، ملتان: پینے کے صاف پانی اور عوام کے صحت کے حق پر گفت وشنید کے لیے زکریا ٹاؤن میں ایک کمیونٹی میٹنگ

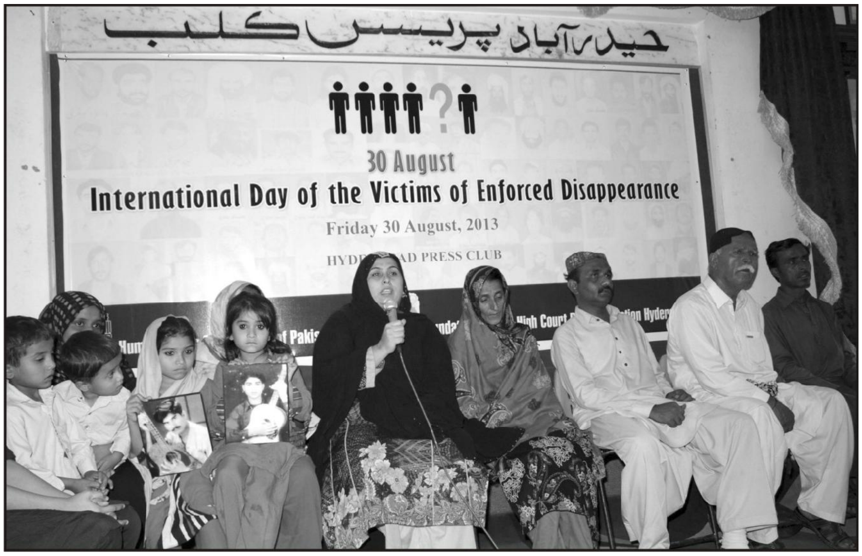

گمشدہ افراد کے اہلِ خانہ کے ساتھ ایک میٹنگ

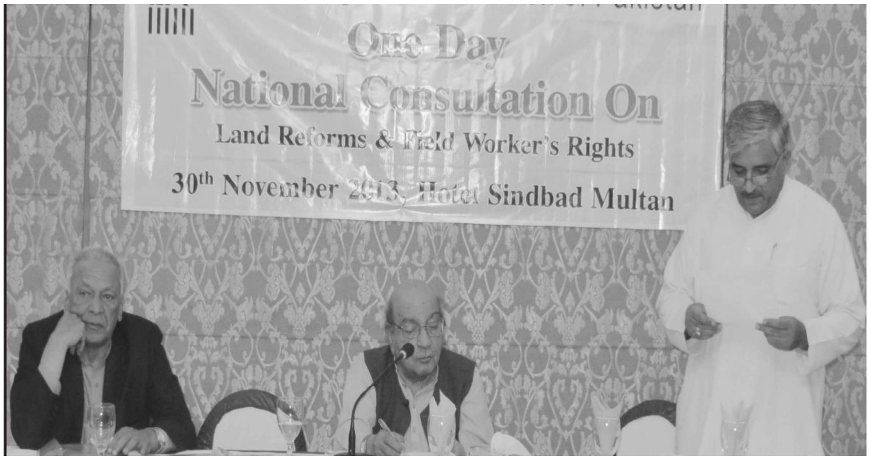

ملتان میں زرعی اصلاحات پر قومی مشاورت

اپریل 1، ملتان: قومی اسمبلی کے حلقہ این اے 148 میں انتخابات کے انتظامات کے متعلق معلومات لینے کے لیے الیکشن کمیشن کے عملے کے ساتھ ملاقات کی گئی۔

اپریل 2-4، ملتان: این اے 148 سے متعدد سیاسی جماعتوں کے انتخابی امیدواروں کے ساتھ میٹنگیں۔

اپریل 3، کراچی: جبری گمشدگیوں پر واقعاتی تحقیق پر مشتمل محمد حنیف کی تحریر کردہ کتاب ''بلوچ جو غائب نہیں اور دیگر جو ہیں'' کی اشاعت کے موقع پر پاکستان آرٹس کونسل کے مقام پر ایک پینل مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔

اپریل 4، کراچی: انتخابات سے قبل سیاسی جماعتوں کے منشور پر مشاورتی تقریب

اپریل 4 حیدر آباد: مسیحی کمیونٹی کے ساتھ میٹنگ جس کا مقصد عام انتخابات میں اُن کی نمائندگی پر گفت وشنید کرنا تھا۔

اپریل 4، اسلام آباد: ایچ آر سی پی نے '2012 میں انسانی حقوق کی صورت حال' نامی اپنی سالانہ رپورٹ کا اجراء کیا۔

اپریل 7، لاہور: ایچ آر سی پی کا سالانہ عمومی اجلاس (اے جی ایم)

اپریل 16، کراچی: ایچ آر سی پی کے ایک وفد نے الیکشن کمشنر سندھ کے ساتھ ملاقات کی تاکہ انتخابات کے انتظامات کے متعلق اُن کے ساتھ تبادلہ خیال کیا جا سکے۔

اپریل 19-20، قمبر شہدادکوٹ: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپس

اپریل 21-22، لاڑکانہ: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

اپریل 22، حیدرآباد: قومی وصوبائی اسمبلیوں کے انتخابی امیدواروں سے ملاقاتوں کا ایک سلسلہ شروع کرنے؛ اور خواتین، مذہبی اقلیتوں، بچوں اور معاشرے کے دیگر غیر محفوظ طبقوں کے حقوق کے لیے لابی کرنے کے لیے سندھ کمیونٹی فاؤنڈیشن کے ساتھ مل کر ایک منصوبے کا آغاز کیا گیا۔

اپریل 26، ملتان: 'خواتین مزدوروں کے حقوق اور کام کے دوران اُنہیں درپیش مشکلات' پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔

اپریل 28، ملتان: کام کے مقام پر تحفظ اور صحت کا عالمی دن' کے موقع پر اجلاس کا انعقاد

مئی 1، کراچی: این اے 249، 252 اور 253 کے انتخابات کے مشاہدہ کاروں کی تربیتی نشست

مئی 2 کراچی: این اے 240، 256 اور 258 کے انتخابات کے مشاہدہ کاروں کی تربیتی نشست

مئی 2، ملتان: انتخابات کا مشاہدہ کرنے کے لیے پاکستان آنے والے بین الاقوامی مشاہدہ کاروں کے ساتھ ایک نشست جس میں انتخابی عمل پر گفت وشنید کی گئی۔

حیدرآباد: انسانی حقوق کے عالمی دن کے موقع پر نکالی گئی ریلی

ایچ آر سی پی کے ایکسپرٹ گروپ کا اجلاس جس میں مذہبی اقلیتوں کے سیاسی حقوق پر گفتگو کی گئی

مئی 5، حیدر آباد: انتخابی مشاہدہ کاروں کا کردار اور ذمہ داریاں، پر ایک ورکشاپ کا اہتمام

مئی 7، حیدر آباد: نوجوانوں کے ایک گروہ کے لیے 'انسانی حقوق اور جمہوریت' پر ایک لیکچر کا اہتمام

مئی 8، کوئٹہ: ایچ آر سی پی کی انتخابات کے مشاہدہ سے متعلق سرگرمیوں کے حوالے سے الیکشن کمیشن کے ساتھ میٹنگ

مئی 9، پشاور: ایچ آر سی پی کے انتخابی مشاہدہ کاروں کے لیے ایک تربیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔

مئی 9، اسلام آباد: پاکستان میں انتخابات کے مشاہدے کے لیے میانمر سے آنے والے ایک وفد کے ساتھ ملاقات

مئی 11، کوئٹہ: ایچ آر سی پی کے کوئٹہ دفتر نے انتخابات کے مشاہدے کے لیے انتخابی دن الیکشن سیل قائم کیا۔

مئی 11، کراچی: ایچ آر سی پی کی ٹیموں نے سندھ کے 21 اضلاع میں انتخابات کا مشاہدہ کیا۔

مئی 11 اسلام آباد: ایچ آر سی پی کے اراکین اور پوٹھوہار آرگنائزیشن برائے ترقیاتی ایڈووکیسی (پوڈا) نے مل کر عام انتخابات کا مشاہدہ کیا اور ای سی پی کو شکایات ارسال کیں۔

مئی 13 سکھر: گورنمنٹ ہائی سکول میں بنیادی انسانی حقوق پر لیکچر کا اہتمام

مئی 19، کراچی: این اے 250 کے 43 پولنگ اسٹیشنوں میں دوبارہ ہونے والی پولنگ کا مشاہدہ کیا۔

مئی 22، ملتان: ٹریڈ یونین کے نمائندوں کے ساتھ محنت کشوں کے حقوق پر گفت وشنید کی گئی۔

مئی 25-26، میانوالی: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ کا اہتمام

مئی 29، ملتان: پینے کے صاف پانی کی فراہمی پر تبادلہ خیال کے لیے محکمہ ماحولیات، ملتان کے ڈائریکٹر کے ساتھ ملاقات

مئی 29، ملتان: واپڈا یونین کے ریفرنڈم کا مشاہدہ کیا گیا اور مزدوروں میں انسانی حقوق کے موضوعات پر مبنی مواد تقسیم کیا گیا۔

مئی 29-30 ، کوہاٹ: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

جون 2، ملتان: ملتان لاء کالج میں انسانی حقوق کی آ گاہی کے لیے ایک نشست کا اہتمام

جون 4، حیدر آباد: رہائی پانے والے گروی مزدوروں نے اپنے مسائل پر گفت وشنید کرنے کے لیے ایچ آر سی پی کے دفتر کا دورہ کیا۔

جون 8، حیدر آباد: سندھ گورنمنٹ ہیپا ٹائٹس پروگرام کے افسران سے ملاقات

جون 8، کراچی: محنت سے متعلقہ معاملات کو زیر بحث لانے کے لیے ایچ آر سی پی نے انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن وریسرچ (پائلر) کے تعاون سے ایک اجلاس کا انعقاد کیا جس میں ٹریڈ یونین رہنماؤں اور وکلاء کو شریک ہو کر گفت وشنید کرنے کی دعوت دی گئی۔

جون 14 حیدر آباد: انسانی حقوق کی صورت حال اور انسانی حقوق کے محافظین کا کردار پر گفت و شنید کا اہتمام

جون 15-16، اسلام آباد: پاکستان بھر کے 50 اضلاع سے تعلق رکھنے والے ایچ آر سی پی کے انسانی حقوق کے مشاہدہ کاروں کی تربیتی ورکشاپ

جون 20، ایبٹ آباد: منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی پر عوامی جلسہ

جون 20-21، گوادر: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا

سبی: شہریوں کے معاملات اور قانون سازوں کے ساتھ باہمی عمل پر ورکشاپ

فروع' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپس

جون 21، ہری پور: 'نوجوانوں کے حقوق اور اُن سے متعلق پالیسی کو زیر بحث لانے کے لیے میٹنگ کا اہتمام

جون 23-24 لسبیلہ: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروع' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

جون 25، کراچی: کراچی پریس کلب میں 'اذیت رسانی کے خلاف عالمی دن' کے موقع پر سیمینار کا اہتمام

جون 26، حیدرآباد: اذیت رسانی کے متاثرین کی صحت عالمی دن کے موقع پر تھیٹر پرفارمنس اور سیمینار کا انعقاد

جون 28، سکھر: 'مقامی حکومت میں خواتین کا کردار' پر سیمینار

جون 28-29، قلعہ سیف اللہ: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروع' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ کا اہتمام۔

جولائی 1، بٹ گرام: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی: پر عوامی اجلاس

جولائی 2، ہری پور: 'نوجوانوں کے حقوق اور اُن سے متعلق پالیسی، کو زیر بحث لانے کے لیے

میٹنگ کا اہتمام

جولائی 2-3، چاغی: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

جولائی 3، تورغر: منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی پر عوامی نشست

ش مظفر گڑھ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن سے تعلق رکھنے والے وکلاء سے ملاقات میں اُن کے ساتھ انسانی حقوق کے معاملات پر تبادلہ خیال کیا گیا۔

جولائی 18، کوئٹہ: ایچ آر سی پی نے سینیٹ کے انتخاب کا مشاہدہ کیا۔

جولائی 19، ملتان: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

جولائی 19، حیدر آباد: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

جولائی 20، وہاڑی: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

جولائی 21، سانگھڑ: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

جولائی 22، خانیوال: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

جولائی 28، ملیر: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست 1، ملتان: یوم ہیروشیما پر ملتان ڈسٹرکٹ بار کے وکلاء سے ملاقات۔ ملاقات کا مقصد وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے اسلحہ جات کے اثرات پر تبادلہ خیال کرنا تھا۔

اگست 14، اسلام آباد: اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون اور اُن کی بیوی بان سُون تیک نے ایچ آر سی پی کے دفتر کا دورہ کیا۔

اگست 15، عمر کوٹ: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست 16، مٹھی: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست 17، بدین: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست 22، کوئٹہ: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست 17، کراچی: اپنے عقائد کے باعث غیر محفوظ کمیونٹیوں پر ایچ آر سی پی کے ماہرین گروپ کا اجلاس 11 مئی کے عام انتخابات کے تناظر میں اجلاس کا ایجنڈا، ''پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کے سیاسی حقوق اور نمائندگی'' تھا۔

انسانی حقوق کے معاملات سے متعلق آ گہی بڑھانے کے لیے ضلعی سطح کا ایک اجلاس

اگست **17-18**، مردان: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ کا اہتمام

اگست **21**، مالاکنڈ: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست **22**، کراچی: ایچ آر سی پی کے ایک وفد نے رینجرز کے نمائندوں سے ملاقات کی۔ ملاقات کا مقصد فورس کی جانب سے انسانی حقوق کی مبینہ خلاف ورزیوں کو زیر بحث لانا تھا۔

اگست **22**، دیر بالا: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست **23**، دیر زیریں: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست **23**، ملتان: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست **24**، زیارت: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست **28**، جام شورو: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست **30**، کراچی: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست **30**، شانگلہ: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اگست **30** حیدر آباد: 'جبری غائب کیے گئے افراد کے عالمی دن' کے موقع پر ایچ آر سی پی نے سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے تعاون سے ایک سیمینار کا اہتمام کیا۔

اگست 31، کوہستان: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پرعوامی اجلاس

اگست 31۔ستمبر 1، راجن پور: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقداراورانسانی حقوق کافروغ' پردوروزہ تربیتی ورکشاپ

ستمبر 7-8، لاہور: پبلک ایجوکیشن کا اہتمام۔ پاکستان بھر سے ماہرین تعلیم کو مدعو کیا گیا تھا۔

ستمبر 10، ملتان: سیاسی اور سماجی کارکنوں کو 'جمہوریت اور شہریوں کا کردار' کے موضوع پر منعقد ہونے والی ایک مشاورتی تقریب میں شریک ہونے والی ایک مشاورتی تقریب میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا تھا۔تقریب کا اہتمام ملتان میں ہوا تھا۔

ستمبر 11، لورالائی: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پرعوامی اجلاس

ستمبر 11، چترال: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پرعوامی اجلاس

ستمبر 12، چترال: ''نوجوانوں کے حقوق اور اُن سے متعلق پالیسی' پرایک اجلاس منعقد کیا گیا۔

ستمبر 12، ہرنائی: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پرعوامی اجلاس

ستمبر 14-15، سکردو: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پردوروزہ تربیتی ورکشاپ

ستمبر 17-18، کراچی: انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے تعاون سے 'گروی مزدور اور قوانین

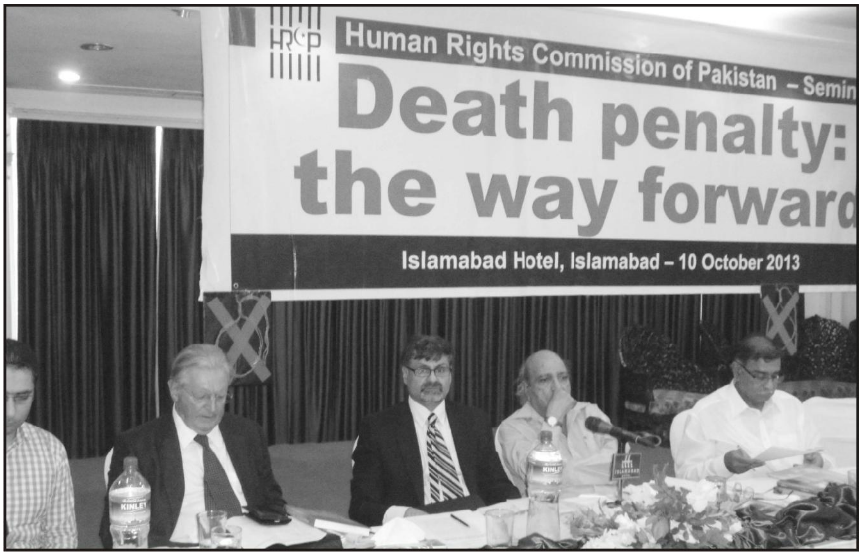

اسلام آباد: موت کی سزا پر منعقدہ سیمینار

ملتان: پانی کے عالمی دن پر ایک واک

مزارعت' پر دوروزہ مشاورت کا اہتمام کیا گیا۔

ستمبر 19-18، استور: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسایت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

ستمبر 20، نصیرآباد: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

ستمبر 21، جعفرآباد: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

ستمبر 21، ٹانک: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

ستمبر 22-21 ہنزہ نگر: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

ستمبر 22، ڈی آئی خان: 'نوجوانوں کے حقوق اور اُن سے متعلق پالیسی' پر ایک اجلاس کا اہتمام

ستمبر 22، خانیوال: 'نوجوانوں کے حقوق اور اُن سے متعلق پالیسی' پر ایک اجلاس کا اہتمام

ستمبر 23، ملتان: گلزار ٹاؤن ملتان میں ایک کمیونٹی میٹنگ کی گئی جس کا مقصد خواتین کی خودمختاری میں حائل سماجی رکاوٹوں کو زیر بحث لانا تھا۔

ستمبر 26، مظفرگڑھ: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

ستمبر 27، نوشکی: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

ستمبر **28**، لورالائی: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اکتوبر **6**، خیرپور: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اکتوبر **7**، شکارپور: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اکتوبر **7**، سکھر: غیرت کے نام پر قتل کے متعلق آگاہی دینے کے لیے ایک سیمینار کا اہتمام

اکتوبر **7**، لکی مروت: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اکتوبر **8**، گھوٹکی: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اکتوبر **8**، بنوں: 'نوجوانوں کے حقوق اور اُن سے متعلق پالیسی' پر ایک میٹنگ کا اہتمام

اکتوبر **9**، کرک: 'نوجوانوں کے حقوق اور اُن سے متعلق پالیسی' پر ایک میٹنگ کا اہتمام

اکتوبر **9**، سکھر: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

اکتوبر **9**، ملتان: ٹیکنیکل ٹریننگ کالج، ملتان میں انسانی حقوق کی آگاہی کی نشست منعقد کی۔

اکتوبر **9**، اسلام آباد: ایچ آر سی پی نے ''انتخابات میں مذہبی اقلیتیں: قانون برابری، عمل میں نہیں'' نامی رپورٹ کا اجراء کیا۔

اکتوبر **10**، اسلام آباد: ''پاکستان میں سزائے موت: آگے کی جانب پیش رفت'' پر سیمینار۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ایمریٹس برائے علم جرائم، ڈاکٹر راجر ہوڈ کا خصوصی خطاب تھا۔ دیگر مقررین میں

کوئٹہ: فوڈ سکیورٹی کے مطالبہ کے لیے ایک واک

وکلاءاورسول سوسائٹی کے کارکنان تھے۔

اکتوبر 12 مردان: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پرعوامی اجلاس

اکتوبر 13، بونیر: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پرعوامی اجلاس

اکتوبر 14، چارسدہ: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پرعوامی اجلاس

اکتوبر 25، کراچی: ''پاکستان میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور فرقہ واریت'' پر ایک لیکچر کا اہتمام۔

اکتوبر 26-27، ڈی آئی خان: 'انتہا پسندی کے انسداد سوز انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ کا اہتمام۔

اکتوبر 27، ملتان: تحصیل شجاع آباد، ملتان میں کسانوں کے ساتھ ایک نشست ہوئی۔ اس نشست کا مقصد اُن کے امور پر گفت وشنید کرنا اوراُنہیں ایک تنظیم کے قائم کرنے کے لیے متحرک کرنا تا کہ اُن کے مسائل کا ازالہ ہوسکے۔

اکتوبر 28، سبی: گورنمنٹ کالج میں 'نوجوانوں کے حقوق اور اُن سے متعلق پالیسی' پر ایک عوامی اجلاس منعقد کیا گیا۔

اکتوبر 28، سبی: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پرعوامی اجلاس

اکتوبر 29، جھل مگسی: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پرعوامی اجلاس

اکتوبر 29-30، پشاور: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ' پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ۔

اکتوبر 30، سبی: کمیونٹی ہال جعفر کالج میں ''نوجوانوں کے حقوق اور اُن سے متعلق پالیسی'' پر ایک اجلاس کا اہتمام کیا گیا۔

اکتوبر 31، حیدرآباد: این جی اوز اور این جی اوز کے نمائندوں کے ساتھ ایک میٹنگ جس کا مقصد ہندو لوک گلوکار بھورو بھیل کی نعش قبر سے نکالنے اوراس کی بے حرمتی کرنے کے واقعے کو زیر بحث لانا تھا۔

نوشہرہ، سجاول ٹھٹہ: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پرعوامی اجلاس

25 نومبر، پشاور: پاک افغان یوتھ فورم کے نمائندوں کے ساتھ ملاقات

6-5 نومبر، خیر پور: 'انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ پر

کوئٹہ: گمشدہ افراد کے لیے قائم کیے گئے بھوک ہڑتالی کیمپ کا دورہ انسانی حقوق کے کمیشن کی ٹیم نے کیا

دوروزہ تربیتی ورکشاپ

نومبر 7، زیارت: ''نوجوانوں کے حقوق اور اُن سے متعلق پالیسی'' ایک اجلاس کا انعقاد

نومبر حیدرآباد: ایچ آر سی پی نے سندھ پروٹیکشن کلسٹر کے تعاون سے ''ہیومینٹیرین تناظر میں تحفظ، اور جی بی وی میڈیا ہدایات، پر نشستوں کا اہتمام کیا۔

نومبر 7-8، گھوٹکی: انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

نومبر 9-10، جیک آباد: انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

نومبر، خاران: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس نومبر 12، نوشکی: نوجوانوں کے حقوق اوران سے متعلق پالیسی پر اجلاس کا اہتمام

نومبر 16، لاہور: بین الاقوامی کمیشن ماہرین قانون کے تعاون سے اقوام متحدہ میں پاکستان کی شمولیت پر ایک مشاورتی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔

نومبر 19، چمن: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

نومبر 19، اسلام آباد: 'جوابدہی، قانون اور پالیسیاں' کے عنوان سے مشاورتی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔

نومبر 20 بولان: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

نومبر 22، ملتان: ایچ آر سی پی کے دفتر غذا کے حق اور غذائی تحفظ کے معاملات کو زیر بحث لانے کے لیے ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔

نومبر 23، لاہور: ایچ آر سی پی کے عملے کی استعداد سازی کے لیے ورکشاپ منعقد کی گئی۔ ورکشاپ میں ''رپورٹ رائٹنگ'' کو توجہ کا مرکز بنایا گیا۔

نومبر 29: ایچ آر سی پی نے 'غذائی تحفظ' پر ایک نشست کا اہتمام کیا۔

نومبر 30، ملتان: کسانوں کے حقوق پر قومی کنونشن کا انعقاد کیا گیا۔

نومبر 30-1 دسمبر، جہلم: انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

دسمبر 2-6، کراچی: بلوچستان، سندھ اور گلگت بلتستان سے ایچ آر سی پی کے ضلعی کوآرڈینیٹرز اور علاقائی کوآرڈینیٹرز کی تربیتی ورکشاپ منعقد کی گئی۔ تربیت میں ایسی نشستیں بھی تھیں جن میں شریک ہونے سے عملے کو عام جرم اور انسانیت دوست قانون یا انسانی حقوق کے قانون کی خلاف ورزی میں فرق سمجھنے میں مدد ملی۔ عملے کو انسانی حقوق کا مشاہدہ کرنے، رپورٹنگ کرنے اور سکیورٹی کے معاملات کا ادراک کرنے اور سکیورٹی کے منصوبے کی تیاری کی تربیت دی گئی تا کہ وہ خطرات میں کمی لاکر یا ان سے محفوظ رہتے ہوئے کام کو موثر انداز سے کر سکیں۔

دسمبر 3-4، اٹک: انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

دسمبر 4، کراچی: 'پاکستان میں جوابدہی قوانین اور پالیسیوں پر مذاکرہ' کا اہتمام کیا گیا۔

دسمبر 5، کراچی: 'پاکستان کی مذہبی اقلیتوں کو درپیش نئے چیلنجز اور ان کے ازالے کا طریقہ کار' پر تربیت کاروں کی چھ روزہ تربیتی ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔

دسمبر 5، کراچی: اپنے عقائد کے باعث غیر محفوظ کمیونٹیوں پر ایچ آر سی پی کے ماہرین گروپ کی میٹنگ منعقد ہوئی۔ نشست میں بحث کا مرکز ''پاکستان کی مذہبی اقلیتوں کو درپیش نئے چیلنجز اور ان کے ازالے کا طرائق کار'' تھا۔

جیلوں اور قیدیوں کی صورت حال جاننے کے لیے ایچ آر سی پی کی ٹیموں کا دورہ

دسمبر 7، لاہور: مصنفین اور فنکاروں کا قومی کنونشن منعقد ہوا۔

دسمبر 8، راولپنڈی: انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

دسمبر 9، لاہور: اذیت رسانی کے خلاف عالمی تنظیم کے تعاون سے ''کیٹ کے نفاذ پر مشاورت؛ مواقع اور رکاوٹیں'' کے عنوان سے ایک مشاورتی تقریب منعقد کی گئی۔ اس مشاورت کا مقصد اذیت رسانی کے خلاف کنونشن کے نفاذ کے لیے پاکستان کی جانب سے کی گئی پیش رفت کا جائزہ لیا تھا۔ وکلاء اور سول سوسائٹی کے اراکین نے تقریب میں شرکت کی تھی۔

دسمبر 9، حیدرآباد: انسانی حقوق کے عالمی دن کے موقع پر انسانی حقوق اور سماجی انصاف، پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔

دسمبر 9-13، لاہور: جنوبی پنجاب، خیبر پختونخوا اور فاٹا سے ایچ آر سی پی کے ضلعی مانیٹرز اور علاقائی کوآرڈینیٹرز کی تربیتی ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔

دسمبر 10، پشاور: انسانی حقوق کے عالمی دن کے موقع پر خواتین کے مسائل پر گفت وشنید کے لیے سول سوسائٹی کے کارکنوں، اساتذہ اور وکلاء کے ساتھ میٹنگ کی گئی۔

دسمبر 10، کوئٹہ: ''خواتین کی خودمختاری کے بغیر ترقی ممکن نہیں'' کے موضوع پر ایک سیمینار کا اہتمام

کیا گیا۔

دسمبر 10، چکوال: انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

دسمبر 14-15، ملتان: انتہا پسندی کے انسداد میں انسانیت دوست اقدار اور انسانی حقوق کا فروغ پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

دسمبر 16، کراچی: پاکستان میں انسانی حقوق کے عالمی منشور کے نفاذ پر گفت وشنید کی گئی۔

دسمبر 17، کراچی: ایچ آر سی پی سندھ چیپٹر نے روٹری کلب میں یوڈی ایچ آر پر لیکچر دیا۔

دسمبر 18، حیدرآباد: حیدرآباد میٹروپولیٹین کارپوریشن (سی ایم سی) کے مسیحی ملازمین کے ساتھ ملاقات کی گئی۔

دسمبر 19، مظفر گڑھ: نوجوانوں کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں سے متعدد پالیسی پر ایک اجلاس منعقد کیا گیا۔

دسمبر 28، ڈیرہ غازی خان: 'منتخب نمائندوں کے ساتھ شہریوں کی رابطہ سازی' پر عوامی اجلاس

دسمبر 29، ٹھٹھہ: نوجوانوں کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں سے متعدد پالیسی پر ایک عوامی اجلاس کا انعقاد

دسمبر 30، خیر پور: شاہ عبداللطیف یونیورسٹی میں ''نوجوانوں کے حقوق اور ان سے متعلق پالیسی'' پر گفت وشنید کرنے کے لیے اجلاس منعقد کیا گیا۔

فیکٹ فائنڈنگ مشن

مارچ 25، حیدرآباد: فیکٹ فائنڈنگ مشن کے اراکین نے ضلع حیدرآباد میں واقع گاؤں سومار میر بہار کا دورہ کیا جہاں قبضہ گیروں نے ایک شخص کو قتل اور دیگر دو کو زخمی کر دیا تھا۔ تحقیقات سے ظاہر ہوا تھا کہ پولیس قبضہ گروپوں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

جون 3، میر پور خاص: ایچ آر سی پی نے ایک خاتون کی خودکشی کے واقعے کے حقائق کی چھان بین کی جس نے سی آئی ڈی پولیس کے اہلکاروں کی بدسلوکی اور تضحیک سے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کی تھی۔

جون 22-25، کوئٹہ، گوادر: ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے بلوچستان میں انسانی حقوق کی

صورتحال اور نظم ونسق کا جائزہ لینے کے لیے وہاں کا دورہ کیا۔خاص طور پر طالب علموں پر ہونے والے حملے اور 11 مئی کے انتخابات کے بعد صوبائی حکومت کی تبدیلی کے تناظر میں۔

ستمبر 7، دادو: ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے ضلع دادو کے علاقے کوٹڑی میں سکیورٹی فورسز کے ہاتھوں افضل پنہور کو جبری غائب کیے جانے اور ان کے قتل کے واقعے کی چھان بین کی۔انہیں ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا تھا۔

اکتوبر 26-30، سکردو، گلگت، ہنزہ نگر: ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے گلگت بلتستان میں انسانی حقوق کی صورتحال اور نظم ونسق کا جائزہ لینے کے لیے وہاں کا دورہ کیا۔

نومبر 20، ہری پور: ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے اس واقع کے حقائق کی چھان بین کی کہ ہری پور سنٹرل جیل کے قیدیوں کو جیل کے محافظوں نے تشدد کا نشانہ کیوں بنایا تھا اور انہیں مناسب طبی علاج کے بغیر ایک الگ کمرے میں کیوں رکھا تھا۔ایچ آر سی پی کو معلوم ہوا کہ قیدیوں کو اس وجہ سے شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ انہوں نے اپنی شکایات کا اظہار کیا تھا۔

دسمبر 17، چارسدہ: ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے ایک خاتون کا اتہ پتہ معلوم کیا جس کے بھائی نے اس کے خاوند کو قتل کر دیا تھا۔خاتون کے خاوند نے مبینہ طور پر اسے فروخت کر دیا تھا اور اس کے 12 سالہ بھائی نے انتقام میں اس کو قتل کر دیا۔لڑکے کو گرفتار کر لیا گیا تھا مگر اس وقت کسی کو بھی اس کی بہن کے حال احوال کا علم نہیں تھا۔ایچ آر سی پی کو معلوم ہوا کہ وہ اپنے والد کے پاس رہائش پذیر تھی۔

دسمبر 21، پشاور: ایچ آر سی پی پشاور چیپٹر نے ایک جوان ہندو خاتون کے اغواء کے وقوعے کی چھان بین کے لیے ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن تشکیل دیا۔مبینہ طور پر پولیس متاثرہ خاتون کے ساتھ تعاون نہیں کر رہی تھی کیونکہ ان کی مالی حیثیت کمزور تھی۔حکام اور پولیس کے ساتھ گفت وشنید کے بعد ایف آئی آر درج کر لی گئی۔

احتجاجی مظاہرے/ ریلیاں/ دورے

جنوری 10، حیدرآباد: ایچ آر سی پی کی ایک ٹیم نے تضحیک مذہب کے واقعے کی چھان بین کے لیے سیتا ٹاؤن کا دورہ کیا۔

جنوری 26، حیدرآباد: ہوسری میں ہاری کیمپ کا دورہ کیا اور رہائی پانے والے گروی مزدوروں سے ان مسائل پر گفت وشنید کی گئی۔

جنوری 27، کراچی: پاک۔بھارت دوستی اور علاقے میں امن کے لیے شمعیں جلائی گئیں۔

فروری 12، اسلام آباد: ایچ آر سی پی نے ویمن ایکشن فورم (ڈبلیو اے ایف) آئی ایچ آئی، ای وی اے ڈبلیو/ جی اور پی آر ایچ آر کے ساتھ مل کر فاطمہ جناح ایف۔9 پارک میں خواتین کا قومی دن منایا۔ ایچ آر سی پی کے سٹال پر آنے والے افراد کو معلوماتی مواد اور کتابیں فراہم کی گئیں۔

08 مارچ، حیدر آباد: خواتین کے عالمی دن پر واک اور سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔

مارچ 10، کراچی: لاہور کے علاقے بادامی باغ میں مسیحی برادری پر تشدد کی مذمت کے لیے کراچی پریس کلب میں احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔

مارچ 14، حیدر آباد۔ ایچ آر سی پی نے ہمدم اور عوامی ورکرز پارٹی کے ہمراہ سماجی کارکن اور اورنگی پائلٹ پراجیکٹ کی ڈائریکٹر پروین رحمان کے قتل کی مذمت کے لیے احتجاجی مظاہرہ نکالا۔

14 مارچ، پشاور: گورنمنٹ مینٹل ہسپتال پشاور کا دورہ کیا گیا تا کہ مریضوں کے علاج، ہسپتال کی استعداد اور انفراسٹرکچر کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکیں۔

15 مارچ، پشاور: ایچ آر سی پی کی ایک ٹیم نے جلوزئی کیمپ کا دورہ کیا۔ دورے کا مقصد اندرون نقل مکینوں کی حالت کا جائزہ لینا اور تازہ ترین کوائف اکٹھا کرنا تھا۔

مارچ 22، ملتان: پانی کا عالمی دن منایا گیا اور پانی کے حق میں ایک احتجاجی ریلی نکالی گئی۔

مارچ 29، حیدر آباد: انسانی حقوق کے کارکن آفتاب احمد کے لیے تعزیتی ریفرنس منعقد کیا گیا۔

مئی 11، پشاور: پشاور، نوشہرہ اور مردان کے اضلاع میں پولنگ اسٹیشنوں کا دورہ کیا اور انتخاب کے دوران بے ضابطگیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے 13 انتخابی حلقوں کے رہنماؤں کے ساتھ رابطہ سازی کی۔

مئی 29، حیدر آباد: حیدر آباد پریس کلب میں غائب کئے گئے تین گروی مزدوروں کی بازیابی کے لیے احتجاجی مظاہرہ کیا۔

30 مئی، حیدر آباد: ایچ آر سی پی کی ٹیم نے قاسم آباد میں واقع غیر قانونی آبادی کا دورہ کیا جہاں آگ لگنے کے باعث 80 سے زائد لکڑی کی جھونپڑیاں تباہ ہو گئی تھیں۔

جون 14، حیدر آباد: ریل پاک حیدر آباد کے نزدیک ہوزری کیمپ اور بہان موزی کیمپ کا دورہ کی۔

جون 26، ملتان: اذیت رسانی کے متاثرین کی حمایت کے عالمی دن پر ایک ریلی کا اہتمام کیا اور اذیت رسانی کے متاثرین کے ساتھ اظہار یکجہتی کے طور پر شمعیں جلائی گئیں۔

جولائی 2، کوئٹہ: ایچ آر سی پی نے سی ایم ایچ کا دورہ کیا اور عباس ٹاؤن میں بم دھماکے کے متاثرین سے ملاقات کی۔

جولائی 8، پشاور: اندرون نقل مکینوں کی حالت زار کا جائزہ لینے اور کوائف اکٹھا کرنے کے لیے جلوزئی کیمپ کا دورہ کیا۔

اگست 1، اسلام آباد: ایچ آر سی پی نے انسانی حقوق اتحاد (آئی ایچ آئی) کے ساتھ مل کر نیشنل پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس کی جس میں الگ اور خود مختار وزارت انسانی حقوق کی بحالی کا مطالبہ کیا گیا۔

اگست 8، کوئٹہ: ایچ آر سی پی کی ایک ٹیم نے سی ایم ایچ اور پولیس لائن کا دورہ کیا۔ دورے کا مقصد کوئٹہ میں پولیس افسر کی نماز جنازہ پر ہونے والے حملے کے متاثرین سے ملاقات کرنا تھا۔

اگست 16،: ایچ آر سی پی نے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز (وی پی ایم پی) کی جانب سے پریس کلب کوئٹہ میں لگائے گئے بھوک ہڑتالی کیمپ کا دورہ کیا۔

ستمبر 6، کراچی: بلدیہ فیکٹری کے واقعے پر کراچی پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔

اکتوبر 10، حیدر آباد: سزائے موت کے خلاف عالمی دن پر ریلی نکالی گئی۔

اکتوبر 10، ملتان: سزائے موت کے خلاف عالمی دن پر کراچی پریس کلب کے مقام پر احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔

اکتوبر 28، بدین: ایچ آر سی پی کے ایک وفد نے ضلع بدین کے ایک گاؤں کا دورہ کیا جہاں ایک ہندو لوک فنکار کی قبر سے اس کی نعش نکال کر اس کی بے حرمتی کی گئی تھی۔

نومبر 7، حیدر آباد: ایچ آر سی پی نے بدین سے تعلق رکھنے والے ایک ہاری خاندان کے حق میں احتجاجی مظاہرہ نکالا تھا جسے ان کے زمیندار نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔

نومبر 17، حیدر آباد: ایچ آر سی پی کی ایک ٹیم نے ہوزری کیمپ کا دورہ کیا۔ دورے کا مقصد حال ہی میں رہائی پانے والے گروی مزدوروں سے ملاقات کر کے ان سے ان کے مسائل پر گفت وشنید کرنا تھا۔

دسمبر 28، حیدر آباد: ایچ آر سی پی نے بھوک کے خاتمے کے عالمی دن پر اولڈ کیمپس سے لے کر حیدر آباد پریس کلب تک مارچ کیا۔

نومبر 29، ملتان: خوراک کے عالمی دن پر ملتان میں ریلی کا اہتمام کیا۔

نومبر 29، لاہور: پنجاب اسمبلی سے لاہور پریس کلب تک ''بھوک کے خاتمے کے لیے مارچ'' کا اہتمام کیا گیا۔ مزدوروں کے حقوق کے لیے کام کرنے والے کارکنوں سمیت سول سوسائٹی کے افراد نے شرکت کی تھی۔

دسمبر 3، حیدرآباد: ایچ آر سی پی کی ایک ٹیم کے اراکین تنظیم برائے خصوصی سماجی بہبود کے اراکین کے پاس گئے جو حیدرآباد پریس کلب میں بھوک ہڑتال پر تھے۔

دسمبر 10، سکھر: انسانی حقوق کے عالمی دن پر ایک ریلی نکالی۔

دسمبر 10، ملتان: انسانی حقوق کا عالمی دن منایا گیا اور نواب شیر چوک، ملتان میں پرامن احتجاجی ریلی نکالی گئی۔

دسمبر 10، کوئٹہ: ایچ آر سی پی نے ''بھوک کے خاتمے کے لیے مارچ'' کے عنوان تلے ایک ریلی نکالی۔

دسمبر 10، حیدرآباد: پریس کلب حیدرآباد میں انسانی حقوق کا عالمی دن منایا گیا۔

دسمبر 21، حیدرآباد: ایچ آر سی پی کی ایک ٹیم نے لطیف آباد میں خواتین پولیس اسٹیشن کا دورہ کیا۔

دسمبر 25، حیدرآباد: ایچ آر سی پی کے ایک وفد نے بلوچ مظاہرین کے ٹھنڈی سڑک سے حیدرآباد بائی پاس نکالے جانے والے لانگ مارچ کو خوش آئند قرار دیا اور لانگ مارچ میں شرکت کی۔

جیل خانہ جات کے دورے

جنوری 4، ڈی آئی خان: قیدیوں کی حالت کا جائزہ لینے کے لیے سنٹرل جیل ڈی آئی خان کا دورہ کیا گیا۔

جنوری، 26 ملتان: ایچ آر سی پی کی خواتین اراکین نے ملتان میں خواتین کی جیل کا دورہ کیا تاکہ وہاں کے قیدیوں کے حالات کا جائزہ لیا جا سکے۔

جنوری 31، ہری پور: ایچ آر سی پی پشاور دفتر کے اراکین نے قیدیوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے سنٹرل جیل ہری پور کا دورہ کیا۔

نومبر 5، کراچی: کراچی سنٹرل خواتین و بچوں کی جیل کے حالات معلوم کرنے کے لیے ایک سروے کیا گیا۔

نومبر **12**،ملیر: ضلع ملیر میں مردوخواتین کی جیلوں کے حالات جاننے کے لیے سروے کیا گیا۔

نومبر **19**،حیدرآباد: سنٹرل جیل حیدرآباد میں خواتین اور بچوں کے وارڈ کا دورہ کیا۔

دسمبر **10**،نوشکی: ایچ آر سی پی کی ٹیم نے ڈسٹرکٹ جیل نوشکی کا دورہ کیا۔

دسمبر **11**،سکھر: ایچ آر سی پی کی ٹیم نے سنٹرل جیل سکھر کا دورہ کیا۔

دسمبر **12**،مستونگ: ایچ آر سی پی کی ٹیم نے سنٹرل جیل مستونگ کا دورہ کیا۔

دسمبر **18**،راولپنڈی: ایچ آر سی پی کے شریک چیئرپرسن کی سربراہی میں چھ اراکین کی ایک ٹیم نے اڈالیہ جیل کا دورہ کیا۔

دسمبر **20**،حیدرآباد: ایچ آر سی پی حیدرآباد دفتر نے ناراجیل حیدرآباد میں ایک سروے کیا۔

شکایات سیل

ایچ آر سی پی نے زیرتجزیہ سال کے دوران 16,00 شکایات موصول کیں۔ ان شکایات کی موضوع وار ترتیب ذیل میں دی گئی ہے۔

شکایات کی نوعیت	تعداد
پولیس/انتظامیہ کا تجاوز	626
غیرریاستی عناصر/عوامل کا تجاوز	512
حقوق نسواں کی خلاف ورزی/گھریلو تشدد	264
متفرق	158
کل	1600
حکام کو لکھے گئے خطوط	610
موصول جوابات	204

ویب سائٹ

ایچ آر سی پی کی ویب سائٹس (ww.hrcp-web.org) پر اس کی مطبوعات، بشمول ماہنامہ میگزین ''جہدحق''، تنظیم کی طرف سے جاری کردہ صحافتی بیانات اور ایچ آر سی پی کے مشن اور سرگرمیوں کے بارے میں معلومات کے الیکٹرانک ورژن دستیاب ہیں۔ ویب سائٹ کے آن لائن آرکائیو سیکشن تک رسائی

اس پتے پر پائی جاسکتی ہے۔

www.hrcparchive.com

مطبوعات

- ☆ ایچ آر سی پی سالانہ رپورٹ: انسانی حقوق کی صورتحال سال 2012 (انگریزی/اردو)
- ☆ بلوچ غائبستان میں بلوچ
- ☆ جمہوریت کے استحکام کی طرف پیش رفت
- ☆ امن کے لیے موقع۔ فیکٹ فائنڈنگ مشن کی رپورٹ
- ☆ قانون میں مساوی۔ عمل میں غیر مساوی
- ☆ قومی معیشت، انسانی حقوق اور غربت کا خاتمہ
- ☆ سزائے موت: پاکستان عالمی تناظر میں
- ☆ جب بارش ہوتی ہے۔ مذہبی اقلیتیں اور نئے چیلنجز
- ☆ مذہبی اقلیتوں کی سیاسی حمایت
- ☆ کیلنڈر 2014
- ☆ جہد حق: 12 ماہانہ شامرے
- ☆ غائبستان میں بلوچ
- ☆ عورتوں پر تشدد اور کاروکاری
- ☆ ادیب، فنکار اور نوجوانوں کے حقوق اور مسائل
- ☆ کھیت کھلیان اور دہقان

انٹرن شپ پروگرام

2013ء کے سرمائی انٹرن شپ کے تحت پانچ انٹرن منتخب کئے گئے۔ وہ تھے؛

- ☆ کامل چیمہ، ہارورڈ یونیورسٹی

  تحقیقی عنوان: بہتان، طعن و تشنیع، یا تحقیر
- ☆ جنید عالم، لاہور یونیورسٹی آف منیجمنٹ سائنسز

تحقیقی عنوان: گلگت بلتستان پر فرقہ وارانہ تشدد کے اثرات

☆ رابعہ خان: آکسفورڈ بروکس یونیوسٹی

تحقیقی عنوان: پاکستان میں ڈرون حملوں کے اثرات (سماجی، سیاسی اور معاشی اثرات)

☆ زہرہ سہیل خان، لاہور سکول آف اکنامکس

تحقیقی عنوان: گھریلو تشدد کے بارے میں لاہور کی شہری آبادی کے خیالات اور رویہ جات

☆ شایان ملک، یونیورسٹی آف لندن

شکایت سیل سے وابستہ انٹرن

ضمیمہ - 2

اہم مسائل پر کمیشن کا مؤقف

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے 2013ء میں ایسے واقعات اور معاملات پر تبصروں اور آراء کا سلسلہ جاری رکھا جو عوام کے حقوق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ 2013ء کے دوران کمیشن نے اہم مسائل پر جو مؤقف اختیار کیے ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

اظہار رائے کی آزادی

28 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے میران شاہ، جنوبی وزیرستان میں صحافی ملک ممتاز کے قتل کی شدید مذمت کی ہے۔ ایچ آر سی پی نے کہا ہے کہ مذکورہ قتل سے معلوم ہوتا ہے کہ صحافیوں کے خلاف بڑھتے ہوئے تشدد کا پریشان کن سلسلہ جاری ہے۔ سال 2013 کے پہلے دو ماہ کے دوران قتل ہونے والے یہ پانچویں صحافی ہیں۔ اس سے شعبہ صحافت کو درپیش خطرات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ 2012 میں بھی کم از کم 10 صحافی قتل کر دیئے گئے تھے۔ ایچ آر سی پی کے خیال میں مذکورہ ہلاکت سمیت تمام دیگر صحافیوں کا قتل ذرائع ابلاغ پر براہ راست حملے کے مترادف ہے۔ اس حوالے سے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے اقدامات مکمل طور پر غیر موثر ہیں کیونکہ صحافیوں پر حملوں کا سلسلہ جاری ہے اور حملہ آوروں کو سزا سے استثنیٰ حاصل ہے۔

عقیدے کی آزادی/فرقہ واریت

11 جنوری: انسانی حقوق کمیشن برائے پاکستان (HRCP) مینگورہ اور کراچی میں ہونے والے حملوں اور کوئٹہ میں ہونے والے مسلسل بم دھماکوں میں 100 سے زیادہ لوگوں کی ہلاکتوں پر جن میں ہزارہ

شیعہ غالب تعداد میں ہیں، شدید ملامت کرتا ہے اور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ حکومت اس قتل و غارت سے ہونے والے ہنگامے پر قابو پانے کے لیے فوری طور پر اقدامات کرے۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا کہ 2013 کے ابتدائی دنوں میں، انسانی حقوق کمیشن برائے ملک میں دوسری بار بڑے پیمانے پر ہونے والے فرقہ وارانہ قتل و غارت کی وجہ سے شدید رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ کوئٹہ میں ہونے والے دو بم دھماکوں میں کوئٹہ کی ہزارہ کمیونٹی کے اراکین کے سنگ دلانہ قتل اب تک پاکستان میں ہونے والے کسی بھی فرقہ وارانہ حملے میں ایک دن میں ہونے والے قتلوں سے زیادہ ہیں۔ ان ظالمانہ حملوں پر بظاہر کسی دکھ کے اظہار کا نہ ہونا اور قاتلوں کو فوری طور پر گرفتار کیے جانے کی کوشش نہ ہونے نے ملک اور ملک سے باہر انسانی حقوق کی تنظیموں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ریاست کو اگر مکمل طور پر قصوروار نہ بھی ٹھہرائیں تو بھی اس کو اس میں برابر کا شریک ضرور سمجھیں، کیونکہ زیادہ سے زیادہ شیعہ عقیدہ رکھنے والے شہریوں کو ان ہولناک حملوں میں کاٹ کر پھینکا گیا ہے۔

اگر حکومت فرقہ وارانہ قتل و غارت میں خوفناک بڑھوتڑی کو روکنے میں اپنی ناکامی اور اس کی اپنی رٹ کا بالکل نہ ہونے کے متعلق کوئی بھی بے چینی رکھتی ہے، تو اس نے اس کو چھپانے کی یقیناً بہت کوشش کی ہے۔ یہ بھی قابلِ غور معاملہ ہے کہ کس طرح کوئٹہ جیسے شہر میں حملہ آور سیکورٹی چیک پوسٹوں سے گزر جاتے ہیں اور اپنی مرضی سے حملے کرتے ہیں۔ جمعرات کو کراچی میں شرم ناک قتل و غارت اور مینگورہ میں بم کا پھٹنا اضطرابی کیفیت میں تیزی سے اضافے کی طرف نشاندھی کرتا ہے کیونکہ جنرل الیکشن قریب آ رہے ہیں۔ عوام پولیس اور سیکورٹی فورسز سے ان حملوں کی نوعیت اور ان کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے افراد کے اعداد و شمار کی معلومات کے علاوہ بھی بہت کچھ توقع کرتے ہیں۔ ایک بظاہر پابندی لگی ہوئی تنظیم نے کوئٹہ دھماکوں کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ اس تنظیم اور دوسری اس طرح کی تنظیموں کے نیٹ ورکس اور پناہ گاہوں کو توڑنے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ ہوتا ہے ریاست کا دہشتگردوں کے لیے نرم رویہ بھی نظرانداز نہیں کیا جانا چاہئے۔ صرف یہی ایک راستہ ہے کہ شہریوں میں اس یقین کو دوبارہ پیدا کیا جا سکے کہ ریاست ان کی زندگیوں کی محافظ اور ان کی بھلائی کے لیے ہوتی ہے۔

اس بات پر بھی سوچ و بچار ہونی چاہئے کہ کوئٹہ میں میڈیا کے لوگوں کو بچانے کے لیے کیا اقدامات کیے جا سکتے تھے، جب وہ پہلے دھماکے کی رپورٹ بنا رہے تھے جب دوسرا دھماکہ ہو گیا۔ بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ تشدد اور الیکشن سے متعلقہ تشدد جو کہ پاکستان کی جمہوری تاریخ میں یقینی طور پر بدترین ہے، کی وجہ اسلحے کا پھیلاؤ، معاشرے میں بے رحمانہ پن اور تمام متعلقہ اداروں کا بہت زیادہ رسک پر ہونا ہے۔ اس وجہ سے ہم یہ

بھی دیکھتے ہیں کہ صحافی اس چیز کا زیادہ نشانہ بن رہے ہیں۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق امید کرتا ہے کہ حکومت، میڈیا اور صحافیوں کی تنظیمیں ایسے مواقع پر کام کرنے والوں کے لیے ضابطہ تیار کرے اور شورش زدہ علاقوں میں رپورٹنگ کی تربیت کے ذریعے صحافیوں کو محفوظ کرنے کے لیے اقدامات کریں گی۔

18 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کوئٹہ میں ہونے والے بم دھماکے میں 80 سے زائد ہزارہ شیعوں کی ہلاکت کی شدید مذمت کی ہے اور ستم زدہ برادری پر حملوں کی کھلے عام ذمہ داری قبول کرنے والی جنگجو تنظیم لشکر جھنگوی کے خلاف کارروائی میں حکومتی ناکامی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا: بلوچستان کی مظلوم ہزارہ برادری کو پیش آنے والے حالیہ حادثے کی مذمت کرنے کے لیے ایچ آر سی پی کے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ گزشتہ کچھ ہفتوں سے ہم ہزارہ افراد کی خون ریزی کے واقعات کا مشاہدہ کر رہے ہیں جن پر میڈیا نے 'کوئٹہ المیہ' یا ہزارہ برادری کا قتل عام، کا لیبل چسپاں کیا ہے۔ ہفتہ کو کوئٹہ میں پیش آنے والا واقعہ جانی پہچانی جنگجو تنظیموں کے خلاف حکومتی کارروائی میں ناکامی کے نتائج کی نشاندہی کرتا ہے۔ مذکورہ واقعہ انسانی زندگی کو اہمیت دینے والے کسی بھی معاشرے کا سر شرم سے جھکانے کے لیے بھی کافی ہے۔ اس طرح کے معاشرے میں ایسا وقوعہ لوگوں کے دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دے گا۔ مگر پاکستان میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ خون ریزی کا تازہ ترین واقعہ انٹیلی جنس کی ناکامی کا نتیجہ ہے۔ مقتولین کے اہل خانہ اور سول سوسائٹی اس قسم کے غیر معقول بیانات کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو کہ تنقید سے بچنے کے لیے میڈیا کی زینت بنائے جا رہے ہیں۔ لوگ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ گزشتہ ماہ کوئٹہ میں ہزارہ برادری پر سنگین حملہ کے بعد اپنے بہیمانہ اقدامات کی کھلے عام ذمہ داری قبول کرنے والے سفاک قاتلوں کو قانون کے کٹہرے میں لانے کے لیے کیا اقدامات کئے گئے تھے۔

20 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کی چیئرپرسن زہرہ یوسف نے کہا ہے کہ ایچ آر سی پی نے صدر آصف علی زرداری اور وزیراعظم پرویز اشرف سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ہزارہ شیعوں کی جانوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ذاتی پیش قدمی کا مظاہرہ کریں۔ صدر آصف علی زرداری سے کوئٹہ کا دورہ کرنے کی اپیل بھی کی گئی ہے۔ رواں برس کے سات ہفتوں کے دوران کوئٹہ شہر میں ہزارہ شیعہ برادری کو خونریزی کے دو بڑے حملوں کا نشانہ بنایا گیا ہے جس میں 200 سے زائد افراد جاں بحق ہوئے۔ جبکہ پچھلے کچھ سالوں میں ہزارہ برادری کے سینکڑوں افراد مارے جا چکے ہیں۔ یہ معاملہ اب اتنی سنگین صورتحال اختیار کر گیا ہے کہ اس کا اعلیٰ ترین سطح پر نوٹس لیا جانا چاہئے۔ اس تشویش ناک صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری تجویز

ہے کہ ظلم کا نشانہ بننے والی برادری جو کہ ہلاکتوں کیخلاف دھرنا دیئے بیٹھی ہے، سے بات چیت کے نتائج سے ماورا ہو کر آپ آنے والے چند دنوں میں کوئٹہ کا دورہ کریں۔ آپ کے ماتحت حکام ہزارہ شیعوں کی ہلاکتوں کے ذمہ دار عناصر پر قابو پانے میں ناکام رہے ہیں مگر وہ عناصر آپ کی براہ راست مداخلت کے آگے سرِخم کرنے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔ آپ کے دورہ کوئٹہ سے عرصہ دراز سے ستم زدہ ہزارہ برادری کو تحفظ فراہم کرنے کے حکومتی عزم کی یقین دہانی بھی ہو جائے گی۔

04 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کراچی میں حالیہ دو بم دھماکوں کی مذمت کی ہے اور عقیدے کے باعث شہریوں کو نشانہ بنانے کے نہ ختم ہونے والے سلسلے پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔

ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا: ایک اور ہفتے میں ایک اور شہر کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ کراچی میں اتوار کو ہونے والے بم دھماکے شہریوں کو بیہمانہ ہلاکتوں سے تحفظ فراہم کرنے کے حوالے سے حکومت اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی ناکامی ایک اور ثبوت ہے۔ شہریوں کو ان کے عقیدے اور مسلکی شناخت کے باعث بیک وقت دو بم دھماکوں کا نشانہ بنایا گیا۔ حکومت نے حسبِ معمول مقتولین کے اور تباہ شدہ املاک کے لیے معاوضے کا اعلان کیا ہے۔ ایک روزہ یومِ سوگ کا اعلان کیا گیا اور پرچم کو نصف ستون پر لہرایا گیا۔ ان اقدامات سے متاثرین اور دیگر لاتعداد پاکستانیوں کے دکھ کا مداوا نہیں ہو سکتا جو سمجھتے ہیں کہ ریاست نے انہیں بے یارو مددگار چھوڑ دیا ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ فرقہ وارانہ قتل و غارت کی سازشوں کو ناکام بنانے پر شہریوں کی تعریف کرنے کی بجائے خون ریزی کے خاتمے کے لیے قاتلوں کی گرفتاری کو یقینی بنائے۔ اس طرح کی لگاتار اور بے معنی ہلاکتوں نے شکوک و شبہات کو جنم دیا ہے کہ سکیورٹی ایجنسیوں کے پاس خون ریز واقعات کو روکنے کی استعداد نہیں یا پھر وہ ان میں ملوث ہیں۔ ان حالات میں نااہلیت اور ملی بھگت میں انتہائی معمولی فرق ہوتا ہے۔

09 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے بادامی باغ میں 100 سے زائد مسیحی گھروں پر بے لگام حملے پر گہرے دکھ اور غصے کا اظہار کیا ہے۔ یہ صدمہ انگیز واقعہ ایک نوجوان مسیحی پر توہین رسالت کے الزام کے بعد پیش آیا۔

یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ پنجاب انتظامیہ نے گوجرہ اور شانتی نگر میں پیش آنے والے واقعات سے سبق حاصل نہیں کیا اور مصیبت میں گھری اقلیت کو تحفظ فراہم کرنے میں مکمل طور پر ناکام ثابت ہوئی ہے۔ واقعہ کی مکمل تفتیش کرنے کی بجائے، پولیس نے مسیحیوں کو گرفتار کیا اور مشتعل افراد جن کو باآسانی ٹی وی فوٹیج

کے ذریعے پہچانا جا سکتا ہے آزاد پھر رہے ہیں۔ مذکورہ حملہ غیر محفوظ کمیونٹی پر شرمناک حملوں کے سلسلے میں ایک نیا اضافہ ہے۔ یہ واقعہ ایک طرف معاشرے میں انتہا پسندی میں اضافے جبکہ دوسری طرف پولیس کی بے حسی اور نااہلی کی عکاسی کرتا ہے۔ نقصان کی تلافی کے لیے معاوضہ جاتی چیک دینا مسئلے کا حل نہیں ہے بلکہ ذمہ داروں کے خلاف سخت کارروائی کو یقینی بنایا جائے۔

یکم جولائی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے گزشتہ ہفتے کے دوران متعدد بم دھماکوں کے باعث شہریوں کی ہلاکت پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے اور ہزارہ برادری پر مشتمل علاقے میں واقع امام بارگاہ پر حملے کے باعث کم از کم 30 افراد کی ہلاکت کی شدید مذمت کی ہے۔

کمیشن نے اپنے ایک بیان میں کہا، ایچ آر سی پی کو کوئٹہ میں ایک بار پھر قتل عام کے واقعے پر شدید تشویش لاحق ہے۔ کمیشن اس امر کی واضح نشاندہی کرنا چاہتا ہے کہ حملہ نہ تو غیر متوقع تھا اور نہ ہی ناگزیر۔ کالعدم مسلح گروہ لشکر جھنگوی نے حملے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ مذکورہ حملہ کسی فرد کے لیے خلاف توقع بات نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ کون سی چیز حکام کو اس پر آمادہ کرے گی کہ وہ یکسوئی کے ساتھ قاتلوں کا تعاقب کریں۔ کیا کوئی سرخ لکیر ہے جسے عبور کرنا قاتلوں کے لیے باقی ہے جس پر حکام کارروائی کرنے پر مجبور ہوں گے۔ یا ایسا ہے کہ قتل عام کے واقعات میں کچھ وقفہ برپا ہونے سے چیر پھاڑ کے شکار پرامن شہری وقتی طور پر تمسخر کا نشانہ بننے سے بچ جاتے ہیں۔ لشکر جھنگوی کی جانب سے تقریباً ہر ہفتے ہونے والے حملوں کو ہم کب تک برداشت کر سکیں گے ماسوائے اس کے کہ کوئی شعوری طور پر گروہ کی تباہ کاریوں کو نظرانداز کرتا رہے۔

ایچ آر سی پی نے پشاور میں پیرا ملٹری فورس کے ایک قافلے پر حملے کے باعث 18 افراد کی ہلاکت کی مذمت بھی کی ہے۔ ایچ آر سی پی سیکیورٹی کے معاملات میں مہارت کا دعویٰ نہیں کرتا مگر اسے یقین ہے کہ غارت گری وقوع پذیر ہو جانے کے بعد ردعمل ظاہر کرنا کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ یہ حقیقت دہشت گردی کے خلاف موثر اقدامات کرنے کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے کافی ہے کہ دھماکہ خیز مواد اور بم سازی کی صلاحیتوں سمیت بڑے اور چھوٹے ہتھیار پورے ملک میں باآسانی دستیاب ہیں۔ ایچ آر سی پی کے خیال میں خفیہ معلومات پر مبنی جامع منصوبہ سازی نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ تاہم جس مسئلے پر قابو پانے میں دیر لگے گی وہ معاشرے میں بڑھتی ہوئی عدم رواداری ہے جس کا بدقسمتی سے مطلب یہ ہے کہ معصوم شہریوں کے قتل کی اتنی واضح مذمت نہیں کی جاتی جتنا قابل مذمت یہ جرم ہے۔ اس وقت تک موثر پیش رفت ناممکن ہے جب تک ایسے حملوں کی اتنی شدید مذمت نہ کی جائے جس کے یہ مستحق ہیں۔ ایچ آر سی پی کا سول سوسائٹی کی تنظیموں اور تمام شہریوں سے مطالبہ ہے کہ وہ ان حملوں کے خلاف اپنی آواز بلند کریں اور حکومت سے مطالبہ ہے کہ وہ بار بار ہونے والی غارت گری کا انسداد کرے۔

23 جنوری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے خسرہ کی وباء کے باعث اموات کی بڑھتی ہوئی تعداد پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ مذکورہ بیماری کے باعث گزشتہ چند ہفتوں میں تقریباً500 بچے ہلاک ہو چکے ہیں۔ ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ایچ آر سی پی کو اس امر پر تشویش ہے کہ سندھ میں سینکڑوں بچے خسرہ سے ہلاک ہو گئے ہیں اور فاٹا سمیت دیگر صوبوں سے بھی اموات کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ گزشتہ ماہ خسرہ کے باعث سینکڑوں ہلاکتیں پیش آنے کا سبب کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ریاست کے ویکسینیشن پروگرام میں بچوں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا یا ان کو دی جانے والی ویکسین موثر ثابت نہیں ہو سکی۔ اس قسم کے واقعے کی پہلے کہیں مثال نہیں ملتی اور یہ مکمل طور پر نا قابل قبول اور مجرمانہ امر ہے کہ اس دور میں بھی ہمارے بچے ایسی بیماری کے باعث موت کا شکار ہو رہے ہیں جس پر ویکسینیشن کے ایک شفاف پروگرام کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے۔ اب کئی مفروضے پیش کئے جا رہے ہیں؛ یہ کہ وباء کے پھیلنے کی وجہ اقوام متحدہ کی ایجنسیوں کی جانب سے ویکسین کی مقدار میں کمی ہونا ہو سکتی ہے یا ادویات کے معیار کو قائم رکھنے کے لیے مطلوبہ درجہ حرارت کو برقرار نہیں رکھا گیا۔ اگر یہ صورتحال تھی تو اس کا پہلے نوٹس کیوں نہیں لیا گیا؟ ایک بچے کی زندگی کا ضیاع بھی نا قابل تلافی نقصان ہے۔ اس کے باوجود ہلاکتوں کے ابتدائی واقعات پیش آنے کے بعد پورا مہینہ بیماری کے باعث بچے ہلاک ہوتے رہے ہیں۔ یہ ریاست کی ویکسینیشن مشینری پر بھی بہت بڑا دھبہ ہے۔ حکومت کو فوری طور پر ہنگامی ویکسینیشن پروگرام شروع کرنے چاہئیں تاکہ بچوں کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے۔

اجتماع کی آزادی

11 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے لاہور میں ڈاکٹروں پر پولیس تشدد اور سرکاری ہسپتالوں میں تعینات ڈاکٹروں اور حکام کے مابین پائی جانے والی کشیدگی پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ایچ آر سی پی کو لاہور میں ڈاکٹروں کو پولیس تشدد کا نشانہ بنائے جانے پر تشویش ہے جس کے نتیجے میں متعدد ڈاکٹر زخمی ہو گئے ہیں۔ کمیشن کا مطالبہ ہے کہ مظاہرین کے خلاف طاقت کا استعمال کئے بغیر معاملے کو سلجھایا جائے۔ ایچ آر سی پی کے خیال میں پرامن اجتماع اور احتجاج ایک اہم انسانی حق ہے جس کی خلاف ورزی نہیں ہونی چاہئے۔ اگرچہ لاٹھی کے ذریعے ہجوم کو کنٹرول کرنا پولیس کا روایتی طریقہ کار ہے، تاہم اگر ڈاکٹر امن عامہ میں خلل کا باعث بن رہے تھے تو انہیں پُرامن طریقے سے کنٹرول نہ کرنے کا عمل انتہائی افسوسناک امر ہے۔ عام شہریوں اور سول سوسائٹی کے لیے انتہائی پریشان کن بات ہے کہ ڈاکٹروں اور پولیس کے مابین کشیدگی تقریباً ایک ماہ سے جاری ہے جس کے باعث ڈاکٹروں کی جانب سے طبی سہولیات کی معطلی، مظاہروں کے دوران سڑکوں کی بندش اور پولیس اور ڈاکٹروں کے مابین

ہاتھا پائی کے نتیجے میں عام لوگ شدید مشکلات سے دوچار ہیں۔ایچ آر سی پی کی تمام متعلقہ فریقین سے اپیل ہے کہ اس مسئلے کو ذاتی دشمنی کا معاملہ نہ بنایا جائے۔ حکام کو چاہئے کہ وہ بغیر کسی تاخیر کے ڈاکٹروں کے ساتھ مذاکرت کریں اور اس بحران سے نکلنے کی راہ تلاش کریں۔

سزائے موت

14 جنوری: سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی سابق صدر محترمہ عاصمہ جہانگیر نے صحافتی حلقے میں اپنے ساتھ منسوب ہونے والے اس بیان کی سختی سے تردید کی ہے کہ 'دہلی اجتماعی جنسی تشدد کیس' کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ملزمان کو پھانسی دینے یا ان کے جنسی اعضاء کاٹنے کا مطالبہ کیا تھا۔انہوں نے یہ بات حال ہی میں لاہور میں منعقدہ ساؤتھ ایشیا میڈیا کانفرنس میں ان افراد کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا جو 'دہلی اجتماعی جنسی تشدد کیس' کے ملزمان کو بہیمانہ سزائیں دینے کا مطالبہ کررہے ہیں۔انہوں نے کہا کہ وہ کبھی بھی وحشیانہ سزاؤں کی حمایت نہیں کرسکتیں۔انہوں نے اپنے اس مطالبہ کا اعادہ بھی کیا کہ پاکستان میں سزائے موت ختم ہونی چاہیے۔

یکم جولائی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے صدر اور وزیراعظم سے مطالبہ کیا ہے کہ ملک کی جیلوں میں موجود سزائے موت کے قیدیوں کی پھانسی پر چار سال سے جاری پابندی کو برقرار رکھا جائے۔

اس ہفتے کے آغاز میں ایچ آر سی پی نے 30 جون کو پھانسیوں کی معطّلی سے متعلق صدارتی حکم کی معیاد ختم ہونے کے بعد صدر اور وزیراعظم سے پھانسیوں پر عائد غیر رسمی پابندی کی مدت کو بڑھانے کا مطالبہ کیا ہے۔ ایچ آر سی پی نے 2008 سے جاری روایت کے برعکس صدارتی حکم کے دوبارہ سے جاری نہ ہونے پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔

ایچ آر سی پی نے کہا کہ ملک کی جیلوں میں موجود سزائے موت کے 8,000 قیدیوں کے علاوہ ہزاروں ایسے ہیں جن پر سزائے موت والے جرائم کا الزام عائد کیا گیا تھا یا ان پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر پھانسیاں جاری رکھی گئیں تو پاکستان میں حکام کی جانب سے انسانی زندگیوں کے چھن جانے کا شدید خدشہ ہے۔

کمیشن نے کہا؛ ہم یہ نشاندہی کرنا چاہتے ہیں کہ جب سے حکومت نے 2008 کے آخر میں پھانسیوں پر غیر رسمی پابندی کی تھی اس وقت سے ایچ آر سی پی کی جانب سے سزائے موت کی دیرینہ مخالفت کی اہم وجوہات میں سے کسی ایک میں بھی تبدیلی نہیں آئی۔ جب حکومت نے 2008 میں پہلی مرتبہ پھانسیوں کو معطل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

کمیشن صدر سے یہ درخواست بھی کرتا رہا ہے کہ جب تک پھانسیوں پر باضابطہ پابندی کا اعلان نہیں کیا جاتا اس وقت تک پھانسی پر عارضی پابندی کی مدت میں توسیع کے لیے حکم جاری کیا جائے۔

05 جولائی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے پنجاب حکومت کو صوبے کی جیلوں میں موجود

سزائے موت کے قیدیوں کی پھانسی پر چار سال سے جاری پابندی کو برقرار رکھنے پر زور دیا ہے۔

اس ہفتے کے آغاز میں ایچ آر سی پی نے 30 جون کو پھانسیوں کی معطلی سے متعلق صدارتی حکم کی معیاد ختم ہونے کے بعد صدر اور وزیراعظم سے پھانسیوں پر عائد غیر رسمی پابندی کی مدت کو بڑھانے کا مطالبہ کیا ہے۔ ایچ آر سی پی نے 2008 سے جاری روایت کے برعکس صدارتی حکم کے دوبارہ سے جاری نہ ہونے پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔

پنجاب میں سزائے موت کے قیدیوں کی تعداد پاکستان بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ درحقیقت صوبے میں سزائے موت کے 6,000 قیدی موجود ہیں جو کہ دنیا بھر میں موجود سزائے موت کے مجرموں کی سب سے زیادہ تعداد میں سے ایک ہیں۔ وزیراعلیٰ پنجاب کے نام ایک خط میں ایچ آر سی پی نے کہا کہ پنجاب کی جیلوں میں موجود سزائے موت کے چھ ہزار قیدیوں کے علاوہ ہزاروں ایسے ہیں جن پر سزائے موت والے جرائم کا الزام عائد کیا گیا تھا یا ان پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر پھانسیاں جاری رکھی گئیں تو پاکستان میں حکام کی جانب سے زندگیوں کے چھن جانے کا خطرہ پنجاب میں سب سے زیادہ ہوگا۔

کمیشن نے کہا؛ ہم یہ نشاندہی کرنا چاہتے ہیں کہ جب سے حکومت نے 2008 کے آخر میں پھانسیوں پر غیر رسمی پابندی کی تھی اس وقت سے ایچ آر سی پی کی جانب سے سزائے موت کی دیرینہ مخالفت کی اہم وجوہات میں سے کسی ایک میں بھی تبدیلی نہیں آئی۔ جب حکومت نے 2008 میں پہلی مرتبہ پھانسیوں کو معطل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایچ آر سی پی کی جانب سے پاکستان میں سزائے موت کی مخالفت کی اہم وجوہات پر غور کرنا چاہئے اور پھانسیوں کو جاری رکھنے سے متعلق کسی بھی اقدام پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔

04 اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے پھانسی پر پابندی برقرار رکھنے کے حکومتی فیصلے کو خوش آئند اقدام قرار دیا ہے اور ملک میں سزائے موت کے نظام کی مکمل نظر ثانی کا مطالبہ کیا ہے۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ایچ آر سی پی حکومت کے اس بیان کو لائق تحسین قرار دیتا ہے کہ پھانسی پر عائد پابندی کو برقرار رکھا جائے گا۔ یہ خبر سزائے موت کے ہزاروں قیدیوں اور اُن کے اہل خانہ کے لیے کچھ حد تک تسکین کا باعث ہے بالخصوص اُن قیدیوں کے لیے جنہیں مستقبل قریب میں پھانسی لگنے کی توقع تھی۔

یہ حوصلہ افزاء امر ہے کہ حکومت نے دباؤ کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور نہ صرف قومی مفاد میں فیصلہ کیا ہے بلکہ انصاف کے تقاضوں کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ ایچ آر سی پی کو یہ جان کر نہایت خوشی ہوئی ہے کہ حکومت

نے اپنے اعلان میں ریاست کی جانب سے کیے گئے بین الاقوامی عہد و پیمان کا حوالہ دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کا تحفظ بھی فیصلے کی وجوہات میں شامل ہے۔

اگرچہ درست سمت میں یہ پہلا قدم ہے مگر اس کو بامعنی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان میں سزائے موت کے نظام کی مکمل نظرثانی کی جائے اور یہ کام جتنی جلدی کیا جائے اُتنا ہی بہتر ثابت ہوگا۔

10 اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی جانب سے منعقد ہونے والے سیمینار کے شرکاء اور مقررین نے سزائے موت کے عمومی اطلاق کی مخالفت کی اور اس امر پر بھی اتفاق رائے کا اظہار کیا کہ پاکستان کے ملکی قوانین میں دو درجن سے زائد جرائم نافذ سزائے موت کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

10 اکتوبر کو سزائے موت کے خلاف عالمی دن کے موقع پر ''پاکستان میں سزائے موت: آگے کی جانب پیش قدم'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے ایک روزہ سیمینار میں ملکی اور غیر ملکی مقررین نے سزائے موت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعینات پروفیسر راجر ہوڈ نے اپنے خصوصی خطاب میں سزا کے اطلاق اور سزائے موت کے خاتمے کی عالمی تحریک کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ جسٹس پراجیکٹ پاکستان سے وابستہ مریم حق ایڈووکیٹ نے نظام انصاف کی وسیع پیمانے پر ناکامی کے معاملے کو اجاگر کیا جس کا سامنا سزائے موت کے جرائم کے ملزمان کو کرنا پڑتا ہے۔ سروپ اعجاز ایڈووکیٹ نے وکیل صفائی کے تناظر سے فوجداری نظام انصاف میں پائے جانے والے نقائص کو بیان کیا۔ انیس جیلانی ایڈووکیٹ نے بچوں پر سزائے موت کے منفی اثرات کا جائزہ لیا اور سزائے موت کی مخالفت کی۔ اسلم خاکی نے اسلام کے نقطہ نظر سے سزائے موت کا جائزہ لیا اور اس بات پر اتفاق کیا کہ بہت زیادہ جرائم پر مختص سزائے موت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ آرتھر ولسن نے انتقام کی بجائے مصالحت اور اصلاح پر مبنی فوجداری نظام انصاف تشکیل دینے کا مطالبہ کیا۔

سیاسی عمل میں شرکت

10 اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کہا ہے کہ سپریم کورٹ کی جانب سے وزیراعظم کی گرفتاری کے حکم کے اجراء کے بعد جمہوری نظم ونسق کو لاحق خطرات میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ کمیشن نے منگل کو اپنے ایک بیان میں کہا؛ ''پاکستان کے بدقسمت عوام کی بدنصیبی کا اندازہ لگانا نہایت مشکل ہے جب ان کی ریاست شدید عدم استحکام کا شکار ہے اور وہ مکمل طور پر بلا جواز بھیانک ڈرامے پر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

ایک طرف ہم کوئٹہ کے مقتولین کو دفنا رہے ہیں اور بلوچستان کے لوگوں کو ایف سی کے رحم وکرم پر

چھوڑنے کے نتائج کا جائزہ لے رہے ہیں اور دوسری طرف پُر یقین مسٹر قادری غیر معقول گفتگو اور غلط حقائق کے ساتھ سامعین سے اپنے خطاب میں ایک بناوٹی مذہبی معاشرے کی تبلیغ کر رہے ہیں جسے متعدد مہذب اقوام بغاوت سے تعبیر کریں گی۔

ایچ آر سی پی قابل احترام عدالت کے زیر سماعت مقدمے کے میرٹ پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا مگر ہمیں یقین ہے کہ عدالتی فعالیت کے ذریعے سیاست کا انتظام وانصرام کرنے کی کوششیں دنیا کے کسی بھی حصے میں مفید ثابت نہیں ہوئیں۔ اگر اور کچھ نہیں تو عدالت کو ریاست پر اپنے فیصلوں کے اثرات کا جائزہ ضرور لینا چاہیے جس کے مفادات کے تحفظ کی وہ ذمہ دار ہے۔ سپریم کورٹ کے تمام احترام کے ساتھ، یہ بات یقینی ہے کہ وزیراعظم کی گرفتاری کا فیصلہ جمہوری رائے عامہ کی تنقید سے نہ بچ سکے گا۔

اتفاقاً یہ سب اس وقت ہو رہا ہے جب کہ عوام اگلے پانچ برسوں کے لئے اپنے نمائندوں کا انتخاب کرنے کے منتظر ہیں۔ ممکن ہے کہ بہت سے لوگ یہ کہیں کہ سپریم کورٹ نے جلتی پر تیل ڈالنے سے کچھ بڑھ کر ہی کیا ہے۔ یہ تمام حرکات پاکستان کے عوام کی جانب سے ریاست کے جمہوری کردار کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری کو مشکل بنا رہے ہیں۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق تمام سیاسی پارٹیوں سے امید کرتا ہے کہ وہ جمہوری ریاست کو اس افراتفری سے بچانے کے لیے اپنی ذمہ داری کا احساس کریں گی کیونکہ اس وقت جمہوری نظام کو پٹری سے اتارنے سے پاکستان کی سلامتی کے لئے خطرہ اور اگلی نسلوں کے مستقبل کی بیخ کنی ہوتی ہے۔ ان کو مل جل کر جتنی جلدی ممکن ہو انتخابات کرانے پر اتفاق رائے پیدا کرنا چاہئے جس سے لوگوں کو اس صورتحال سے جس کے لئے تمام ہی پارٹیاں ذمہ دار ہیں باہر نکلنے کے لئے راستہ ملے۔

05 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے الیکشن کی آمد کے موقع پر تسلسل سے ہونے والے واقعات پر تشویش کا اظہار کیا ہے جو کمیشن کی نظر میں لوگوں کے جمہوری حقوق کو سلب کرنے اور کوتاہ بین حلقوں کی حوصلہ افزائی کا سبب بنیں گے۔ ایک بیان میں کمیشن نے کہا ''عین اس وقت جب شہری یہ توقع کر رہے تھے کہ عام انتخابات کی آمد آمد مسلسل گراوٹ میں ایک وقفہ مہیا کرے گی، ملک بھر میں نئے المیے رونما ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ ان المیوں میں ملک کے شمالی حصہ سے سنگ سار کئے جانے کی خبر، فوجی ایجنسیوں پر تنقید کرنے کے حوالے سے بلوچستان کے شہرت یافتہ وکیل صلاح الدین مینگل کا اغواء، ملک بھر میں لاقانونیت کا دور دورہ، روز افزوں بے روزگاری اور ملک کے بڑے حصے میں ریاست کا گرتا ہوا اختیار شامل ہیں۔ ان نقصانات کو بھی کافی نہ سمجھتے ہوئے انتخابی امور کا بندوبست کرنے والوں نے لوگوں کو ان معاملات میں الجھا دیا ہے جو کہ غیر متعلقہ اور غیر ضروری ہیں۔ کاغذات نامزدگی کے نام پر ایک ڈرامہ رچایا جا رہا ہے۔

عام انتخابات کے امیدواروں سے ایسے سوالات کئے جا رہے ہیں جن کا قانون اور آئین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی سب سے بری مثال ایک مضمون لکھنے کی پاداش میں مسٹر ایاز امیر کو نااہل قرار دینا ہے۔ نااہلی کی لہر تیزی سے ایسی مضحکہ خیزی میں تبدیل ہو رہی ہے جس سے نہ صرف عوام کو اپنے نمائندگان کے انتخاب کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے بلکہ یہ فطری انصاف کے بنیادی اصول کے بھی منافی ہے۔ امیدواروں کی چھانٹی کا بلا جواز اقدام انتخابات کے بنیادی مقصد کو شکست سے دوچار کرنے کا سبب بنے گا اور تنازعات کو ہوا دینے اور سیاستدانوں کے مابین اختلافات پیدا کر کے رجعت پسند شرانگیزوں کے لیے راہ ہموار کرے گا۔

ایچ آر سی پی لوگوں کو اپنے حکمران چُننے کے حق سے محروم کرنے کی حالیہ سازش کی مذمت کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ الیکشن کمیشن کو خاموش تماشائی نہیں بنے رہنا چاہیے۔ ایچ آر سی پی یہ توقع بھی کرتا ہے کہ سیاسی جماعتیں جمہوری نظم و نسق کو مزید نقصان سے بچانے کے لیے فروعی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کریں گی۔ کمیشن کو خدشہ ہے کہ گزشتہ دنوں اور ہفتوں میں پیش آنے والے واقعات کی روک تھام نہ کی گئی تو ملک میں حقیقی جمہوریت کا حصول ایک ادھورا خواب بن کر رہ جائے گا۔

17 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے سیاسی رہنماؤں، کارکنوں اور ان کے امیدواروں پر حملوں اور ان کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں کی شدید مذمت کی ہے اور حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ سیاستدانوں کو تحفظ فراہم کرنے کا فریضہ سرانجام دے۔ کمیشن نے تمام سیاسی جماعتوں سے بھی مطالبہ کیا ہے کہ وہ تشدد کا یکے بعد دیگرے نشانہ بننے کی بجائے متحد ہو کر اس کا مقابلہ کریں۔

آج یہاں جاری ہونے والے بیان میں کمیشن نے کہا، پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کو ملک کے مختلف حصوں میں سیاسی رہنماؤں پر ہونے والے قاتلانہ حملوں پر شدید تشویش ہے جو متعدد ہلاکتوں کا باعث بنے ہیں۔ منگل کو پشاور میں عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) کے جلسہ پر ہونے والے بم دھماکے میں درجن بھر لوگ ہلاک ہوئے ہیں۔ اُسی دن بلوچستان میں پاکستان مسلم لیگ نواز شریف (پی ایم ایل۔ این) کے رہنما ثناء اللہ زہری کے قافلے پر ہونے والے حملے کے نتیجے میں ان کے بھائی، بیٹا اور بھتیجا ہلاک ہو گئے۔ اُس سے قبل حیدرآباد میں ایم کیو ایم کے ایک امیدوار کو ہلاک کیا گیا۔ کمیشن متاثرہ خاندانوں اور متعلقہ سیاسی جماعتوں سے تعزیت کا اظہار کرتا ہے۔ مذکورہ واقعات تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں جس پر قابو نہ پایا گیا تو انتخابی عمل سبوتاژ ہونے کا خدشہ ہے۔ انتخابی مہم سازی پر چھائی ہوئی خوف و ہراس کی فضا کے آزاد اور شفاف انتخابات پر شدید منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اگرچہ تمام سیاسی جماعتوں کو انتہا پسند عناصر کی جانب سے خطرات کا سامنا ہے مگر اس امر کے ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ بعض

جماعتوں کو دیگر کی نسبت زیادہ سنگین خطرات درپیش ہیں۔ کمیشن کے خیال میں اس لحاظ سے اے این پی شدید ابتر صورتحال میں گھری ہوئی ہے۔ اے این پی بیہمانہ اور لگاتار دہشت گردانہ سرگرمیوں کا نشانہ بن رہی ہے۔ گزشتہ چند دنوں سے سوات، شبقدر اور دیگر مقامات پر اے این پی کے امیدواروں اور کارکنوں پر حملے کئے جا رہے ہیں۔ کمیشن کا مطالبہ ہے کہ نگران حکومت تمام سیاسی قیادت اور سیاسی کارکنوں کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے تمام ضروری اور موثر اقدامات کرے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس حدف کو اپنی بنیادی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اسے سب سے پہلی ترجیح قرار دے۔ ایچ آر سی پی تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین سے توقع کرتا ہے کہ وہ جماعتوں کے مابین اختلاف کو نظرانداز کرتے ہوئے مذکورہ گھناؤنے حملوں کی مذمت میں یک جہتی کا مظاہرہ کریں گی۔

26 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے کراچی میں متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کے الیکشن دفتر کے باہر بم دھماکے اور تشدد کے دیگر واقعات کی شدید مذمت کی ہے اور بعض سیاسی جماعتوں کے امیدواروں، کارکنوں اور انتخابی مہموں کو نشانہ بنانے پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ایچ آر سی پی کراچی میں ایم کیو ایم کے الیکشن دفتر پر حملے کی شدید مذمت کرتا ہے۔ کمیشن کے خیال میں بعض سیاسی جماعتوں کے امیدواروں اور کارکنوں پر جاری حملے واضح طور پر جانبدارانہ سیاست کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان حملوں میں صرف مخصوص خیالات کی حمایت کرنے والی سیاسی جماعتوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ نشانہ زد تشدد کا سلسلہ جاری رہا تو انتخابات بے معنی ثابت ہوں اور ملک فسطائی طاقتوں کے ہاتھوں یرغمال بن جائے گا۔ نگران حکومت اور الیکشن کمیشن آف پاکستان (ای سی پی) نے امیدواروں اور انتخابی مہموں کے تحفظ کا متعدد بار عہد کیا ہے۔ اگر انہیں تحفظ فراہم کیا گیا تھا تو اس سے کوئی فرق پڑتا نظر نہیں آیا اور جماعتوں اور ان کے کارکنوں کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ملا بلکہ اس کے برعکس ان پر سوچے سمجھے حملے بلا روک ٹوک جاری ہیں۔ ایم کیو ایم اور عوامی نیشنل عوامی پارٹی (اے این پی) پر گزشتہ چند دنوں میں ہونے والے متعدد حملوں میں ملوث ایک بھی مجرم گرفتار نہیں ہو سکا جس سے حکام پر لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچ رہی ہے۔ ایچ آر سی پی نے چیف الیکشن کمشنر کو بھی اپنی شدید تشویش سے آگاہ کیا ہے اور ان سے مطالبہ کیا ہے کہ بعض سیاسی جماعتوں کے امیدواروں، کارکنوں اور انتخابی مہموں پر حملوں کو روکنے کے لیے اقدامات کئے جائیں اور اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ یہ جماعتیں حملوں کے خوف سے آزاد ہو کر اپنی انتخابی مہم چلا سکیں۔ ایچ آر سی پی تمام سیاسی جماعتوں کو موجودہ صورتحال پر ان کی خاموشی پر متنبہ کرتا ہے جو محض اس وجہ سے خاموش ہیں کہ حملوں کا نشانہ بننے والوں کا تعلق دیگر سیاسی جماعتوں سے ہے۔ اگر اس طرح کی قتل و غارت جماعتوں کے

مابین یک جہتی اور غارت گری پر یقین رکھنے والے عناصر کی مخالفت کرنے کا جذبہ پیدا نہیں کرسکتی تو کوئی بھی ذریعہ یہ جذبہ پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

10 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے انتخابی امیدواروں اور سیاسی کارکنوں کے قتل، ریلیوں اور انتخابی دفاتر پر حملوں اور سابق وزیراعظم مسٹر یوسف رضا گیلانی کے بیٹے کے اغواء سمیت انتخابات سے قبل تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات کی مذمت کی ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ پولنگ کے عمل کو مکمل تحفظ فراہم کرنے کے لیے حفاظتی انتظامات میں بہتری لائی جائے۔

عام انتخابات کے موقع پر جاری ہونے والے ایک بیان میں، ایچ آر سی پی نے کہا، موجودہ انتخابات ملکی تاریخ کے سب سے متشدد انتخابات ثابت ہوئے ہیں۔ ملک بھر میں انتخابی امیدواروں، ان کی انتخابی سرگرمیوں، ریلیوں اور سیاسی جماعتوں کے دفاتر کو نشانہ بنایا گیا ہے اور قبل از انتخاب تشدد کے باعث امیدواروں اور سیاسی کارکنوں سمیت 100 سے زائد افراد ہلاک کئے جا چکے ہیں۔شرانگیزوں کو اپنے اہداف کا انتخاب کرنے اور انہیں نشانہ بنانے کے حوالے سے کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہیں ہے۔ جمعرات کو ایک انتخابی ریلی سے سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے بیٹے کا اغواء ایک سنگین معاملہ ہے اور نسبتاً محفوظ سمجھے جانے والے سیاستدانوں کی غیر محفوظ حالت کی واضح نشاندہی کرتا ہے۔جنگجو انتہا پسندوں کی جانب سے قتل وغارت کی دھمکیوں کے علاوہ سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کے ایک دوسرے کے خلاف جاری پروپیگنڈہ مہم نے لوگوں کے جذبات کو ہوا دی ہے اور ان کے غصے و نفرت کو اس حد تک اشتعال دلایا ہے کہ مناسب انتظامات نہ کئے گئے تو پولنگ والے دن بہت زیادہ قتل وغارت ہونے کا خدشہ ہے۔موجودہ صورتحال سکیورٹی فورسز کے لیے آزمائش کی گھڑی ہے جو بہت عرصے سے انتخابات کے پُرامن انعقاد کو یقینی بنانے کے دعوے کرتے رہے ہیں۔تاحال ان کی کارکردگی عوام کا اعتماد حاصل نہیں کرسکی۔

انتخابات کے موقع پر ایچ آر سی پی کے لیے تشویش کا امر صرف یہ نہیں کہ بعض افراد کو دھمکیوں یا تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے مگر زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ جس طریقے سے اور جس پیمانے پر تشدد کا مظاہرہ کیا گیا ہے اس کے باعث انتخابات کی شفافیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔انتخاب کے دن ہونے والا تشدد معاملات کو مزید پیچیدہ کرے گا۔ ایچ آر سی پی توقع کرتا ہے کہ تمام ادارے ہفتہ کو ووٹروں، امیدواروں اور پولنگ اسٹیشنوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کریں گے تاکہ لوگ اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق استعمال کرسکیں۔

11 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے کہا ہے کہ اپنی زندگیوں کو درپیش خطرات کے باوجود

پاکستانی عوام نے جمہوریت پر اعتماد کا اظہار کیا جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کمیشن نے کراچی اور دیگر مقامات پر عوام کے حق رائے دہی میں مداخلت کرنے والے عناصر کی مذمت بھی کی ہے۔ پولنگ کے اختتام پر آج شام کمیشن کی طرف سے جاری ہونے والے بیان میں کہا گیا۔ حالیہ عام انتخابات میں پولنگ کی شرح میں قابل قدر اضافہ عوام کے جمہوری عمل پر یقین کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اپنی زندگیوں کو لاحق خطرات اور تشدد کے باوجود اپنے جمہوری فرض کی ادائیگی پر عوام خصوصی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ آج کے دن منتخب ہونے والے نمائندے جمہوری اُصولوں کا اسی عزم اور جذبے کے ساتھ احترام کریں گے جس کا مظاہرہ آج عوام نے کیا ہے۔ یہ امر انتہائی قابل افسوس ہے کہ امیدواروں کی نامزدگی اور اُن کے کاغذات نامزدگی کے مرحلے کے دوران انتخابات کی شفافیت پر لگنے پر سوالیہ نشانات میں آج شدت آئی ہے۔ کراچی اور چند دیگر مقامات پر انتخابی عمل کو جس طرح تہہ و بالا کیا گیا ہے اس کی مذمت ہی کی جاسکتی ہے۔

پولنگ کا بائیکاٹ کرنے والی جماعتوں کے تحفظات کا فوری اور غیر جانبدارانہ نوٹس لیا جائے اور تمام جائز شکایات کا ازالہ کیا جائے۔ لوگوں کے حق رائے دہی میں مداخلت کرنے والے تمام ذمہ داران کے خلاف کارروائی کی جائے۔ خواتین کو حق رائے دہی سے محروم کرنے والی جماعتوں کے خلاف کارروائی کرنے میں الیکشن کمیشن کی ناکامی کے لیے غالباً کسی قسم کی انکوائری کی ضرورت نہیں۔ ملک بھر میں انتخابی انتظامات ناکافی تھے اور بیشتر مقامات پر ووٹروں کی ضروریات کے حوالے سے نااہلی اور بےحسی دونوں کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ کئی مقامات پر پولنگ ایجنٹوں کے اغوا کے علاوہ ناقص سکیورٹی انتظامات کا مشاہدہ بھی کیا گیا ہے۔ کراچی میں بعض پولنگ اسٹیشنوں پر انتخابی ساز وسامان کی بروقت عدم فراہمی کے باعث پولنگ تقریباً دوپہر کے وقت شروع ہوئی جبکہ بعض پر (بالخصوص این اے 250 میں) پولنگ شام 6 بجے تک شروع نہ ہوسکی۔ سیاسی کارکنوں کی جانب سے دباؤ ڈالنے کا مشاہدہ بھی کیا گیا۔ لاہور میں پولنگ اسٹیشنوں کے لیے غیر موزوں عمارتوں کے انتخاب سے ووٹروں کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ کئی مقامات پر پولنگ اسٹیشنوں میں جگہ تنگ تھی، متعدد ضعیف اور معذور افراد کے لیے عمارتوں کی پہلی منزل پر واقع پولنگ بوتھ تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں چڑھنا نہایت تکلیف دہ تھا۔ علاوہ ازیں پولنگ اسٹیشنوں کے داخلہ / اخراج کے راستے بہت تنگ تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ متعدد مقامات پر تعینات پولنگ کا عملہ اچھی طرح تربیت یافتہ نہیں تھا اور ووٹروں کی بھیڑ پر قابو پانے کے اہل نہیں تھا۔ ان سب چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتخابی اصلاحات پاکستانی ایجنڈے میں سرفہرست ہونی چاہئیں۔ دریں اثنا اس اَمر پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ آج کے انتخابی نتائج کو عوام کی منشا تصور کرتے ہوئے تسلیم کرنا چاہیے اور عوام کو جمہوری نظام کی فراہمی کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تمام تر توانائیاں

بروئے کار لائی جائیں جس کے وہ مستحق ہیں اور جس کی انہوں نے ہمیشہ خواہش کی ہے۔

13 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے تمام سیاسی جماعتوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ 11 مئی کو کیے گئے عوام کے فیصلے کا احترام کریں اور کچھ بھی ایسا کرنے سے پرہیز کریں جو جمہوری نظام کو پٹڑی سے اتار سکے۔ اس بات پر زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ پورے ملک میں ایچ آر سی پی کے انتخابی جائزہ کاروں کو 11 مئی کو منظّم دھاندلی کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ سوموار کو جاری کردہ ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا:

''انتخابی نتائج پر کچھ سیاسی جماعتوں کے احتجاج کا نوٹس لیتے ہوئے ایچ آر سی پی تمام جماعتوں کو یاد دلانا چاہتا ہے کہ بہت کوشش کے بعد ملک میں جمہوری عمل کی تجدید کو تہہ وبالا نہیں کیا جانا چاہیے۔

ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایچ آر سی پی کو ملک میں کسی مقام پر بھی باضابطہ اور منظّم دھاندلی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہ بیان ایچ آر سی پی کی تمام ملک میں انتخابات کا مشاہدہ کرنے والی ٹیموں کی تحقیق پر مبنی ہے۔

ان ٹیموں کو 1988 سے اب تک ملک کے ہر انتخات میں مشاہدہ کرنے والے ایچ آر سی پی کے جائزہ کار کی اعانت حاصل تھی۔

ایچ آر سی پی کے الیکشن کے جائزہ کاروں نے بلاشبہ بعض جگہوں پر انفرادی طور پر بددیانتی کے واقعات کو محسوس کیا اور ایچ آر سی پی کو اس بات پر تشویش ہے کہ بلوچستان میں مناسب سکیورٹی کی عدم موجودگی کی وجہ سے انتخابی عمل بُری طرح متاثر ہوا۔ کچھ حلقوں سے بے ضابطگیوں کے متعلق سنگین قسم کی شکایات موصول ہوتی رہیں اور نتائج کے اعلان میں بہت زیادہ تاخیر بھی بے چینی کا سبب بنی۔ بلوچستان اور دوسری جگہوں سے موصول ہونے والی شکایت پر غیر جانبدارانہ طور پر توجہ مبذول کی جائے۔ تاہم لوگوں کو بے قاعدگی اور منظّم دھاندلی میں فرق کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ جو لوگ الیکشن میں ہار گئے ہیں وہ بغیر ثبوت کے الزامات کی بنا پر جذبات کو اشتعال دینے کی بجائے اپنی شکست کو خوش اسلوبی سے تسلیم کریں گے جیسا کہ عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) نے کیا۔

انتخابی نتائج اقتدار سنبھالنے والوں کے لیے بھی ایک تنبیہہ ہیں کہ لوگ ان کی کارکردگی اور نظم ونسق کا بھی جائزہ لیں گے۔

مزدوروں کے حقوق

13 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ بھارت کی بندرگاہ پر موجود بحری جہاز کے عملے کے پانچ افراد جن کا تعلق پاکستان سے ہے کی مدد کے لیے فوری

اقدامات کیے جائیں۔ مذکورہ افراد کو کئی ماہ سے ان کی تنخواہ ادا نہیں کی گئی اور ان کے پاس صرف چند دن کی خوراک باقی رہ گئی ہے۔

28 اپریل: گروی مشقت مخالف قومی اتحاد (این سی اے بی ایل) جو کہ گروی مشقت کے خاتمے کے لیے کام کرنے والی متعدد تنظیموں کا اتحاد ہے، نے آج یہاں اپنے جنرل باڈی کے اجلاس میں تمام سیاسی جماعتوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ملک میں سے ہر قسم کی غلامانہ سرگرمیوں کے خاتمے کے لیے اپنے پختہ عزم کا اظہار کریں۔ اتحاد کی جنرل باڈی نے اپنی قرارداد میں کہا:

گروی مشقت مخالف قومی اتحاد کی جنرل باڈی اپنے اجلاس میں آنے والے الیکشن کے ذریعے طاقت حاصل کرنے کی خواہاں سیاسی جماعتوں کی جانب سے ملک کے مزدور پیشہ طبقے بالخصوص گروی مشقت کرنے والے مزدوروں کی مشکلات پر انتہائی کم رنج اور مایوسی کا اظہار کرتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے پاس آئین کے آرٹیکل 3 پر توجہ دینے کا وقت ہی نہیں جو کہ ریاست کو استحصال کے خاتمے کے لیے کوششیں کرنے اور فرد کی سکت کے مطابق اس سے کام لینے اور ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق سہولیات فراہم کرنے کی ضمانت کا پابند کرتا ہے۔

یہ سیاسی جماعتیں ان مزدوروں کے استحصال سے لاعلم نہیں ہو سکتیں جو کہ زراعت، بھٹے کی صنعت، قالین بنانے والی فیکٹریوں اور کانوں میں غلامی کی مختلف حالتوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور نہ ہی وہ فیکٹری مزدوروں، بے زمین مزارعوں اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت زار سے انکار کر سکتے ہیں۔

این سی اے بی ایل نے تمام سیاسی جماعتوں سے مطالبہ کیا کہ وہ واضح اور پختہ عہد کریں کہ:

1۔ گروی مشقت چاہے جس شکل میں ہو اور جہاں بھی موجود ہو وہ اس کے خاتمے کے لیے مطلوبہ اقدامات کو ترجیح دیں گی۔
2۔ وہ زرعی اصلاحات لائیں گے اور حقیقی مزارعوں کو زمین فراہم کریں گی۔
3۔ وہ مزدوروں کی انجمن سازی سے متعلق آئی ایل او کنونشن 141 کی منظوری دیں گے اور اسے نافذ کریں گی۔
4۔ وہ آئی ایل کے تمام معاہدات بالخصوص کنونشن 11,100,98,87,138,105,29 اور 182 جن کی حکومت پاکستان نے منظوری دی ہے کو نافذ کریں گی۔

07 اگست: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے بلوچستان میں 13 مزدوروں

کے قتل کی شدید مذمت کی ہے جو کہ اطلاعات کے مطابق پنجاب سے تعلق رکھتے تھے اور عید کا تہوار منانے کے لیے اپنے گھر آ رہے تھے۔

ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا ''ایچ آر سی پی کو بلوچستان کے علاقے مچھ میں جنگجوؤں کے ہاتھوں 13 مزدوروں کے سفاکانہ قتل پر شدید تشویش ہے۔ اطلاعات کے مطابق وقوعے کی ذمہ داری قبول کرنے والے ایک جنگجو گروپ نے یہ مؤقف اپناتے ہوئے اِس اقدام کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے کہ مقتولین سکیورٹی فورسز کے لیے کام کرتے تھے۔ تاہم مقامی پولیس کی اطلاعات اِس مؤقف سے متضاد ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر یہ مسلّم حقیقت ہے کہ جنگجوؤں کی جانب سے مسافر بسوں سے اتارے جانے والے اور اغوا ہونے والے مذکورہ 3 افراد غیر مسلح تھے۔ اُن نہتے افراد کا قتل شدید قابل مذمت ہے اور جنگجوؤں کی صفوں میں بربریت اور بوکھلاہٹ کی عکاسی کرتا ہے۔ اگرچہ ایچ آر سی پی نے بلوچستان میں انسانی حقوق کے احترام کا بارہا مطالبہ کیا ہے تاہم یہ مطالبہ صوبے کے کشیدگی زدہ علاقوں میں تعینات سکیورٹی فورسز تک ہی محدود نہیں تھا۔ ایچ آر سی پی کا یہ بھی خیال ہے کہ اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کا دعویٰ کرنے والوں کو دوسروں کے بنیادی حقوق کا احترام بھی کرنا چاہیے اور انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں سے دستبردار ہونا چاہیے۔

02 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (HRCP) کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے دوسرے کسان کنونشن نے مطالبہ کیا ہے کہ زرعی اصلاحات کے راستے میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کیا جائے، کھیت مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے مناسب قانون بنایا جائے اور زرعی شعبے کو درپیش مسائل سے نپٹنے کے لیے ایک پانچ سالہ منصوبہ تیار کیا جائے۔

ملتان میں منعقد ہونے والے کنونشن میں ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والی کسان تنظیموں اور کسان دوست انسانی حقوق کے کارکنوں نے کسانوں کو درپیش مسائل کا جائزہ لیا۔ شرکاء نے گزشتہ سال ہونے والے کسان کنونشن کی سفارشات کی توثیق کرتے ہوئے ملک کے کسانوں کے مطالبات کو نئی شکل دی اور ایک 10 نکاتی ملتان اعلامیہ منظور کیا جس میں اگلے برس کسانوں کے حقوق کے تحفظ کی جدوجہد کے خدو خال واضح کیے گئے ہیں۔

قانون کی حکمرانی

17 جنوری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے خیبر ایجنسی میں تقریباً 20 شہریوں کے قتل کی شدید مذمت کی ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ متاثرہ خاندانوں کے ان الزامات کی شفاف اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائیں کہ مقتولین کو سکیورٹی فورسز کے اہلکاروں نے قتل کیا تھا۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ایچ آر سی پی خیبر ایجنسی کی تحصیل باڑہ میں تقریباً 20 افراد کے بیہمانہ قتل کی شدید مذمت کرتا ہے۔ مقتولین کے اہل خانہ ان کی نعشیں پشاور لائے جہاں انہوں نے گورنر ہاؤس اور بعدازاں پشاور پریس کلب کے باہر مظاہرہ کیا۔ مظاہرین کے مطابق مقتولین میں سے بیشتر نعشوں کی برآمدگی سے قبل فوج کی تحویل میں تھے۔ ہمارے خیال میں یہ سب سے سنگین الزام ہے جو کسی بھی سکیورٹی فورس پر عائد کیا جاسکتا ہے اور اس کی شفاف انداز اور اس طریقہ سے تحقیقات ہونی چاہیے جو مقتولین کے اہل خانہ کے اعتماد پر پورا اترے۔ ہر فرد کی حکومت اور سکیورٹی فورسز سے توقع ہے کہ وہ ہلاکتوں کے حالات کی فوری اور شفاف تحقیقات میں متاثرہ خاندانوں سے بھی زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کریں گے۔ ایچ آر سی پی کے لیے یہ امر حوصلہ افزاء ہے کہ پاکستان میں مظلومین کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور مظالم کے ازالے کے لیے پرامن راستہ اختیار کرنے کا سلسلہ بڑھ رہا ہے۔ تاہم ان لوگوں کی حالت زار کا اندازہ لگانا مشکل ہے جنہیں یقین ہے کہ مقتولین کو وہ متعلقہ حکام کی جانب سے انصاف کی کھلے عام یقین دہانی ہونے تک دفنانے سے انکار کر کے ہی انصاف حاصل کر سکتے ہیں۔ ارباب اختیار کو غور و فکر کرنا چاہیے کہ لوگ ایسا کرنے پر کیوں مجبور ہوئے اور اگر مزید لوگ یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تو حالات کس نہج پر پہنچ جائیں گے؟ لوگوں پر آنسو گیس پھینکنے اور لاٹھیاں برسانے کی بجائے ان کے مطالبات کو نرمی کے ساتھ سنا جائے اور اس انداز سے حقائق کو منظر عام پر لایا جائے جو متاثرین کے اعتماد پر پورا اتر سکے۔ ایچ آر سی پی اس امر کو خوش آئند قرار دیتا ہے کہ ہلاکتوں کی عدالتی تحقیقات کا حکم جاری کر دیا گیا ہے اور امید کرتا ہے کہ ماضی میں اسی نوعیت کی تحقیقات کے برعکس اس تحقیقات کو منظر عام پر لایا جائے گا۔

20 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے کراچی میں کشیدگی اور تشدد میں اضافے پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے اور تمام فریقین سے اپیل کی ہے کہ وہ معقول رویے کا مظاہرہ کریں اور ملک کو درپیش مشکلات کے ازالے پر توجہ مبذول کریں۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ایچ آر سی پی کو کراچی کی پُرتشدد صورت حال اور پاکستان تحریک انصاف سے تعلق رکھنے والی سینئر سیاستدان کے قتل پر تشویش ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ انتخابات کے نتیجے میں جنم لینے والے معاملات کو معقول اور غیر متشدد طرز عمل کے ذریعے اور جذبات کی رو میں بہے بغیر حل کر لیا جائے گا۔ ایچ آر سی پی کو کراچی میں زہرا شاہد اور بلوچستان میں ایچ آر سی پی کے پرانے کارکن پیر جان بلوچ کے دو نواسوں جنہیں مارچ میں اغوا کیا گیا تھا، کے قتل پر شدید دُکھ ہے۔ ایچ آر سی پی ہلاکتوں کا مورد الزام صرف گولی چلانے والوں کو نہیں ٹھہراتا بلکہ سیاست میں نفرت، تشدد اور دہشت گردی کو متعارف کروانے والے اور

فروغ دینے والے تمام عناصر بھی برابر کے ذمہ دار ہیں۔ کراچی کے حلقہ قومی اسمبلی 250 میں پولنگ کا عمل بالآخر پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے مگر اس کی کتنی قیمت چکانی پڑی؟ اس بحث میں پڑے بغیر کہ آیا دوبارہ پولنگ پورے حلقہ انتخاب میں ہونی چاہیے تھی یا نہیں، ایچ آر سی پی اس رائے کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ جس طریقے سے پولنگ ہوئی یہ نہ تو جمہوریت کے لیے قابل ستائش چیز ہے اور نہ آزاد انتخابات کے لیے مثبت پیش رفت ہے اور یہ ایک ایسی مثال نہیں جس کی دہرائے جانے کی خواہش کی جاسکتی ہے۔ ایچ آر سی پی کراچی کے تمام حلقوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تناؤ میں کمی لانے کے لیے پُرامن اور شائستہ رویے کا اظہار کریں گے۔ ہم یہ بھی توقع کرتے ہیں کہ شہریوں کے تحفظ کے ذمہ دار ادارے اور افراد بغیر کسی تاخیر کے اپنے فرض کا احساس کریں۔ پولنگ سے متعلقہ مسائل جتنی جلدی حل ہوں ملک کے لیے اُتنا ہی بہتر ہے کیونکہ انتخابی جھگڑوں پر اڑے رہنے کی بجائے خواہ یہ چند افراد کے لیے کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں، قوم کو درپیش دیگر سنگین نوعیت کے مسائل پر توجہ دینی چاہیے۔

15 جولائی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے رواں برس کے پہلے چھ ماہ میں کراچی میں تشدد کے باعث شہریوں کی ہلاکتوں میں اضافے پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ایک پریس ریلیز کے ذریعے میڈیا کو اعداد و شمار فراہم کرتے ہوئے ایچ آر سی پی نے کہا کہ جون 2013 کے اختتام تک کراچی میں جاری تشدد کے باعث تقریباً 1,726 شہری قتل ہو چکے ہیں۔ ایچ آر سی پی نے اس امر کو واضح کیا کہ تمام اعداد و شمار اخبارات کی اطلاعات پر مبنی ہیں۔ مقتولین میں وہ لوگ شامل ہیں جو فرقہ وارانہ تشدد اور ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنے، شہر سے جن کی نعشیں برآمد ہوئیں اور ایسے افراد جو تشدد کے واقعات کے نتیجے میں ہلاک ہوئے۔ ذرائع ابلاغ کی اطلاعات پر مبنی ایچ آر سی پی کے اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ برس اس عرصہ کے دوران کراچی میں تشدد کے باعث 1215 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ رواں برس کے ہر ماہ میں ہلاکتوں کی تعداد گزشتہ برس کے اسی عرصہ کے دوران پیش آنے والی ہلاکتوں سے زیادہ ہے۔

جنوری 2013 میں 291 افراد (جنوری 2012 میں 153)، فروری میں 271 (فروری 2012 میں 149)، مارچ میں 311، (مارچ 2012 میں 182)، اپریل میں 262 (اپریل 2012 میں 258)، مئی میں 278 (مئی 2012 میں 244) اور جون میں 313 (جون 2012 میں 229) افراد قتل ہوئے۔ اگرچہ گزشتہ برس تشدد کے باعث ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد اس برس کی نسبت کم تھی مگر 2013 میں جنوری سے جون تک کسی بھی ماہ میں یہ تعداد 250 سے کم نہیں ہوئی۔ 2012 کے صرف تین ماہ......اپریل، مئی اور جون میں مقتول شہریوں کی تعداد 200 سے زائد تھی۔ 2012 کے پہلے چھ ماہ میں سب سے زیادہ جون

میں 258افراد ہلاک ہوئے۔ 2013 کے چھ ماہ کے دورانیے میں 73افرادفرقہ وارانہ حملوں کا نشانہ بنے، 203افراد اغواء ہونے کے بعد قتل ہوئے۔ 547ایسے افراد قتل جن کی نمایاں سیاسی وابستگی نہیں تھی اور 178سیاسی کارکن (صرف جون میں 48) ہلاک ہوئے۔ 92پولیس اہلکاراور 18پیراملٹری فورسز اہلکار ہلاک ہوئے جبکہ شہر سے 101افراد کی نعشیں برآمد ہوئیں۔ 92افراد بم دھماکوں اور 41افرادلیاری گینگ وار کا نشانہ بنے۔ 49افراد ڈاکوؤں کے ہاتھوں جبکہ 57افراد پولیس مقابلے میں ہلاک ہوئے۔

ایچ آرسی پی نے کہا کہ کراچی میں ہر ماہ ہلاکتوں کی شرح میں اضافے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تشدد اور ہلاکتوں کے واقعات پر قابو پانا حکام کی ترجیحات میں شامل نہیں۔کمیشن نے کہا کہ امن عامہ میں بہتری لانے کی عدم صلاحیت یا غیر آمادگی، قاتلوں کی گرفتاری اور انہیں انصاف کے کٹہرے میں لانے میں ناکامی انتہائی سنگین اور ناقابل فہم امر ہے۔

ایچ آرسی پی نے اس امر پر تشویش کا اظہار کیا کہ بڑھتی ہوئی ہلاکتوں کو انسانی جانوں کے ضیاع کی بجائے محض اعداد وشمار کے طور پر لیا جا رہا ہے جس سے انسانی زندگی کے تحفظ میں ریاست کی ناکامی کی عکاسی ہوئی ہے۔کمیشن نے مزید کہا کہ مقتولین کے اہل خانہ اور معاشرے پر ان ہلاکتوں کے اثرات پر اتنی توجہ نہیں دی جارہی جتنی دینی چاہیے۔

26 جولائی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے خیبر ایجنسی کے علاقے باڑہ میں 20 مسخ شدہ نعشوں کی برآمدگی پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ متاثرین کی شناخت کے لیے اور ملک بھر میں جاری بدامنی کے انسداد کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں۔

ایچ آرسی پی نے کہا؛ باڑہ، خیبر ایجنسی میں 20افراد کی متعفن نعشوں کی برآمدگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک بالخصوص فاٹا میں انسانی زندگی کس حد تک غیر محفوظ ہے۔ اس سے قطع نظر کہ متاثرین کون ہیں، یہ اقدام معاشرے کی بربریت کی انتہائی بدترین مثال کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر مقتولین عام شہری ہیں تو پھر یہ ایک سنگین جرم ہے۔ اگر وہ جنگجو ہیں اور ہلاک کیے گئے ہیں اور سکیورٹی فورسز نے ان کی نعشوں کو ٹھکانے لگایا ہے تو پھر بھی مجرموں کے ساتھ نبٹنے کا یہ مہذب طریقہ نہیں ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مقتولین کا تعلق سکیورٹی فورسز سے ہو۔ اس حوالے سے پہلا کام مقتولین کی شناخت کا ہے اور ملک بھر میں جبری گمشدگی کے بے شمار متاثرین کی موجودگی میں یہ کام انتہائی مشکل ہے۔ اس سے جبری گمشدگی کے تمام واقعات کو فوری طور پر نمٹانے کی ضرورت بھی واضح ہوتی ہے۔ مذکورہ مقتولین کی موت کا سبب بننے والے حالات و واقعات جاننے کے لیے غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائیں تاکہ قاتلوں کی نشاندہی ہوسکے اور انہیں انصاف کے کٹہرے میں لایا جاسکے۔

08 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے پشاور میں ایچ آر سی پی خیبر پختونخوا کے سابق وائس چیئرپرسن اور کونسل رکن ملک جرار ایڈووکیٹ کی ٹارگٹ کلنگ کی شدید مذمت کی ہے۔

کمیشن نے اپنے ایک بیان میں کہا: ''ایچ آر سی پی ملک جرار کے قتل کی پرزور مذمت کرتا ہے اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ تعزیت کا اظہار کرتا ہے۔ ہم مقتول کے بچوں کی حالت زار کے متعلق خصوصی طور پر فکرمند ہیں جنہیں وہ سکول چھوڑنے کے لیے جا رہے تھے جب مسلح افراد نے انہیں فائرنگ کر کے ہلاک کیا۔ مسٹر جرار ایک قابل احترام وکیل اور پرامن انسان تھے جنہوں نے تمام لوگوں کے انسانی حقوق کے تحفظ کو اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا تھا۔ ٹارگٹ کلنگ کے حملے میں ان کی ہلاکت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں قتل وغارت کی وباء مکمل طور پر بے قابو ہے۔ ایچ آر سی پی کو انسانی حقوق کے نڈر کارکن اور معزز انسان کی ہلاکت کا شدید دکھ ہے۔ کمیشن متعدد دفعہ حکومت سے مطالبہ کر چکا ہے کہ انسانی حقوق کا دفاع کرنے والوں سمیت تمام شہریوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ٹھوس اقدامات کئے جائیں اور امید کرتا ہے کہ مسٹر جرار کے قاتلوں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے موثر کارروائی کی جائے گی'۔

14 مارچ: پروین رحمان، ڈائریکٹر اورنگی پائلٹ پراجیکٹ (او پی ڈی) کی بہیمانہ ہلاکت کی مذمت کرتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) آزادی، انصاف اور انسانی حقوق پر یقین رکھنے والے تمام پاکستانیوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں جو ان کی امید کا خاتمہ کرنے پر کمربستہ ہیں۔

28 مئی: ایک ایرانی وکیل اور 'ایرانی لیگ برائے دفاع انسانی حقوق' کے بانی صدر کریم لہدجی کو گزشتہ روز استنبول میں 'عالمی وفاق برائے انسانی حقوق' کی 38 ویں کانگریس کے موقع پر تنظیم کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔ انہوں نے سوہائیر بالحسن کی جگہ لی جو کہ چھ سال تک تنظیم کے صدر رہے۔ اس موقع پر منتخب ہونے والے تنظیم کے نائب صدور میں ایچ آر سی پی کی چیئرپرسن زہرا یوسف بھی شامل ہیں۔ 14 نئے اراکین کی شمولیت سے FIDH میں انسانی حقوق کی قومی تنظیموں کی تعداد 178 ہوگئی ہے۔

02 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے انسانی حقوق کے کارکن اور ایڈووکیٹ مسٹر حیدر علی کے اغوا پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔ انہیں مبینہ طور پر قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے 27 نومبر 2013 کو اس وقت اغوا کیا تھا جب وہ ضلعی عدالت سے اپنے گھر واپس جا رہے

تھے۔اس وقت سے ان کا کچھ اتا پتا نہیں۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس سے پہلے بلوچستان میں ایچ آر سی پی کے دو کارکنان کو نامعلوم حملہ آوروں نے ہلاک کر دیا تھا۔ان کے قاتلوں کو گرفتار نہیں کیا گیا۔

ایچ آر سی پی نے بلوچستان کے حکام سے مسٹر حیدر علی کی فوری بازیابی کا مطالبہ کیا ہے۔اُن سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا ہے کہ وہ وہ اس امر کو یقینی بنائیں کہ حراست کے دوران حیدر علی کو اذیت کا نشانہ نہ بنایا جائے۔

27 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے پنجگور میں اپنے کارکن احمد جان بلوچ کے قتل کی شدید مذمت کی ہے۔کمیشن نے مطالبہ کیا ہے کہ احمد جان کے قاتلوں کو گرفتار کیا جائے اور انسانی حقوق کے کارکنوں کو لاحق خطرات میں کمی لائی جائے۔

احمد جان کو پنجگور میں واقع ایک بازار میں موٹر سائیکل سوار حملہ آوروں نے 23 دسمبر کو فائرنگ کر کے شدید زخمی کر دیا تھا۔انہیں سٹی ضلعی ہیڈکوارٹر ہسپتال لے جایا گیا مگر تشویش ناک حالت کے پیش نظر انہیں کراچی منتقل کیا جا رہا تھا کہ وہ راستے میں ہی چل بسے۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے ان کے اہل خانہ اور بلوچستان میں انسانی حقوق کے مدافعین کی کمیونٹی سے اس صدمے پر تعزیت کا اظہار کیا ہے۔

کمیشن نے کہا ہے کہ ایچ آر سی پی سے وابستہ انسانی حقوق کے محافظ کا بلوچستان میں یہ پہلا قتل نہیں ہے اور ایسے حملے اور ان کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتیں اور قاتلوں کو سزا سے استثنٰی کے باعث جاری ہیں۔ایچ آر سی پی نے وفاقی اور صوبائی حکومت سے احمد کے قتل کا سنجیدگی سے نوٹس لینے کا مطالبہ کیا ہے اور کہا ہے کہ حکومتیں انسانی حقوق کے محافظین کے لیے محفوظ ماحول فراہم کے حوالے سے اپنے عزم کا اظہار اپنے اقدامات کے ذریعے کریں۔ایچ آر سی پی نے مزید کہا کہ احمد جان کے قاتلوں کو فوری طور پر انصاف کے کٹہرے میں لانا اس سمت میں پہلا قدم ہو سکتا ہے۔

اندرونی نقل مکانی

25 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے پلاننگ کمیشن اور واپڈا سے مطالبہ کیا ہے کہ میرانی ڈیم (بلوچستان) کے متاثرین کو معاوضہ کی ادائیگی کی جائے۔

یہاں جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: تربت، بلوچستان سے درجنوں کاشتکار واپڈا ہاؤس لاہور کے سامنے گزشتہ ایک ہفتے سے اپنے جائز حق کے حصول کے لیے خیمہ زن ہونے اور علامتی بھوک ہڑتال کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ اُن پندرہ ہزار (15,000) خاندانوں کی نمائندگی کر رہے ہیں جو چند برس

میرانی ڈیم سے پانی کے اُلٹے بہاؤ کی زد میں آ کر اپنی زمینوں سے بے دخل ہوگئے تھے۔ ان کے کھجوروں کے درخت اور گھر تباہ ہوگئے تھے اور وہ اپنے گھر بار چھوڑ کر پانچ سال تک جھونپڑیوں اور خیموں میں رہنے پر مجبور رہے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق کچھ عرصہ قبل ان کا معاوضہ جات کا دعویٰ منظور کرلیا گیا ہے جس کے باوجود تا حال انہیں رقم کی ادائیگی نہیں کی گئی۔ مذکورہ مظاہرین گزشتہ برس مارچ میں بھی لاہور آئے تھے مگر انہیں خالی ہاتھ واپس لوٹا دیا گیا۔ اب واپڈا متاثرین کو معاوضہ کی ادائیگی کی ذمہ داری پلاننگ کمیشن پر ڈال رہا ہے۔ جو ادارہ بھی مذکورہ غریب افراد کو انصاف کی فراہمی کا ذمہ دار ہے، اسے جلد از جلد یہ فریضہ سرانجام دینا چاہئے اور ایک ایسے معاملے کا تصفیہ کرنا چاہئے جو لوگوں کو ریاست کی ملامت پر مجبور کرنے اور ان کے غم و غصہ کا سبب بن رہا ہے۔

25 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے وادی تیراہ، خیبر ایجنسی میں پائی جانے والی ابتر صورتحال پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ایچ آر سی پی نے وادی تیراہ سے تشدد کے باعث نقل مکانی کرنے والے افراد کے لیے جلوزئی میں قائم خیمے پر ہونے والے بم دھماکے کی شدید مذمت کی ہے جس کے نتیجے میں کم از کم 17 افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ کمیشن بم دھماکے میں مرنے والوں کے اہل خانہ سے تعزیت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ حکومت وادی میں اپنی رٹ قائم کرنے میں ناکام ہے جہاں انتہا پسندوں نے گزشتہ کئی ماہ سے تشدد کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تشدد کی حالیہ لہر کے بعد بیشتر علاقے پر حکومت کا کنٹرول ختم ہوگیا ہے۔ ایچ آر سی پی کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ وہ وادی تیراہ میں دوبارہ کنٹرول حاصل کرنے کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے۔ علاوہ ازیں حکومت کو ان لوگوں کی بہبود اور بحالیٔ نو کے لیے موثر اقدامات کرنے چاہئیں جو مذکورہ کشیدگی کے باعث نقل مکانی کر گئے ہیں۔

خواتین

08 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے مطالبہ کیا ہے کہ صنفی مساوات کے فروغ کے لیے کئے جانے والی کوششیں رسمی اقدامات اور زیر التوا قانون سازی تک محدود نہیں رہنی چاہئیں اور خواتین کی معاشی آزادی کے لیے فوری اقدامات کئے جانے چاہئیں۔ 8 مارچ کو خواتین کے عالمی دن کے موقع پر جاری ہونے والے ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا: ''ملک بھر میں لڑکیوں اور خواتین کو متعدد چیلنجوں کا سامنا ہے۔ قانون سازی سے متعلق چند مثبت تبدیلیوں کے نفاذ میں ناکامی کے علاوہ قانون میں مجوزہ تبدیلیوں کی منظوری میں بے جا تاخیر کے باعث خواتین کی انسانی حقوق کی صورتحال بدتر ہوتی جارہی

ہے، اگرچہ ایچ آر سی پی سمجھتا ہے کہ خواتین کے عالمی دن کو گزشتہ سال کے دوران ہونی والی پیش رفت اور درپیش چیلنجوں کی نشاندہی کے موقعے کے طور پر منانا ضروری ہے تاہم صرف یہ کرنے سے زمینی حقائق تبدیل نہیں ہوں گے۔ رسمی اقدامات یا ہر سال 8 مارچ کے موقع پر جذباتی بیانات دینے سے لڑکیوں اور خواتین کی حالت میں تبدیلی کی امید نہیں۔

''نام نہاد غیرت کے نام پر قتل کی شکل میں خواتین کے خلاف تشدد میں کمی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ عورتوں پر تیزاب پھینکنے اور جبری طور پر مذہب کی تبدیلی کے واقعات بھی بدستور رونما ہو رہے ہیں۔ ملک کے اندر شورش زدہ علاقوں، جیسا کہ فاٹا اور مالاکنڈ کی خواتین اور لڑکیوں اور ملک کے اندر مختلف وجوہات کی بنا پر بے گھر ہونے والی خواتین پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے وقت جب انتہا پسند جنگجوؤں کے ساتھ مذاکرات حکومت کی ترجیحات میں شامل معلوم ہوتے ہیں، اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ شورش زدہ علاقوں میں خواتین کی پریشانیوں اور مسائل کو خاص طور پر مدنظر رکھا جائے اور ان کے حقوق پر سمجھوتہ نہ کیا جائے۔

''8 مارچ کے لیے اس سال کا موضوع ''خواتین کے لیے مساوی حقوق میں ہی سب کی بہتری ہے'' خاص طور پر پاکستان کی صورتحال سے ہم آہنگ ہے۔ مختلف ممالک کے تجربے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جہاں جہاں صنفی مساوات، خواتین کی خودمختاری اور مختلف شعبوں میں ان کا وسیع کردار ہے وہاں خواتین کی حالت اور معاشی اور سماجی ترقی کی صورتحال بہتر ہے اور زیادہ رواداری پائی جاتی ہے۔

''موجودہ تناظر میں پاکستان میں زیرالتوا قانون سازی کو جلد از جلد مکمل کرنے کی ضرورت ہے جیسا کہ کم عمری کی شادی کی ممانعت اور اس جیسے دیگر قوانین جو اس وقت مقنّنہ کے سامنے ہیں۔ ہندوؤں کے ازدواجی قانون اور مسیحوں کے قانون طلاق میں ترامیم کی منظوری میں مسلسل تاخیر بھی خواتین کے مسائل میں اضافے کا باعث ہے۔

ایچ آر سی پی یہ سمجھتا ہے کہ لڑکیاں اور خواتین جن مسائل سے دوچار ہیں وہ اس وقت تک ختم نہیں ہوں گے جب تک انہیں برابری، معاشی آزادی، بشمول تعلیم، روزگار اور وراثت میں ان کے حصے جیسے حقوق میسر نہیں ہوتے۔ محض قوانین بنا دینے سے ہی ان سماجی رویوں میں تبدیلی نہیں لائی جا سکتی جو صنفی مساوات کے وقوع پذیر ہونے میں حائل ہیں۔ اس حوالے سے اب تک کی پیش رفت خاصی غیر امید افزا ہے اور اس میں بہتری کی خاصی گنجائش ہے۔

ہزار سالہ ترقیاتی اہداف (ایم ڈی جی) کے حصول کے لیے 2015 میں ختم ہونے والی معیاد کو مدنظر

رکھتے ہوئے اس سال خواتین کا عالمی دن پاکستان کو خواتین اور لڑکیوں کے حوالے سے ایم ڈی جی کے نفاذ کا جائزہ لینے اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی یاد دہانی بھی کراتا ہے جو اس کی ترقی میں حارج ہیں۔

31 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے اسلامی نظریاتی کونسل (سی آئی آئی) کے اس تجویز پر شدید تشویش اور افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ڈی این اے معائنے کے نتائج کو جنسی تشدد کے واقعات میں بنیادی شہادت کے طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ایچ آر سی پی نے اس بیان کو رجعتی، مایوس کن اور جنسی تشدد کے متاثرین کے لیے ظالمانہ قرار دیا ہے۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ایچ آر سی پی برملا کہنا چاہتا ہے کہ سی آئی آئی کی حالیہ تجویز رجعت پسند اور اس ادارے اور ملک کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے تاہم سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ عصمت دری کے متاثرین کے لیے حساسیت سے عاری اور ظالمانہ ہے۔ آبروریزی ایک سنگین جرم ہے اور پاکستان میں بہت زیادہ عام ہے۔ تحقیقات کے ناقص طرائق کار اور خوف کی بدولت گواہوں کے سامنے نہ آنے کے باعث حالات پہلے ہی عصمت دری کرنے والوں کے حق میں ہیں۔ ان حالات میں تمام دستیاب شدہ شہادت بالخصوص ڈی این اے معائنے کے نتائج جیسی غیر متنازعہ شہادت پر انحصار نہ کرنا انتہائی احمقانہ اقدام ہے۔ ڈی این اے ٹیسٹ جس کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ نشان دہی کا سب سے معیاری طریقہ ہے، کے ذریعے سائنسی طریقوں سے استفادہ حاصل کرنے کی بجائے سی آئی آئی نے بغیر کسی معقول وجہ کے اسے ختم کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ ایچ آر سی پی نے ان لوگوں کی حمایت میں ایک طویل عرصے تک آواز اٹھائی ہے جو پولیس اور انصاف کے بدعنوان، غیر موثر اور سست رو نظام کے باعث خود کو لاچار محسوس کرتے ہیں۔ تاہم ڈی این اے کے نتائج جرم کو شک وشبہ سے بالاتر ثابت کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی اہمیت سے انکار کرنے اور اسے بنیادی شہادت کے طور پر قبول نہ کرنے کی تجویز سے صرف عصمت دری کرنے والوں کو ہی فائدہ پہنچے گا۔ سی آئی آئی کی سفارش میں آبروریزی کے متاثرین کے حقوق کا خیال نہیں رکھا گیا اور بغیر کسی شک وشبہ کے مجرم ثابت ہونے والوں کو سزا دینے کی ضرورت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس طرح کی سفارشات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سی آئی آئی کتنا قدامت پرست ادارہ ہے اور وقت سے کس حد تک پیچھے ہے۔ مزید برآں سی آئی آئی کے اس اقدام سے لوگوں پر اس کے خاتمے کے مطالبے کا جواز بھی آشکار ہوا ہے کہ پارلیمان، عدلیہ اور متحرک میڈیا کی موجودگی میں مجوزہ یا موجودہ قوانین کی جانچ پڑتال کے لیے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کم سے کم یہ ایک افسوس ناک عمل ہے کہ اس غیر ضروری سفارش کی سی آئی آئی کے کسی رکن نے مخالفت نہیں کی اور سی آئی آئی کی فی الفور وسیع تر مشاورت کیساتھ از سر نو تشکیل کے لیے یہی جواز ہی کافی ہے۔ نئی حکومت کو سی آئی آئی

کی خلافِ عقل اور غیر دانشمندانہ مذکورہ سفارش کی وجہ سے پہنچنے والے نقصان کی بلا تاخیر تلافی کرنی ہوگی۔

17 ستمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے پاکستان میں خواتین کے خلاف بڑھتے ہوئے تشدد پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ جاری ہونے والے اپنے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ایچ آر سی پی نے حالیہ دنوں میں خواتین کے حلاف تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات کا شدید تشویش کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے۔ بدقسمتی سے ملک میں ایسے واقعات ہمیشہ سے معمول رہے ہیں لیکن ایسے واقعات کی اطلاعات نہ صرف دور دراز کے علاقوں بلکہ بڑے شہروں سے بھی موصول ہو رہی ہیں۔ گزشتہ چند دنوں کے دوران پنجاب سے جنسی تشدد کے متعدد واقعات کی اطلاعات بھی ہیں جس میں ایک پانچ سالہ بچی سے جنسی زیادتی کا وقوعہ بھی شامل ہے۔ اس مسئلے کی سنگینی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ صرف لاہور میں پولیس نے رواں برس یکم جنوری سے 31 اگست تک جنسی تشدد کے 113 مقدمات درج کئے تھے۔ اسی عرصہ کے دوران پنجاب کے دارالحکومت کی پولیس نے اجتماعی جنسی تشدد کے 32 مقدمات درج کئے۔ اس ہفتے کے اوائل میں کوہاٹ، خیبر پختونخواہ میں تین خواتین کو ان کے خاندان کے اراکین نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ ایچ آر سی پی کی جانب سے میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق، اس سال جولائی کے اختتام تک کم از کم 44 خواتین پر تیزاب پھینکا گیا جن میں سے سات زخموں کی تاب نہ لاکر ہلاک ہوگئیں۔ تقریباً 44 خواتین کو آگ لگائی گئی جن میں سے 11 ہلاک ہوئیں۔ اس سال جولائی کے اختتام تک تقریبا، 451 خواتین کو عزت کے نام پر قتل کیا گیا۔ 2012 میں یہ تعداد 918 تھی۔

مزید برآں ایچ آر سی پی کو اس امر پر بھی تشویش ہے کہ متاثرین کی مدد کرنے والوں یا مظالم کو اجاگر کرنے والوں کو لاحق خطرات میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ خواتین کے خلاف مظالم کی نشاندہی کرنے والے انسانی حقوق کے مدافعین خصوصی طور پر خطرے کی زد میں ہیں۔ ایچ آر سی پی کے ایک سٹاف ممبر کو دو ہفتے قبل صرف اس وجہ سے روپوش ہونا پڑا کہ اس نے ایک واقعہ اجاگر کیا تھا جس میں ایک آدمی نے اپنی رشتہ دار خاتون کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا جس پر ملزمان نے اسے قتل کرنے کی دھمکیاں دیں اور اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ محض جنس کی بنیاد پر آبادی کے ایک حصے کو تشدد کا نشانہ بنانا ناقابل قبول امر ہے اور شرمناک بات ہے کہ اس بھیانک عمل کے خاتمے کے لیے معاشرہ اپنی آواز بلند نہیں کر رہا۔ خواتین کے خلاف تشدد اور مجرموں کو سزا سے حاصل استثنیٰ کے متعدد عوامل ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے ہم بطور معاشرہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں کہ ہمارے معاشرے کو خواتین کے خلاف تشدد کا سنگین مسئلہ درپیش ہے جس سے فوری نبٹنے کی ضرورت ہے۔ جوں جوں خواتین اپنی زندگیوں پر اثر انداز ہونے والے فیصلوں میں شراکت کی زیادہ کوشش

کررہی ہیں، ان کے خلاف تشدد کے واقعات میں اضافہ ہورہا ہے۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ معاشرے کی نامور شخصیات اور سیاسی رہنماؤں نے ایسے تشدد کی موثر مذمت نہیں کی ہے۔ مجرموں کو سزا سے تحفظ دینے والے حالات نے بھی تشدد کے فروغ میں براہ راست کردار ادا کیا ہے۔

ایچ آر سی پی نے حکام سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ خواتین کے خلاف تشدد اور مجرموں کو سزا سے استثنیٰ کے خاتمے کو اپنی ترجیحات میں شامل کریں تاکہ آبادی کے نصف حصے کو انصاف کی فراہمی ممکن ہو سکے۔ ایچ آر سی پی پر امید ہے کہ ان اقدامات میں آگہی کی مہمیں بھی شامل ہوں گی اور یہ قوانین میں تبدیلیوں تک محدود نہیں رہیں گی جن پر بعدازاں عمل درآمد ہی نہیں کیا جاتا۔ کمیشن یہ بھی امید کرتا ہے کہ کم از کم انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو اجاگر کرنے والے صحافیوں اور انسانی حقوق کے محافظین کو کام کار کا محفوظ ماحول فراہم کرنے کے لیے چند بامعنی اقدامات اٹھائے جائیں گے۔

خوراک کا حق

29 نومبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے جمعہ کے روز 'بھوک کے خاتمے کے لیے مارچ' کا اہتمام کیا جس کے شرکاء نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ تمام افراد کی غذا تک رسائی کو یقینی بنایا جائے، روزمرہ کی اشیائے خوردونوش کی قیمتوں کو کنٹرول کیا جائے اور زرعی اصلاحات متعارف کروائی جائیں۔

مارچ پنجاب اسمبلی سے شروع ہوا اور لاہور پریس کلب پر اختتام پذیر ہوا۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق، ساؤتھ ایشیا پارٹنر شپ (ایس اے پی) اور ورکروز آرگنائزیشنز کے اراکین اور انسانی حقوق کے کارکنوں سمیت سینکڑوں افراد نے مارچ میں شرکت کی۔ مزید برآں مزدوروں، طلباء اور باشعور شہریوں نے بھی مارچ میں اپنی شرکت کو یقینی بنایا۔ شرکاء میں پمفلٹ اور دیگر معلوماتی مواد تقسیم کیا گیا جن میں غذائی تحفظ، اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل اور شہریوں کے مطالبات کی وضاحت کی گئی۔ اسی طرح کی تقریبات کا اہتمام ایچ آر سی پی کے کوئٹہ، ملتان اور حیدرآباد، چیپٹر دفاتر نے بھی کیا۔ مارچ کے اختتام پر شرکاء نے لاہور پریس کلب میں پریس کانفرنس کی۔ مقررین میں ایچ آر سی پی کے سیکرٹری جنرل آئی اے رحمان، محترمہ حنا جیلانی، مسٹر خورشید احمد، مسٹر فاروق طارق اور دیگر شامل تھے۔ مقررین نے اس امر کی نشاندہی کی کہ بڑھتی ہوئی افراط زر نے زیادہ تر لوگوں کے لیے متوازن غذا کا حصول ناممکن بنادیا ہے۔ پروٹین کے بنیادی ذرائع مثال کے طور پر گوشت اور دالیں لوگوں کی قوت خرید سے باہر ہو چکے ہیں۔ اگرچہ حکومت نے صارفین کو غذا کی سبسڈی فراہم کی تھی مگر غریب خاندانوں کو اس کا کوئی فائدہ نہیں مل سکا اور انتہائی ضرورت مند لوگوں کی مدد پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت تھی۔

ایچ آر سی پی نے حکومت اور سول سوسائٹی سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ مشترکہ کاشوں سے بنیادی غذا اور غذائی تحفظ کے حق کے متعلق لوگوں کے شعور کو بڑھائیں۔اس کے علاوہ درج ذیل مطالبات کئے گئے:

_ غذائی اشیاء کی مناسب پیداوار کے لیے زرعی اصلاحات اور زمین کے درست استعمال کی ضرورت ہے۔
_ صاف پانی کی فراہمی اور حفظان صحت کے انتظامات کو یقینی بنایا جائے کیونکہ یہ دیگر تمام حقوق کے حصول کے لیے ضروری ہیں۔
_ غذا کی اسمگلنگ اور ناجائز ذخیرہ اندوزی کو کنٹرول کیا جائے، بالخصوص بحران کے اوقات میں۔
_ روزمرہ کی اشیائے خوردونوش کی قیمتوں کو بڑھنے سے روکنے کے لیے اور کم از کم اجرت کے نظام پر نظرثانی کے لیے موثر طریقہ کار نافذ کیا جائے تاکہ لوگوں کی قوت خرید میں اضافہ ہو۔
_ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے اقدامات کئے جائیں۔
_ فصلوں کی پیداوار میں اضافے، ذخیرہ اندوزی اور نقل وحمل کے نظام میں بہتری لانے کے لیے تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی کی جائے۔
_ زرخیز زرعی زمینوں کو ہاؤسنگ اسکیموں میں بدلنے کے ناجائز سلسلے پر قابو پایا جائے۔

جیلیں اور قیدی

27 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کوٹ لکھپت جیل میں ہندوستانی قیدی سربجیت سنگھ پر حملے کی شدید مذمت کی ہے اور حکومت پاکستان اور پنجاب حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ معاملے کی مکمل تحقیقات کرکے مجرموں کو سزا دی جائے۔آج یہاں جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کوٹ لکھپت جیل لاہور میں ہندوستانی قیدی سربجیت سنگھ پر قاتلانہ حملہ کی شدید مذمت کرتا ہے۔ایک قیدی اپنے تحفظ کے حصول کے حوالے سے مکمل طور پر جیل انتظامیہ کے رحم وکرم پر ہوتا ہے اور اپنے جرم سے قطع نظر وہ جیل کے منتظمین یا اپنے ساتھی قیدیوں کے تشدد سے تحفظ کا مستحق ہوتا ہے۔اس وقوعہ میں حکام اپنا بنیادی فریضہ سرانجام دینے میں ناکام رہے ہیں۔ انہیں سربجیت کی حفاظت کا خصوصی بندوبست کرنا چاہیئے تھا کیونکہ اس کا مقدمہ مصروف ہے اور اس کے ساتھی قیدیوں میں اس کے لیے پائی جانے والی مخالفت قابل ادراک تھی۔حکام کو اس امر کا اندازہ بھی ہونا چاہیئے کہ اگر کوئی ہندوستانی اس طرح کے گھناؤنے حملے کا نشانہ بنتا ہے تو اس کے پاک-انڈیا تعلقات پر کیا اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔چند ماہ قبل ہندوستان نے کوٹ لکھپت جیل میں قید ہندوستانی قیدی کی تشدد سے ہلاکت کی شکایت کی تھی جس کا معاملہ ابھی تک تحقیقاتی مرحلے میں ہے۔ان واقعات سے پاکستانی معاشرے میں بڑھتی

ہوئی عدم رواداری کے سنگین نتائج بھی نمایاں ہورہے ہیں جو ملک کے عوام کے لیے شدید نقصان کا باعث ثابت ہوں گے۔ کمیشن حکومت پاکستان اور پنجاب دونوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس حالیہ دہشت ناک وقوعے کی مکمل تحقیقات کی جائیں اور اس میں ملوث ملزمان کو فوری طور پر گرفتار کیا جائے۔

02 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے ہسپتال میں ہلاک ہونے والے ہندوستانی قیدی سربجیت سنگھ پر حملے میں ملوث تمام افراد کے خلاف کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور اسلام آباد اور دہلی پر زور دیا ہے کہ وہ ایسے واقعات کے باعث دوطرفہ تعلقات کو متاثر ہونے سے بچانے اور دونوں ممالک میں ایک دوسرے کے قیدیوں کی حالت زار میں بہتری لانے کے لیے فوری اقدامات کریں۔

جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ایک انتہائی سادہ لوح فرد بھی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں کہ موت کی کوٹھڑی میں بند سربجیت سنگھ جیسے قیدی کو دیگر قیدیوں کی جانب سے جیل محافظین اور حکام کے علم اور حمایت کے بغیر اس قسم کے بھیانک تشدد کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ یہ جنرل پرویز مشرف جیسے آدمی کو عدالت سے فرار ہونے کا موقع دینے سے زیادہ سنگین نوعیت کا جرم ہے۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ سربجیت سنگھ کو اپنے اوپر عائد الزام کے باعث شدید خطرات کا سامنا تھا، تاہم اس کے باوجود اُن کے تحفظ کو اہمیت نہ دی گئی۔ وہ اس وقت ہلاک ہوئے ہیں جب پاک انڈیا مشترکہ ججز کمیٹی پاکستانی جیلوں میں ہندوستانی قیدیوں کی حالت زار دیکھنے کے لیے پاکستان کا دورہ کررہی ہے۔ اپنی انتقامی کارروائی پر فخر محسوس کرنے والے پاکستانیوں میں شرم کا مادہ ہے تو ان کا سر شرم سے جھک جانا چاہئے۔ بلاشبہ اب ہندوستان میں موجود بعض شر پسند عناصر بھی اپنی جارحیت کا مظاہرہ کریں گے جو انتقام، عدم رواداری اور جنگجویانہ وطن پرستی کے جذبے کے حوالے سے اپنے پاکستانی ہم منصوبوں سے پیچھے نہیں ہیں۔

جبری غائب کیئے گئے افراد

29 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے بلوچستان کے اضلاع گوادر اور کیچ میں غیر قانونی چھاپوں اور متعدد افراد کی جبری گمشدگی اور سندھ میں دو سیاسی کارکنوں کی ہلاکت کی اطلاعات پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔ پیر کو جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا یہ باعث تشویش ہے کہ جن کارروائیوں کے باعث پاکستان خطرناک موڑ تک پہنچا ہے۔ وہ انتخابات کے موقع پر بھی جاری وساری ہیں۔

ایچ آر سی پی کے خیال میں حکام کو سول سوسائٹی کی جانب سے اقدام کرنے کی اپیل کا انتظار کیئے بغیر ان اطلاعات کا سنجیدگی کے ساتھ نوٹس لینا چاہئے تھا۔ کمیشن کا مطالبہ ہے کہ مذکورہ دونوں افراد کی حراست

اور قتل کی وجہ معلوم کرنے کے لیے آزادانہ تحقیقات کی جائے تاکہ ان کے قاتلوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جاسکے۔

06 جون: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں درخواست دائر کی ہے کہ لاپتہ افراد کی بحالی کے لیے 2007 میں کمیشن کی طرف سے دائر کی جانے والی پٹیشن کو خارج کرنے کے فیصلے پر نظرثانی کی جائے۔ سپریم کورٹ نے 18 مئی کو ایک مختصر آرڈر کے ذریعے جبری گمشدہ افراد کے حوالے سے ایچ آر سی پی کی 2007 سے دائر کردہ آئینی پٹیشن کو خارج کردیا اور کہا کہ درخواست گزار اس معاملے کے حوالے سے قائم کردہ انکوائری کمیشن کے سامنے اس مسئلے کو اٹھائے۔ ایچ آر سی پی کے خیال میں مختصر آرڈر میں پٹیشن میں مذکورہ شکایات کا ازالہ نہیں کیا گیا جس کے باعث کمیشن نے نظرثانی کی درخواست دائر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایچ آر سی پی نے دلیل پیش کی ہے کہ آئین کی دفعہ 184(3) کے تحت قابل احترام عدالت کا دائرہ اختیار انکوائری کمیشن کو نہیں سونپا جاسکتا جس کے اراکین کی اکثریت غیر جوڈیشل حکام پر مشتمل ہے، بالخصوص اس لیے کہ پٹیشن میں اجاگر کردہ معاملہ عوامی اہمیت کا حامل ہے اور اس میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا عنصر شامل ہے جن کے نفاذ کی ذمہ داری واضح طور پر قابل احترام سپریم کورٹ پر عائد ہوتی ہے۔ ایچ آر سی پی نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ اس کی جمع کردہ فہرست میں شامل 47 افراد تاحال لاپتہ ہیں اور ان کے اہل خانہ کو حکومت کے قائم کئے گئے کمیشن تک رسائی نہیں دی گئی۔

ایچ آر سی پی نے اس بات پر بھی غور کیا کہ چھ سالوں میں سپریم کورٹ کی سماعتوں کے دوران ایچ آر سی پی کی جانب سے جمع کرائی گئی فہرست میں موجود لاپتہ افراد میں سے متعدد کو عدالت میں پیش کیا گیا تھا اور انہوں نے اپنے غیر قانونی اغواء اور حراست کے متعلق بیانات دیئے تھے اور سکیورٹی فورسز پر الزامات عائد کئے تھے۔ ایچ آر سی پی نے اس امر کا مشاہدہ بھی کیا ہے کہ سپریم کورٹ نے گزشتہ چھ برسوں سے زیر سماعت بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے انتہائی اہم معاملے کے حوالے سے تفصیلی فیصلہ جاری نہیں کیا۔ مزید برآں عدالت نے گزشتہ چھ برسوں میں اس مقدمے کی سماعتوں اور اس دوران قلم بند ہونے والے بیانات جن میں جبری گمشدگیوں کے مجرموں کی واضح نشاندہی کی گئی تھی، کے حوالے سے بھی تفصیلی فیصلہ جاری نہیں کیا۔ ایچ آر سی پی نے اس بات کی بھی نشاندہی کی کہ اس کی درخواست میں ان افراد کے لیے معاوضے کی استدعا بھی کی گئی تھی جو جبری گمشدگی کے بعد بازیاب ہو چکے تھے لیکن مذکورہ فیصلے میں معاوضے کے معاملے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

23 اگست: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کراچی میں لاپتہ بلوچوں کی مسخ

شدہ نعشوں کو ٹھکانے لگانے جیسے اقدامات پر نہایت تشویش کا اظہار کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ قاتلوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔

جاری ہونے والے اپنے ایک بیان میں کمیشن نے کہا کہ یہ امر انتہائی افسوس ناک اور باعث تشویش ہے کہ لاپتہ افراد کی نعشوں کی برآمدگی کا سلسلہ تواتر سے جاری ہے۔کمیشن نے مزید کہا کہ اگرچہ کراچی میں مسخ شدہ نعشوں کی برآمدگی بدقسمتی سے خلاف معمول امر نہیں ہے تاہم یہ بات انتہائی تشویش ناک ہے کہ حالیہ مہینوں میں ان افراد کی نعشیں کراچی سے برآمد ہونے کے عمل میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے جو بلوچستان سے لاپتہ ہوئے تھے اور ان کی جیبوں سے ایسی پرچیاں ملی ہیں جن پر اُن کے نام لکھے ہوئے تھے۔صرف رواں ہفتے کے دوران کراچی کے علاقے سرجانی ٹاؤن سے تین بلوچ افراد محمد رمضان، عبدالغفور اور عبدالرزاق کی نعشیں ملی ہیں۔رمضان اور عبدالغفور بلوچستان کے علاقے تربت سے گزشتہ ہفتے لاپتہ ہوئے تھے اور ان کے اہل خانہ نے ان کے اغواء کا الزام سکیورٹی فورسز پر عائد کیا تھا۔ایک بلوچ صحافی عبدالرزاق جو کراچی کے علاقے لیاری میں رہائش پذیر تھا اور مارچ سے لاپتہ تھا، اس کی نعش اتنی بُری طرح مسخ تھی کہ اہل خانہ نے جب پہلی دفعہ اسے دیکھا تو اس کی شناخت نہ کرسکے۔صرف اس کے بازو اور ٹانگیں اس حالت میں تھیں کہ ان سے مقتول کی شناخت ہوئی۔ایچ آر سی پی بلوچستان میں 'مارو اور ٹھکانے لگاؤ' جیسے واقعات اور اب کراچی میں لاپتہ افراد کی نعشوں کی برآمدگی کے حوالے سے نہایت فکرمند ہے۔ایچ آر سی پی کا مطالبہ ہے کہ مذکورہ تینوں افراد کی گمشدگی اور ان کے قتل کے وقوعے کی مکمل تحقیقات کی جائے تاکہ قاتلوں کی نشاندہی ہو اور انہیں انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔

29 اگست: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے وزیراعظم نواز شریف سے مطالبہ کیا ہے کہ شہریوں کی جبری گمشدگی اور اس غیر قانونی عمل میں ملوث افراد کو سزا سے استثنٰی کے خاتمے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں۔

30 اگست کو جبری گمشدگی کے متاثرین کے عالمی دن کے موقع پر وزیراعظم کو لکھے گئے ایک خط میں ایچ آر سی پی نے ان پر زور دیا ہے کہ پاکستان میں جبری گمشدگی کے بھیانک جرم کو ماضی کا حصہ بنانے کے لیے فوری اقدام کیا جائے۔ایچ آر سی پی نے مشاہدہ کیا ہے کہ جبری گمشدگی نے گزشتہ ایک دہائی سے نہ صرف متاثرین اور ان کے اہل خانہ بلکہ مجموعی طور پر پورے معاشرے میں خوف اور عدم تحفظ پھیلایا ہوا ہے۔کمیشن نے کہا کہ اگرچہ معاملے کو اعلیٰ سطح پر اٹھایا گیا ہے مگر یہ ابھی تک حل طلب ہے۔آپ کی سربراہی میں نئی حکومت کی تشکیل سے چونکہ آپ اس کے سربراہ کی حیثیت میں معاملے کی سنگینی سے آگاہ ہیں، ایچ آر سی پی پر امید تھا

کہ اس روش کے خاتمے کے لیے کارروائی کی جائے گی جس کی کسی بھی مہذب معاشرے میں جگہ نہیں ہونی چاہئے۔ تاہم ایچ آر سی پی نے شدید افسوس کا اظہار کیا ہے کہ شہریوں کو آج بھی اٹھایا جا رہا ہے اور لاپتہ افراد کی نعشوں کو ٹھکانے لگایا جا رہا ہے۔ یہ صورتحال لاپتہ افراد کے مصائب میں اضافے اور شہریوں میں انتشار پھیلانے کا سبب بن رہی ہے اور ریاست پر شہریوں کے اعتماد کی بحالی کا کام مشکل ہو رہا ہے۔ ایچ آر سی پی نے مزید لکھا کہ حکومت ظلم کا شکار افراد اور ان کے اہل خانہ کے ذہن سے ہولناک جرائم کی تصویر کو مٹا سکتی تھی۔ ''درحقیقت یہ خلاف ورزی پاکستان کے انسانی حقوق کے ریکارڈ میں ہمیشہ کے لیے ایک ان مٹ دھبہ کے طور پر محفوظ رہے گی۔ ان تمام وجوہات کی بناء پر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جبری گمشدگیوں کو ایک دن بھی مزید نہیں چلنا چاہئے۔ ایچ آر سی پی نے وزیراعظم کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہے کہ وہ ضروری اقدامات کریں جس سے یہ بھیانک عمل ہمیشہ کے لیے ماضی کا حصہ بن جائے اور ان سے یہ درخواست بھی کی ہے کہ وہ ''ریاستی اداروں کو حکم جاری کریں کہ وہ گمشدہ افراد کی بازیابی کے لیے تعاون کریں اور شہریوں کو اغواء کرنے، ان کو خفیہ جیلوں میں رکھنے یا ان کو قتل کرنے اور ان کی لاشوں کو دفن کرے جیسے عمل سے خود کو باز رکھیں۔ جبری گمشدگی کے مجرموں کو سزا سے استثنیٰ کا خاتمہ ہو۔ درحقیقت گزشتہ کچھ ہفتوں میں متعدد ریاستی اہلکاروں کی نشاندہی ہوئی ہے کہ وہ جبری گمشدگی کے عمل میں شراکت دار ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ممکہ طور پر جلد از جلد ان لوگوں کے خلاف کارروائی کا آغاز لوگوں کے اعتماد میں اضافے کا سبب بنے گا۔ جبری گمشدگی سے تمام لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے کے بین الاقوامی کنونشن کی منظوری ہونی چاہئے۔ جبری گمشدہ افراد کے خاندانوں کو جو کئی سالوں سے اذیت کا شکار ہیں کے لیے تلافی کی رقم کا بندوبست کرنا چاہئے۔

09 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے وزیر اعلیٰ بلوچستان ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کے ہاتھوں اغوا ہونے والے انسانی حقوق کے کارکنوں اور شہریوں کی بازیابی کے لیے فی الفور اقدامات کریں اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کے ہاتھوں جاں بحق ہونے والے شہریوں کی ہلاکت کی مؤثر تحقیقات کا حکم دیں۔

ایچ آر سی پی کو حالیہ دنوں میں بلوچستان میں قتل اور اغوا کے واقعات کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد پر گہری تشویش ہے۔

ایچ آر سی پی نے ایڈووکیٹ حیدر علی کی بازیابی کا ایک دفعہ پھر مطالبہ کیا ہے جن کو 27 نومبر کو اغوا کیا گیا تھا اور گزشتہ ہفتے 6 افراد کی اغواء نما گرفتاری کے بعد ہلاکت کا نوٹس لینے پر بھی زور دیا ہے۔

ایچ آر سی پی کو حالیہ دنوں میں بلوچستان میں قتل اور اغوا کے واقعات کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد پر

گہری تشویش ہے۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق، وزیراعلیٰ بلوچستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ انسانی حقوق کے کارکنوں کو حراست کے دوران اذیت کا نشانہ نہ بنایا جائے اور مزید یہ کہ وہ بلوچوں کے قتل عام کو روکنے میں اپنا فعال کردار ادا کریں۔

20 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے جبری گمشدگیوں سے متعلق مجوزہ قانون سازی کے حوالے سے ذرائع ابلاغ کی اطلاعات پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔

جاری ہونے والے ایک اپنے بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا، یہ افسوس ناک امر ہے کہ انسانی حقوق کے انتہائی اہم معاملے سے متعلق جلد ہی متعارف ہونے والی متنازعہ قانون سازی کے بارے میں عوام کو ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے ذریعے معلوم ہو رہا ہے۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ عوام کو اس سے بے خبر کیوں رکھا جا رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ سول سوسائٹی اور متاثرہ افراد اور خاندانوں کی تجاویز لینے کے لیے وسیع تر مشاورتی عمل شروع کیا جاتا تاکہ پاکستان پر لگے جبری گمشدگیوں کے داغ کو مٹانا ممکن ہو جاتا۔

ذرائع ابلاغ سے جاری ہونے والی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مسودہ قانون کا مقصد افراد کی غیر قانونی طویل حراست کو قانونی جواز بخشنا اور انسانی حقوق کی اس سنگین خلاف ورزی میں ملوث خفیہ ایجنسیوں اور سکیورٹی فورسز کو سزا سے مکمل استثنٰی فراہم کرنا ہے۔ مجوزہ قانون میں 12 شفارشات درج ہیں جن میں سے ایک سفارش جبری گمشدگیوں کو فوجداری جرم قرار دیتی ہے۔ مجوزہ قانون مزید کہتا ہے ''سکیورٹی فورسز اور خفیہ ایجنسیوں کو مشتبہ افراد کی مکمل تفتیش کے لیے اضافی وقت درکار ہے باوجود اس امر کے کہ جبری گمشدگی ایک فوجداری جرم ہے''۔ اگرچہ سفارشات کا حتمی شکل اختیار کر لینے کے بارے میں علم نہیں، تاہم ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ مجوزہ قانون مشتبہ افراد کو 90 دن سے بھی زائد مدت تک زیر حراست رکھنے کی اجازت دے گا۔

اس بل میں کہا گیا ہے کہ اگر سکیورٹی فورسز کسی غائب کئے گئے شخص کے خلاف ثبوت اور شہادت پیش کریں تو انہیں سزا سے مکمل استثنٰی حاصل ہوگا۔ اضافی اور مطلوبہ حفاظتی اقدامات کے نام پر عوام کے لیے متعارف کرائے جانے والے ایسے اقدامات محض جبری غائب کئے جانے والے مسئلے کو مزید گھمبیر بناتے ہیں، باضابطہ قانونی کارروائی کی نفی کرتے ہیں اور تفتیشی طرائق کار کو بہتر بنانے کی بجائے بغیر کسی الزام کے حراست اور قید کے دوران تشدد کی ترغیب دیتے ہیں تاکہ جبری اعتراف جرم کروایا جا سکے۔ ایسے قانون کی منظوری سے نہ صرف پاکستان جبری گمشدگیوں کی روک تھام میں ناکام رہے گا بلکہ اس سے لاپتہ افراد کے خاندانوں اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کی جدوجہد کو بھی نقصان پہنچے گا جنہوں نے ملک میں جبری غائب کرنے والے مجرموں کو سزا سے حاصل استثنٰی کے خاتمے کے لیے ایک طویل جدوجہد کی ہے۔ ایچ آر سی پی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ مجوزہ قانون متاثرہ شخص کی بجائے حقوق کی قابل مذمت خلاف ورزی کا ارتکاب کرنے والوں کی طرفداری کرتا ہے۔ اگر مجوزہ قانون کی منظوری دی گئی تو اس سے محض جبری غائب کرنے کے اقدام کو قانونی جواز ملے گا۔

فیکٹ فائنڈنگ مشن

13 مارچ: بادامی باغ، جوزف کالونی میں فیکٹ فائنڈنگ مشن کی تحقیقات کے بعد اپنی ابتدائی رپورٹ میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے پولیس اور صوبائی انتظامیہ کو اس بہیمانہ واقعہ کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ مشن کو معلوم ہوا کہ شام کو مقامی پولیس نے مسیحی برادری کو وقوعے سے ایک دن پہلے یہ کہہ کر علاقہ خالی کرنے کی ہدایت کی کہ اگلے روز پرتشدد واقعہ پیش آنے کا خدشہ ہے۔ پولیس نے انہیں یقین دلایا کہ ان کی املاک محفوظ رہیں گی۔ چندر ہائشیوں کا کہنا تھا کہ وقوعہ میں مقامی تاجر برادری کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ ان کے مطابق اس پورے عمل اور لوگوں کو اشتعال دلانے میں ٹریڈ ایسوسی ایشن کے اگلے انتخابات میں حصہ لینے والے ایک امیدوار کا کردار ہوسکتا ہے۔ ایچ آر سی پی نے اس بات پر تشویش ظاہر کی ہے کہ مقامی انتظامیہ جو کہ ایسے حملے کے ممکنات سے مکمل طور پر آگاہ تھی وہ اس حملے سے پہلے اور بعد میں بھی موثر اقدامات اٹھانے میں ناکام رہی ہے۔

18 جون: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کوئٹہ اور زیارت میں ہونے والے دہشت گردانہ حملوں کے متعلق حقائق معلوم کرنے کے لیے بلوچستان میں ایک اعلیٰ سطح کا فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیج رہا ہے۔

کوئٹہ اور زیارت میں دہشت گردانہ حملوں کی شدید مذمت کرتے ہوئے ایچ آر سی پی نے جاری ہونے والی پریس ریلیز میں کہا ہے کہ ملک میں حالیہ سیاسی تبدیلی کے باعث حملوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ مذکورہ حملوں کے باعث عوام اور نئی حکومت کو درپیش مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایچ آر سی پی نے بلوچستان کے لئے ایک اعلیٰ سطحی فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے جس کی قیادت سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی سابق صدر عاصمہ جہانگیر کریں گی۔ مشن صوبے میں اعلیٰ حکومتی اہلکاروں اور سیاستدانوں سے ملاقات کرے گا۔

25 جون: بلوچستان کے لیے ایچ آر سی پی کے فیکٹ فائنڈنگ مشن نے ایک پریس کانفرنس کی جس میں مشن کے ابتدائی مشاہدات اور سفارشات کو زیر بحث لایا گیا۔ ایچ آر سی پی کی جانب سے کچھ عرصہ بعد اس حوالے سے ایک جامع رپورٹ شائع کی جائے گی۔ درج ذیل مشاہدات اور سفارشات پیش کئے گئے۔

مشاہدات

- ایچ آر سی پی کی فیکٹ فائنڈنگ ٹیم سے ملاقات کرنے والے تمام حلقوں نے اس امر پر اتفاق رائے کا

اظہار کیا ہے کہ وہ حال ہی میں تشکیل پانے والی حکومت سے صوبے میں حالات کی تبدیلی کے حوالے سے پُر امید ہیں۔ نئی جمہوری حکومت کے قیام کو ایک مثبت پیش رفت قرار دیا گیا جو صوبے میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خاتمے کا سبب بن سکتی ہے۔ تاہم ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ سکیورٹی اور خفیہ اداروں کی پالیسی میں تبدیلی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے کیونکہ ''مارو اور ٹھکانے لگاؤ''، اذیت رسانی اور ماورائے عدالت ہلاکتوں کے واقعات کا سلسلہ جاری ہے۔ یہاں تک کہ ایک طرف نئی حکومت حلف اٹھا رہی تھی جبکہ دوسری طرف نعشیں برآمد ہو رہی تھیں اور انتخابات کے بعد بھی لوگوں کی جبری گمشدگیوں کی اطلاعات منظر عام پر آئی ہیں۔

- فیکٹ فائنڈنگ ٹیم کو اس قسم کے متضاد اطلاعات موصول ہوئی ہیں کہ ماضی قریب میں ہونے والے دہشت گردانہ حملوں کی نوعیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہشت گرد تنظیموں اور بلوچ جنگجو گروہوں کے مابین عملی سطح پر رابطہ سازی پائی جاتی ہے۔ ایچ آر سی پی ان اطلاعات کی توثیق نہیں کر سکتا تاہم کمیشن کا مطالبہ ہے کہ ان الزامات کا سنجیدگی سے نوٹس لیا جائے اور ان کی مکمل تحقیقات کی جائیں۔
- نئی جمہوری حکومت کی تشکیل کو خوش آئند قرار دینے والے تمام گروہ، افراد اور سیاسی عناصر اس امر پر بضد تھے کہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہئے اور نئی حکومت کو مستحکم کیا جائے تاکہ یہ صوبے کو درپیش متعدد مسائل کا سامنا کر سکے۔ وفاقی حکومت سے توقع کی جا رہی ہے کہ وہ صوبے میں ترقیاتی کاموں اور فوجی خفیہ ایجنسیوں پر جمہوری حکومت کے کنٹرول کے سلسلے میں صوبائی حکومت کی معاونت کرے گی۔
- امن عامہ کی صورتحال مایوس کن ہے۔ شہری شدید خوفزدہ ہیں۔ ان کی زندگی کو تحفظ حاصل نہیں اور سکیورٹی فورسز کے ہاتھوں ان کی تذلیل معمول بن چکا ہے۔ اغواء برائے تاوان کے واقعات بڑھ رہے ہیں اور زیادہ تر واقعات میں اغواء کاروں کا سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ مذہبی اقلیتیں خصوصی طور پر عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ سول سوسائٹی کی تنظیموں نے عملی طور پر صوبے میں اپنی سرگرمیاں ترک کر دی ہیں۔ خواتین شدید طور پر خوفزدہ ہیں اور انتہا پسند قوتوں کی جانب سے مسلسل ہراسگی کا شکار ہیں۔ فرقہ وارانہ جنگجو گروہ سزا کے خوف سے مبرا ہو کر کارروائیاں کر رہے ہیں اور اگر قانون نافذ کرنے والے ادارے ان کیخلاف اقدام کرتے ہیں تو وہ ریاست سے انتقام لینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

سفارشات

- ایچ آر سی پی بلوچستان حکومت سے انسانی حقوق کے مشیر کی تقرری کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ وزیر اعلیٰ اور کابینہ کو صوبے میں انسانی حقوق کی صورتحال سے مکمل باخبر رکھا جا سکے۔

- عین اسی وقت قانون سازی کے ذریعے ایک صوبائی انسانی حقوق کمیشن بھی تشکیل دیا جائے جو بااختیار ہونا چاہئے اور اسے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی نگرانی اور ان کا ازالہ کرنے کے لیے وسیع اختیارات دیئے جانے چاہئیں۔
- ایچ آرسی پی سکیورٹی فورسز اور خفیہ ایجنسیوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ آئین اور قانون کے دائرے میں رہ کر کام کریں۔صوبے میں جاری انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں بشمول جبری گمشدگیوں، من مانی گرفتاریوں، تشدد اور ماورائے عدالت ہلاکتوں کی قابل وثوق اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ جب ایچ آرسی پی کی ٹیم بلوچستان میں تھی تو ایف سی نے ڈیرہ بگٹی کے علاقے مٹھ سے 7 نوجوانوں کو اٹھالیا اور بعد میں انہیں فوری ہلاک کردیا گیا۔ اطلاعات کے مطابق ان کی ماؤں کو سنگدلی سے کہا گیا کہ وہ اپنے بیٹوں کے چہروں کو اچھی طرح دیکھ لیں کیونکہ ان کے پاس اپنے بیٹوں کو دیکھنے کا یہ آخری موقع ہے۔اگر سکیورٹی فورسز اور خفیہ ایجنسیوں نے اپنی جابرانہ پالیسیاں جاری رکھیں تو اس سے جمہوری عمل کو نقصان پہنچے گا اور لوگوں میں ریاست سے بیگانگی کا احساس پیدا ہوگا۔ ایچ آرسی پی مطالبہ کرتا ہے کہ ایف سی اور خفیہ ایجنسیوں کے انتظامی سربراہان کو اپنی فورسز کو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے باز رکھنے کے لیے سخت پیغام دینا چاہئے اور اگر اس بات کے شواہد ملیں تو مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔
- ایچ آرسی پی پُریقین ہے کہ بلوچستان کے لوگ امن کی بحالی اور سیاسی استحکام کی مکمل حمایت کریں گے۔ بلوچ جنگجوؤں کو لوگوں کی خواہشات کا احترام کرنا چاہئے اور معصوم لوگوں پر اپنے جنگجویانہ حملے بند کرنے چاہئیں۔اگرچہ ایچ آرسی پی ریاستی عناصر کی جانب سے بلوچ قوم پرستوں کو لاحق خطرات سے مکمل طور پر واقف ہے اس کے باوجود کمیشن یہ توقع کرتا ہے کہ بلوچ جنگجو گروہ تشدد کا ارتکاب ترک کردیں گے۔اس وقت بلوچ قوم پرستوں اور جنگجوؤں کے پاس ان جدید حقائق کو تسلیم کرنے کا موقع ہے جو حالیہ جمہوری عمل کے ذریعے سامنے آئے ہیں۔ اس عمل کی کمزوری سے صرف غیر جمہوری طاقتوں کے ہاتھ ہی مضبوط ہوں گے۔ اور یہ بلوچستان میں کارکنوں کے خلاف تشدد کو ہوا دینے کا موجب بن سکتا ہے۔ ایچ آرسی پی کا مطالبہ ہے کہ مثبت پیش رفت کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور بلوچ جنگجوؤں کو چاہئے کہ وہ امن کو موقع دینے کے لیے کم از کم ایک محدود عرصے تک تمام قسم کے تشدد کو ترک کردیں۔اس سے نئی منتخب ہونے والی حکومت کو اُن ریاستی عناصر کے خلاف سخت موقف اختیار کرنے کا موقع ملے گا جو قومی سلامتی کے نام پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا ارتکاب کرتے

ہیں۔اس عرصہ کے دوران حکومت مانیٹرنگ کا ایک جامع طریقہ کار وضع کر سکتی ہے تا کہ ریاستی اہلکاروں کی جانب سے سرزد ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا سراغ لگایا جائے، ان کی تحقیقات کی جائے اور مجرموں کو سزا دی جائے۔اس سے انتقام کی بجائے امن کے فروغ میں مدد ملے گی کیونکہ انتقامی کارروائیوں کے نتیجے میں بالآخر عام شہریوں کو ہی اپنی زندگی، آزادی اور پُر امن رہن سہن کے حق سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

اذیت رسانی

26 جون: تھانوں اور جیلوں میں زیر حراست افراد کو ایذ رسانی، انتہائی غیر انسانی سلوک، رویہ اور قانون کی حکمرانی کے لیے بہت بڑا خطرہ اور چیلنج ہے۔اِس ضمن میں یہ بات قابلِ مذمت ہے کہ پاکستان میں روزانہ تھانوں میں زیرِ حراست کم از کم 1300 افراد پر ٹارچر کیا جاتا ہے جو کہ اقبالِ جرم کرانے کا ظالمانہ طریقہ کار ہے۔اِن خیالات کا اظہار 26 جون کو ٹارچر (ایذ رسانی) کے خلاف عالمی دن کے موقع پر ہونے والے سیمینار میں مقررین نے کیا جس کا موضوع "اذیت رسانی کا خاتمہ: انسانی حقوق کا تحفظ" تھا۔یہ سیمینار ہیومین رائٹس کمیشن آف پاکستان، ساؤتھ ایشیا پارٹنر شپ پاکستان، ایشین ہیومن رائٹس کمیشن، اینٹی ٹارچر الائنس، پاکستان کے زیر اہتمام ہیومین رائٹس کمیشن آف پاکستان کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔اس میں ملک بھر سے سول سوسائٹی تنظیموں نے شرکت کی۔اس موقع پر مقررین نے کہا کہ پاکستان میں ایذ رسانی یا ٹارچر کے بغیر تفتیش اور اقبالِ جرم کا کوئی نظام موجود نہیں ہے جو کہ ہماری ریاست میں انگریز دور کے نو آبادیاتی نظام کے غیر انسانی رویوں کی پیروی اور تسلسل ہے۔اُنہوں نے کہا کہ انگریز دور کے پینل کوڈ کے تحت سزاؤں اور ایذ انسانی کا یہ عمل انسانی حقوق کے منافی ہے اور ہمارے عدالتی، قانونی اور انتظامی نظام میں راسخ ہو چکا ہے۔اُنھوں نے اِس بات پر زور دیا کہ ہر سطح پر حکومتی اور ریاستی اداروں کو ٹارچر کے خلاف قائل کرنے کے لیے با قاعدہ مہم چلانے کی ضرورت ہے۔

ایچ آر سی پی کونسل کے بیانات

06 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے امیدواروں کو انتخابات سے باہر کرنے اور اپنی پسند کے امیدواروں کے چناؤ اور ان کا احتساب کرنے کی عوامی صلاحیت پر ہونے والے معاندانہ حملے پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔

ہفتہ کو اپنے اجلاس کے اختتام پر ایچ آر سی پی کی ایگزیکٹو کونسل نے ایک بیان میں کہا ''یہ بات واضح

ہے کہ امیدواروں کی چھانٹ کا حالیہ عمل بے بنیاد الزام تراشی ہے جس کا مقصد امیدواران کو ہراساں کرنا اور ان کی تضحیک کرنا ہے۔ اس سے جمہوریت کی اصل رُوح شدید متاثر ہورہی ہے اور یہ اپنے نمائندے منتخب کرنے کے عوام کے حق اور استعداد کو تسلیم نہ کرنے کے مترادف ہے۔ ایچ آرسی پی اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ سیاسی جماعتیں نگران حکومت کی تشکیل سمیت ان تمام مشکل ذمہ داریوں کو بخوبی سرانجام دے سکتی ہیں جوان پر یکے بعد دیگر عائد کی گئیں۔ تاہم آج ہم جس موڑ پر کھڑے ہیں اس کا بنیادی سبب ان سیاسی حکومتوں کی جانب سے اُن ریاستی اداروں کی عملی سیاست میں واضح مداخلت کے ادراک سے چشم پوشی ہے جن کا اِس میدان سے کوئی سروکار نہیں۔ اسی وجہ سے جمہوری عمل آج غیر نمائندہ گروہوں اور اداروں کے مخصوص مفادات کے تابع ہے۔ پاکستان کے عوام شفاف اور مذہب زدگی پرمبنی انتخابات میں فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ گزشتہ چند دنوں کے دوران امیدواروں کے ہونے والے چناؤ نے شدید تحفظات کو جنم دیا ہے۔ ریٹرننگ افسران کی مکمل من مانی سے امیدواروں کو نا اہل قرار دینا ہدایات اور شہہ کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا۔ ایچ آرسی پی کے خیال میں اس سارے عمل کا مقصد عوام کی رائے کو مکمل طور پر غیر متعلقہ قرار دے کر جمہوری نظام کی بساط لپیٹنے کی منصوبہ بند کوشش ہے۔ انتخابی عمل میں سوچی سمجھی بے ضابطگیوں کا مقصد مرکزی سیاست میں انتہا پسندی کی مداخلت اور لوگوں کی گردنوں پر مذہبی حکومت کا طوق چڑھانے کے ضیاءالحق کے ایجنڈے کی تکمیل ہے۔

ایچ آرسی پی کا سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی سے مطالبہ ہے کہ وہ پاکستان کو جمہوریت کی پٹڑی سے اتارنے کی حالیہ کوششوں کی بھرپور مذمت کریں اور غیر نمائندہ طرز حکومت کے قیام کے لیے مختلف حیلہ سازیوں سے انتخابات میں تاخیر کرنے کی تمام کارروائیوں کا پُرعزم مقابلہ کریں۔ انتخابات کا التواء غیر معمولی طور پر خلافِ عقل اور خطرناک ہے جس کا پاکستان بالکل بھی متحمل نہیں ہوسکتا۔ ایچ آرسی پی کا الیکشن کمیشن سے بھی مطالبہ ہے کہ وہ انتخابی عمل میں بے ہنگم محاذ آرائی کے انسداد کے لیے مداخلت کرے۔ ایچ آرسی پی تمام سیاسی قیادت پر زور دیتا ہے کہ وہ پاکستان میں نام نہاد فرشتوں کی حکمرانی قائم کرنے کے سازشی منصوبے کی کھل کر مذمت کریں۔ اس رجحان کی مذمت کرنے کی آواز صرف ایک سیاسی جماعت کے سربراہ کی طرف سے بلند ہوئی ہے۔ دوسروں کو بھی خوف کی فضا سے باہر نکل کر اس فیصلہ کن موڑ پر اپنی آواز اٹھانے کی ضرورت ہے۔

07 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آرسی پی) نے ملک بھر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر فوری توجہ دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ کمیشن نے بالخصوص مذہبی اور فرقہ وارانہ اقلیتوں کے خلاف بڑھتے ہوئے تشدد، دور افتادہ علاقوں میں ریاست کی موثر رٹ کی غیر موجودگی، خراب نظم وضبط، جبری

گمشدگیوں کی روک تھام میں ناکامی جہاں سندھ میں ان کی تعداد اب بلوچستان کے برابر ہوگئی ہے، گمشدہ افراد کی لاشوں کا برآمد ہونا صحافیوں اور انسانی حقوق کا دفاع کرنے والوں پر حملے اور قابل ذکر تعداد میں داخلی نقل مکانی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

سالانہ جنرل باڈی کے اجلاس کے اختتام پر ایچ آر سی پی نے کہا: ''کمیشن اس بات کی داد دے سکتا ہے کہ حکام کے پاس ان خلاف ورزیوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے جن سے اسے نبرد آزما ہونا ہے لیکن یہ یک سمتی، رسمی اور ان خلاف ورزیوں جنہوں نے بہت سے لوگوں کی حالت کو پہلے سے بھی زیادہ بدتر بنا دیا ہے کے حوالہ سے محض جوابی ردعمل ہے۔ اکثریتی آبادی کے عقیدہ سے تعلق نہ رکھنے والوں کے ساتھ عدم رواداری کا سلسلہ بلا روک ٹوک بڑھتا چلا جا رہا ہے جس کا اندازہ ان کے خلاف بڑھتے ہوئے تشدد سے لگایا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی مذہبی و مسلکی اقلیتوں کی تشویش ناقابل بیان ہے۔ مذہب کے نام پر بلوائی تشدد کو فروغ مل رہا ہے۔ ایچ آر سی پی کا مطالبہ ہے کہ پیشگی تنبیہ کو سنجیدگی سے لیا جانا چاہئے اور بروقت بامعنی اقدام کرنا چاہئے۔ لاہور میں مسیحی برادری کی جوزف کالونی پر حملے، جس نے قوم کا سر شرم سے جھکا دیا تھا، کو بھلایا جا چکا ہے۔ اس امر کی یقین دہانی کے لیے کچھ بھی نہیں کیا گیا کہ بلوچستان اور گلگت بلتستان میں ہزارہ شیعوں کے قتل عام پر قابو پالیا جائے گا۔ اپنے عقیدے کے باعث احمدیوں پر نشان زد حملوں کا سلسلہ جاری ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقتولین اور اس کے اہل خانہ کو حکام کی ہمدردیاں حاصل نہیں ہیں۔ مزید برآں احمدی وہ واحد گروہ ہے جسے جداگانہ انتخابی فہرستوں میں شامل کیا گیا ہے۔ مذہبی اقلیتوں اور مسالک کی عبادت گاہوں پر حملے معمول بن چکے ہیں۔ ملک بھر میں تعلیمی مراکز کے نام پر قائم ہونے والے اداروں سے منافرت کی تبلیغ کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ مخصوص مسلکی گروہوں کو ہتھیاروں کی تقسیم کی اطلاعات بھی منظر عام پر آئی ہیں۔ مذہب کی ذاتی اور پسندیدہ تشریحات اور سنگین قاتلوں کی من مانیاں پاکستان میں زندگی اور موت کا پیمانہ ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر فتنہ انگیزوں کو ریاستی مشینری میں موجود بعض عناصر کی مدد حاصل نہ ہوتی یا مجموعی طور پر ریاست غیر موثر سازی کا مظاہرہ نہ کرتی تو حالات اتنی سنگین صورت اختیار نہ کرتے۔ مذہب کے نام پر تشدد کی تبلیغ بارے قانون متعارف کروانے کی فوری ضرورت ہے۔ ملک کے بیشتر حصوں بشمول فاٹا، خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں لاقانونیت اب ایک عام رواج ہے۔ یہ تصور کرنا ہی محال ہے کہ ریاستی معاملات اتنے بدتر بھی ہو سکتے ہیں کہ کراچی میں کوئی حکومتی مشینری نظر ہی نہ آئے۔ ہر روز قتل ہونے والوں کی تعداد کم سے کم ایک درجن ہے۔ گزشتہ کچھ ماہ کے دوران پشاور سے بوری بند لاشیں ملتی رہی ہیں۔ دہشت گردوں کے بڑے گروہوں نے سرکاری تنصیبات پر حملے جاری رکھے جیسا کہ پشاور اور بنوں میں دیکھنے کو ملا۔ کشیدگی کے

باعث ہونے والی بے دخلی/نقل مکانی جاری رہی۔ بے دخلی کی بنیادی وجہ کو بھی معلوم نہیں کیا گیا۔ خیبرایجنسی کی تحصیل باڑہ میں ایک سال سے زائد عرصہ تک کرفیو نافذ رہا۔ لوگوں کی حالت زار کو ہر حوالے سے بری طرح سے نظرانداز کیا گیا۔ آج تقریباً فاٹا میں مسلح تصادم کی وجہ سے دس لاکھ کے قریب لوگ اندرونی طور پر بے دخل ہیں۔ عدلیہ خود کو تمام ریاستی امور میں شراکت دار بناتی ہے جبکہ یہ اس کا اپنا ہی حلقہ اختیار ہے جو کہ سب سے زیادہ نظرانداز شدہ اور پیچھے ہے۔ سپریم کورٹ ان درخواستوں پر کوئی فیصلہ نہیں دے پا رہی جو کہ جبری گمشدگی کے متعلق ہیں اور جس کی سماعت پہلی دفعہ 2007 میں شروع ہوئی۔ سال 2012 میں سندھ میں گمشدہ افراد کی تعداد بلوچستان میں گمشدہ ہونے والے افراد کے تقریباً برابر ہے۔ 2012 میں 72 افراد کی لاشیں جنکی گمشدہ ہونے کی اطلاعات دی گئی تھیں، ویران مقامات سے ملیں۔ انسانی حقوق کو نقصان پہنچانے والے قوانین متعارف کروانے کے نئے جذبے نے انسانی حقوق کے بین الاقوامی معاہدات اور ملکی قوانین کے نفاذ میں ناکامی کو مزید سنگین کر دیا ہے۔ قاتلوں کو سزا سے مکمل استثنٰی حاصل رہا۔ کراچی میں صحافی بابر ولی کا قتل، قاتلوں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے میں ریاستی اداروں کی ناکامی کی واضح مثال ہے۔ مقدمے کے چھ گواہوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ آج کی ابتر صورتحال میں ہر معروف صحافی کی زندگی خطرے کی زد میں ہے جس طرح کہ ہر معروف شیعہ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے۔ سیاسی کارکنوں اور سیاستدانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے اور وہ غیر محفوظ ماحول میں انتخابی مہموں میں مشغول ہیں۔ ان خوفناک حالات میں لوگ پر اعتماد ہو کر ووٹ ڈالنے کے لیے باہر کیسے نکلیں گے۔ تشدد کا خدشہ بھی موجود ہے۔

لوگوں کے معاشی خدشات صرف لوگوں تک ہی محدود رہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ خدشات مقتدر حلقوں کے لیے بھی قابل توجہ نہیں۔ انسانی حقوق کے تحفظ اور فروغ کے لیے کام کرنے والوں کے لیے خطرات میں نمایاں اضافہ ہوا۔ بہت سے صحافیوں اور انسانی حقوق کے محافظوں کو مخصوص حملوں میں قتل کیا جاتا رہا۔ دیگر بہت سوں کو دھمکیوں اور دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ سال 2012 میں پاکستان صحافیوں کے لیے ایک خطرناک ترین ملک تھا۔ ملک بھر میں 14 صحافیوں کا قتل ہوا۔ صحافیوں کو لاحق خطرات بلوچستان کے ضلع خضدار میں شدید ترین تھے جہاں صحافیوں کے رشتہ داروں کو نشان زد حملوں میں قتل کیا گیا۔

خواتین اور اقلیتی برادریوں کی استعداد سے استفادہ حاصل کرنے سے یکسر انکار سے ان معاملات کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی۔ ایچ آر سی پی اے جی ایم نے 2013 کے عام انتخابات میں تورغر، بنوں، لکی مروت، میانوالی اور دوسرے علاقوں میں خواتین کو انتخاب لڑنے یا ووٹ ڈالنے سے روکنے کے لیے طے کردہ اقدامات کے متعلق ایک مرتبہ پھر سامنے آنے والی اطلاعات کے متعلق شدید تشویش کا اظہار کیا۔ ایچ آر سی پی

کا الیکشن کمیشن سے مطالبہ ہے کہ وہ ایسے غیر قانونی اور غیر آئینی اقدامات کی کھلے عام مذمت کرے اوران کے خاتمے کے لیے موثر کارروائیاں کرے؛ ایسے حلقہ انتخاب کے نتائج کالعدم قرار دے جہاں خواتین کے ووٹ نسبتاً کم کاسٹ ہوں یا بالکل ہی کاسٹ نہ ہوں اور انتخابات کے دن ہی اس فیصلے کا اعلان کرے۔ ایچ آر سی پی تمام سیاسی جماعتوں، ان کے حمایتیوں اور مذہبی قائدین پر زور دیتا ہے کہ وہ خواتین ووٹروں یا انتخابات میں حصہ لینے والی خواتین کو حق رائے دہی سے محروم کرنے والے ایسے تمام غیر جمہوری ہتھکنڈوں کی مذمت کریں، انہیں مسترد کریں اوران سے لاتعلق رکھیں۔ یہ تباہ کن صورتحال میں ایک خطرناک آمیزش ہے۔ ایچ آر سی پی مرکز اور صوبوں میں نگران حکومتوں کے محدود کردار سے آگاہ ہے اور توقع کرتا ہے کہ وہ اپنی حدود میں رہتے ہوئے زندگی، آزادی اور لوگوں کے تحفظ کو یقینی بنائیں گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کی حقیقی رائے کی عکاسی کرنے والی نئی منتخب حکومت جلد از جلد ان مشکلات پر قابو پائے۔ یہ ضروری ہے کہ تبدیلی بندوق یا اخلاقیات کے پاسبانوں کے فتووں کی بجائے ووٹ کے ذریعے آئے۔ ایچ آر سی پی کا سیاسی جماعتوں سے بھی مطالبہ ہے کہ وہ اپنے منشوروں، انتخابی مہموں اور دیگر سرگرمیوں میں ان معاملات پر توجہ مبذول کریں۔ میڈیا اور سول سوسائٹی ایک مرتبہ پھر خود کو اکیلا محسوس کر رہے ہیں۔ خطرات کے باوجود انہیں ان تمام خلاف ورزیوں کو اجاگر کرنا ہوگا اور ان لوگوں سے معاونت کی امید وابستہ رکھنا ہوگی جنہیں عوام اس مقصد کے لیے منتخب کریں گے کہ وہ انہیں اس دلدل سے باہر نکالیں۔

14 اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ریاست کو درپیش شدید بحرانوں سے نبٹنے کے حوالے سے واضح پالیسی اور حکمت عملی کے فقدان پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔

ایچ آر سی پی کی ایگزیکٹو باڈی نے اپنے خصوصی اجلاس کے اختتام پر کہا: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی ایگزیکٹو باڈی کو ملک کو درپیش متعدد بحرانوں پر قابو پانے کے حوالے سے واضح پالیسی اور حکمت عملی کے فقدان پر تشویش لاحق ہے۔ دہشت گردوں سے کسی بھی قیمت پر مذاکرات کرنے کی شدید خواہش کے برے نتائج نکلیں گے۔ ان مذاکرات کی شرائط کے متعلق پائے جانے والے ابہام سے عوام کی اس پریشانی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے کہ دہشت گردوں کو دی جانے والی رعایت کی قیمت انہیں بنیادی انسانی حقوق پر سمجھوتے کی صورت میں چکانی پڑے گی اور دہشت گردوں کے زیر قبضہ علاقوں میں ریاست کا برائے نام کنٹرول بھی ختم ہو جائے گا۔ مزید برآں لوگوں کی یہ توقعات بھی دم توڑ رہی ہیں کہ ریاست کشیدگی زدہ علاقوں میں شہریوں کے تحفظ اور ضروریات کے حوالے سے اپنی بنیادی ذمہ داریاں سرانجام دینے کی استعداد حاصل کر لے گی۔ ایچ آر سی پی دنیا بھر میں ڈرون حملوں کا مخالف ہے مگر پاکستان میں دہشت گردی کا صرف یہ ہی

بنیادی سبب نہیں ہے اور پالیسی سازوں کی جانب سے صرف اس معاملے پر زور دینا حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی ڈرون حملوں میں مارے جا رہے ہیں تاہم لوگوں کی بہت بڑی تعداد دہشت گردوں کے بیہمانہ اور سنگین حملوں میں ماری جاری ہے جس پر ہماری سیاسی قیادت سنجیدہ توجہ نہیں دے رہی۔ اس لیے مکمل صورت حال کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایچ آر سی پی کا خیال ہے کہ پاکستان کے تمام مسائل کا سبب شدت پسندی پر ٹھوس ردعمل کا فقدان ہے۔

قانون میں ترامیم: قانون میں مجوزہ تبدیلیوں، بالخصوص دہشت گردی مخالف ایکٹ (اے ٹی اے) میں مجوزہ ترامیم نے اس خدشے کو جنم دیا ہے کہ ان کے باعث انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں جنم لیں گی۔ برقیاتی انداز سے کوائف اکٹھا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ عوام کی خفیہ نگرانی اور ان کی نجی زندگیوں میں مداخلت کی جائے گی۔ دستاویزات میں تحریف کئے جانے کا خدشہ بھی ہے۔ ان ترامیم پر ہونے والے مباحثے سے عوام کو بے خبر نہ رکھا جائے۔ کوئی بھی فیصلہ انتہائی شفاف اور جمہوری طریقے سے کیا جائے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ لاقانونیت کو کنٹرول کرنے کے لیے ماورائے عدالت اور غیر قانونی اقدامات کی طرف رجوع نہ کرے اور تحفظ عامہ کی خواہش میں انسانی حقوق پر سمجھوتہ نہ کرے۔

جبری گمشدگی: یہ انتہائی افسوسناک امر ہے کہ پاکستان نے ابھی تک جبری گمشدگی کی غیر قانونی روش ختم نہیں کی۔ بلوچستان میں یہ مسئلہ ابھی تک حل طلب ہے۔ علاوہ ازیں خیبر پختونخوا اور سندھ میں جبری گمشدگیوں کے واقعات تشویش میں اضافے کا باعث بن رہے ہیں۔ ایچ آر سی پی کا خیال ہے کہ بلوچستان میں مجرموں کو سزا سے استثنیٰ کے باعث دیگر صوبوں میں بھی ان خلاف ورزیوں کو فروغ مل رہا ہے۔ کمیشن کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ وہ ''جبری گمشدگی سے تمام افراد کا تحفظ کا بین الاقوامی میثاق'' پر دستخط کرے اور اس کی توثیق کرے۔

قیمتوں پر اضافہ: قیمتوں میں بڑھتے ہوئے اضافے کے باعث عوام کی صحت، تعلیم اور خوراک سمیت بنیادی حقوق تک رسائی کم ہوتی جا رہی ہے۔ بالخصوص توانائی کی قیمت میں اضافے اور افراط زر کے باعث لوگوں پر شدید برے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے بصورت دیگر غربت کی وجہ سے جرائم، خودکشیوں اور ذہنی بیماریوں میں اضافہ ہوگا۔

نظم و نسق: پاکستانی عوام نے جمہوریت کے لیے عظیم قربانیاں دی ہیں اور وہ ایک انتہائی بہتر نظم و نسق پانے کے مستحق ہیں نسبتاً اس کے جو وہ اب تک دیکھ چکے ہیں۔ یہ حقیقت دن بدن زیادہ نمایاں ہو رہی ہے کہ پارلیمان اپنا کردار ادا نہیں کر رہی۔ یہ رجحان ختم ہونا چاہیئے۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ وفاقی اور صوبائی حکومتیں

اپنے اختلافات کو ایک طرف رکھتے ہوئے مل کر اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کریں گی۔

انتخابی عمل: کونسل نے انتخابی عمل نقائص بالخصوص سیاہی کے استعمال اور انگلیوں کے نشانات کی دوبارہ جانچ پڑتال کے حوالے سے ہونے والی بحث کا نوٹس لیا ہے۔ اگرچہ الیکشن کمیشن آف پاکستان کی جانب سے کئے گئے انتظامات ناکافی تھے اور مختلف جماعتوں کی جانب سے کی جانے والی سازشوں کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ تاہم گڑھے مردے اکھاڑنے سے پارلیمنٹ کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ پارلیمنٹ کے نمائندہ کردار کو کمزور کرنے کے لیے ایسے اقدامات کی اجازت نہ دی جائے۔

کرپشن: کرپشن کے لوگوں کی زندگیوں پر کبھی بھی اتنے منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے جتنے اب ہو رہے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ حکومت اور سول سوسائٹی کی تنظیمیں بہتر نظم و نسق کے قیام پر توجہ دیں جس میں ایک جوابدہ حکومت اور بنیادی انسانی حقوق شامل ہیں۔

پولیو کے خلاف مہم: یہ انتہائی مایوس کن امر ہے کہ جو لوگ پاکستان کے بچوں کو ایک اپاہج مستقبل سے بچانا چاہتے ہیں انہیں اس کے بدلے میں گولیاں ماردی جاتی ہیں۔ فاٹا اور خیبر پختونخوا میں ایک لاکھ سے زائد بچے ویکسین سے محروم ہیں۔ پورے ملک کو پولیو ٹیموں پر ہونے والے حملوں کا مل کر مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ ہمارے بچوں کے لیے ایک صحت مند مستقبل کے مخالفین کو بے نقاب کیا جائے اور ایک جامع حکمت عملی بشمول موثر آگہی مہمات کے ذریعے بچوں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ ویکسین دینے والوں کو بھی تحفظ فراہم کیا جائے اور ان کی خدمات کی قدر کی جائے۔

زلزلہ زدگان کی امداد: یہ بات اب عیاں ہو چکی ہے کہ بلوچستان میں زلزلے کی شدت جس نے آواران کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ تھی جس کا پہلے اندازہ لگایا گیا تھا اور یہ کہ امداد متاثرین تک نہیں پہنچ رہی۔ متاثرہ علاقوں تک رسائی کی ہر صورت میں ضمانت دی جائے۔

انسانی حقوق کے مدافعین کے لیے سازگار ماحول کی فراہمی: پاکستان کے تمام علاقوں میں انسانی حقوق کے مدافعین، پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) اور انسانی حقوق کی دیگر تنظیموں کو درپیش خطرات بدستور قائم ہیں۔ ایچ آر سی پی ایک مرتبہ پھر حکومت کو اس کی ذمہ داری کی یاددہانی کرانا چاہتا تاکہ انسانی حقوق کے مدافعین کے لیے محفوظ ماحول کو یقینی بنایا جاسکے۔

کشیدگی زدہ علاقے: امن اور سلامتی کی عدم موجودگی کے باعث بلوچستان، فاٹا اور خیبر پختونخوا مشکلات کا شکار ہیں اور لوگوں کی زندگیوں پر اس جنگ کے اثرات کا جائزہ لینے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ لوگوں کی زبوں حالی کا جائزہ لینے میں اب مزید تاخیر نہ کی جائے۔

میڈیا کا کردار: ایچ آر سی پی میڈیا سے دہشت گردی کے واقعات کی رپورٹنگ کے دوران ضوابط کی پیروی کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ یہ صرف بریکنگ نیوز جاری کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرے گا بلکہ واقعات کے تعاقب کے ذریعے بھی لوگوں کو معلومات فراہم کرنے کی ذمہ داری پوری کرتا رہے گا۔

اقلیتیں: پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کے خلاف تشدد عروج پر ہے۔ جبکہ ان کی حالت زار پر توجہ نہیں دی جا رہی اور غیر مسلموں کے لیے ملک میں جگہ تنگ ہو رہی ہے۔ اس ناگفتہ بہ صورتحال پر قابو پانے کے لیے پیشگی اور ٹھوس اقدامات نظر نہیں آ رہے۔ اقلیتوں کی تکالیف کو کم کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے کی اشد ضرورت ہے۔